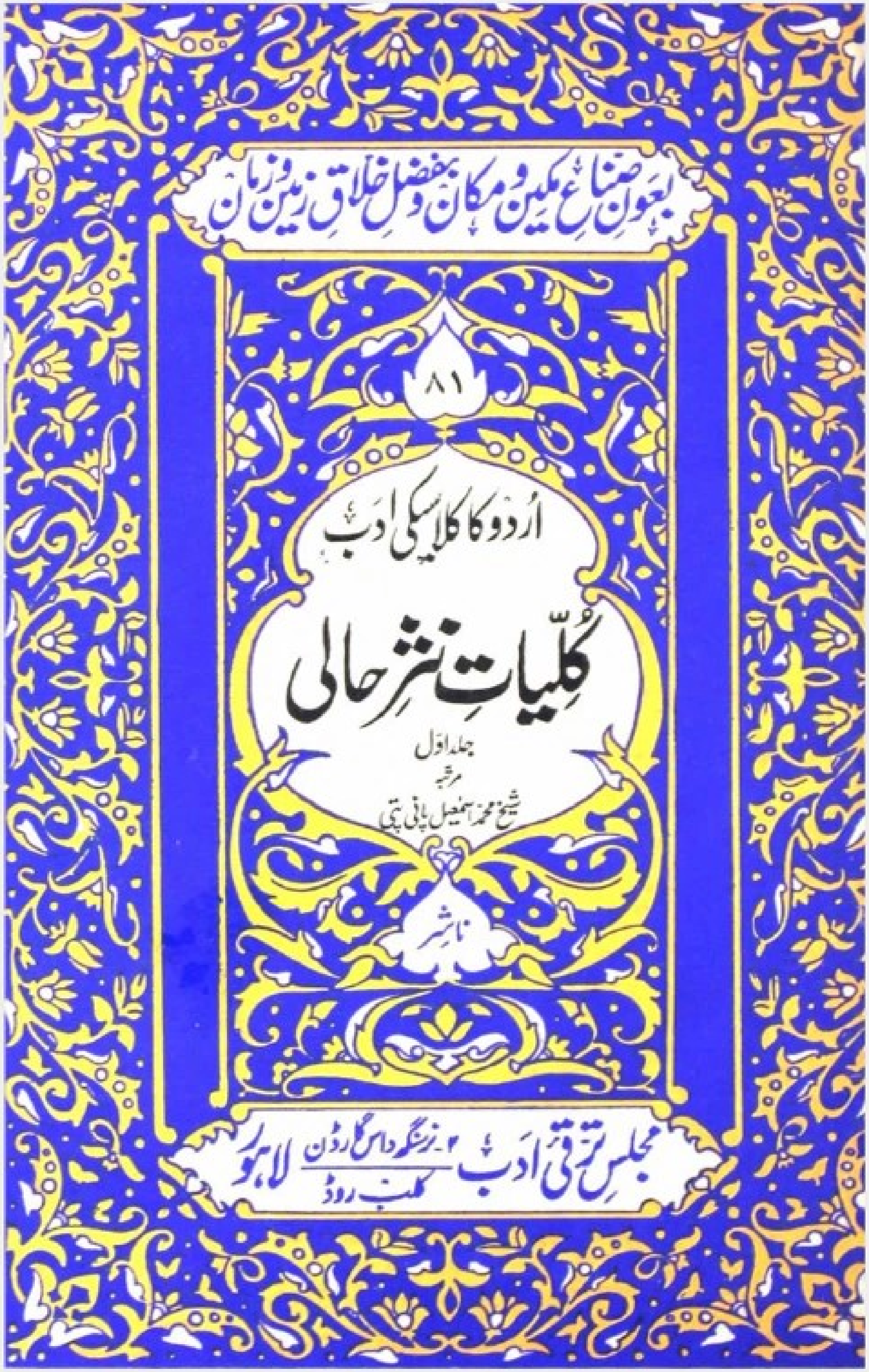

بعونِ صناعِ مکین و مکان و بفضلِ خلاقِ زمین و زمان

۸۱

اردو کا کلاسیکی ادب

کلیاتِ نثرِ حالی

جلد اول

مرتبہ

شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی

ناشر

مجلسِ ترقیِ ادب ۲- نرسنگھ داس گارڈن
کلب روڈ
لاہور

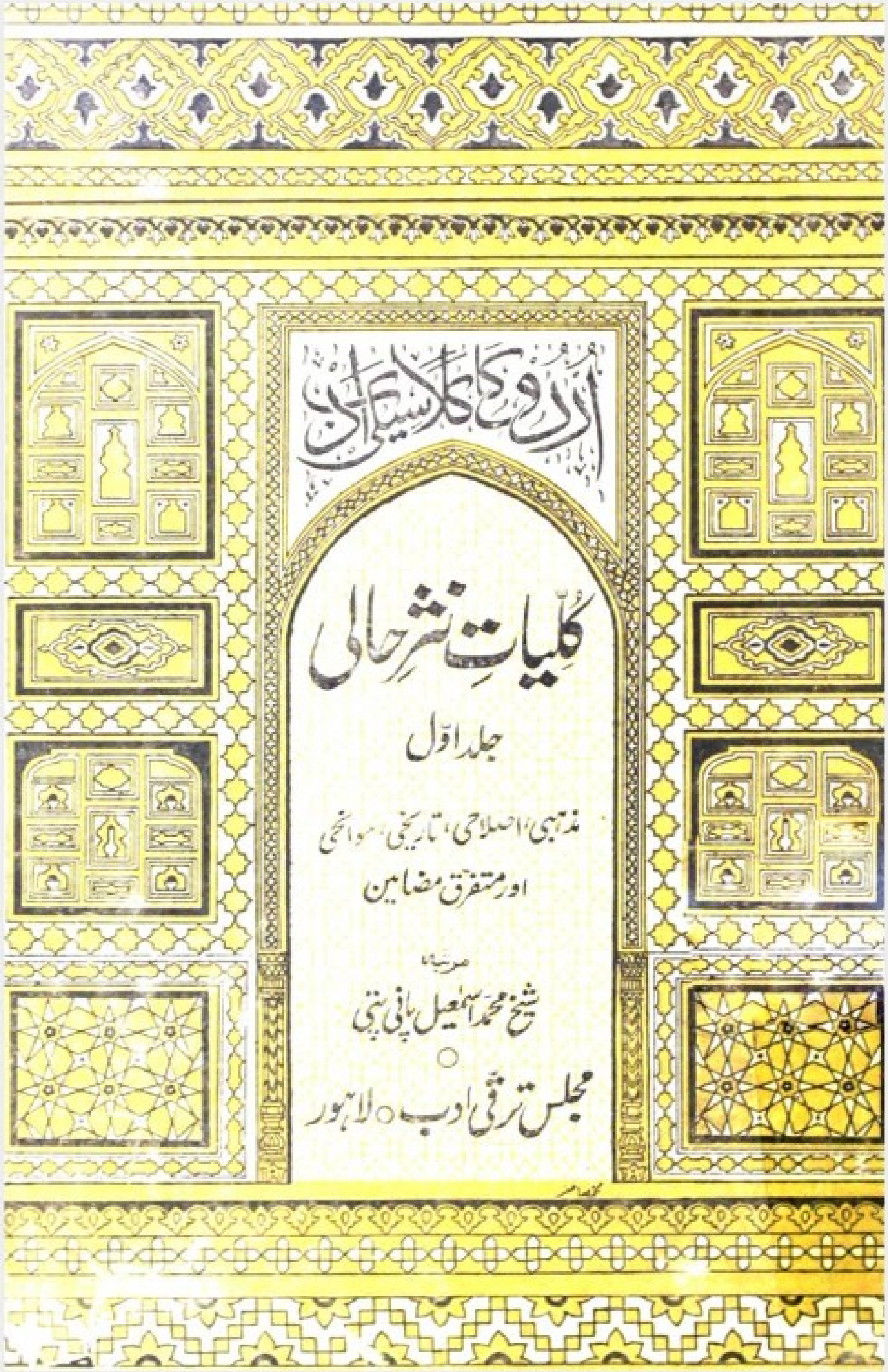

اردو کا کلاسیکی ادب

کلیاتِ نثرِ حالی

جلد اول

مذہبی، اصلاحی، تاریخی، سوانحی
اور متفرق مضامین

مرتبہ

شیخ محمد اسمٰعیل پانی پتی

○

مجلسِ ترقیِ ادب ○ لاہور

فہرست مضامین

جلد اول

نمبرشمار عنوان صفحہ

پیش لفظ از شیخ محمد اسماعیل پانی پتی ۵

۱- مذہبی مضامین (از صفحہ ۱ تا ۱۰۷)

۱- الدین یسرٌ ۳
۲- تدبیر ۳۰
۳- قرآن مجید میں اب نئی تفسیر کی گنجائش باقی ہے یا نہیں؟ ۷۰
۴- مسلمانوں میں مسئلہ خیرات ۹۸

۲- اصلاحی مضامین (از صفحہ ۱۰۹ تا ۲۶۱)

۱- زمانے کے موافق اپنا حال بناؤ ۱۱۱
۲- بدگمانی ۱۳۱
۳- مزاح ۱۴۱
۴- کیا مسلمان ترقی کر سکتے ہیں؟ ۱۶۱
۵- التماس بخدمت برادران وطن متعلق مسئلہ حجاب ۱۷۵
۶- اخبار نویسی اور اس کے فرائض ۱۸۳
۷- موت کے یقین سے ہم کو کیا سبق لینا چاہیے؟ ۱۹۱
۸- دنیا کی کل علم سے چلتی ہے یا عمل سے؟ ۱۹۷

نمبرشمار عنوان صفحہ

۹- ہم جیتے ہیں یا مر گئے؟ ۲۰۳
۱۰- حسب اور نسب ۲۱۵
۱۱- مسلمانوں میں عملی قوت کیوں نہیں رہی؟ ۲۲۰
۱۲- تجارت کا اثر عقل اور اخلاق پر ۲۲۸
۱۳- قومی جلسوں میں نظموں کی بھرمار ۲۴۳
۱۴- موجودہ مذہبی مناظرے ۲۴۸
۱۵- ہماری معاشرت کی اصلاح کیوں کر ہو سکتی ہے؟ ۲۵۵

۳- تاریخی مضامین (از صفحہ ۲۶۳ تا ۲۹۸)

۱- دیوان حافظ کی فالیں ۲۶۵
۲- مدعیان تہذیب کی بداعمالیاں ۲۷۱
۳- قرون اولیٰ کی حق گوئی و حق پسندی ۲۸۳

۴- سوانحی مضامین (از صفحہ ۲۹۹ تا ۳۴۵)

۱- شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ حرانی ۳۰۱
۲- مومن کے سوانحی حالات ۳۱۳
۳- بیان حالی ۳۲۸

۵- مضامین متعلق سر سید (از صفحہ ۳۴۷ تا ۳۸۴)

۱- سید احمد خاں اور ان کے کام ۳۴۹
۲- سرسید کی اسلامی اور مذہبی خدمات ۳۵۸

نمبرشمار عنوان صفحہ

۶۔ مضامین متعلق علی گڑھ کالج (از صفحہ ۳۸۵ تا ۴۳۲)

۱۔ مدرسۃ العلوم مسلمانان علی گڑھ ۳۸۷
۲۔ خیالات دربارۂ مسودۂ قانون ٹرسٹیان مدرسۃ العلوم علی گڑھ ۳۹۴

۷۔ متفرق مضامین (از صفحہ ۴۳۳ تا ۵۲۰)

۱۔ قدیم ہندوؤں کا علمِ طب ۴۳۵
۲۔ آریوں کا فن تعمیر ۴۳۶
۳۔ عربی الفاظ کی جمع اور تذکیر و تانیث کے اصول ۴۳۷
۴۔ بعض فارسی و عربی شعراء کی خصوصیات ۴۳۹
۵۔ اصول فارسی کا دیباچہ ۴۴۰
۶۔ ہندوستانیوں کی قابلیت و استعداد کا مقابلہ یورپ کے لوگوں کی لیاقت و تہذیب کے ساتھ ۴۵۰
۷۔ ایام تعطیل میں ایک سفر کی کیفیت ۴۶۷
۸۔ دیباچہ مثنوی بادم اللذات (یعنی مناجات بیوہ) ۴۷۹
۹۔ بڑے آدمیوں کے باپ ۴۸۱
۱۰۔ دیوتاؤں اور راکشسوں کی جنگ ۴۸۲
۱۱۔ زبانِ گویا ۴۸۶
۱۲۔ تحریکِ سودیشی کے متعلق تین سوالوں کے جواب ۴۹۰
۱۳۔ آل نامہ ۴۹۴
۱۴۔ ترجمۂ قصیدۂ عربیہ ۴۹۷
۱۵۔ حافظ محمد یعقوب صاحب مجددی ۵۱۹

بسم اللہ الرحمن الرحیم
نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

دیباچہ

(از شیخ محمد اسماعیل پانی پتی)

۱۳ صفر ۱۳۳۳ ہجری مطابق ۳۱ دسمبر ۱۹۱۴ عیسوی کو جمعرات کے دن ، رات کے دو بجے حضرت شمس العلماء مولانا حافظ خواجہ الطاف حسین حالی کا پانی پت میں انتقال ہوا اور دوسرے دن یکم جنوری ۱۹۱۵ عیسوی کو وہ حضرت بو علی شاہ قلندر کی درگاہ کے بیرونی احاطے میں حوض کے کنارے دفن کیے گئے ۔

میں نے اسی وقت سے حضرت مولانا مرحوم کے متعلق کام شروع کر دیا تھا جس کی چار شقیں تھیں :

۱۔ مولانا مرحوم کے علمی کارناموں اور مفصل سوانح حیات کی تالیف ۔
۲۔ مولانا کی تمام نظموں اور غزلوں کی تدوین ۔
۳۔ مولانا کے تمام نثری مقالات اور مضامین کی ترتیب ۔
۴۔ مولانا کے تمام مکتوبات و مراسلات کی فراہمی ۔

آج عرصۂ دراز کی محنت ، تلاش اور تگ و دو کے بعد میں مولانا کے مضامین ناظرین کرام کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں ۔

اس کتاب کی تدوین کی کہانی عجیب بھی ہے اور درد ناک بھی ؛ میں پانی پت میں مولانا حالی کی لائبریری کا مہتمم تھا ، اس لیے

اس موضوع کے متعلق مواد حاصل کرنے میں مجھے نسبتاً آسانی تھی ۔ پس جو کچھ مجھے آن کی لائبریری سے حاصل ہو سکا یا جو کچھ آن کے مسودات سے مل سکا ، وہ سب میں نے آہستہ آہستہ جمع کیا ۔ مگر اس راہ میں مشکل یہ پیش آئی کہ :

۱۔ اول تو مولانا مرحوم کی اپنی لائبریری میں خود آن کی تالیفات اور تصنیفات مکمل طور پر موجود نہیں تھیں ۔
۲۔ دوسرے مولانا نے تمام عمر میں ملک کے جرائد و رسائل میں جو مضامین لکھے ، نہ آن کی لائبریری میں آن کا ریکارڈ محفوظ تھا اور نہ ہی وہ پرچے موجود تھے جن میں آن کے مضامین شائع ہوا کرتے تھے ۔
۳۔ تیسرے اس امر کا پتا لگانا بھی آسان نہ تھا کہ مولانا مرحوم نے اپنی زندگی میں ابتدا سے آخر تک کن کن رسالوں اور اخباروں میں مضامین لکھے تھے ۔
۴۔ چوتھے آن قدیم رسالوں اور پرانے اخباروں کا مہیا کرنا بھی بہت دقت طلب کام تھا جن میں مولانا کے مضامین شائع ہوئے تھے ، کیوں کہ اخبارات کے مضامین ایک مرتبہ چھپ کر بالعموم چھپ جایا کرتے ہیں اور ملک میں ایسی کوئی لائبریری نہیں جہاں پرانے اخبارات کے تمام فائل محفوظ ہوں ۔

ان باتوں کی موجودگی میں میرا کام جتنا مشکل تھا اس کا ناظرین کرام آسانی سے اندازہ لگا سکتے ہیں ۔ مگر میں نے ہمت نہ ہاری اور کام کو جاری رکھا ۔ ۱۹۳۰ء میں ایک مختصر مجموعہ مرتب کرکے انجمن ترقی آردو اورنگ آباد کو دیا اور پھر مزید مضامین کی تلاش میں مصروف ہو گیا ۔ ۱۹۴۷ء تک مولانا کے مقالات اور آن کی تحریروں کا ایک معقول ذخیرہ میرے پاس جمع ہو گیا ۔ مگر

ان ہی ایام میں تقسیم ملک کا واقعہ پیش آیا اور قتل و غارت اور بربادی و تباہی کا ایسا ہولناک طوفان برپا ہوا جس کی نظیر اس ملک نے پہلے کبھی نہ دیکھی تھی ۔ پانی پت میں میرا عظیم کتب خانہ ، رسائل کی جلدیں، اخبارات کے فائل ، قیمتی مسودات اور نادر یادداشتوں کے بنڈل ، غرض سب کچھ برباد ہو گیا اور مجھے اپنی عمر بھر کی کمائی کے غارت ہونے پر خون کے آنسو رو کر مجبوراً صبر کرنا پڑا ۔

لاہور پہنچ کر میں نے دوبارہ مضامین کی فراہمی کا کام شروع کیا کہ ۱۹۵۳ء میں یکایک اتنی زبردست بارش ہوئی کہ میرے مکان میں چار چار فٹ پانی بھر گیا اور میرے سارے مسودات اور اخبارات کے فائل اور کتابیں پانی میں ڈوب گئیں ۔

میں نے ضائع شدہ مسودات پر صبر کرکے سہ بارہ تلاش کا کام شروع کیا ۔ اس دفعہ میرا نہایت ہی لائق اور فاضل فرزند محمد احمد بھی میرا شریک کار تھا ۔ مگر صد ہزار افسوس کہ اُس کی زندگی نے وفا نہ کی اور وہ صرف ۳۰ برس کی عمر میں ۹ جنوری ۱۹۶۲ء کو مجھے حزین و غمگین چھوڑ کر اپنے آسمانی آقا کے پاس چلا گیا ۔

جب اس صدمے سے طبیعت کو قدرے سکون ہوا تو کئی مہینے کے بعد لرزتے ہوئے ہاتھوں سے پھر میں نے چوتھی دفعہ کتاب کی تیاری کا کام شروع کیا ۔ مگر کام کرتے کچھ ہی دن ہوئے تھے کہ میری رفیقہ‌ٔ حیات شہربانو اپنے نہایت ہی پیارے اور بے حد سعادت مند بیٹے کی جدائی برداشت نہ کر سکی اور ۲۹ جنوری ۱۹۶۳ء کو وہ بھی اس کے پاس چلی گئی ۔ اناللہ و انا الیہ راجعون ۔ شہربانو میرے تمام علمی کاموں میں میری برابر کی شریک رہتی تھی ۔ اُس کے انتقال سے میں بالکل بے دست و پا ہو کر رہ گیا مگر مرضی مولا از ہمہ اولیٰ ۔

عرصے کے بعد جب اس حادثے کا بوجھ ہلکا ہوا تو میں نے

پانچویں مرتبہ پھر قلم ہاتھ میں لیا اور کام شروع کر دیا جو الحمدللہ کہ اب ختم کر رہا ہوں[1] ۔

حضرت مولانا حالی نے ۱۸۶۳ عیسوی سے مضامین لکھنے شروع کیے اور ۱۹۱۰ عیسوی تک لکھتے رہے ، جو پورے پچاس برس کا زمانہ ہوتا ہے ۔ عجیب اتفاق ہے کہ حضرت مولانا نے پچاس برس تک مضامین لکھے اور میں نے ۱۹۱۵ء سے ۱۹۶۵ء تک پچاس ہی برس کے عرصے میں ان مضامین کو تلاش کرکے فراہم کیا ۔ یعنی یہ مجموعہ جو ناظرین کرام کے ہاتھوں میں ہے ، پورے ایک سو برس یعنی کامل ایک صدی کی کاوش و کوشش کا نتیجہ ہے ۔ اُردو کی کم ہی کتابیں ایسی ہوں گی جو اتنے طویل عرصے میں تیار ہوئی ہوں ۔

پانی پت کے زمانہ‌ٔ قیام میں مولانا حالی کے قریبی عزیز اور میرے محترم اُستاد حضرت مولانا خواجہ غلام الحسنین انسپکٹر تعلیمات کمرگہ نے حضرت مولانا کی نایاب تحریروں سے اور میرے عزیز ترین دوست شیخ محمد بدرالاسلام فضلی پروفیسر ٹوکیو یونیورسٹی جاپان نے اپنے قیمتی مشوروں سے میری بڑی مدد فرمائی ۔ افسوس ! اب یہ دونوں بزرگ اس دنیا میں موجود نہیں اور اُن کی وفات سے جو چرکا میرے دل پر لگا ہے وہ ساری عمر موجود رہے گا ۔

پاکستان بننے اور لاہور آنے کے بعد محترمی مولوی محمد عبداللہ صاحب قریشی مدیر 'ادبی دنیا' نے حضرت مولانا کی بعض نایاب تحریروں کی نشان دہی کی اور محب صادق ڈاکٹر وحید قریشی صاحب ایم ۔ اے ، پی ۔ ایچ ۔ ڈی ، ڈی لٹ نے اپنے قیمتی مشوروں سے مجھے نوازا ۔ ڈاکٹر صاحب موصوف میرے نہایت مخلص دوست ، اورینٹل کالج

---

[1] میں نے یہ کتاب ۱۹۶۵ء میں تیار کر دی تھی مگر اس کے چھپنے کی نوبت اب ۱۹۶۷ء میں آئی ہے ۔ محمد اسماعیل

کے پروفیسر، پاکستان رائٹرز گلڈ کے سیکرٹری، مجلس ترقی ادب کے رکن۔ مجلہ 'صحیفہ' کے مدیراعزازی اور بہت سی کتابوں کے مصنف ہیں۔ مکرمی مولانا امداد صابری مؤلف 'تاریخ صحافت' نے ایک قدیم رسالے سے مولانا کا ایک نہایت اعلیٰ پایے کا مضمون نقل کرا کے دہلی سے بھیجا۔ محترمی ڈاکٹر عبدالقیوم صاحب ایم۔ اے، پی، ایچ ڈی نے بعض مضامین کے حوالے مجھے کراچی سے لکھ کر ارسال فرمائے اور محبی ملک احمد نواز صاحب انچارج شعبۂ اردو پنجاب یونیورسٹی لائبریری نے تلاش کرکے مجھے کئی نادر چیزیں مرحمت فرمائیں۔ میں نہایت صمیم قلب کے ساتھ ان سب احباب کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ اس سلسلے میں پروفیسر محمد اکبرالدین صاحب صدیقی ایم۔ اے لکچرار عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد دکن کا بے حد ممنون ہوں جنھوں نے اتنی دور دکن میں بیٹھے ہوئے بڑے ہی اخلاص کے ساتھ میری بیش قرار مدد فرمائی اور وہاں کی لائبریریوں سے بعض ایسی نادر چیزیں تلاش کرکے بھیجیں جنھیں میں یہاں کسی طرح بھی حاصل نہیں کر سکتا تھا۔

اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر و احسان ہے کہ میں ۷۵ سال کی عمر میں اجب کہ قویٰ عام طور پر کمزور اور مضمحل ہو جاتے ہیں، خداوند کریم کی دی ہوئی توفیق کے ساتھ اس خالص ادبی کام کو نصف صدی کی طویل محنت کے بعد انجام تک پہنچا سکا۔ فالحمدللہ علیٰ ذالک۔

خاکسار محمد اسماعیل پانی پتی
رام گلی نمبر ۳۔ لاہور

مورخہ ۸ نومبر ۱۹۶۷ع

کلیاتِ نثر حالی

مرتبہ

شیخ محمد اسماعیل پانی پتی

۱۔ مذہبی مضامین

۱

الدین یسر

(رسالہ تہذیب الاخلاق بابت ۱۲۹۶ھ مطابق ۱۸۷۹ع ، صفحہ ۱۳)

> حضرت شمس العلما مولانا الطاف حسین حالی کا یہ اصلاحی مضمون جس درجہ بے عدیل و بے نظیر اور جیسا اہم اور وقیع ہے ، اُس کا اندازہ قارئین کرام اس کو پڑھ کر ہی لگا سکیں گے ۔ آج کل کے زمانے میں اشد ضرورت ہے کہ ہر مسلمان اس مضمون کو اول سے آخر تک نہایت غور سے اور پوری توجہ کے ساتھ پڑھے ۔ جس شخص کو بھی اس مضمون کے پڑھنے اور اس پر غور کرنے کا موقع ملے گا اسے اس حقیقت پر ایمان لانا پڑے گا کہ دین میں جس قدر آسانیاں ہیں وہ سب خدا اور رسولؐ کی طرف سے ہیں اور جتنی مشکلات ہیں ، وہ ہمارے علما اور فقہا کی ڈالی ہوئی ہیں ۔
>
> (محمد اسماعیل پانی پتی)

دین برحق کی شان یہ ہے کہ اُس میں کوئی چیز انسان کو مجبور کرنے والی نہ ہو ۔ نہ اعتقادات میں کوئی محال بات تسلیم کرائی جائے ، نہ عبادات میں کوئی بوجھ ایسا ڈالا جائے کہ عاجز بندوں سے اُس کی برداشت نہ ہو سکے ۔ کھانے ، پینے ، پہننے اور برتنے کی چیزوں میں اُن کے لیے اُسی قدر روک ٹوک ہو جیسے طبیب کی طرف سے بیمار کے حق میں ہوتی ہے ۔ اُس کا بڑا مقصد اخلاق کی تہذیب اور نفس انسانی کی تکمیل ہو ۔ اُس میں عبادت کے طریقے ایسے عمدہ ہوں جن میں مشقت کم اور فائدہ بہت ہو ۔ اُس کے اصول

ایسے جامع ہوں کہ ایک نیکی میں بہت نیکیاں مندرج ہوں ۔ اُس میں کوئی بندش ایسی نہ ہو جس سے انسان کو اپنی واجبی آزادی سے دست بردار ہونا پڑے ۔ اس میں کوئی مزاحمت ایسی نہ ہو جس سے انسان پر ترقی کی راہیں مسدود ہو جائیں اور وہ خلافت رحمانی کا منصب حاصل کرنے سے محروم رہ جائے اور جس خوان یغما سے اُس کے بنی نوع بہرہ مند ہیں ، اُس میں ان کا شریک نہ ہو سکے ؛ جیسے ایک کوتل گھوڑا ، جو اپنے ہم جنسوں کو جنگل میں آزاد اور بے قید چرتا اور کاول کرتا دیکھتا ہے مگر خود اپنے مالک کے بس میں ایسا مجبور و ناچار ہے کہ اُن کو حسرت بھری نگاہ سے دیکھتا ہے ، لیکن ہاتھ پاؤں نہیں ہلا سکتا اور بوجھ میں لدا ہوا چپ چاپ چلا جاتا ہے ۔

صرف دین اسلام ہی وہ دین ہے کہ جب اس کی اصل ماہیت پر نظر کی جاتی ہے تو وہ نہایت پاک اور سچا دین ثابت ہوتا ہے ۔ یہ دین انسان کی آزادی کو قائم رکھتا ہے اور اُس کو کسی دشوار بات کے کرنے یا ماننے پر مجبور نہیں کرتا ۔ اس میں نہ تثلیث اور کفارہ جیسی کوئی انوکھی بات تسلیم کرنی پڑتی ہے نہ رہبانیت جیسی کوئی سخت مشقت اُٹھانے کی اُس میں ضرورت ہے ۔

خدا تعالیٰ نے اس دین کے آسان ہونے کو اپنے کلام پاک میں طرح طرح سے جتایا ہے ؛ چناں چہ فرماتا ہے :

۱- یرید اللہ بکم الیسر و لا یرید بکم العسر ۔ (بقرہ)
۲- لایکلف اللہ نفساً الا وسعہا ۔ (بقرہ)
۳- ما جعل علیکم فی الدین من حرج ۔ (الحج)

یعنی ۱- خدا تمھارے لیے آسانی چاہتا ہے ، دشواری نہیں چاہتا ۔
۲- خدا کسی کو اُس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا ۔
۳- خدا نے دین میں تم پر کسی طرح کی تنگی نہیں کی ۔

ہمارے ہادی اور رہنما ؐ نے بھی اس ضروری بات کو طرح طرح سے اُمت کے خاطر نشیں کیا ہے ؛ چناں چہ فرمایا :

ان الدین یسر و لن یشاد الدین احد الا غلبہ ۔ (بخاری)

یعنی دین آسان ہے اور جو کوئی اس دین میں سختی اختیار کرے گا وہ آخر کو عاجز اور درماندہ ہوگا ۔ یعنی اعمالِ شاقہ سے تھک کر ضروری فرائض بھی ترک کرنے لگے گا ۔

یہ بھی فرمایا کہ : ’’ بعثت بالحنیفۃ السمحۃ البیضاء‘‘ (بخاری) یعنی میں وہ شریعت لایا ہوں جو آسان اور روشن ہے ۔ یہ بھی کہا کہ : ’’ خذوا من الاعمال ما یطیقون‘‘ یعنی وہ اعمال اختیار کرو جن کے تم متحمل ہو سکو ۔ یہ بھی ارشاد فرمایا کہ : ’’انما بعثتم میسّرین و لم تبعثوا معسّرین‘‘ یعنی (اے اسلام والو!) ’’ تم سہل گیر بھیجے گئے ہو ، نہ سخت گیر ۔‘‘ اُس نے نجات کا مدار صرف ایک نیکی یعنی توحید پر رکھا جو تمام نیکیوں کا سرچشمہ ہے اور یہ کہا : ’’ من شہد ان لا الہ الا اللہ صادقاً بہا دخل الجنۃ‘‘[۱] ۔ اُس نے استحقاق رحمت سے صرف ایک بدی یعنی شرک کو مستثنیٰ کیا جو تمام بدیوں کی جڑ ہے اور یہ کہا : ’’من مات لایشرک باللہ شیئاً حرمہ اللہ علی النار ۔[۲]‘‘

تعصب جو کہ انسان کی ترقی کا سخت مانع ہے ، اُس کے ناگوار بوجھ سے اسلام کو طرح طرح سے سبکدوش کیا گیا ۔ مسلمانوں کو اجازت دی گئی کہ ’’فاسئلوا اھل الذکر ان کنتم لا تعلمون ۔‘‘ یعنی ’’اگر تم اُمم سابقہ کا علم نہیں رکھتے تو اہل کتاب سے پوچھ لو ۔‘‘

---

[۱] یعنی ’’جس شخص نے صدق دل کے ساتھ یہ بات کہی کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں ، وہ جنتی ہے ۔‘‘ (اسماعیل)

[۲] یعنی جو شخص اس حال میں مرا کہ اللہ کے سوا کسی کو نہیں پوجتا تھا ، اُس پر اللہ نے دوزخ کو حرام کر دیا ۔ (اسماعیل)

زید بن ثابت کو سریانی زبان سیکھنے کے لیے ارشاد ہوا۔ بنی اسرائیل سے روایت کرنے کی صاف صاف اجازت دی گئی۔ ہر مسلمان کو آگاہ کیا گیا کہ ”دانش مندی کی بات مومن کی گم شدہ پونجی ہے۔ پس جہاں کہیں اس کو ملے، وہ اس کا زیادہ حق دار ہے۔“ یہ بھی صاف صاف ارشاد ہوا کہ ”من دعا الی عصبیۃ فلیس منا و من مات علی عصبیۃ فلیس منا و من قاتل علی عصبیۃ فلیس منا۔“ یعنی ”جس نے تعصب کی طرف بلایا، یا تعصب کی حالت میں مرا یا تعصب کی بنا پر لڑا، وہ ہم میں سے نہیں ہے۔“ اہل کتاب کا کھانا مسلمانوں کے لیے اور مسلمانوں کا کھانا اہل کتاب کے لیے حلال کیا گیا۔ یہ بھی جتایا گیا کہ ”کان یحب موافقۃ اھل الکتاب فیما لم یومر فیہ بشئی۔“ (شمائل ترمذی) یعنی ”جس بات میں کوئی نصِ صریح نہ ہو اس میں موافقت اہل کتاب کی پسندیدہ ہے۔“

لونڈی غلاموں کی اس قدر حمایت کی گئی کہ وہ حقیقۃً یا حکماً ہمیشہ کے لیے آزاد کیے گئے۔

رائے انسانی کو یہاں تک آزادی حاصل ہوئی کہ نبی کے حکم کی نسبت، جو وہ اپنی رائے سے دے، لوگوں کو ماننے یا نہ ماننے کا اختیار دیا گیا۔ خود نبی کریم صلعم کو یہ حکم ہوا کہ ”مسلمانوں سے مشورہ کر لیا کرو۔“

سفر، خوف یا مرض وغیرہ کی حالت میں عبادات مفروضہ میں طرح طرح کی آسانیاں کی گئیں۔ یہ بھی اجازت دی گئی کہ اگر کہیں قبلے کی سمت محقق نہ ہو تو اٹکل سے کوئی سمت مقرر کر کے اسی طرف نماز پڑھ لو۔ اگر چاند نظر نہ آئے تو تیس روزے رکھ کر رمضان کو ختم کر دو۔ اگر پانی نہ ملے تو تیمم کر لو۔ اگر کپڑا نہ ہو تو ننگے بدن نماز پڑھ لو۔

الغرض اس پاک دین میں، جب تک وہ اپنی اصلیت پر برقرار رہا، کوئی چیز انسان کی واجبی امنگ اور خوشی اور آزادی کو روکنے والی نہ تھی مگر افسوس ہے کہ وقتاً بعد وقتٍ اور حیناً بعد حینٍ اس پر حاشیے چڑھنے شروع ہوئے اور رفتہ رفتہ اُن کی کثرت اس درجے کو پہنچی کہ متن اور حاشیوں میں تمیز کرنی دشوار ہو گئی۔ بلکہ متن بالکل نظروں سے غائب ہو گیا۔

پہلا حاشیہ جو اس ملت بیضا پر چڑھایا گیا وہ یہ تھا کہ جو باتیں رسول خدا نے محض اصلاحِ معاش کے لیے تعلیم فرمائی تھیں اور جن کا مدار صرف مصالحِ دنیوی پر تھا، وہ بھی شریعت میں داخل کی گئیں اور ان کو بھی ضروریات دین سے سمجھا گیا، حالانکہ یہ ایک صریح مغالطہ تھا جس کو خود رسول کریمؐ نے اپنی زندگی میں حل کر دیا تھا۔

اصل یہ ہے کہ جس قوم میں رسول خدا صلعم مبعوث ہوئے تھے، اس کی اندرونی اور بیرونی دونوں حالتیں زمانۂ جاہلیت کے امتداد سے معالجے اور اصلاح کی محتاج تھیں۔ جس طرح اُن کے عقائد اور اخلاق بگڑ گئے تھے، اسی طرح اُن کا طریق تمدن اور طرز معاشرت بُری حالت میں تھا۔ وہ جیسے مبدأ و معاد سے غافل تھے ویسے ہی کھانے پینے اور پہننے کے آداب سے ناواقف تھے۔ اُن کی مجلسیں تہذیب سے معرا تھیں، اُن کے معاملات وحشیانہ تھے، اُن کا طریقِ معاش بے ڈھنگا تھا۔

پس اس دین کے ہادی اور دنیا کے رہبر نے جیسا اپنے منصبی فرائض یعنی تبلیغِ احکامِ الٰہی کو ضروری سمجھا اور اس کو مبدأ و معاد کی حقیقت سے آگاہ کیا اور اُن کے عقائد باطلہ اور اخلاق رذیلہ کی اصلاح فرمائی، اسی طرح رقت نوعی اور قومی ہمدردی کے مقتضا سے اُن کے طریق معاش کو بھی درست کیا، ان کی مجلسوں میں

تہذیب پھیلائی ، لباس اور طعام کے آداب سکھائے ، نشست و برخاست کے قاعدے بتائے ۔ سلام ، مصافحہ ، معانقہ ، تہنیت ، تعزیت ، مہمانی ، ضیافت ، بیاہ ، شادی ، لین دین ، سفر ، اقامت ، کھیتی ، تجارت ، حفظ صحت ، دوا دارو ، غرض کہ جملہ امور دنیوی کے اصول تعلیم فرمائے ، مگر اسی قدر جتنے کہ اس زمانے اور اس ملک کے مناسب تھے ۔

ان دونوں میں سے پہلی تعلیم آپ کا منصبی فرض تھا جس کے لیے آپ مبعوث ہوئے تھے اور جس کی نسبت کلام الٰہی میں آپ کو یہ ارشاد ہوا کہ : ”یاایھا الرسول بلغ ما آنزل الیک من ربک[1] ۔“ اور اُمت کو یہ حکم ہوا کہ : ”ما اتاکم الرسول فخذوہ و ما نہاکم عنہ فانتہوا[2] ۔“ اسی کا نام شریعت رکھا گیا اور اسی کی مخالفت پر ضلالت کا اطلاق کیا گیا ۔

دوسری تعلیم ، جو کہ معاش سے علاقہ رکھتی تھی ، وہ آپ کے منصبی فرائض سے بالکل علیحدہ تھی : نہ اس کی تعلیم اُمت پر فرض کی گئی اور نہ اس کے خلاف عمل درآمد کرنے کی ممانعت ہوئی ۔ اور اسی تعلیم کی نسبت آں حضرت نے یہ ارشاد فرمایا کہ : ”انما انا بشر اذا امرتکم بشیء من دینکم فخذوا بہ و اذا امرتکم بشیئی من رای فانما انا بشر[3] ۔“

۱- یعنی ”اے رسول ! جو کچھ تجھ پر تیرے پروردگار کی طرف سے نازل ہوا ہے ، وہ لوگوں تک پہنچا دے ۔“ (اسماعیل)

۲- یعنی ”جو کچھ یہ رسول تم کو دے وہ لے لو ، اور جس سے منع کرے ، بس اُس سے باز رہو ۔“ (اسماعیل)

۳- یعنی ”یقیناً میں بھی (تم جیسا) ایک آدمی ہوں ۔ جب دینی امور میں تمہیں کوئی حکم دوں تو اس کی تابعداری کرو اور دنیوی امور میں اپنی رائے سے میں کچھ کہوں تو بے شک میں انسان ہوں ۔“ (یعنی غلطی بھی کر سکتا ہوں) ۔ (اسماعیل)

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی[1] (قدس سرہ) نے اپنی کتاب ”حجۃ اللہ البالغہ[2]“ کے ساتویں مبحث میں اس بات کا بیان کیا ہے کہ احکام شرعیہ کو احادیث نبوی سے کیوں کر استنباط کرنا چاہیے اور اس مبحث کے پہلے باب میں احادیث نبوی کو دو قسموں پر تقسیم کیا ہے ۔

ایک قسم وہ ہے جو تبلیغ رسالت سے متعلق ہے اور جس کی نسبت کتاب اللہ میں یہ ارشاد ہوا ہے کہ : ”ما اتاکم الرسول فخذوہ و ما نہاکم عنہ فانتہوا ۔“ یعنی ”جس بات کا رسول تم کو حکم دے اسے مان لو اور جس بات سے وہ تم کو روکے اس سے باز رہو ۔“ اس قسم کو علمِ آخرت اور علمِ عجائب ملکوت اور علم شرائع و احکام اور علمِ اخلاق و فضائل اعمال میں منحصر کیا ہے ۔ پھر لکھا ہے کہ اسی قسم سے ہماری غرض متعلق ہے اور اسی کو ہم اس مبحث میں بیان کریں گے (یعنی جو باتیں دنیوی تعلیم سے علاقہ رکھتی ہیں ، وہ اس کتاب کے مباحث سے خارج ہیں) ۔

پھر وہ لکھتے ہیں کہ ”دوسری قسم وہ ہے جو تبلیغ رسالت سے تعلق نہیں رکھتی اور جس کی نسبت آپؐ نے فرمایا ہے کہ

۱- حضرت شاہ ولی اللہ بارھویں صدی کے مجدد اعظم ، زبردست عالم ، بے نظیر فاضل اور اعلیٰ پائے کے محدث تھے ۔ ۴ شوال ۱۱۱۴ھ (۱۷۰۳ء) کو دہلی میں پیدا ہوئے ۔ سات سال کی عمر میں قرآن مجید ختم کر لیا اور پندرہ سال کے تھے کہ حدیث ، تفسیر ، فقہ ، منطق ، علم کلام ، تصوف ، طب ، صرف و نحو ، معانی و بیان اور علم ہندسہ و حساب وغیرہ تمام مروجہ وقت علوم میں کامل دست گاہ حاصل کر لی اور مدرسہ رحیمیہ میں بیٹھ کر درس دینے لگے ۔ حضرت شاہ صاحب ہی وہ سب سے پہلے بزرگ ہیں جنھوں نے قرآن پاک کا فارسی میں ترجمہ کیا ۔ قمری حساب سے ۶۳ سال کی عمر میں ۱۱۷۶ھ (۱۷۶۲ء) میں وفات پائی ۔ (اسماعیل)

۲- ’حجۃاللہ البالغہ‘ حضرت شاہ ولی اللہؒ کی تصنیف ہے جو بالاتفاق بڑے پائے کی کتاب سمجھی جاتی ہے ۔

میں صرف ایک آدمی ہوں ۔ جب میں تم کو تمہارے دین کی کوئی بات بتاؤں تو اُس کو مان لو اور جب اپنی رائے سے کوئی بات کہوں (تو یہ جان لو کہ) میں صرف ایک آدمی ہوں ۔'' اور نیز قصۂ بیرِ نخل[1] میں اسی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ ''میں نے ایک رائے لگائی تھی ، سو تم مجھ سے اُس رائے کی بابت مواخذہ نہ کرو ، لیکن جب میں کوئی بات خدا کی طرف سے کہوں تو اُسے مان لو کیوں کہ میں خدا پر جھوٹ نہیں باندھتا ۔'' اس کے بعد شاہ صاحب نے دوسری قسم میں بہت سے ابواب داخل کیے ہیں ۔

ازاں جملہ وہ بے شمار حدیثیں جو طب سے علاقہ رکھتی ہیں یا جو آپ نے اپنے ذاتی تجربے کی رو سے ارشاد فرمائی ہیں ؛ جیسے حدیث ''علیکم بالادھم الاقرح'' یعنی ''جس مشکی گھوڑے کی پیشانی پر سفید دھبا ہو اسے ڈھونڈ لیا کرو ۔'' ازاں جملہ وہ افعال جو آپ نے عادت کی نظر سے نہیں بلکہ عادت کی راہ سے یا قصداً نہیں بلکہ اتفاقاً کیے ہیں ۔ ازاں جملہ وہ امور جن کا ذکر آپ بھی اُسی طور پر کیا کرتے تھے جس طرح آپ کی قوم کرتی تھی ، جیسے حدیث ام ذرع اور حدیث خرافہ ۔ ازاں جملہ وہ حدیثیں جو خاص کسی وقت کی

---

[1] کھجوروں میں ایک درخت نر ہوتا ہے اور ایک مادہ ۔ نر کے پھول مادہ پر چڑھانے کو 'تابیر' کہتے ہیں ۔ مسلم نے یہ قصہ رافع بن خدیج سے اس طرح پر نقل کیا ہے کہ جب آں حضرت ؐ مدینے میں آئے تو اہل مدینہ کو تابیر کرتے ہوئے دیکھا ۔ پوچھا کیا کرتے ہو ؟ لوگوں نے عرض کیا کہ ہم اسی طرح کرتے رہے ہیں ۔ آپ نے فرمایا : ''شاید اگر نہ کرو تو بہتر ہو ۔'' اُنھوں نے چھوڑ دیا ۔ اس سال پھل کم آیا ۔ لوگوں نے آپ سے ذکر کیا ۔ آپ نے فرمایا ''انما انا بشر'' الخ ۔ اور بعضی روایتوں میں یہ ہے کہ آپ نے کہا ''انما ظننت ظنا و لا تواخذونی بالظن ولٰکن اذا حدثتکم عن اللہ شیئاً فخذوا بہ فانی لم اکذب علی اللہ'' ۔ (اسماعیل)

مصلحت کے لحاظ سے ارشاد ہوئی ہیں ، نہ یہ کہ تمام اُمت کے لیے ہمیشہ کے واسطے ضروری ہیں ۔ اور اس اخیر باب کی نسبت شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ اس پر بہت سے احکام محمول کیے گئے ہیں ۔ انتہٰی ملخصاً ۔

صحابۂ کرام بھی ، جیسا کہ صحیح روایتوں سے ثابت ہے ، احادیث نبوی کی نسبت ایسا ہی اعتقاد رکھتے تھے جیسا کہ شاہ صاحب نے بیان کیا ہے ، اور آپ کی تمام تعلیمات کو تبلیغ رسالت سے متعلق نہیں جانتے تھے ۔

ایک بار کچھ لوگ زید بن ثابتؓ[1] کے پاس حدیث سننے کو آئے ۔ اُنھوں نے پہلے اس سے کہ اُن کے سامنے کچھ حدیثیں بیان کریں ، یہ کہا کہ ''میں آں حضرت ؐ کے ہمسائے میں رہتا تھا ، سو جب آپ پر وحی نازل ہوتی تھی ، آپ مجھے بلا بھیجتے تھے ۔ میں حاضر ہو کر وحی لکھتا تھا ۔ پھر جب ہم دنیا کی باتیں کرتے تھے تو آپ بھی ہمارے ساتھ ویسی ہی باتیں کرنے لگتے تھے اور جب آخرت کا ذکر کرتے تھے تو آپ بھی ہمارے ساتھ آخرت ہی کا ذکر کرنے لگتے تھے اور جب ہم کھانے کا ذکر کرتے تھے تو آپ بھی ویسا ہی ذکر کرنے لگتے تھے ۔ سو میں ان سب باتوں کو بہ طور حدیث نبوی کے تمہارے سامنے بیان کروں گا ۔ (حجۃ اللہ البالغہ)

اس روایت سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ زید بن ثابتؓ اُن لوگوں کو یہ جتانا چاہتے تھے کہ میں بہت سی حدیثیں تمہارے سامنے ایسی بیان کروں گا جو امر دین سے علاقہ نہیں رکھتیں ۔

---

[1] زید بن ثابت آں حضرت صلعم کے جلیل القدر صحابی اور کاتب وحی تھے ۔ علم الفرائض اسلامی اور قانون وراثت کے نہایت ماہر تھے ۔ ۴۵ھ مطابق ۶۶۶ع میں بہ عمر ۵۶ سال مدینے میں وفات پائی ۔ (اسماعیل)

مسلم[1] اور ترمذی[2] میں ابن عمرؓ[3] اور جابرؓ[4] سے روایت ہے کہ آں حضرتؐ نے طواف میں رمل[5] کا حکم دیا اور اب تک اسی کے موافق عمل درآمد ہے۔ مگر حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں جب حج کا موسم آیا تو انھوں نے طواف میں رمل کرنے سے منع کیا اور یہ کہا: ''مالنا وللرمل کنا تترایا بہ قوماً قد اھلکھم اللہ۔'' یعنی جس قوم کے دکھانے کو ہم رمل کرتے تھے اس کو خدا نے ہلاک کر دیا۔ (حجۃ اللہ البالغہ)

۱۔ صحیح مسلم: حدیث کی مشہور کتابوں میں سے ہے صحیح بخاری کے بعد اسی کا درجہ ہے۔ حضرت امام ابوالحسین مسلم بن الحجاج قشیری نیشاپوری کی تالیف ہے جو بڑے پایے کے محدث اور علم حدیث کے ماہر گزرے ہیں۔ حضرت امام بخاری کے شاگرد تھے اور بڑے بڑے محدث اُن کے شاگرد ہیں۔ ۲۵ رجب ۲۶۱ھ کو انتقال فرمایا۔ (اسماعیل)

۲۔ سنن ترمذی: احادیث کی مشہور کتاب اور صحاح ستہ میں داخل ہے۔ امام محمد بن عیسیٰ ترمذی کی تالیف ہے جو حضرت امام بخاریؒ کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں۔ ۲۷ رجب ۲۷۹ھ کو وفات پائی۔ (اسماعیل)

۳۔ ابن عمر: عبداللہ نام ہے۔ فاروق اعظم، خلیفۂ ثانی حضرت عمر بن خطاب کے فرزند گرامی اور بڑے پرہیزگار، عابد و زاہد اور صحابہ میں خاص علم و فضل کے مالک تھے۔ ۷۳ھ (۶۹۲ع) میں وفات پائی۔ آپ کی عمر ۸۶ یا ۸۴ برس کی ہوئی۔ (اسماعیل)

۴۔ حضرت جابر بن عبداللہ آنحضورؐ کے اکابر صحابہ میں سے ہیں۔ حضور کے ہمراہ ۱۷ غزوات میں شرکت فرمائی۔ ۹۴ سال کی عمر میں ۷۴ھ (۶۹۳ع) میں انتقال فرمایا۔ (اسماعیل)

۵۔ 'رمل' بازو ہلا کر پہلوانوں کی طرح چلنے کو کہتے ہیں۔ مدینے کے بخار سے کفار مکہ مہاجرین کی نسبت یہ خیال کرتے تھے کہ وہ ضعیف و کمزور یا ہلاک ہو جائیں گے۔ اُن کا گمان غلط کرنے کے لیے آپؐ نے رمل کا حکم دیا تھا۔ (اسماعیل)

ابو داؤد[1] میں ابو الطفیل[2] سے روایت ہے کہ میں نے ابن عباسؓ[3] سے پوچھا کہ لوگ کہتے ہیں کہ آنحضرتؐ نے رمل کیا اور یہ سنت ہے۔ ابن عباسؓ نے جواب دیا کہ اس میں کچھ صحیح ہے، کچھ غلط ہے۔ میں نے کہا، صحیح کیا ہے؟ اور غلط کیا ہے؟ کہا، رمل کرنا آنحضرتؐ کا تو صحیح ہے مگر اس کو سنت جاننا غلطی ہے۔

ان دونوں روایتوں سے ظاہر ہے کہ حضرت عمرؓ رمل کے حکم کو مصالحِ دنیوی سے جانتے تھے، اور عبداللہ ابن عباسؓ آں حضرت کے ہر فعل کو سنت یا دین نہیں سمجھتے تھے۔ اس کے علاوہ اکثر حدیثیں اسی مطلب پر دلالت کرتی ہیں، طوالت کے خوف سے یہاں نقل نہیں کی گئیں۔

غرض اس میں شک نہیں کہ ایک بہت بڑا حصہ احادیث نبوی کا ایسا تھا جو تبلیغِ رسالت سے کچھ علاقہ نہ رکھتا تھا مگر غلطی سے وہ بھی اس میں داخل سمجھا گیا۔ اور جو طریقہ تمدن اور معاشرت کا اب سے تیرہ سو برس پہلے خاص عرب کے لیے اُس زمانے اور اُس ملک

۱۔ سنن ابو داؤد: حدیث کی مشہور کتاب ہے اور صحاح ستہ میں اُس کا چوتھا درجہ ہے۔ امام ابو داؤد سلیمان بن الاشعث سجستانی اس کے مؤلف ہیں۔ ۷۳ سال کی عمر میں ۱۶ شوال ۲۷۵ھ (۸۸۸ع) کو بصرے میں انتقال ہوا۔ (اسماعیل)

۲۔ ابو الطفیل عامر بن واثلہ: آٹھ برس کے تھے کہ آنحضرتؐ نے انتقال فرمایا۔ یہ صحابہ میں دنیا میں سب سے آخری شخص تھے جو باقی رہ گئے تھے۔ آخر ۱۰۲ھ میں آپ نے بھی مکے میں وفات پائی۔ (اسماعیل)

۳۔ عبداللہ بن عباس: آنحضرتؐ کے چچا زاد بھائی اور بڑے پایے کے صحابی تھے۔ ۶۱۹ع میں مکے میں پیدا ہوئے۔ حضرت علی کے زمانۂ خلافت میں بصرے کے حاکم بھی رہے ہیں۔ ۶۸ھ (۶۸۷ع) میں وفات پائی۔ (اسماعیل)

کی ضرورتوں کے موافق تعلیم کیا گیا تھا ، وہ ہر ملک اور ہر قوم کے لیے الٰی یوم القیامہ واجب العمل اور واجب الاذعان ٹھہرایا گیا ، یہاں تک کہ جس طرح نماز ، روزہ ، حج ، زکٰوۃ کے مسائل میں علما کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت تھی ، اُسی طرح ان باتوں کے دریافت کرنے کی بھی حاجت ہوئی کہ کھانا کس وضع پر کھائیں ، لباس کیسا پہنیں ، جوتا منڈا پہنیں یا نوکدار ، ٹوپی ہلکی پہنیں یا بھاری ، برتن چینی کے برتیں یا تانبے کے ، غیر قوموں کے علوم پڑھیں یا نہ پڑھیں ، غیر زبانوں میں سے کون سی زبان سیکھیں اور کون سی نہ سیکھیں ، غیر زبانوں کے الفاظ بہ حسب ضرورت اپنی زبان میں استعمال کریں یا نہ کریں ، نئی وضع کا مکان جس میں ہر موسم کی آسایش ہو ، بنائیں یا نہ بنائیں ، تمباکو میں گڑ ڈال کر پئیں یا خشک ، چائے میں کچا دودھ ملا کر پئیں یا اَونٹا ہوا ؛ غرض کہ انسان کے تمام قوائے جسمانی اور نفسانی اور اُس کی تمام حرکات و سکنات اور اس کے تمام اعضاء و جوارح پر قیدیں اور بندشیں لگائی گئی ہیں اور اس کے لیے کوئی موقع ایسا نہ چھوڑا گیا جس میں وہ اپنی بدنصیب عقل سے بھی کچھ مشورہ یا کام لے سکے ۔

دوسرا حاشیہ یہ چڑھا کہ اعمال بدنی اور احکام ظاہری ، جو کہ بہ منزلہ قالب کے تھے ، اُن میں اس قدر تعمق اور تدقیق کی گئی اور اُن پر اس قدر زور دیا گیا کہ اخلاق فاضلہ اور ملکات صالحہ ، جو بہ منزلہ روح کے تھے اور جن کے تر و تازہ رکھنے کے لیے اعمال ظاہری مشروع ہوئے تھے ، اُن کی طرف اصلا توجہ باقی نہیں رہی ، اور دنیوی ترقیات جن کے بغیر دین کی شوکت قائم نہیں رہ سکتی ، مسدود ہو گئیں ۔ خدا اور رسول کی نہیں بلکہ فقہا کی تکلیفات نے عاجز بندوں کو ایسا شکنجے میں کھینچا کہ ان میں دنیا کے بڑے بڑے کام کرنے کا دم باقی نہیں رہا ۔

انبیا کی بعثت کا خاص مقصد انسان کے نفس کی تکمیل اور اُس کے اخلاق کی تہذیب تھی اور اگرچہ ہر نبی بہ حسب ظاہر ایک جداگانہ شریعت کے ساتھ بھیجا گیا مگر نتیجہ تمام شریعتوں کا واحد تھا ۔ خدا تعالٰی قرآن میں فرماتا ہے : ”شرع لکم من الدین ما وصّٰی بہ نوحاً والذی اوحینا الیک و ما وصینا بہ ابراھیم و موسٰی و عیسٰی ان اقیموا الدین و لا تتفرقوا فیہ ۔“

یعنی” مقرر کیا تمھارے لیے وہ دین جو تعلیم کیا تھا ہم نے نوحؑ کو اور جس کی وحی بھیجی ہم نے تجھ کو اور تعلیم کیا ابراہیمؑ اور موسٰیؑ اور عیسٰیؑ کو (اور وہ یہ ہے) کہ برپا رکھو دین کو اور اُس میں تفرقہ نہ ڈالو ۔“ اس سے معلوم ہوا کہ اُمت محمدیہ کو وہی دین تعلیم ہوا جو نوح اور ابراہیم اور موسٰی اور عیسٰی علیہم السلام کو تعلیم ہوا تھا ۔ اور آنحضرت نے فرمایا ہے کہ ”انما بعثت لاتمم مکارم الاخلاق ۔“ یعنی ”میں صرف اس لیے بھیجا گیا ہوں کہ اخلاق کی خوبیوں کو کمال کے درجے پر پہنچا دوں ۔“ اس آیت اور اس حدیث کا مطلب ملانے سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ تمام ادیان کا خاص مقصد تہذیبِ اخلاقِ انسانی کے سوا اور کوئی شے نہ تھی ۔

ایک شخص آنحضرتؐ کی خدمت میں آیا اور اُس نے چار بار آپ سے یہ پوچھا کہ دین کیا چیز ہے ؟ آپ نے ہر بار یہی فرمایا کہ ”حسن اخلاق“ (احیاءالعلوم) فضیل[1] سے روایت ہے کہ ایک عورت کی نسبت آنحضرتؐ کی خدمت میں یہ عرض کیا گیا کہ ”وہ ہمیشہ روزے رکھتی ہے اور ہمیشہ شب بیدار رہتی ہے مگر بدخلق ہے ، ہمسایوں کو اپنی بد زبانی سے آزار پہنچاتی ہے ۔“ آپ نے فرمایا : ”اس

۱- فضیل بن ایاز ایک نہایت دین دار اور زاہد و عابد بزرگ تھے ۔ حضرت امام جعفر صادقؑ کے شاگرد اور سری سقطی کے اُستاد تھے ۔ حرم کعبہ میں نماز پڑھتے ہوئے ۱۸۷ھ مطابق ۸۰۳ع میں انتقال فرمایا ۔ (اسماعیل)

میں کچھ خیر نہیں ہے ، وہ اہل دوزخ میں سے ہے ۔'' (احیاءالعلوم) آپ فرماتے ہیں کہ ''مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے لوگ سلامت رہیں اور مہاجر وہ ہے جو برائیوں کو چھوڑ دے'' (بخاری) ایک شخص نے آنحضرت سے پوچھا کہ اسلام کی کون سی چیز سب سے بہتر ہے ؟ آپ نے فرمایا کھانا کھلانا اور جان پہچان اور انجان دونوں سے صاحب سلامت کرنی'' (بخاری) ۔ آپ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ ''تم میں سے کوئی صاحب ایمان نہ ہوگا جب تک اپنے بھائی کے لیے بھی وہی نہ چاہے جو اپنے لیے چاہتا ہے ۔''

اس سے ظاہر ہے کہ وضو اور غسل ، نماز اور روزہ ، حج اور زکٰوۃ اور اسی طرح تمام ظاہری احکام مقصود بالذات نہ تھے بلکہ محض تصفیۂ باطن اور معالجۂ نفس اور تہذیب اخلاق کے لیے بہ منزلہ آلات کے تھے ۔ چنانچہ نماز کی نسبت ارشاد ہوا کہ وہ ''فحشاء اور منکر سے باز رکھتی ہے''۔ اور روزے کی نسبت یہ فرمایا کہ ''وہ اس لیے فرض کیے گئے ہیں کہ تم برائیوں سے بچو۔'' اسی طرح قرون اولیٰ اور خاص کر قرن اول میں طہارت اور نجاست اور عبادات بدنی اور اعمال ظاہری میں اس مبالغے اور تشدد کا کہیں نام نہ تھا جو اس کے بعد عباد و زہاد و فقہا اور صوفیہ میں پیدا ہوا ۔

امام غزالی[1] ''احیاءالعلوم''میں لکھتے ہیں کہ صحابۂ کبار کسبِ معاش اور طلب علم اعلاے کلمۃاللہ اور اور ضروری کاموں میں ایسے

---

[1] امام غزالی : ابو حامد محمد بن محمد نام اور حجۃالاسلام لقب ہے ۔ عوام میں اپنی جائے پیدائش غزالہ (واقع طوس ، ملک خراسان) کی نسبت سے غزالی مشہور ہیں ۔ بہت سی معرکہ‌آرا کتابوں مثل 'احیاءالعلوم' 'جواہرالقرآن' 'تفسیر یاقوت التاویل' (چالیس جلدوں میں) 'مشکٰوۃ الانوار' اور 'کیمیاے سعادت' وغیرہ کے مصنف ہیں لیکن ان میں سب سے زیادہ شہرت احیاءالعلوم کو حاصل ہے ۔ بہت بڑے صوفی ، فقیہ ، محقق ، فلسفی اور ادیب تھے ۔ ١٠٣٨ع (٤٣٠ھ) میں پیدا ہوئے اور ١١٢٦ع (٥٢٠ھ) میں وفات پائی ۔ (اسماعیل)

مصروف تھے کہ ان کو ان باتوں کی اصلا فرصت نہ تھی ۔ وہ ننگے پاؤں چلتے تھے ، زمین پر نماز پڑھتے تھے ، خاک پر بیٹھتے تھے ، گھوڑے اور اونٹ وغیرہ کے پسینے سے پرہیز نہ کرتے تھے ، دل کی پاکیزگی میں بہت کوشش کرتے تھے ، ظاہری پاکی پر چنداں التفات نہ کرتے تھے ، غیر مذہب والوں کے برتن کا پانی برابر استعمال کرتے تھے ، جس برتن میں عام لوگوں کے ہاتھ پڑیں اس سے نفرت نہ کرتے تھے ، انتہٰی ۔ آں حضرت صلعم بھی ظاہری احکام کی چنداں پابندی نہ فرماتے تھے ۔ کبھی ایک ہی چلّو سے مضمضہ[1] اور استنشاق[2] دونوں کر لیتے تھے ، کبھی دو چلّو سے ، کبھی تین چلّو سے ، جس زمین پر نماز پڑھتے اسی پر تیمم کر لیتے اور یہ فرماتے کہ جہاں نماز کا وقت آ جائے وہیں مسلمان کی مسجد ہے اور وہیں اس کی طہارت ہے ۔ ہمیشہ مقتدیوں کا خیال رکھتے تھے ۔ اگر جماعت میں سے کسی بچے کے رونے کی آواز آتی تو نماز جلد ختم کر دیتے ۔ اگر نماز میں کوئی بچہ آپ سے آن لپٹتا تو اسے اٹھا کر کندھے پر بٹھا لیتے ۔ بارہا امام حسین[3] سجدے کی حالت میں آپ کی پشت مبارک پر چڑھ گئے اور آپ نے ان کے خیال سے سجدے کو طول دیا ۔ کبھی آپ نماز میں ہوتے تھے اور حضرت عائشہؓ اپنے حجرے کی کنڈی کھٹکھٹاتیں تو آپ نماز ہی میں جا کر کنڈی کھول دیتے تھے ۔ کبھی آپ سے نماز میں کوئی سلام کرتا تو آپ نماز ہی میں اشارے سے اس کو جواب دیتے تھے ۔ ایک بار بنی عبدالمطلب کی دو لڑکیاں لڑتی ہوئی آپ کے قریب آئیں تو نماز ہی میں آپ نے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر ان کو چھڑا دیا ۔ کبھی جوتیوں سمیت نماز پڑھتے تھے اور کبھی ننگے پاؤں (سفرالسعادۃ) ۔ ابن عباسؓ سے روایت

---

[1] ''مضمضہ'' کُلّی کرنے کو کہتے ہیں ۔ (اسماعیل)

[2] ''استنشاق'' کے معنی ہیں ناک میں پانی ڈالنا ۔ (اسماعیل)

ہے کہ آپ نے ظہر کو عصر کے ساتھ اور مغرب کو عشا کے ساتھ اس حالت میں جمع کیا کہ نہ سفر تھا ، نہ کوئی خطرہ تھا اور نہ بارش تھی ۔ لوگوں نے ابن عباسؓ سے پوچھا کہ آپ نے ایسا کیوں کیا ؟ کہا ، اس لیے کہ اُمت پر تنگی نہ رہے ۔ (ترمذی)

موسم حج میں ایک شخص نے آپ سے آ کر عرض کی کہ میں نے قربانی سے پہلے سر منڈوا لیا ہے ۔ فرمایا ”کچھ حرج نہیں ، اب قربانی کر لے ۔“ پھر ایک اور شخص نے آ کر کہا کہ میں نے کنکریاں پھینکنے سے پہلے قربانی کر لی ہے ۔ فرمایا ”کچھ حرج نہیں ، اب کنکریاں پھینک لے ۔ اسی طرح جس کسی نے ایسی بے ترتیبی کی بابت پوچھا ، اُس سے آپ نے یہی فرمایا کہ ”افعل ولا حرج“ (بخاری) عمرو بن عاص[1] ایک آیت سے یہ سمجھ گئے کہ جُنب کی ضرورت کی حالت میں تیمم کافی ہے اور عمرؓ ابن خطاب ایک دوسری آیت سے یہ سمجھے کہ تیمم لمس نساء کے لیے ہے ، نہ جنابت کے لیے ۔ آں‌حضرتؐ نے دونوں پر کوئی اعتراض نہیں فرمایا ۔ طارق[2] سے روایت ہے کہ ایک شخص جُنبی تھا ، اُس نے نماز پڑھی ۔ جب آپؐ سے ذکر کیا تو فرمایا ”تو ٹھیک سمجھا ۔“ پھر ایک دوسرے شخص نے جنابت کی حالت میں تیمم کر کے نماز پڑھ لی اور جب آپ سے ذکر کیا تو اُسے بھی آپ نے یہی فرمایا کہ تو ٹھیک سمجھا (عقد الجید) ۔ غرض کہ تمام اعمال ظاہری اور عبادات بدنی میں آپ کے برتاؤ ایسے تھے جن میں اُمت کے لیے آسانی ہو ۔

---

۱ - عمرو بن عاص : سہمی قریشی ، مشہور صحابی ، زبردست بہادر اور فاتح مصر ہیں ۔ ۵ھ یا ۸ھ میں حضرت خالد بن ولید کے ساتھ مکہ سے حاضر ہو کر اسلام لائے اور عمان کے حاکم مقرر کیے گئے ۔ مصر اُنھوں نے حضرت عمر کے زمانے میں فتح کیا تھا ۔ حضرت معاویہ کے بڑے مشیروں میں سے تھے ۔ ۹۰ برس کی عمر میں ۴۳ھ میں وفات پائی ۔ (اسماعیل)

۲ - طارق : آں حضرتؐ کے صحابہ میں سے ہیں ۔ (اسماعیل)

شاہ ولی اللہ صاحبؒ ”حجۃ اللہ البالغہ“ میں لکھتے ہیں کہ حضور صلعم کے زمانے میں احکام کی بحث ایسی نہ تھی جیسی فقہا کے وقت میں ہوئی کہ وہ کمال اہتمام سے ہر شے کے ارکان اور شرائط اور آداب جدا جدا بیان کرتے ہیں اور فرضی صورتوں پر گفتگو کرتے ہیں ۔ آں حضرتؐ کے زمانے میں تو یہ حال تھا کہ صحابہ نے جس طرح آپ کو وضو کرتے دیکھا ، اُسی طرح آپ بھی کرنے لگے ۔ نہ آں حضرت نے کسی چیز کو رکن ٹھیرایا اور نہ ادب ٹھیرایا ۔ اسی طرح اُنھوں نے جیسے آں حضرت کو نماز پڑھتے اور حج کرتے دیکھا ، ویسا ہی آپ بھی کرنے لگے ۔ کبھی آپ نے یہ نہیں فرمایا کہ وضو میں چھ فرض ہیں یا چار اور کبھی آپ نے (فقہا کی طرح) کوئی صورت فرض کر کے اُس پر کوئی حکم نہیں لگایا ، الا ماشاء اللہ ۔ اور صحابہ بھی ایسے امور میں آپ سے کچھ سوال نہ کرتے تھے ۔ انتہٰی

عمر ابن اسحاق[1] سے منقول ہے کہ اصحاب نبی میں سے جتنے صحابیوں کو میں نے دیکھا ہے ، وہ ان کی نسبت زیادہ ہیں جو مجھ سے پہلے گزر گئے ۔ میں نے کوئی گروہ دین میں آسانی کرنے والا اور سختی نہ کرنے والا ان سے زیادہ نہیں دیکھا (دارمی) عبادہ بن یسر کندی[2] سے لوگوں نے سوال کیا کہ اُس عورت کی بابت کیا حکم ہے جو کسی ایسے قافلے میں مر جائے جس میں اُس کا کوئی ولی نہ ہو ؟ عبادہ نے کہا ”جن لوگوں کو میں نے دیکھا ہے ، نہ وہ تمھاری سی نکتہ چینیاں کرتے تھے اور نہ ایسے مسائل پوچھتے تھے ۔“ (دارمی)

ہندوستان کے ایک پرہیزگار اور ذی علم امیر نے شیخ العلما عبداللہ سراج مکی سے حقے کی اباحت اور حرمت کی بابت سوال کیا[3] ۔

---

۱ و ۲ - عمر بن اسحاق اور عبادہ بن یسر کندی دونوں مشہور تابعی ہیں ۔ (اسماعیل)

۳ - یہ سوال نواب مصطفٰی خاں مرحوم (شیفتہ و حسرتی) آف جہانگیر آباد نے کیا تھا اور راقم نے خود اُن کی زبان سے یہ روایت سنی ہے ۔ (حالی)

شیخ نے مسکرا کر یہ آیت پڑھی کہ: ''و لا تقولوا لما تصف السنتکم الکذب ھذا حلال و ھذا حرام لتفتروا علی اللہ الکذب ۔'' یعنی ''نہ کہو تم اپنی زبانوں کی بے اصل باتوں کو کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام ہے خدا پر جھوٹ باندھنے کے لیے ۔''

افسوس ہے کہ ہمارے علما نے احکامِ ظاہری میں تعمق اور تدقیق کو اس قدر کام فرمایا کہ شریعت کا موضوع بالکل بدل گیا اور جس دین کی نسبت ''الدین یسر'' کہا گیا تھا، وہ ''الدین عسر'' کہنے کا مستحق ہو گیا ۔ طہارت اور نجاست کی تحقیق میں اتنا کچھ لکھا گیا کہ انسان کی تمام عمر اس کے دیکھنے اور پڑھنے اور سمجھنے کے لیے کفایت نہیں کر سکتی ۔ اگر فقط 'آمین' اور 'رفع یدین' اور 'قرأت فاتحہ' کی تحقیقات میں کوئی شخص اپنا تمام وقت صرف کرے تو اس کی عمر کا ایک بڑا حصہ اس میں تمام ہو جائے گا ۔ اگر کوئی شخص ایک سجدۂ سہو کی تمام جزئیات کو ازبر کرنا چاہے، اور اس نالایق دنیا کی ضروریات بھی سرانجام دیتا رہے، تو نہایت دشوار معلوم ہوتا ہے کہ وہ تمام جزئیات کو احاطہ کر سکے ۔ آن کلمات کا، جن کے زبان سے نکلتے ہی ایمان باقی نہیں رہتا، ایک غیرمحدود باب ہے جس کو کوئی حد و حصر نہیں کر سکتا ۔ اسی طرح معاملات میں وہ تدقیقیں کی گئیں کہ کوئی بیع اور کوئی عقد فقہا کے اصول کے موافق صحیح نہیں ٹھیر سکتا ۔ علماے دین کے سوا، جن کی نسبت بدگمانی نہیں کی جا سکتی، شاید ہی کسی امتی کا وضو، غسل، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، بیع، شرا، نکاح، طلاق وغیرہا صحیح ہوتا ہوگا ۔ امام شعرانی[1] نے ''میزان'' میں لکھا ہے کہ ''دین میں جتنی آسانیاں ہیں وہ خدا کی اور رسول کی طرف سے ہیں اور جتنی دشواریاں

---

[1] عبدالوہاب بن محمد بن رفیع الدین احمد شعرانی: بڑے محدث اور مصنف تھے ۔ ۹۳۲ھ میں انتقال کیا ۔ (اسماعیل)

ہیں وہ علما کی طرف سے ہیں'' ۔ واقعی یہ قول نہایت صحیح ہے کیونکہ ہم اپنے عہد کے علما کا حال ایسا ہی دیکھتے ہیں ۔ انھی دنوں میں ایک مولوی صاحب نے، جو کہ عامل بالحدیث ہیں، دس مسئلوں کی نسبت یہ اشتہار دیا تھا کہ اگر ان کے ثبوت میں کوئی صاحب آیاتِ قرآنی یا احادیثِ صحیحہ، جن کی صحت میں کسی کو کلام نہ ہو اور جس مدعا کے لیے وہ پیش کی جائیں، اس کے واسطے نصِ صریح قطعی الدلالہ ہوں، پیش کریں گے تو فی حدیث اور فی آیت دس روپے انعام دوں گا ۔ اس کے جواب میں ایک دوسرے مولوی صاحب نے نہایت تعجب سے یہ لکھا ہے کہ اگر احتجاج کا مدار صرف آیت اور اس حدیث صحیح پر ہو جس کی صحت میں کسی کو کلام نہ ہو اور اثباتِ دعویٰ کے لیے نص صریح قطعی الدلالہ ہو، تو دین اسلام کے بتیس حصوں میں سے اکتیس حصے باطل ہو جائیں گے اور صرف ایک بتیسواں حصہ باقی رہ جائے گا ۔ اور اس بات کو بہت عمدہ طور سے ثابت کیا ہے ۔

مجیب صاحب کی اس تقریر سے ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ ہمارے علما کے نزدیک دین کی عظمت اور بڑائی اس بات میں ہے کہ وہ ایک ایسا دفترِ طویل الذیل ہو جو 'داستان امیر حمزہ' اور 'بوستان خیال' کی طرح سمیٹا نہ سمٹے ۔ نیز ان کے نزدیک ایسی تقریر کے بطلان میں کچھ شبہہ نہیں ہے جس سے دین کا اختصار لازم آئے ۔ مگر اس تعمق اور تشدد میں علما کے ساتھ حضرات صوفیہ کو بھی شامل کرنا ضرور ہے، جنھوں نے عبادات شاقہ اور بے انتہا اذکار و اشغال اور دائمی روزے اور سخت سخت ریاضتیں اختیار کر کے اوروں کو ریس دلائی اور امت کو اور بھی زیادہ بوجھل اور گران بار کر دیا اور تحریفِ دین کی ایک دوسری بنیاد ڈالی ۔

صحابہ نماز بھی پڑھتے تھے، روزہ بھی رکھتے تھے اور دنیا

کے سارے کام بھی سرانجام دیتے تھے ۔ حضرت عمر کا قول تھا کہ : ”احسب جزیۃ البحرین و انا فی الصلواۃ و اجہز الجیش و انا فی الصلواۃ ۔“ یعنی ”میں بحرین کے خراج کا حساب لگاتا ہوں اور نماز میں بھی ہوتا ہوں ، اور لشکر کی تیاری کرتا ہوں اور نماز میں بھی ہوتا ہوں ۔“ وہ نکاح کرتے تھے ، بال بچوں کے لیے کمائی کرکے لاتے تھے ، مہماتِ خلافت کو سرانجام دیتے تھے ، خلیفۂ وقت کی اعانت میں مصروف رہتے تھے ، لوگوں کے جھگڑے فیصلہ کرتے تھے ، غرضیکہ دنیا کے تمام کام ، جن کے بغیر دین کی شوکت ہرگز نہیں رہ سکتی ، سرانجام دیتے تھے ۔ اگر وہ بھی حضراتِ صوفیہ کی طرح خانقاہوں میں ہو بیٹھتے اور نماز ، روزہ اور ذکر اور شغل کے سوا سارے کام چھوڑ دیتے تو آج بغداد میں پیران پیر[1] کی درگاہ اور اجمیر میں خواجۂ خواجگان[2] کے مزار کا کہیں نام و نشان نہ ہوتا ۔ شاید وہاں کوئی عظیم الشان آتش کدہ اور یہاں کوئی عالی شان بت خانہ نظر آتا جہاں مسلمانوں کی ہوا تک نہ پہنچ سکتی ۔

---

[1] ۱۔ پیرانِ پیر حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی کو کہتے ہیں ۔ بغداد کے قریب قصبۂ جیلان میں ۲۹ شعبان ۴۷۰ھ (۱۰۷۸ع) کو پیدا ہوئے ۔ بغداد میں تحصیل علم کی ۔ اپنے زمانے کے مجدد ، اعلیٰ درجے کے صوفی ، بے نظیر عالم علم دین تھے ۔ آپ نے بہت سی کتابیں لکھی ہیں جن میں سے ’غنیۃ الطالبین‘ فقہ میں اور ’بہجۃ الاسرار‘ تصوف میں مشہور ہیں ۔ بغداد میں بہ عمر ۹۰ سال ۵۶۱ھ (۱۱۶۵ع) میں آپ کی وفات ہوئی ۔ (اسماعیل)

[2] ۲۔ خواجۂ خواجگان حضرت معین الدین سنجری چشتی اجمیری بہت بڑے صوفی ، عالم اور باکمال بزرگ تھے ۔ ۵۳۷ھ (۱۱۴۲ع) میں اصفہان میں پیدا ہوئے ۔ ۵۲ سال کی عمر میں ہندوستان تشریف لائے اور ۴۵ برس اجمیر میں قیام فرما کر تبلیغ اسلام میں مصروف رہے ۔ ۶۳۳ھ (۱۲۳۵ع) میں وفات پائی ۔ آپ کا مزار اجمیر میں زیارت گاہِ عام و خاص ہے ۔ (اسماعیل)

شاہ ولی اللہ صاحبؒ ”حجۃ اللہ البالغہ“ میں لکھتے ہیں کہ عبادت میں سب سے زیادہ مضر چیز انسان کا عبادت سے اکتا جانا ہے ، کیونکہ پھر اس عبادت میں خشوع کی صفت باقی نہیں رہتی اور اس کی تمام مشقتیں ، جو وہ عبادت میں کرتا ہے ، عبادت کی روحانیت سے محروم رہ جاتی ہیں ۔ چناں چہ آں حضرتؐ نے فرمایا ہے کہ ”ہر چیز کی حرص ہوتی ہے اور ہر حرص کے بعد سستی اور ماندگی ضرور ہے ۔“ اسی واسطے شارع نے عبادات کی مقدار ایسے طور پر معین کی ہے جیسے دوا کی مقدار مریض کے لیے کہ نہ اس سے زیادہ ہونی چاہیے نہ کم ۔ نیز اصل مقصود تہذیب نفس ہے ، ایسے طور پر کہ تدابیرِ حسنِ معیشت اور حقوقِ عباد فروگزاشت نہ ہونے پائیں ۔ آں حضرتؐ نے فرمایا ہے کہ ”میں روزہ بھی رکھتا ہوں ، افطار بھی کرتا ہوں ، تہجد بھی پڑھتا ہوں ، سوتا بھی ہوں ، نکاح بھی کرتا ہوں ، سو جس نے میرے طریقے کو چھوڑا اس کو مجھ سے علاقہ نہیں ۔“ نیز شریعت کا بڑا مقصد یہ ہے کہ دین کی باتوں میں دقتیں پیدا کرنے کا راستہ بند کیا جائے ۔ ایسا نہ ہو کہ لوگ اس کو لازم پکڑ لیں اور جو اُن کے بعد پیدا ہوں ، وہ ان کو عبادات مفروضہ خیال کرنے لگیں اور جو اُن کے بعد پیدا ہوں ، اُن کو اُن عبادات کی فرضیت کا یقین ہو جائے اور رفتہ رفتہ دین محرف ہو جائے ۔ انھی مصلحتوں سے آں حضرتؐ نے چاہا کہ لوگ اعمال میں میانہ روی اختیار کریں اور یہ فرمایا کہ ”خذوا من الاعمال ما تطیقون“ انتہٰی ملخصاً ۔

الغرض یہ دوسرا حاشیہ ، جو فقہا کے تعمق اور صوفیہ کے تشدد سے دین اسلام پر چڑھا ، اُس نے بھی اہل اسلام کو سخت نقصان پہنچایا اور اس کے برے نتائج اس وقت ہم آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں ۔

مسلمانوں کی دنیوی ترقیات اس سے بالکل مسدود ہی نہیں ہو گئیں بلکہ تنزل کے ساتھ مبدل ہو گئیں اور دین اسلام ، جو ایک

صاف اور ہموار اور نہایت نزدیک رستہ تھا ، وہ ان کو ایسا پیچ دار ، اونچا نیچا اور دور دراز نظر آیا جس کے طے کرنے میں انسان کو ادھر اُدھر دیکھنے کی مہلت نہیں مل سکتی ۔

دوسرے اُن کی تمام ہمت اور توجہ طہارتِ ظاہری اور احکامِ جسمانی کی طرف مصروف ہوگئی اور طہارتِ باطنی اور تہذیبِ روحانی ، جو کہ اصل مقصود تھی ، بالکل فراموش ہوگئی ۔ اور وہ سراسر عیسیٰ علیہ السلام کے اُس قول کے مصداق ہو گئے جو اُنھوں نے یہودیوں کی طرف مخاطب ہو کر کہا تھا کہ ’’تم اپنے برتنوں کو باہر سے دھوتے ہو لیکن اندر کی ناپاکی کو دور نہیں کرتے ۔‘‘ یہی سبب ہے کہ جس قدر بداخلاقیاں علماء اور عُباد و زہاد و حجاج میں دیکھی جاتی ہیں ، وہ عام مسلمانوں میں بہت کم پائی جاتی ہیں ۔

تیسرا حاشیہ واعظوں کی نادانی اور صوفیوں کی سادہ لوحی یا خود غرضوں کی بددیانتی سے اس پاک دین پر یہ چڑھا کہ اُنھوں نے اعمالِ ظاہری کی ترغیب یا کسی مذہب کی تائید یا تعصب کے جوش میں کسی دنیوی غرض کے پورا کرنے کے لیے سینکڑوں اور ہزاروں حدیثیں وضع کیں اور رفتہ رفتہ یہ سراسر جعلی اور بناوٹی احادیث بھی دین کا ایک اصلی جزو قرار پا گئیں ۔ اگرچہ محققین نے ان کی تحقیقات اور چھان بین کرنے میں کوتاہی نہیں کی اور ان کی موضوعات اور مفتریات کو احادیث صحیحہ سے جہاں تک ہو سکا ، جدا کیا مگر اُن کی جرح و قدح صرف کتابوں ہی تک محدود رہی اور واعظوں کے رنگین فقرے ، جو کم سے کم ہزار برس تک وعظ کی بھری مجلسوں میں وقتاً فوقتاً مسلمانوں پر چلتے رہے ، وہ مشرق سے مغرب تک اور جنوب سے شمال تک وبا کی طرح پھیل گئے ۔

علماء کی ایک بڑی جماعت (جیسا کہ ’جامع الاصول‘ اور ’شرح نخبة الفکر‘ وغیرہ میں تصریح کی گئی ہے) اس بات پر متفق ہو گئی تھی کہ ترغیب اور ترہیب کے لیے حدیثیں وضع کرنی یا ضعیف اور

منکر حدیثوں کی روایت کرنی جائز ہے ۔

اسی بنا پر بےشمار حدیثیں ترغیب کے لیے وضع کی گئیں : مثلاً موذنوں کے فضائل میں ایسا مبالغہ کیا گیا کہ اُن کے مراتب سے بڑھ کر انسان کے لیے ’’و لو کان نبیاً او اماماً‘‘ کوئی درجہ تصور میں نہیں آ سکتا ۔ مثلاً یہ حدیث کہ ’’مؤذن کے لیے ہر شے ، جس کو اُس کی اذان کی آواز پہنچی ہے ، پتھر ہو یا درخت یا ڈھیلا یا خشک یا تر ، قیامت کے دن سب ہی گواہی دیں گے اور اس مسجد کے تمام نمازیوں کے برابر اس کو ثواب ملے گا ۔‘‘ یا یہ حدیث کہ ’’قیامت کے دن سونے کی کرسیاں لائی جائیں گی جن میں یاقوت اور موتی جڑے ہوئے ہوں گے اور سندس اور استبرق کے فرش پر بچھائی جائیں گی ۔ پھر اُن پر نور کے سائبان لگائے جائیں گے اور پکارا جائے گا کہ کہاں ہیں مؤذن تاکہ اُن پر آ کر بیٹھیں ۔‘‘ یا مثلاً مسجد کی خدمت کرنے والوں کے فضائل میں : جیسے :

’’جس نے مسجد میں چراغ روشن کیا ، جب تک وہ چراغ روشن ہے ، اُس کے لیے فرشتے اور حاملانِ عرش برابر استغفار کرتے رہتے ہیں ۔

’’جس نے مسجد میں قندیل لٹکائی یا بوریا بچھایا ، اُس پر ستر فرشتے برابر درود بھیجتے ہیں ، جب تک وہ قندیل نہیں بجھتی یا وہ بوریا نہیں ٹوٹتا ۔‘‘

’’جس نے خدا کے کسی گھر میں جھاڑو دی ، اُس نے گویا چار سو حج کیے اور چار سو بردے آزاد کیے اور چار سو روزے رکھے اور چار سو جہاد کیے ۔‘‘

یا مثلاً حفظة القرآن کے فضائل میں جیسے یہ حدیث کہ :

’’حافظ قرآن کی فضیلت غیر حافظ پر ایسی ہے جیسے خالق کی فضیلت مخلوق پر ۔‘‘ اسی طرح سینکڑوں روزے اور ہزاروں نمازیں اور بے انتہا طواف اور بے شمار صدقے وضع کیے اور اُن کے اجر اور ثواب کے بیان کرنے میں حد سے زیادہ مبالغہ کیا گیا ۔

ترہیب و تخویف کے لیے بھی ایسے ہی مبالغے کے ساتھ حدیثیں وضع کی گئیں ۔ مثلاً :

”جس نے دو نمازوں کو بغیر عذر کے جمع کیا ، وہ گناہِ کبیرہ کا مرتکب ہوا ۔“

”مسجد کے ہمسائے کی نماز مسجد کے سوا کہیں نہیں ہوتی ۔“

”جو شخص مسجد میں دنیا کی باتیں کرتا ہے ، خدا اُس کے تمام اعمالِ حسنہ کو ضائع کر دیتا ہے ۔“

”جس نے بے نماز کی مدد ایک لقمے سے کی ، اُس نے گویا تمام نبیوں کے قتل میں اعانت کی ۔“

بہت سی حدیثیں اپنے اپنے مذہب کی تائید اور نصرت کے لیے بنائی گئیں ۔ مثلاً :

”جس نے نماز میں ’رفع یدین‘ کیا اُس کی نماز باطل ہے ۔“

”جس نے رکوع میں رفع کیا اُس کی نماز باطل ہے ۔“

”جب سورۂ ’کوثر‘ نازل ہوئی تو آں‌حضرتؐ نے جبرئیلؑ سے پوچھا کہ ’نحر‘ سے کیا مراد ہے ؟ کہا ، یہ مراد ہے کہ جب نماز کی نیت باندھو تو پہلی تکبیر پر اور رکوع کرتے وقت اور رکوع سے سر اٹھاتے وقت رفع یدین کرو ۔“

بہت سی حدیثیں تعصب یا تنفر کی وجہ سے بنائی گئیں : جیسے امام شافعیؒ[1] اور امام اعظمؒ[2] کی مدح یا ذم میں ، یا جیسے حضرت

---

[1] ۱- امام شافعی : اصل نام محمد بن ادریس ، کنیت ابو عبداللہ ، ناصر الحدیث لقب اور شافعی اپنے جد اعلیٰ شافع بن سائب کی نسبت سے مشہور ہیں ۔ ۱۵۰ھ میں پیدا ہوئے ۔ فرقۂ شافعیہ کے امام ، بڑے مجتہد ، فقیہ اور محدث تھے ۔ آپ کے پیرو عرب ، مصر اور ہندوستان میں بکثرت ہیں ۔ ۲۰۴ھ میں وفات پائی ۔ (اسماعیل)

[2] ۲- نعمان بن ثابت نام ، ابو حنیفہ کنیت اور امام اعظم لقب ہے ۔ کوفے کے رہنے والے تھے اور ۸۰ھ (۷۰۰ع) میں پیدا ہوئے ۔ اہل سنت والجماعت کے امام ہیں ۔ بہت بڑے فقیہ اور محقق شریعت تھے ۔ رجب ۱۵۰ھ (۷۶۷ع) میں آپ کا انتقال ہوا ۔ (اسماعیل)

معاویہ[1] بن ابی سفیان کی مدح یا ذم میں مثلاً یہ حدیثیں :

”خدا کے نزدیک تین امین ہیں : میں ، جبرئیل اور معاویہ ۔“

”ہر اُمت کے لیے ایک فرعون ہے اور اس اُمت کا فرعون معاویہ ہے ۔“

”ایک بار آں‌حضرتؐ نے جبرئیلؑ سے ہاتھ ملانا چاہا ۔ جبرئیلؑ نے ہاتھ ملانے سے انکار کیا ۔ آپ نے سبب پوچھا ، کہا ”تم نے ایک یہودی کا ہاتھ پکڑا تھا ، اور جو ہاتھ کافر کے ہاتھ سے مس کرے میں اُس سے ہاتھ ملانا پسند نہیں کرتا ۔“

”جو شخص یہودی یا نصرانی سے مصافحہ کرے ، اس کو اپنا ہاتھ دھونا اور وضو کر لینا چاہیے ۔“

امام ابن جوزیؒ[2] نے لکھا ہے کہ حدیثیں وضع کرنے والوں کا ایک بہت بڑا گروہ ہے جن کے راس و رئیس وہب بن وہب اور قاضی بختری وغیرہ تیرہ آدمی ہیں ۔ انتہیٰ ۔

---

[1] ۱- معاویہ : خاندان بنواُمیہ کے بانی اور آں حضرتؐ کے مشہور صحابی ہیں ۔ ۸ھ (۶۳۰ع) میں بہ موقع فتح مکہ مسلمان ہوئے ۔ سیاست اور تدابیر ملکی میں اعلیٰ درجے کا دماغ پایا تھا ۔ حضرت عمر اور حضرت عثمان کے زمانے میں علاقۂ شام کے گورنر رہے ۔ مگر حضرت علی کے بعد تمام ممالک اسلامیہ انھی کے زیر نگین تھے ۔ شمالی افریقہ کے اکثر علاقے ، یونان کا کچھ حصہ ، افغانستان اور سندھ آپ کے زمانے میں فتح ہوئے ۔ آپ نے دمشق کو اپنا دارالخلافہ بنایا جو بعد میں تمام خلفائے بنی اُمیہ کے زمانے میں اسلامی سلطنت کا پایۂ تخت رہا ۔ سنہ ۶۰ھ میں وفات پائی ۔ (اسماعیل)

[2] ۲- ابن جوزی : بغداد کے بہت بڑے محدث ۔ فرقۂ حنبلیہ کے زبردست عالم ، نہایت مشہور واعظ ، سینکڑوں کتابوں کے مصنف اور اعلیٰ درجے کے مقرر تھے ۔ عبدالرحمن نام تھا ۔ ۵۰۹ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۶ جون ۱۲۰۱ع مطابق ۱۲ رمضان ۵۹۷ھ کی شب کو وفات پائی ۔ شیخ سعدی کے اُستاد تھے ۔ (اسماعیل)

انھی تیرہ آدمیوں میں سے ایک محمد بن عکاشہ کرمانی ہے جس نے محمد بن تمیم فاریابی کی شرکت میں دس ہزار حدیثوں سے زیادہ وضع کی ہیں ۔

ابن جوزیؒ کہتے ہیں کہ جن کی حدیثوں میں وضع اور کذب وغیرہ کے آثار پائے جاتے ہیں ، وہ کئی قسم کے لوگ ہیں ۔

پہلا گروہ : بعضے تارکِ دنیا ہیں جنھوں نے حدیث کی نگہداشت سے غفلت برتی ۔

دوسرا گروہ : بعضوں کی تحریریں ضائع ہو گئیں اور انھوں نے اپنی یاد کے بھروسے پر غلط روایتیں بیان کر دیں ۔

تیسرا گروہ : بعضے ثقات بھی ہیں جو بڑھاپے میں آ کر خرف ہو گئے ۔

چوتھا گروہ : بعضوں نے سہو سے غلط روایت کی اور جب اپنی غلطی سے خبردار ہوئے تو ان کو صحیح روایت کرنے سے شرم آئی ۔

پانچواں گروہ : بعضے زندیق اور ملحد ہیں جنھوں نے شریعت میں رخنہ اور خرابی ڈالنے کے لیے عمداً اور جان بوجھ کر حدیثیں وضع کیں ۔ حماد بن زید[1] نے کہا ہے کہ ”زنادقہ نے چار ہزار حدیثیں وضع کی ہیں ۔“ جس وقت ابن ابی العوجاء کو وضع حدیث کے جرم میں قتل کرنے لگے تو اس نے اقرار کیا کہ ”میں نے تمھارے دین میں چار ہزار حدیثیں بنائی ہیں جن میں حرام کو حلال اور حلال کو حرام ٹھیرایا ہے ۔“

---

[1] حماد بن زید : مشہور و معروف محدث ، اپنے زمانے کے امام کبیر اور حضرت امام اعظم کے خاص شاگردوں میں سے تھے ۔ ۱۷۹ھ میں بہ عمر ۸۱ سال بصرے میں انتقال کیا ۔ (اسماعیل)

چھٹا گروہ : بعضے ایسے بھی تھے جو ثواب و اجر کی امید پر ترغیب و ترہیب کے لیے حدیثیں وضع کرتے تھے ۔ گویا ان کے نزدیک شریعت ناقص تھی جس کی تکمیل کی ضرورت تھی ۔

ساتواں گروہ : بعضوں نے اپنے مذہب کی تائید میں جعلی احادیث بنائیں ۔ چنانچہ اہل بدعت میں سے ایک شخص تائب ہوا تو اس نے کہا کہ حدیث کے لینے میں احتیاط کرو اور دیکھا کرو کہ کس شخص سے حدیث لیتے ہو ۔ ہمارا مدت تک یہ حال رہا کہ جس بات کو چاہا حدیث نبوی کے پیرائے میں بیان کر دیا ۔

آٹھواں گروہ : بعضوں نے یہ ٹھیرا لیا تھا کہ جس کسی کا کوئی عمدہ قول ہاتھ لگے ، اس میں اسناد اپنی طرف سے شامل کر دیجیے اور آں حضرتؐ تک اسناد کو پہنچا دیجیے ۔

نواں گروہ : بعضوں نے سلاطین و ملوک کے خوش کرنے اور ان کا تقرب حاصل کرنے کے لیے یہ شیوہ اختیار کیا تھا ۔

دسواں گروہ : بعضے قصہ گو اور واعظ تھے جو لوگوں کو حسن بیان پر فریفتہ کرنے کے لیے حدیثیں وضع کرتے تھے اور کتب صحاح میں اس قسم کی حدیثیں نقل کی گئی ہیں ۔ انتھی

اس کے سوا اور بھی اسباب وضع و افترا کے بیان کیے ہیں ۔ ”من شاء فلیرجع الی ’الفوائد المجموعة‘ لمحمد بن الشوکانی ۔“

چوتھا حاشیہ یہ چڑھا کہ مفسرین نے اپنی تفسیروں میں ہزاروں موضوع اور ضعیف و منکر حدیثیں بھر دیں اور یہ قابل نفرین کام انھوں نے مختلف طریقوں سے کیا ۔ مثلاً :

۱۔ صحابہ ، تابعین ، تبع تابعین و من بعدہم کے اقوال بلا ذکر اسناد بہ حسبِ ضرورت اپنی اپنی تفسیروں کی تقویت کے لیے حدیث نبوی کے پیرائے میں نقل کر دیے گئے ۔

۲۔ یہودیوں سے سنے سنائے لاانتہا جھوٹے اور بے بنیاد قصے تفسیروں میں بھر دیے گئے ۔

۳۔ بہت سے مسائل اصول و فروع کے قرآن شریف کی عبارات و اشارات سے محض اپنی رائے اور قیاس کے موافق استنباط کیے گئے ۔ نہ اس کی تائید کے لیے کوئی حدیثِ صحیح نقل کی اور نہ کسی صحابی یا تابعی کا قول لکھا ۔

۴۔ جن موجوداتِ علوی و سفلی کا ذکر قرآن شریف میں آیا ہے اُن کے حقایق کی تشریح ارسطو اور بطلیموس اور دیگر فلاسفۂ یونان کے موافق کی گئی ۔

۵۔ متکلمین نے مخالف فرقوں کو الزام دینے اور اپنا مدعا ثابت کرنے کے لیے صدہا آیتوں کی تفسیریں اپنی مرضی کے موافق کیں اور آیات قرآنی کو کھینچ تان کر کہیں سے کہیں لے گئے اور یہ تمام کوڑا کرکٹ اصل دین میں داخل سمجھا گیا اور وحی سماوی کی طرح واجب التسلیم خیال کیا گیا ۔

'شرح جامع صغیر' میں علامہ ابن کمال سے نقل کیا گیا ہے کہ ''تفسیر کی کتابیں موضوع حدیثوں سے بھری پڑی ہیں ۔''

اسی طرح مفسرین کے قصص و اخبار کی نسبت ابوالامداد ابراہیم نے 'قضاء الوطر' حاشیۂ 'نخبۃ الفکر' میں اور ملّا علی قاری[1] نے

---

[1] ۱۔ ملّا علی قاری : ملّا علی بن سلطان محمد ہروی مکی ایک نہایت مشہور محدث ، فقیہ اور متکلم گزرے ہیں ۔ فقۂ حنفیہ کے زبردست عالم تھے ۔ بہت سی کتابوں کے مصنف اور ابن حجر مکی اور شیخ عبداللہ سندھی کے شاگرد ہیں ۔ شرح فقہ اکبر ، مرقاۃ شرح مشکٰوۃ ، موضوعات ، نورالقاری شرح صحیح بخاری ، شرح مسلم ، جمالین شرح جلالین ، شرح موطا امام محمد وغیرہ بیسیوں کتابوں کے مصنف ہیں ۔ ۱۰۱۴ھ میں وفات ہوئی ۔ (محمد اسماعیل)

'شرح الشرح نخبۃ الفکر' میں اور علامہ سیوطی[1] نے 'اتقان' میں اور علامہ ذہبی[2] نے 'میزان الاعتدال' میں تصریح کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ تقریباً تمام قصے اہل کتاب کے ہاں سے لیے گئے ۔ اصل یہ ہے کہ فتح شام میں عبداللہ[3] بن عمرو بن عاص کو اہل کتاب کی بہت سی کتابیں بہ قدر ایک بار شتر کے ہاتھ لگی تھیں ؛ سو جو باتیں اُن سے بہ کثرت منقول ہیں ، وہ صرف اخبار اور قصے بنی اسرائیل کے اور روایات اہلِ کتاب کی ہیں ۔ اور اسی طرح بہت سی روایتیں عبداللہ بن سلام[4] سے بھی اسی قسم کی مروی ہیں ۔ پھر مفسرین کے دوسرے

---

[1] ۱۔ جلال الدین سیوطی: شافعیہ کے امام ، اعلٰی درجے کے مفسر ، زبردست نحوی اور مصر کے رہنے والے تھے ۔ قریباً چار سو کتابیں آپ نے لکھی ہیں ۔ تفسیر اتقان ، درالمنشور نصف اول تفسیر جلالین ، تاریخ الخلفاء ، جمع الجوامع ، جامع الصغیر ، حسن المحاضرہ اور طبقات المفسرین وغیرہ اُن کی مشہور کتابیں ہیں ۔ ۸۴۹ھ میں پیدا ہوئے اور ۹۱۱ھ (۱۵۰۵ء) میں وفات پائی ۔ (اسماعیل)

[2] ۲۔ ذہبی : ابو عبداللہ شمس الدین بن محمد بہت بڑے مورخ ، اسماءالرجال کے ماہر اور محدث تھے ۔ ۲۰ جلدوں میں 'تاریخ اسلام' لکھی۔ دول الاسلام ، میزان الاعتدال ، تذکرۃ الحفاظ وغیرہ کے مصنف ہیں ۔ ۷۴۸ھ میں وفات پائی ۔ (اسماعیل)

[3] ۳۔ عبداللہ : حضرت عمرو بن عاص کے صاحب زادے اور نہایت متقی اور پرہیزگار صحابی تھے ۔ آن کی وفات میں سخت اختلاف ہے ۔ ۶۳ھ ، ۷۳ھ ، ۶۷ھ ، ۵۵ھ ، ۹۵ھ ان کا سنہ وفات لکھا ہے ۔ (اسماعیل)

[4] ۴۔ عبداللہ بن سلام : مدینے کے سربرآوردہ رئیس اور یہودیوں کے زبردست فاضل اور عالم تھے ۔ ۲ھ میں اسلام لائے ۔ ۴۳ھ میں مدینے ہی میں انتقال فرمایا ۔ (اسماعیل)

طبقے میں مجاہد[1] اور تیسرے طبقے میں مقاتل[2] بن سلیمان اور ان کے سوا اور لوگوں نے صدہا قصے اہل کتاب سے اخذ کیے ہیں ۔

اس مطلب کو اگر تفصیل سے دیکھنا چاہو تو 'تہذیب الاخلاق'[3] کے ایک مضمون میں ، جو مولوی مہدی علی صاحب[4] نے لکھا ہے ، دیکھو ۔

متکلمین کے تفلسف اور حکیمانہ تدقیقات سے اس پاک دین پر پانچواں حاشیہ چڑھا اور وہ بھی دین کا ایک اصلی جزو قرار دیا گیا ۔

۱۔ خلفائے عباسیہ کے عہد میں جب مصر ، شام ، یونان اور قبرس[5] وغیرہ سے فلسفے کی کتابیں مسلمانوں کے ہاتھ لگیں اور ان

---

[1] مجاہد بن جبیر : تابعی اور مکے کے فقہا اور قاریوں میں سے تھے ۔ مشہور و معروف بزرگ اور قرأۃ و تفسیر کے امام تھے ۔ ۱۰۲ھ میں وفات پائی ۔ (اسماعیل)

[2] مقاتل : ابوالحسن مقاتل بن سلیمان بن بشیر خراسانی ۔ مشہور محدث اور مفسر تھے ۔ ۱۵۰ھ میں بصرے میں وفات پائی ۔ (اسماعیل)

[3] تہذیب الاخلاق : ایک ماہوار رسالے کا نام ہے جو سرسید نے تین مختلف اوقات میں علی گڑھ سے جاری کیا ۔ پہلا پرچہ ۲۴ دسمبر ۱۸۷۰ع کو نکلا اور آخری فروری ۱۸۹۷ع میں ۔ اعلیٰ درجے کا علمی اور مذہبی رسالہ تھا اور سرسید کے تمام بڑے بڑے رفیق اس میں نہایت اعلیٰ پائے کے مضامین لکھا کرتے تھے ۔ اس پرچے میں سرسید اور مولانا حالی نے وقتاً فوقتاً جس قدر مضامین لکھے تھے ، وہ سب میں نے 'مقالات سرسید' اور 'کلیات نثر حالی' میں جمع کر دیے ہیں ۔ (اسماعیل)

[4] مہدی علی : نواب محسن الملک کا نام ہے جو سرسید کے بڑے گہرے اور اولین رفیقوں میں سے تھے ۔ سرسید کے بعد علی گڑھ کالج کے سکریٹری رہے ۔ ۹ دسمبر ۱۸۳۷ع کو اٹاوے میں پیدا ہوئے اور ۱۶ اکتوبر ۱۹۰۷ع کو شملے میں انتقال کیا ۔ (اسماعیل)

[5] قبرس : بحیرۂ روم کا مشہور تاریخی جزیرہ ہے ۔ حضرت عثمانؓ کے عہد خلافت میں حضرت معاویہ نے ۲۸ھ میں فتح کیا ۔ (اسماعیل)

کے ترجمے عربی زبان میں ہونے اور فلاسفہ کے مختلف خیالات اور اُن کی مختلف رائیں ، جو باری تعالیٰ کی ذات اور صفات اور عالم کی حقیقت سے علاقہ رکھتی تھیں ، علمائے اسلام میں شائع ہوئیں تو فلسفے کی چکنی چپڑی اور دل فریب دلیلوں کے آگے مذہب کی عظمت آہستہ آہستہ دلوں میں کم ہونے لگی کیونکہ حکما کے مقالات بہ ظاہر موجہ اور مدلل دکھائی دیتے تھے اور مذہبی تعلیمات محض حسنِ عقیدت یا وجدانی شہادت سے تسلیم کی گئی تھیں ۔

۲۔ دوسرے اہل نفاق کے شبہے آں حضرت صلعم کے زمانے میں پیدا ہو چکے تھے اور اسلام میں شک اور تردد کا بیج بو چکے تھے ۔

۳۔ تیسرے آپ کے مرضِ موت میں اور آپ کی وفات کے بعد کاغذ و دوات ، جیش اسامہ ، خلافت ، فدک ، شہادتِ حضرت عثمانؓ ، جمل وغیرہ کے جھگڑے دین میں اختلاف ڈال چکے تھے ۔

پس دین کے ہوا خواہوں نے اس بات کی ضرورت دیکھی کہ فلسفۂ یونانیہ کے مقابلے میں ایک دوسرا فلسفہ مرتب کیا جائے جس میں مذہبی تعلیمات کی تائید فلسفی دلیلوں سے کی جائے ، چنانچہ ایسا ہی کیا گیا مگر رفتہ رفتہ ، جیسا کہ انسان کی طبیعت کا مقتضا ہے ، اس جدید فلسفے میں صدہا مباحث ضرورت سے زیادہ بڑھا دیے گئے اور خوب دل کھول کر معرکہ آرائیاں کی گئیں ۔ چوں کہ یہ کام کسی جماعت یا کمیٹی نے مل کر نہیں کیا تھا بلکہ جدا جدا طبع آزمائیاں ہوئی تھیں ، اس لیے ضرور تھا کہ اُن کی راہوں میں بے شمار اختلافات واقع ہوں ۔ اس طرح دین اسلام میں بے شمار فرقے بن گئے ، مگر علماء نے کھینچ تان کر اُن لا انتہا جماعتوں کو تہتر فرقوں میں محدود کر دیا تا کہ حدیث : ''ستفترق اُمتی ثلثۃ و سبعین فرقۃ ، کلھم فی النار الا واحدۃ''[1] کی سچائی میں کچھ فرق نہ آئے ۔ اگرچہ اُن

---

[1] یعنی میری اُمت تہتر فرقوں میں تقسیم ہو جائے گی ، وہ سب دوزخی ہوں گے سوائے ایک کے ۔ لیکن علامہ مجدالدین فیروز آبادی نے 'سفرالسعادۃ' کے خاتمے پر لکھا ہے کہ اس باب میں کوئی حدیث ثابت نہیں ۔ (حالی)

تہتر فرقوں میں سے معدود فرقوں کے سوا (جیسے اشاعرہ یا شیعہ یا اُن کی چند شاخیں) کوئی فرقہ اب دُنیا میں نہیں پایا جاتا ، مگر صدہا بلکہ ہزارہا کتابیں اُن کے مناظروں اور مباحثوں سے بھری ہوئی اب تک موجود ہیں اور وہ تمام علمِ کلام کے نام سے مشہور ہیں ۔

علم کلام کی ان کتابوں میں جن مطالب کی تفصیل درج ہے اُن کا جاننا اور سمجھنا اور یقین کرنا ایسا ضروری سمجھا گیا ہے کہ اُن کے بغیر اسلام معتبر اور صحیح نہیں ہو سکتا : مثلاً اشاعرہ کے ہاں ، جو آج کل ''اہل سنت والجماعت'' کے نام سے مشہور ہیں ، ان باتوں کا انکار کرنا کہ صفات باری تعالیٰ نہ عین ذات ہیں ، نہ غیر ذات ، نہ لاعین نہ لاغیر ۔ یا یہ کہ خدا تعالیٰ اگر تمام نیک بندوں کو ہمیشہ کے لیے دوزخ میں ڈال دے اور تمام شریروں کو ہمیشہ کے لیے جنت میں بھیج دے تو اس کی طرف حیف و میل کی نسبت نہیں ہو سکتی ۔ یا یہ کہ خلفا کی فضیلت ایک دوسرے پر خلافت کی ترتیب کے موافق ہے : یعنی ہر خلیفۂ سابق خلیفۂ لاحق سے افضل ہے ، بالکل ایسا ہی ہے جیسے نبوت یا معاد کا انکار کرنا ۔ اگر کوئی شخص مثلاً رؤیتِ بصری کو محال قرار دے اور حدیث نبوی جو رؤیت بصری پر دلالت کرتی ہے ، اس کی تاویل کرے یا علی مرتضیٰ کو شیخین کے برابر یا اُن سے افضل سمجھے ، وہ فوراً جماعت اہل سنت سے باہر ہو جاتا ہے اور اُن فرقوں میں شمار کیا جاتا ہے جن کی نسبت ''کلھم فی النار'' کہا گیا ہے ۔ 'شرح مواقف' اور 'شرح مقاصد' اور امام رازی[1] کی اکثر مبسوط کتابیں ، جو کلام میں ہیں اور 'صواعق محرقہ' اور 'صواعق کابلی'

---

[1] امام رازی : 'تفسیر کبیر' کے مصنف اور تاریخ اسلام میں زبردست عالم اور اعلیٰ پائے کے مصنف شمار ہوتے ہیں ۔ بہت سے علوم و فنون میں کامل دست گاہ رکھتے تھے ۔ ۵۴۴ھ میں پیدا ہوئے اور ۶۰۶ھ میں انتقال فرمایا ۔ (اسماعیل)

اور 'تحفہ' ، 'منتہی الکلام' ، 'ازالۃ العین' اور اس قسم کی ہر کتاب اور ہر رسالہ جو علم کلام میں اشاعرہ کی تائید کے لیے لکھا گیا ہو یا لکھا جائے ، سب اول سے آخر تک واجب التسلیم سمجھے گئے ہیں ، اور جو شخص اُن کے خلاف ایک لفظ بھی کہتا ہے وہ مبتدع سمجھا جاتا ہے ۔

چھٹا حاشیہ تقلید اور بدعات اور رسوم کا ایک طویل الذیل حاشیہ ہے جس کی نہ ابتدا ہے نہ انتہا ہے ۔ یہ حاشیہ اصلِ دین سے بھی زیادہ عزیز ہو گیا ہے ۔

تقلید نے کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کتبِ سابقہ کی طرح منسوخ کر دیا ہے ۔

کتاب اللہ سوائے اس کے کسی کام کی چیز نہیں رہی کہ :

''ذرا ذرا سے بچے اسے مکتبوں میں طوطے کی طرح پڑھیں ، یا بڑے ہو کر اُس کی تلاوت محض لفظی طور پر کریں ، یا ختموں اور عرسوں میں اُس کی چند آیتیں یا سورتیں مناقب کے ساتھ پڑھی جائیں ، یا نئے مردوں کی نئی قبروں پر اس کا ایک آدھ ختم کرایا جائے ، یا رمضان کی تراویح میں آکتا آکتا کر اور پچھتا پچھتا کر اس کا ایک ختم وہ لوگ سنیں جو اس کا ایک حرف نہیں سمجھتے ۔''

سنت رسول اللہ کا بھی یہی حال ہے کہ اول تو اس کے پڑھنے پڑھانے اور سمجھنے سمجھانے والے روز بروز صفحۂ ہستی سے محو ہوتے جاتے ہیں اور اگر چند نفوسِ متبرکہ باقی ہیں تو اُن کا لے دے کر یہ کام ہے کہ صحاح کے اول و آخر کے چند صفحے تبرکاً تیمناً شاگرد کو سرسری طور پر پڑھا دے اور اس کو علم حدیث کی سند لکھ دی ۔ شاگرد اور استاد دونوں کو اس بات کا خیال بھی نہیں آتا کہ کبھی ضرورت کے وقت ہم کو ان حدیثوں سے کچھ کام پڑے گا کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ کوئی فتویٰ اور کسی مسئلے کا جواب اس

وقت تک مقبول نہیں ہو سکتا جب تک 'قاضی خاں' اور 'عالمگیری' یا 'بحرالرایق' وغیرہ کی عبارت اُس میں درج نہ کی جائے ، گویا قرآن اور حدیث کے مخاطبِ صحیح تمام اُمت میں چند آدمی تھے جو اُن کا لب لباب نکال کر کتبِ فقہیہ میں درج کر گئے ۔ اب کتاب و سنت معاذ اللہ بالکل اس شعر کے مصداق ہے :

من ز قرآں مغز را برداشتم
استخواں پیش سگاں انداختم

رسوم و بدعات کا بھی یہی حال ہے کہ وہ بھی اسلام کی رگ و پے میں بیٹھ گئی ہیں ۔ اُن کا دین سے جدا کرنا اور گوشت کا ناخن سے جدا کرنا برابر ہے ۔ دو پلڑی ٹوپی ، پردہ دار انگرکھا ، ڈھیلا یا تنگ مہری کا پائجامہ ، نوک دار جوتی ، زمین پر بیٹھ کر کھانا اور اسی قسم کی سینکڑوں باتیں مسلمانوں نے قطعاً غیر قوموں سے سیکھی ہیں ۔ بیاہ شادی کی اکثر رسوم ہندوستان میں آکر انھوں نے تعلیم پائی ہیں مگر وہ اس قدر عزیز اور ضروری ہو گئی ہیں کہ اگر کوئی شخص اُن کے خلاف کرتا یا کہتا ہے تو وہ کرستان کا خطاب پاتا ہے ۔

یہاں ہم کو رسوم و بدعات کا مفصل بیان کرنا منظور نہیں ہے بلکہ مجمل طور پر صرف یہ جتانا ہے کہ دین اسلام پر جو فضول اور لغو حواشی چڑھے ہوئے ہیں ، اُن میں سے سب سے بڑا حاشیہ تقلید اور رسوم و بدعات کا ہے ۔ موقع اور فرصت ہوئی تو کسی دوسرے وقت یہ بحث کسی قدر تفصیل سے لکھی جائے گی ۔

یہ تمام حواشی جو ہم نے اُوپر بیان کیے ، ان کے سوا اور بھی بہت سے حاشیے اس سیدھے سادے دین پر چڑھے ہوئے ہیں جو تھوڑا غور کرنے سے معلوم ہو سکتے ہیں ۔ پس نہایت افسوس کی بات ہے کہ ہمارے علماے دین دوشِ اسلام کو اس ناگوار بوجھ سے ہلکا کرنے

میں کوشش نہیں کرتے بلکہ اس کی عظمت اور بزرگی اسی میں جانتے ہیں کہ وہ روز بروز اور بھی زیادہ بوجھل اور گراں بار ہوتا چلا جائے ۔ شاید پچھلی صدیوں میں کوئی زمانہ ایسا بھی گزرا ہو جس میں اُمت کے لیے شریعت کا دائرہ تنگ کرنا قرینِ مصلحت سمجھا گیا ہو اور انسان کے حق میں خدا اور رسول کی تکلیفیں ناکافی خیال کی گئی ہوں اور اس کی بہبودی اسی میں تصور کی گئی ہو کہ وہ کسی حالت میں اپنے آپ کو آزاد نہ سمجھے ، مگر ہم سچ کہتے ہیں کہ یہ زمانہ ہرگز ایسا نہیں ہے ۔

آج ہم کو نہ صرف دنیوی عزت حاصل کرنے کے لیے بلکہ زیادہ تر اس لیے کہ دین محمدی کی شان و شوکت دنیا میں قائم رہے اور اُمت محمدیہ اپنے ہم عصروں کی نظر میں حد سے زیادہ حقیر و ذلیل نہ ہو جائے ، اس قدر کام در پیش ہیں کہ خالص دین کے سوا دیگر تکلفات کا تحمل ہم میں باقی نہیں ہے ۔ اسلام پر حاشیے چڑھتے چڑھتے جو صورت اس کی اب ہو گئی ہے ، اگر اُسی کو اسلام سمجھا جائے تو عنقریب کسی مسلمان کو ضروریاتِ دین سے اس قدر مہلت نہ ملے گی کہ وہ نہایت ذلت و خواری سے دونوں وقت قوت لایموت بہم پہنچا کر بری بھلی طرح اپنا اور اپنے بال بچوں کا پیٹ بھر لے ، چہ جائیکہ وہ دنیا میں عزت سے رہ سکے یا دین کی کچھ شان و شوکت بڑھا سکے ۔ جس عالم میں ہم کو اب اور آئندہ رہنا ہے اس میں ادنی درجے کی عزت کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے لیے وہ تدبیریں درکار ہیں جو پہلے شاید ملک اور سلطنت ہی کے لیے درکار تھیں کیونکہ ترقیِ انسان کا زمانہ اُس قوم کے حق میں سخت مصیبت کا زمانہ ہوتا ہے جو اُس زمانے کا ساتھ نہ دے بلکہ اُس کے برخلاف اپنے لیے ایک دوسرا راستہ اختیار کرے ۔

ہم کو دین کی شان و شوکت قائم رکھنے کے لیے بھی ضرور

ہے کہ صرف خالص اسلام کی حمایت کریں اور اس کو حشو و زواید سے پاک کرکے تمام عالم کو دکھا دیں کہ صرف اسلام ہی دنیا میں ایسا دین ہے جو انسان کی خوشی اور آزادی کو ترقی دینے والا ہے ۔

یورپ کے بڑے بڑے محققوں نے ، جو اسلام کی نسبت نہایت عمدہ عمدہ رائیں لکھی ہیں ، اُس سے اُن کی کمال تحقیق اور تنقیح معلوم ہوتی ہے کیونکہ اُنھوں نے ، جیسا کہ اُن کی تصنیفات سے ظاہر ہے ، اُس سارے مجموعے کو اسلام نہیں سمجھا جس پر اب اسلام کا اطلاق کیا جاتا ہے ، بلکہ اُنھوں نے اپنی نہایت گہری نگہ سے اُس تمام کوڑے کرکٹ کو دور کرکے ٹھیٹ اسلام کا کھوج لگایا ہے اور صرف اسی پر اپنی رائیں لکھی ہیں ۔ اگر وہ اُس تمام مجموعے کو جس کو ہمارے بھائی مسلمان اسلام سمجھتے ہیں ، ٹھیٹ اسلام جان کر اُسی پر رائے لکھ بیٹھتے تو اُن کی راستی اور انصاف ہرگز ایسی رائیں لکھنے کی اجازت نہ دیتا ۔ جو مسلمان اس زمانے کے موافق تعلیم پا رہے ہیں یا آیندہ پائیں گے ، وہ جب ہی تک اسلام پر ثابت قدم رہ سکتے ہیں کہ اس تمام مجموعے کو اسلام نہ سمجھیں ۔ اگر بدنصیبی سے اُنھوں نے بھی اسی کو دین اسلام سمجھا تو عیاذاً باللہ ان غریبوں کی نوبت الحاد اور ارتداد تک پہنچ جائے گی اور اس کا مظلمہ اُن مولویوں اور عالموں کی گردن پر ہوگا جو اسی مہیب اور ڈراؤنی اور وحشت انگیز صورت پر اسلام کا رہنا پسند کرتے ہیں ۔

ہم جو دنیا کے تمام ادیان اور ملل میں سے صرف دین اسلام ہی کو واجب التسلیم سمجھتے ہیں اور اس کے سوا اَور دینوں کو ایسا نہیں جانتے ، اس کے یہ معنی ہرگز نہیں ہیں کہ صرف اسلام ہی خدا کا بھیجا ہوا دین ہے اور باقی ایسے نہیں ہیں ، کیونکہ کلام الٰہی میں وارد ہوا ہے کہ ”و ان من اُمۃ الا خلا فیہا نذیر“ ۔ یعنی ”کوئی قوم ایسی نہیں ہے جس میں کوئی نبی نہ گزرا ہو ۔“

اور یہ بھی ارشاد ہوا ہے کہ ”منہم من لم نقصص علیک“ یعنی ”ہم نے بعض انبیاء کا حال تجھ سے (اے نبی آخر الزمان) بیان نہیں کیا ۔“

پس معلوم ہوا کہ ہم اسلام کو اس وجہ سے ، جو اوپر مذکور ہوئی ، اَور دینوں پر ترجیح نہیں دیتے بلکہ اس سبب سے دیتے ہیں کہ جس وقت دین اسلام کا ظہور ہوا اُس وقت ادیانِ سابقہ میں سے کوئی دین اپنی اصلیت پر باقی نہیں رہا تھا ۔ انسان کی افراط و تفریط سے حق اور باطل مل جل کر ایک ہو گئے تھے ، شرک و بدعت نے توحید اور سنن راشدہ کو دبا لیا تھا اور خود غرض عالموں کی تحریفات اور مقلد جاہلوں کی جہالت اور متعصب دین داروں کے غلو سے تمام شریعتوں کے موضوع بدل گئے تھے ۔

نبی آخر الزمان صلی اللہ علیہ وسلم نے آن کر حق کو باطل سے جدا کیا اور جو کھوٹ اور ملاؤ اگلی شریعتوں میں مل گیا تھا اُس کو دور کرکے ایک خالص کندن نکالا اور اسی کا نام اسلام رکھا ۔[1]

اب اگر اسلام بھی شرائعِ سابقہ کی طرح اپنی اصلیت پر باقی نہ رہے تو ہم کس منہ سے کہہ سکتے ہیں کہ ”ہمارا دین حق ہے اور باقی ادیان ایسے نہیں ہیں“ ۔ فقط

---

[1] اس کے ساتھ ہی ہم مسلمانوں کا یہ بھی ایمان اور عقیدہ ہے اور اس کے مستحکم دلائل موجود ہیں کہ دین اسلام خدا کی آخری شریعت اور انسان کے لیے مکمل ترین ضابطۂ اخلاق ہے ۔ اب قیامت تک نہ کوئی ایسا دین آئے گا جو شریعتِ محمدیہ کو منسوخ کر دے اور نہ اسلام سے بہتر دین اب کوئی بن سکتا ہے ۔ ”یقیناً نوعِ انسان کے لیے روئے زمین پر اب کوئی کتاب نہیں مگر قرآن ۔ اور تمام آدم زادوں کے لیے اب کوئی رسول اور شفیع نہیں مگر محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ۔ نجات یافتہ وہی شخص ہے جو یقین رکھتا ہے کہ خدا سچ ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اُس میں اور تمام مخلوق میں درمیانی شفیع ہیں ۔ آسمان کے نیچے نہ اُن کے ہم مرتبہ کوئی اَور رسول ہے اور نہ قرآن کے ہم مرتبہ کوئی اَور کتاب ہے ۔“ (اسماعیل)

۲

تدبیر

(رسالہ 'تہذیب الاخلاق' بابت ۱۲۹۶ھ مطابق ۱۸۷۹ع صفحہ ۱۶۹)

جو لوگ تقدیر پر قانع ہو کر بیٹھ جاتے ہیں کہ ''جو کچھ قسمت میں لکھا ہے ، وہ تو بہرحال پورا ہوگا ، تدبیر سے کیا فائدہ اور کوشش سے کیا حاصل ؟''

اس کے برخلاف جو لوگ کہتے ہیں کہ '' تقدیر کوئی چیز نہیں ، جو کچھ ہے انسان کی تدبیر اور سعی ہے'' دونوں گروہ غلطی پر ہیں ۔

اور اسی غلطی کو دلائل اور شواہد کے ساتھ مولانا حالی نے اس مضمون میں وضاحت اور تفصیل سے بیان کیا ہے ۔ تدبیر کے فوائد بیان کیے ہیں اور تقدیر کے صحیح معنی بتائے ہیں ، جس کے مطالعے کے بعد دونوں باتوں میں کوئی تضاد باقی نہیں رہتا اور سارا معاملہ اطمینان بخش طریقے پر سمجھ میں آجاتا ہے ۔ تدبیر و تقدیر کے مسئلے پر یہ بہترین مضمون ہے جو اب تک لکھا گیا ہے ۔ سعی و تدبیر اور تقدیر و توکل کے معنی عام طور پر نہایت غلط سمجھے گئے ہیں ۔ اور اس غلط فہمی میں عوام ہی نہیں بلکہ بعض خواص بھی مبتلا ہیں ۔

تدبیر کے حامی اور تقدیر پر قانع دونوں خیالات کے اصحاب جب اس مضمون کو پڑھیں گے تو اُن کو اپنے خیال کی غلطی خود معلوم ہو جائے گی ۔ (اسماعیل)

بہت سے خیالات ہیں جو حقیقت میں مذہب سے کوئی علاقہ نہیں رکھتے بلکہ مذہب کے سوا اور مختلف اسباب سے انسان کے دل میں پیدا ہوتے ہیں ۔

مثلاً یہ خیال کہ زمین ساکن ہے اور آسمان اس کے گرد پھرتے ہیں ، حقیقت میں مذہب اسلام سے علاقہ نہیں رکھتا ، بلکہ یونانی فلسفے سے ، جو علمائے اسلام کے خیالات پر چھا گیا تھا ، پیدا ہوا ہے ۔ لیکن غلطی سے وہ ایک ایسی ضروری بات سمجھی گئی ہے کہ اس کے انکار سے گویا قرآن اور حدیث کا انکار لازم آتا ہے ۔

اسی طرح یہ خیال کہ ''آدمی کی تدبیر سے کچھ نہیں ہو سکتا'' ایک ایسا خیال ہے جو مذہب کے سوا اور مختلف اسباب سے انسان کے دل میں پیدا ہوتا ہے مگر غلطی سے ایک مذہبی خیال سمجھ لیا گیا ہے ۔

اصل یہ ہے کہ جو خیالات ملکی یا تمدنی یا تعلیمی خاصیتوں سے انسان کے دل پر مستولی ہو جاتے ہیں ، وہ ان کو کسی ایسی زبردست دستاویز سے تقویت دینی چاہتا ہے جس کے آگے چون و چرا کی گنجائش نہ ہو ، اور وہ دستاویز اگر مذہب کی گہری سیاہی سے لکھی جائے ، جبھی اس پر اعتقاد کی نظریں پڑ سکتی ہیں ۔

ہم اس آرٹیکل میں یہ بیان کرنا چاہتے ہیں کہ :

حصولِ مقاصد کے لیے تدبیر اور سعی اور کوشش کرنی انسان کا ایک ضروری فرض ہے ۔

اسلام نے تدبیر کا ضروری اور مفید ہونا بتایا ہے ، نہ غیرضروری اور غیر مفید ہونا ۔

وہ کیا اسباب ہیں جن سے تدبیر کی وقعت انسان کے دل سے جاتی رہتی ہے ؟

کوئی شخص اس بات کا انکار نہیں کر سکتا کہ خدا تعالی نے

ہر ذی روح کی جبلت میں یہ خاصیت رکھی ہے کہ وہ نفع حاصل کرنے یا ضرر کے دفع کرنے کا بالطبع ارادہ کرتا اور جہاں تک اُس کی دسترس ہوتی ہے ، اس غرض کے لیے کوشش کرتا ہے : بھوک میں کھانے کی اور پیاس میں پانی کی جستجو کرتا ہے ۔ گھوڑے کی فطرت میں یہ بات داخل ہے کہ وہ شیر سے بھاگتا ہے ، چوہے کی خلقت میں یہ بات رکھی گئی ہے کہ وہ بلی سے ڈرتا ہے ۔ یہی کوشش جب انسان میں پائی جاتی ہے تو اُس کا نام 'تدبیر' رکھا جاتا ہے ۔

تدبیر کے معنی لغت میں 'انجام کار پر نظر کرنا' ہیں ۔ عرف عام میں ''مطلوب کے لیے قدرتی اسباب کی جستجو کرنے اور اُن کے ذریعے سے اُس مطلوب کو بہم پہنچانے میں کوشش کرنے کو 'تدبیر' کہتے ہیں ۔

ظاہر ہے کہ ایسی کوشش تمام حیوانات میں سے صرف انسان ہی میں (جو کہ ذی روح ہونے کے علاوہ عقل بھی رکھتا ہے) پائی جا سکتی ہے ۔ پس جس طرح دفعِ مضرت اور جلبِ منفعت کے لیے کوشش کرنا حیوانات کا قدرتی خاصہ ہے ، اسی طرح تدبیر کرنا انسان کا قدرتی خاصہ ہے ۔

جو لوگ تدبیر کو زبان سے محض بےکار اور لاحاصل بتاتے ہیں اور دل سے بھی ایسا ہی یقین کرتے ہیں ، وہ بھی تدبیر کرنے سے باز نہیں رہ سکتے : مثلاً روزمرہ کے خرچ کے لیے اکٹھی جنس خرید کر رکھتے ہیں تا کہ ہر روز فکر کرنی نہ پڑے ۔

پرانی جڑاول[1] کو گرمی اور برسات میں حفاظت اور احتیاط سے رکھتے ہیں تا کہ آئندہ موسم سرما میں کام آئے ۔

مکانوں کی مرمت کرتے ہیں تا کہ وہ گرنے سے محفوظ رہیں ۔

چھتوں پر مٹی ڈالتے ہیں تا کہ برسات میں چھتیں نہ ٹپکیں ۔

---

[1] جڑاول : جاڑے میں کام آنے والے ملبوسات کو کہتے ہیں ۔ (اسماعیل)

انجمن ترقی اردو (ہند)
نئی دہلی

روپیہ پیسہ بغیر حفاظت کے نہیں رکھتے ۔

اکیلے مکان کو کھلا نہیں چھوڑتے ۔

مویشی کو مقید رکھتے ہیں ۔ اولاد کو تا بہ مقدور بری صحبت سے روکتے ہیں ۔

غرضیکہ اُن تمام مقاصد کے لیے ، جن کے اسباب نہایت ظاہرہ اور بدیہی ہیں ، ہمیشہ تدبیر کرتے ہیں اور اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ تدبیر کرنا انسانی فطرت کا مقتضا ہے اور یہ سبق اُس کو قدرت ہی نے سکھایا ہے ۔

ظاہر ہے کہ قدرت کا کوئی عطیہ بے کار نہیں ہوتا ۔ پس ضرور ہے کہ تدبیر بھی انسان کے حق میں بے کار اور غیر مفید نہ ہو : جیسا کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ و سلم نے پرندوں کے حق میں ارشاد فرمایا ہے کہ ''تغدو خماصاً و تروح بطاناً'' یعنی ''جانور صبح کو بھوکے نکلتے ہیں اور شام کو سیر ہو کر آتے ہیں'' ۔ مطلب یہ ہے کہ اپنی کوشش ہی سے کامیاب ہوتے ہیں ۔ اور فرمایا کہ ''الاسواق موائد اللہ فمن آتاھا فقد اصاب منھا'' ۔ یعنی ''بازار خدا کی نعمتوں کے خوان ہیں ، جو وہاں آئے گا ان سے بہرہ‌مند ہوگا'' ۔ مطلب یہ ہے کہ تجارت میں دوڑ دھوپ کرنے سے ضرور کامیابی ہوتی ہے ۔

ان دونوں حدیثوں سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے کہ قدرتی خاصیت ، جس کا نام تدبیر ہے ، انسان کی طبیعت میں بے کار نہیں پیدا کی گئی اور انسان کی کامیابی کا سیدھا راستہ تدبیر کے سوا اور کوئی نہیں ہے ۔

ہماری قوم میں یہ خیال کثرت سے پھیلا ہوا ہے کہ آدمی کی تدبیر سے کچھ نہیں ہو سکتا بلکہ نفع یا ضرر جو کچھ پہنچنے والا ہوتا ہے ، وہ ضرور پہنچتا ہے ، خواہ تدبیر کی جائے اور خواہ نہ کی جائے ۔ اور وہ اس کو دین اسلام کا ایک ضروری عقیدہ خیال کرتا ہے ۔

جیسا کہ ہم نے اوپر بیان کیا ، اگرچہ وہ سرسری اور معمولی اغراض کے لیے ہمیشہ تدبیریں کرتے ہیں مگر جب کوئی ایسا کام پیش آتا ہے جو آسانی سے حل نہیں ہو سکتا یا جس کے وسائل اور اسباب کسی قدر دقیق ہوتے ہیں ، تو وہ تقدیر اور توکل کا حرف زبان پر لاتے ہیں ۔

جو بے علم ہیں وہ پیشانی پر آنگلی ٹیک کر یہ مصرع پڑھ دیتے ہیں : ع

جو کہ پیشانی پہ لکھی ہے وہ پیش آنی ہے

اور پڑھے لکھے آیتوں اور حدیثوں سے استدلال کرکے کبھی اپنی مجبوری اور کبھی اپنے توکل کا اظہار کرتے ہیں ۔

(الف) کوئی یہ آیت پڑھتا ہے ''و من یتوکل علی اللہ فهو حسبہ'' یعنی ''خدا پر بھروسا رکھنا کافی ہے ۔''

(ب) کوئی یہ حدیث پڑھتا ہے ''جف القلم بما ھو کائن'' یعنی ''جو کچھ ہونے والا تھا وہ قلمِ تقدیر لکھ چکا ۔''

(ج) کہیں یہ آیت پیش کی جاتی ہے : ''تعز من تشاء و تذل من تشاء'' یعنی ''جس کو تو چاہے عزت دے اور جس کو چاہے ذلت دے ۔''

(د) اور کہیں یہ حدیث کہ ''ماشاء اللہ کان و ما لم یشاء لم یکن'' یعنی ''جو خدا نے چاہا وہ ہو گیا اور جو اس نے نہ چاہا وہ نہ ہوا ۔''

(ہ) اور کہیں یہ آیت پڑھی جاتی ہے کہ ''و ما من دابۃ فی الارض الا علی اللہ رزقها'' یعنی '' کوئی جان‌دار زمین پر ایسا نہیں جس کا رزق خدا کے ذمے نہ ہو ۔''

غرض اسی قسم کی اور بہت سی آیتیں اور حدیثیں پیش کی جاتی ہیں جو تین باتوں میں سے کسی ایک نہ ایک بات پر دلالت کرتی ہیں :

۱۔ ایک یہ کہ خدا پر توکل کرنا کافی اور ضرور ہے اور ہر

ذی حیات کا رزق اس کے ذمے ہے ۔

۲۔ دوسرے یہ کہ ازل سے ابد تک جو کچھ ہونے والا تھا سو ہو چکا ۔

۳۔ تیسرے یہ کہ جو خدا چاہتا ہے وہ ہوتا ہے اور جو بندہ چاہتا ہے وہ نہیں ہوتا ۔

ان متذکرۂ بالا تینوں باتوں سے تدبیر کا لاحاصل اور بے کار ہونا لازم نہیں آتا ۔

خدا پر توکل کرنا (جیسا کہ ہم آگے مفصل بیان کریں گے) اس لیے کافی اور ضروری ہے کہ بغیر توکل کے کسی تدبیر پر اقدام کرنے کی جرأت انسان سے نہیں ہو سکتی ۔ اور خدا جو ذی روح کے رزق کا متکفل ہوا ہے ، اُس کے یہ معنی ہیں کہ تمام عالم کی پرورش کے لیے جو چیزیں ضروری اور لابدّی ہیں ، اُن کا روے زمین پر پیدا کرنا اس کے ذمے ہے ، نہ یہ کہ بغیر ہاتھ پاؤں ہلائے حلق میں اُتار دینا اُس کے ذمے ہے ۔

دوسری بات بھی تدبیر کے منافی نہیں بلکہ مؤید ہے کیونکہ ازل سے ابد تک جو کچھ ہونے والا تھا ، وہ یہی تھا کہ ہر شے اپنے اسباب و علل کے ساتھ وابستہ ہو ۔ جب مینہ برسے تو سہان ہو اور جب مینہ نہ برسے تو کال پڑے ۔ جب تخم ریزی کی جائے تو غلہ پیدا ہو اور جب غذا کھائی جائے تو جسم میں خون کی مقدار بڑھے ۔

تیسری بات سے بھی تدبیر کا بے کار ہونا نہیں سمجھا جاتا ، کیونکہ خدا تعالیٰ نے اپنے پاک کلام میں جا بجا اپنے مدبرِ عالم اور مسبب الاسباب اور علت العلل ہونے کی وجہ سے اسباب کی تاثیرات اور افعال کو اپنی طرف منسوب کیا ہے ؛ جیسے ''و ما رمیت اذ رمیت و لٰکن اللہ رمٰی ۔'' یعنی ''جب تُو نے پھینکا تھا تو تُو نے نہیں پھینکا بلکہ خدا نے پھینکا تھا ۔'' اور ''أأنتم تذرعونہ ام

نحن الزارعون'' یعنی ''آیا تم بوتے ہو اس کو یا ہم بوتے ہیں ؟''

جس قدر ہم کو اس بات کا یقین ہے کہ عالم موجود ہے ، اسی قدر ہم کو اس بات کا بھی یقین ہے کہ ہم سب کام اپنے اختیار سے کرتے ہیں ۔ اور جیسا ہم کو پہلے یقین میں ایک نہایت ضعیف احتمال اس بات کا رہتا ہے کہ شاید یہ تمام نمائش عالمِ خواب کی سی نمائش ہو ، ویسا ہی ایک نہایت ضعیف احتمال اس بات کا رہتا ہے کہ شاید ہمارے یہ سب افعال و حرکات ایسے ہوں جیسے قطب نما کی سوئی کی حرکت ۔ لیکن ایسے ضعیف احتمالات سے یقین زائل نہیں ہو سکتا ، اسی لیے آں حضرتؐ نے فرمایا ہے : ''دع ما یریبک الی ما یریبک'' یعنی ''شک میں ڈالنے والی بات کو اس بات کے مقابل میں چھوڑ دو جو شک میں نہ ڈالے ۔'' پس اس میں شک کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ جس طرح عالم کا موجود ہونا یقینی ہے ، اسی طرح ہمارے افعال کا اختیاری ہونا یقینی ہے ۔ اگر ہم اپنے افعال میں ایسے ہی مجبور ہوں جیسے اور جمادات مجبور ہیں تو تمام تکلیفاتِ شرعیہ اور سزا و جزا باطل ہو جائے اور جن معنوں میں نیکی ، بدی ، مدح ، ذم ، لیاقت ، نالائقی ، انصاف ، بے انصافی ، دانائی و نادانی ، فرض ، جواب دہی ، قصور اور بے قصوری وغیرہ الفاظ مذہب اور اخلاق اور قانون میں استعمال کیے جاتے ہیں ، وہ سب غلط ٹھہر جائیں ۔ پس جہاں کہیں قرآن و حدیث میں ایسے الفاظ وارد ہوئے ہیں ، جن میں بندوں کے کام خدا کی طرف نسبت کیے گئے ہیں ، وہاں اُن الفاظ کی اسناد اپنی حقیقت پر نہیں ہے ۔ اور یہ بات اُن آیات و احادیث پر نظر کرنے سے بالکل صاف ہو جاتی ہے جن میں بندوں کے اقبال و ادبار اور راحت و تکلیف وغیرہ کو انہی کے افعال کا ثمرہ بتایا ہے جیسا کہ آگے چل کر ذکر کیا جائے گا ۔

ہمارے نزدیک یہ خیال کہ انسان کی تدبیر سے کچھ نہیں ہو سکتا اور اس کو ایک مذہبی عقیدہ جاننا ، تدبیر اور توکل کے غلط

معنی سمجھنے سے پیدا ہوا ہے ۔ تقدیر کے ایسے معنی سمجھے گئے ہیں جن سے انسان کا مجبور ہونا اور اسباب کا معطل اور بے کار ہونا لازم آتا ہے ، مگر شارعؐ نے تقدیر کے ایسے معنی نہیں بتائے جن سے نہ انسان کا مجبور ہونا اور نہ اسباب کا معطل ہونا لازم آتا ہے ۔

حضرت شاہ ولی اللہ ، 'حجة اللہ البالغہ' میں لکھتے ہیں کہ تقدیر اور اسباب کی سببیت میں کچھ منافات نہیں ہے کیونکہ آں حضرت صلعم سے پوچھا گیا کہ کیا دوا اور رقیہ تقدیرِ الٰہی کو ہٹا دیتے ہیں ؟ تو آپ نے فرمایا کہ وہ خود تقدیرِ الٰہی سے باہر نہیں ہیں (یعنی دوا وغیرہ میں جو تاثیر ہے ، وہ بھی خدا ہی کی پیدا کی ہوئی ہے) ۔

پھر شاہ صاحب نے اسی مطلب پر حضرت عمرؓ کے اس قول سے استدلال کیا جو سرغ کے قصے میں اُن سے منقول ہے : سرغ وادیِ تبوک میں ایک بستی کا نام تھا ۔ وبائے شام کے قصے میں عبداللہؓ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ جب عمر فاروقؓ سرغ پہنچے اور وبائے شام کا حال سنا تو وہاں سے اُلٹے پھر جانے کا حکم دیا ۔ عبیداللہؓ بن الجراح نے کہا : ''کیا تقدیرِ الٰہی سے بھاگتے ہو ؟'' عمر فاروقؓ نے کہا : ''نعم نفر من قدراللہ الی قدراللہ'' یعنی ''ہاں ہم تقدیرِ الٰہی سے تقدیرِ الٰہی کی طرف بھاگتے ہیں'' اور پھر یہ تمثیل بیان کی کہ ''دیکھو ! اگر تمہارے پاس اونٹ ہوں اور تم ایک ایسی وادی میں پہنچو جس کی ایک جانب سرسبز ہو اور دوسری جانب پٹ پڑ ہو ، تو چاہو تم سرسبز زمین میں اپنے اونٹ چراؤ اور چاہو پٹ پڑ زمین میں ۔ دونوں صورتوں میں تقدیرِ الٰہی سے باہر نہیں ہو سکتے ۔

اس سے معلوم ہوا کہ مسبب الاسباب نے جو مختلف اسباب میں مختلف تاثیریں رکھی ہیں ، اُسی کا نام تقدیرِ الٰہی ہے ۔ مرض کی حالت میں پرہیز اور دوا نہ کرنے سے مرض کا طول پکڑنا بھی تقدیرِ الٰہی

ہے اور پرہیز اور دوا کرنے سے اُس کا زائل ہو جانا یہ بھی تقدیرِ الٰہی ہے ۔ وبا کے مقامات سے بھاگ کر موت سے بچنا بھی تقدیرِ الٰہی ہے اور وبا کے مقامات میں جا کر مر جانا یہ بھی تقدیرِ الٰہی ہے ۔ گلے کو سرسبز زمین میں چھوڑ کر اُس کو چارے سے سیراب کرنا بھی تقدیرِ الٰہی ہے اور پٹ پڑ زمین میں چھوڑ کر اُس کو بھوکا مارنا یہ بھی تقدیرِ الٰہی ہے ۔

اس مطلب کی تائید کے لیے چند آیتیں قرآنِ مجید کی بھی یہاں نقل کرنی مناسب معلوم ہوتی ہیں :

۱۔ ’’ان اللہ لا یغیّر ما بقوم حتیٰ یغیّروا ما بانفسھم ۔‘‘ (رعد)

یعنی ’’خدا کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا ، جب تک وہ آپ اپنی حالت نہ بدلیں ۔‘‘

۲۔ ’’ذالک بان اللہ لم یک مغیّراً نعمۃ انعمھا علیٰ قوم حتیٰ یغیّروا ما بانفسھم ۔‘‘ (انفال)

یعنی ’’یہ اس سبب سے ہے کہ خدا تعالیٰ جو نعمت کسی قوم کو دیتا ہے ، اُس کو نہیں بدلتا ، جب تک وہ قوم خود اپنی حالت نہیں بدلتی ۔‘‘

۳۔ ’’ما اصابکم من مصیبۃ فبما کسبت ایدیکم‘‘ (شوریٰ)

یعنی ’’جو مصیبت تم کو پہنچتی ہے ، وہ تمھارے ہی کرتوت کا نتیجہ ہوتی ہے ۔‘‘

۴۔ ’’فما کان اللہ لیظلمھم و لٰکن کانوا انفسھم یظلمون ۔‘‘ (روم)

یعنی ’’خدا کی شان سے نہ تھا کہ اُن پر ظلم کرے ، بلکہ وہ آپ اپنی جانوں پر ظلم کرتے تھے ۔‘‘

۵۔ ’’ ذالک بما قدمت ایدیکم و ان اللہ لیس بظلام للعبید ۔‘‘ (انفال)

یعنی ’’یہ تمھارے ہی کرتوت کی سزا ہے ، اور خدا بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہے ۔‘‘

۶۔ ’’من شاء فلیؤمن و من شاء فلیکفر‘‘ (کہف)

یعنی جس کا جی چاہے ایمان لائے اور جس کا جی چاہے ایمان نہ لائے ۔‘‘

۷۔ ’’لھا ما کسبت و علیھا ما کتسبت‘‘ (بقرہ)

یعنی ’’اس کے لیے مفید ہے جو وہ نیکی کرے اور اس کے لیے مضر ہے جو وہ برائی کرے ۔‘‘

اسی مضمون کی اور بہت سی آیتیں اور حدیثیں ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ ایسے کام جن کا نتیجہ اچھا ہے اور ایسے کام جن کا نتیجہ برا ہے ، دونوں طرح کے کام کرنے کا اختیار انسان کو دیا گیا ہے ۔ اور جو تکلیف یا راحت یا اقبال یا ادبار اُس کو پہنچتا ہے ، وہ سب اُسی کے کام کے نتیجے ہوتے ہیں ۔

پس معلوم ہوا کہ شارعؑ نے تقدیر کے وہ معنی نہیں بتائے جو ہماری قوم کے عام خیالات میں سمائے ہوئے ہیں : یعنی یہ کہ جس کو جو نفع یا ضرر پہنچنے والا ہے ، وہ ضرور پہنچے گا ، خواہ تدبیر کی جائے ، خواہ نہ کی جائے ۔

دوسری غلطی توکل کے معنی سمجھنے میں ہوئی ہے : توکل کے صحیح معنی ’’اپنے کو عاجز سمجھنے‘‘ اور ’’خدا پر بھروسا کرنے‘‘ کے ہیں ۔

مگر غلطی سے توکل ایسا بھروسا کرنے کا نام رکھا گیا ہے کہ جس میں تدبیر اور کوشش کا بالکل لگاؤ نہ ہو اور انسان مثل جمادات کے بے حس و حرکت ہو کر بیٹھ رہے ۔ گویا تدبیر اور توکل میں منافات سمجھی گئی ہے ۔

لیکن شریعت سے توکل کے ایسے معنی معلوم ہوتے ہیں جو ہرگز تدبیر کے منافی نہیں ۔ اور تدبیر کے ایسے معنی معلوم ہوتے ہیں جو

ہرگز توکل کے منافی نہیں ۔ جس طرح توکل کرنے کی تاکید کی گئی ہے اسی طرح تدبیر کرنے کی تاکید کی گئی ہے ، اور جس طرح توکل کرنے والوں کی تعریف کی گئی ہے اسی طرح تدبیر کرنے والوں کی تعریف کی گئی ہے ۔

اس مقام پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ چند آیتیں اور حدیثیں اور اقوالِ سلف ، جن میں کوشش اور تدبیر کرنے کی اجازت یا تاکید یا تعریف کی گئی ہو ، یہاں نقل کیے جائیں۔

۱۔ آیات قرآنی :

۱۔ ’’لیس علیکم جناح ان تبتغوا فضلاً من ربکم ۔‘‘ (بقرہ)

یعنی ’’تم پر (اے حاجیو !) کچھ الزام نہیں ہے ، اگر تم سفرِ حج میں خدا کے رزق کی تلاش کرو (یعنی تجارت وغیرہ کے ذریعے سے معاش بھی پیدا کرو اور حج بھی کر آؤ تو کچھ مضائقہ نہیں ہے) ۔

۲۔ ’’و جعلنا النہار معاشاً ۔‘‘ (انبیاء) ۔

یعنی ’’ہم نے (تمھارے لیے) دن کو کمائی کرنے کا وقت بنایا ۔‘‘

۳۔ ’’و جعلنا لکم فیھا معائش (الحجر) ۔‘‘

یعنی ’’ ہم نے تمھارے لیے زمین پر معاش حاصل کرنے کے اسباب پیدا کیے ۔‘‘

۴۔ ’’فانتشروا فی الارض وابتغوا من فضل اللہ ۔‘‘ (الجمعہ)

یعنی ’’پھیل جاؤ زمین پر اور خدا کا رزق تلاش کرو ۔‘‘

۵۔ ’’علم ان سیکون منکم مرضیٰ و آخرون یضربون فی الارض یبتغون من فضل اللہ ۔‘‘ (مزمل)

یعنی ’’خدا نے جان لیا ہے کہ بعضے ہوں گے تم میں سے بیمار ، اور وہ لوگ ہوں گے جو سفر کریں گے زمین پر خدا کے رزق کی تلاش میں ۔ (یعنی وہ بھی بیماروں کی طرح رعایت کے قابل ہوں گے) ۔

اسی طرح اور بہت سی آیتیں ہیں جن سے طلب معاش کے لیے کوشش اور تدبیر کرنے کی اجازت اور ترغیب پائی جاتی ہے ۔

۲۔ احادیثِ نبوی :

اخبار و آثار ، جو اس باب میں وارد ہیں ، اُن میں سے چند اس مقام پر ’احیاءالعلوم‘ سے ہم نقل کرتے ہیں :

۱۔ ’’ قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ و سلم من الذنوب ذنوب لا یکفرھا الا انھم فی طلب المعیشة ۔‘‘

یعنی ’’بعضے گناہ ایسے ہیں کہ طلب معاش میں کوشش کرنے ہی سے پاک ہوتے ہیں ۔‘‘

۲۔ ’’التاجر الصدوق یحشر یوم القیامة مع الصدیقین والشہداء ۔‘‘

یعنی ’’سچا سوداگر قیامت کے دن صدیقوں اور شہیدوں کے ساتھ محشور ہوگا ۔‘‘

۳۔ ’’من طلب الدنیا حلالا تعففا عن المسئلة و سعیا علی عیالہ و تعطفا علی جارہ ، لقی اللہ وجھہ کالقمر لیلة البدر ۔‘‘

یعنی ’’جو شخص دنیا کو وجہِ حلال سے اس لیے ڈھونڈتا ہے کہ سوال کرنے سے بچے اور اپنے بچوں کی خبر لے اور ہمسائے کے ساتھ ہمدردی کرے ، وہ خدا سے ایسی حالت میں ملے گا کہ اُس کا منہ چودھویں رات کے چاند کی مانند چمکتا ہوگا ۔‘‘

۴۔ ’’کان رسول اللہ (صلعم) جالساً مع اصحابہ ذات یوم فنظروا الی شباب ذی جلد و قوة و قد بکر یسعی فقالوا ویح ھذا لو کان شبابہ و جلدہ فی سبیل اللہ ۔ فقال (صلعم) لا تقولوا ھذا فانہ ان کان یسعٰی علٰی نفسہ لیکف عن المسئلة و یعینھا عن الناس فھو فی سبیل اللہ و ان کان یسعٰی علی ابوین ضعیفین او ذریة ضعاف لیعینھم و یکفیھم فھو فی سبیل اللہ ۔‘‘

یعنی ''ایک روز آں حضرت صلعم صحابہ کے ساتھ بیٹھے تھے۔ انھوں نے ایک چست اور قوی جوان کو دیکھا کہ علی الصباح معاش کی تلاش میں نکلا تھا۔ بولے کیا خوب ہوتا اگر اس کی قوت اور چستی خدا کی راہ میں صرف ہوتی۔ اس پر آں حضرت صلی اللہ علیہ و سلم نے فرمایا کہ ایسا نہ کہو، کیوں کہ اگر وہ اپنے لیے سعی کرتا ہے تاکہ مانگنے سے بچے اور لوگوں کا محتاج نہ ہو تو وہ خدا ہی کی راہ میں ہے، اور اگر وہ اپنے ضعیف ماں باپ یا بال بچوں کے لیے کوشش کرتا ہے تاکہ اُن کو مستغنی کرے اور اُن کے کام آئے تو بھی وہ خدا ہی کی راہ میں ہے۔''

۵۔ ''ان اللہ یحب العبد یتخذ المھنۃ یستغنی بھا عن الناس۔''

یعنی ''خدا تعالیٰ اُسی بندے کو دوست رکھتا ہے جو نوکری اس لیے اختیار کرے کہ لوگوں کا محتاج نہ ہو۔''

۶۔ ''ان اللہ یحب المومن المحترف۔''

یعنی ''خدا تعالیٰ پیشہ ور مسلمانوں کو دوست رکھتا ہے۔''

''روی عن عیسیٰ رأی رجلا قال ما تصنع قال اتعبد قال من یعولک قال اخی قال اخوک اعبد منک۔''

یعنی ''روایت ہے کہ حضرت عیسیٰ نے ایک شخص کو دیکھا، کہا تو کیا کرتا ہے؟ کہا، عبادت! کہا، تیری خبرگیری کون کرتا ہے؟ کہا، میرا بھائی۔ کہا، تیرا بھائی تجھ سے بڑا عبادت کرنے والا ہے۔''

۳۔ اقوالِ سلف :

۱۔ ''کان زید بن سلمۃ یغرس فی ارضہ فقال لہ عمر رضی اللہ عنہ اصبت استغن عن الناس یکن اصون لدینک و اکرم لک علیھم کما قال صاحبکم احیحۃ (ع) : ان الکریم علی الاخوان ذوالمال۔''

یعنی '' زید بن سلمہ اپنی زمین میں پیڑ لگا رہے تھے۔ حضرت عمرؓ نے کہا، ایسا ہی چاہیے۔ اگر تو لوگوں سے بے غرض رہے گا تو تیرا دین زیادہ محفوظ رہے گا اور تیری عزت ان میں زیادہ ہوگی جیسا کہ تمھاری دوست احیحہ شاعرہ کا قول ہے کہ ''بھائیوں میں دولت‌مند ہی معزز ہوتا ہے۔''

۲۔ ''قال عمر ما من موضع یاتی الموت فیہ احب الی من موضع السوق فیہ لاھلی ابیع و اشتری۔''

یعنی ''عمر فاروقؓ کہا کرتے تھے کہ میں موت کے آنے کی جگہ اُس جگہ سے بہتر نہیں سمجھتا جہاں اپنے کنبے کے لیے بازار میں لین دین کر رہا ہوں۔''

ان تمام آیتوں اور حدیثوں اور اقوالِ سلف سے ظاہر ہے کہ طلبِ معاش میں کوشش اور تدبیر کرنی انسان کا ایک ضروری فرض ہے۔ پس اگر تدبیر اور توکل میں منافات ہوتی، تو طلبِ معاش میں کوشش کرنے کی اجازت اور ترغیب اور تعریف نہ ہوتی۔ امام غزالی 'احیاءالعلوم' میں لکھتے ہیں کہ ''بعض اوقات ایسا خیال کیا جاتا ہے کہ ہاتھ پاؤں سے کسب کرنے اور دل سے تدبیر کرنے کو ترک کرنا، اس کا نام توکل ہے۔ یہ جاہلوں کا خیال ہے کیوں کہ کسب اور تدبیر کو ترک کرنا شریعت میں حرام ہے، اور جب کہ شریعت نے توکل کرنے والوں کی تعریف کی ہے، تو یہ کیوں کر ہو سکتا ہے کہ دینی فضیلت (یعنی توکل) ممنوعات شرعیہ (یعنی ترک کسب و ترک تدبیر) سے حاصل ہو سکے۔'' اس کے سوا بیماری کی حالت میں دوا اور پرہیز وغیرہ سے اس کے دفعیے کی تدبیر کرنی بھی بے‌شمار روایتوں سے ثابت ہے۔ چناں‌چہ بعض محدثین نے خاص اسی قسم کی حدیثیں جمع کی ہیں اور اس مجموعے کا نام 'طب نبوی' رکھا ہے۔ 'احیاء العلوم' میں لکھا ہے کہ آپؐ نے اکثر صحابہ کو دوا

اور پرہیز کی تاکید فرمائی ہے۔ سعدؓ[1] بن معاذ کی فصد خود آں حضرت نے لی اور سعدؓ[2] بن زراہ کے بدن پر داغ دیا۔ علیؓ مرتضٰی کی آنکھیں دُکھتی تھیں، آپ نے کھجوریں کھانے کو منع کیا۔ اور صہیبؓ[3] کو آنکھیں دُکھنے میں خرما کھانے کا پرہیز بتایا۔ خود آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ رات کو سرمہ اور ہر مہینے میں ایک بار پچھنے لگاتے تھے اور ہر سال سنا کا مسہل لیتے تھے۔ بچھو وغیرہ کے کاٹنے کا بارہا آپ نے علاج کیا۔ درد سر اور پھنسی پھوڑے کے لیے حنا کا استعمال فرماتے تھے۔ اسی طرح کی اور بہت سی روایتیں لکھی ہیں اور اُن لوگوں کا قول رد کیا ہے جو علاج معالجہ ترک کرنے کو افضل بتاتے ہیں۔ اور آخر میں یہ لکھا ہے کہ

"جو لوگ ترک تداوی کو شرعاً توکل قرار دیتے ہیں، اُن کو چاہیے کہ بھوک میں کھانا نہ کھانے اور پیاس میں پانی نہ پینے اور سردی میں کپڑا نہ پہننے کو بھی شرطِ توکل قرار دیں، حالانکہ وہ ایسا ہرگز نہیں کہہ سکتے۔"

توکل کی حقیقت، جو ہمارے خیالِ ناقص میں آتی ہے، وہ یہ ہے کہ اگرچہ انسان کی کامیابی کا سیدھا رستہ، جو فطرت الٰہی نے اس کو بتایا ہے، تدبیر کے سوا اور کوئی نہیں ہے لیکن تدبیر کا کامیاب ہونا ایسے ذریعوں پر موقوف ہے جو قطعاً انسان کی طاقت سے باہر ہیں۔

اول تو انسان کی تدبیر میں بعض اوقات غلطی بھی ہو جاتی ہے، یعنی حصولِ مقاصد کے لیے جو واقعی اسباب اور علل ہیں، وہاں تک اُس کا ذہن نہیں پہنچتا اور اس سبب سے ناکام رہتا ہے۔ مثلاً طبیب نے مرض کے اسباب و علامات سمجھنے میں غلطی کی اور اس سبب سے اس کا علاج مرض کے موافق نہ پڑا۔

بعض اوقات تدبیر کے ناقص رہ جانے سے بھی مطلب حاصل نہیں ہوتا۔ مثلاً طبیب نے اسباب و علامات تو صحیح سمجھے مگر جو دوا اس مرض کے لیے نافع تھی، وہ بہم نہ پہنچی۔

اگر بالفرض تدبیر میں کوئی غلطی یا نقصان واقع نہیں ہوا اور مطلب بھی حسبِ دل خواہ حاصل ہوگیا، تو بھی غور کرنا چاہیے کہ جن وسائل سے مطلب حاصل ہوا ہے، اُن میں کتنے ایسے ہیں جو انسان کی قدرت سے باہر ہیں۔

مثلاً جو تدبیر کہ انسان اپنی بقاے حیات کے لیے ہر روز دو وقت کرتا ہے: یعنی روٹی، دال، سالن وغیرہ جو دونوں وقت پکا کر کھاتا ہے، اگر اُس میں سے صرف روٹی کے لیے اناج پیدا ہونے اور آٹا پیس کر تیار کرنے کے وسائل پر نظر کی جائے تو بے انتہا وسیلوں کے ایسے مختلف سلسلے معلوم ہوں گے جن میں سے ہر ایک کا مرتب کرنا اُس کی طاقت سے باہر ہے۔ مثلاً اگر انسان کی اُن تمام ترتیب وار کوششوں سے، جو اُس نے فصل کے تیار کرنے میں کی ہیں، اور مینہ کے پانی اور دن کی حرارت اور رات کی برودت اور مختلف ہواؤں کے تموج، اور دیگر قدرتی اسباب سے، جن کے سبب سے غلہ تیار ہوا، قطع نظر کی جائے اور اُن آلات سے بھی قطع نظر کی جائے جو کھیتی کے کام آتے ہیں اور جن کے بننے میں بڑھئی اور لوہار اور

١٠٣٩٦

---

[1] سعد بن معاذ: جلیل القدر صحابی اور مدینے کے رؤسا میں سے تھے۔ آں حضورؐ نے ان کو سید الانصار کا خطاب دیا تھا۔ بدر اور اُحد کی جنگوں میں شریک رہے۔ غزوۂ خندق میں ایسا زخم لگا کہ اس سے جاں بر نہ ہو سکے اور ایک مہینے بعد ذیقعدہ ۵ھ میں صرف ۳۷ برس کی عمر میں وفات پائی۔ (اسماعیل)

[2] سعد بن زراہ بن عدس بن عبید: انصار مدینہ میں سے حضورؐ کے صحابی ہیں۔ قبیلۂ خزرج سے تعلق رکھتے تھے۔ (اسماعیل)

[3] صہیب بن سنان رومی: عبداللہ بن جدعان کے آزاد کردہ غلام اور اولین صحابیوں میں سے ہیں۔ ۹۰ سال کی عمر میں ۳۸ھ میں بمقام مدینہ انتقال فرمایا۔ (اسماعیل)

اور کاریگروں کی ضرورت پڑی ہے اور جن کے لیے بہت سے مزدوروں نے لوہا کانوں سے اور لکڑی جنگل سے بہم پہنچائی ہے ، اگر صرف یہ دیکھا جائے کہ غلہ تیار ہو کر اور اُس کا آٹا پِس کر انسان تک کیوں کر پہنچتا ہے ، تو بھی ایک بڑا لمبا سلسلہ نظر آئے گا ، جو اُس کے احاطۂ قدرت سے باہر ہے ، کیوں کہ غلہ سب جگہ پیدا نہیں ہوتا بلکہ ایک جگہ سے دوسری جگہ بھر کر لے جایا جاتا ہے اور اس غرض کے لیے بیوپاری دریا اور جنگل قطع کرتے ہیں ۔ اور باوجودیکہ کبھی ڈوب جانے کی وجہ سے اور کبھی لُٹ جانے کے سبب سے اور کبھی بعض دیگر اسباب سے اُن کو سخت سخت نقصان پہنچتے ہیں ، تو بھی مسبب الاسباب نے اُن کے دل پر منفعت کی امید کو ایسا مسلط کیا ہے کہ وہ اپنی کوشش سے باز نہیں آتے ۔ اور انسان کے مدنی الطبع ہونے کی وجہ سے خاص خاص ملکوں کی پیداوار تمام دنیا کی پرورش کرتی ہے ۔ پھر جن جہازوں میں یا جن چھکڑوں میں غلہ لد کر ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتا ہے ، وہ بھی خود بخود تیار نہیں ہوتے بلکہ بے شمار آدمیوں کی صنعت سے تیار ہوتے ہیں ۔ پھر اُن بیوپاریوں سے دوکان دار لوگ خرید کر ایک شہر کے کوچے کوچے میں پھیل جاتے ہیں اور اس کو پِسنہاریوں[1] سے پِسواتے ہیں ۔ اور جن آلات سے غلہ پِستا ہے یا جابجا متفرق ہوتا ہے ، اُن کی تیاری بھی ایک جمِ غفیر کی محنت پر موقوف ہے ۔

---

[1] ۔ جس زمانے میں مولانا نے یہ مضمون لکھا اُس وقت نہ تو عام طور پر آٹا بازار میں ملتا تھا ، نہ گندم پیسنے کی کلیں اور آٹا تیار کرنے کے مل تھے ۔ لوگ بالعموم پسنہاریوں سے اُجرت پر آٹا پسواتے یا خود گھر میں پیستے تھے ۔ گھر گھر چکیاں تھیں اور بڑی بڑی معزز خواتین خود ہی اپنی ضرورت کے لیے ان چکیوں میں آٹا پیس لیا کرتی تھیں ۔ مگر مشینوں کی آمد اور نئی تہذیب کی برکت نے وہ صف ہی لپیٹ دی ۔ (اسماعیل)

غرض کہ ادنٰی سے ادنٰی مقصد کے لیے انسان کو وہ اسباب درکار ہیں جو اُس کی قدرت کے احاطے سے باہر ہیں ، مگر مدبرالسمٰوٰت والارض نے نظام عالم کا مدار ایسے محکم اور مضبوط قانون پر رکھا ہے جو اُس کی عاجز مخلوق کی تمام ضرورتوں کو حاوی ہے اور کبھی اپنے دائمی اقتضا سے تجاوز نہیں کرتا ۔

اسی واسطے انبیاء علیہم السلام نے ، جو کہ دنیا میں خاص خدائے واحد کی پرستش اور توحید اور عظمت و جلال پھیلانے کے لیے بھیجے گئے تھے ، بندوں کو ایسے قاعدے تعلیم فرمائے ہیں کہ وہ کسی حالت میں اُس بڑے بازی گر کو ، جو پردے میں بیٹھا اس بڑی پُتلی کو نچا رہا ہے پر کبھی سامنے نہیں آتا ، بھولنے نہ پائیں۔

صبر و شکر ، رضا و تسلیم ، خوف و رضا ، توبہ و استغفار ، عبادت و صدقہ ، ذکر اور دعا اور ان کے سوا دیگر مقامات یقین جو انبیاء علیہم السلام نے تعلیم کیے ہیں ، وہ سب اپنے اپنے موقع پر اسی غرض کے لیے تعلیم کیے ہیں ۔

اسی طرح توکل کی بھی جابجا تاکید کی گئی ہے ، یعنی یہ سکھایا گیا ہے کہ انسان کو اپنی تدبیر پر مغرور نہ ہونا چاہیے بلکہ یہ سمجھنا چاہیے کہ اگر قدرتی تائیدیں نہ ہوں گی اور وہ تمام اسباب ، جو مسبب‌الاسباب نے ہماری کامیابی کے لیے مقدر کیے ہیں ، مساعدت نہ کریں گے تو ہماری کامیابی غیرممکن ہے ، لیکن یہ سمجھنا کہ محض خدا پر توکل کرکے بے حس و حرکت بیٹھ جانے سے مطالب حاصل ہو سکتا ہے ، سخت غلطی ہے ۔

چنانچہ حضرت عمرؓ فاروق نے اس غلطی کو صاف ظاہر کر دیا ہے اور یہ کہا ہے کہ :

”لا یقعد احدکم عن طلب الرزق و یقول 'اللھم ارزقنی فقد علمتم ان السماء لا تمطر ذھبا ولا فضۃ ۔“ (احیاءالعلوم) ۔

یعنی ''تم میں سے کسی کو نہیں چاہیے کہ تلاشِ معاش سے بیٹھ رہے اور یہ پڑھا کرے کہ 'اللھم ارزقنی' (بار خدا مجھ کو رزق دے) کیوں کہ تم جانتے ہو کہ آسمان سے سونا اور چاندی نہیں برستا۔''

''قیل لاحمد ما تقول فیمن جلس فی بیتہ او مسجد و قال لا اعمل شیئاً حتی یاتینی رزق۔ فقال احمد ھذا رجل جھل العلم، اما سمع قول النبی صلعم ان اللہ جعل رزق تحت ظل رمحی و قولہ حین ذکر الطیر فقال تغدوا خماصاً و تروح بطانا فذکرہ انھا تغدوا فی طلب الرزق۔'' (احیاء العلوم)

یعنی ''امام احمد[1] بن حنبل سے جب لوگوں نے پوچھا کہ آپ اُس شخص کے حق میں کیا کہتے ہیں جو اپنے گھر میں بیٹھا رہے اور کہے کہ میں کچھ نہ کروں گا، جب تک کہ رزق میرے پاس آپ سے نہ آئے۔ تو اُنھوں نے یہ جواب دیا کہ ایسا شخص علم دین سے جاہل ہے۔ کیا اُس نے نبی صلعم سے نہیں سنا کہ خدا نے میرا رزق میرے نیزے کے سایے تلے مقرر کیا ہے۔ اور یہ قول بھی نہیں سنا کہ پرندے صبح کو بھوکے نکلتے ہیں اور شام کو سیر ہو کر آتے ہیں یعنی وہ رزق کی تلاش میں نکلتے ہیں۔''

توکل کی تعلیم میں اُس روحانی تلقین کے علاوہ، جو اوپر ذکر کی گئی ہے، ایک دنیوی مصلحت بھی مضمر ہے: یعنی آدمی اپنی عاجزی اور درماندگی پر اور کامیابی کی بے انتہا مشکلات پر نظر کرکے اکثر اوقات تدبیر کرنے سے جی چھوڑ دیتا ہے؛ اور اپنی کوشش کو اُن بے انتہا مشکلات کے مقابلے میں ناچیز سمجھ کر ہاتھ پاؤں نہیں ہلاتا۔ اسی واسطے خدا پر بھروسا کرنے کی تاکید کی گئی ہے تاکہ انسان پر

---

[1] حضرت امام احمد بن حنبل: حنبلی فرقے کے امام اور حدیث و فقہ کے بہت بڑے عالم تھے۔ فتنۂ خلقِ قرآن میں آپ نے بے نظیر استقلال کا مظاہرہ کیا۔ ۱۶۴ھ میں پیدا ہوئے اور ۲۴۱ھ میں وفات پائی۔ (اسماعیل)

مایوسی اور بے چینی طاری نہ ہونے پائے اور وہ اپنے اڑے وقتوں میں مسبب الاسباب اور رب الارباب پر بھروسا کرکے کوشش کے لیے فوراً کھڑا ہو جائے۔ اسی لیے کلام الٰہی میں ارشاد ہوا ہے کہ ''و من یتوکل علی اللہ فھو حسبہ'' یعنی ''خدا پر بھروسا کر لینا ہی کامیابی کے لیے کافی ہے۔'' کیوں کہ اُس پر بھروسا کرنے کے بعد کوئی مشکل، مشکل نہیں رہتی اور کوشش و تدبیر کرنے کا حوصلہ، جو کہ کامیابی کا اصلی سبب ہے، خود بخود پیدا ہو جاتا ہے۔ اور اسی لیے یہ بھی ارشاد ہوا کہ ''فاذا عزمت فتوکل علی اللہ'' یعنی ''جب تو کسی کام کا ارادہ کرے تو خدا پر بھروسا کر۔''

اس سے معلوم ہوا کہ توکل کرنے کا حکم اس لیے نہیں دیا گیا تا کہ تدبیر و کوشش کرنی نہ پڑے، بلکہ اس لیے دیا گیا ہے کہ تدبیر اور کوشش کرنے کی جرأت اور حوصلہ زیادہ ہو۔

غالباً ہمارا اوپر کا بیان اس مطلب کے لیے کافی ثبوت ہوگا کہ عقل اور شرع دونوں کی رُو سے کامیابی کا اصل ذریعہ تدبیر کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔

ابھی ہم کو بیان کرنا باقی ہے کہ جب عقل اور نقل دونوں سے تدبیر کی ضرورت معلوم ہوتی ہے تو کیا سبب ہے کہ ہماری قوم میں یہ خیال پھیلا ہوا ہے کہ انسان کی تدبیر سے کچھ نہیں ہوتا؟

۱۔ کبھی وہ بعض اشخاص کو بغیر سعی و تدبیر کے کامیاب ہوتا دیکھتا ہے: مثلاً ایک نہایت مفلس آدمی تھا، اس کو اتفاق سے کوئی ایسا دفینہ مل گیا جس سے اُس کا افلاس جاتا رہا۔ یا ایک شخص مدت سے کسی مرضِ مزمن میں گرفتار تھا اور علاج معالجہ نہ کرتا تھا، دفعۃً اُس کا مرض خود بخود زائل ہو گیا۔

۲۔ کبھی وہ بعض لوگوں کو باوجود تدبیر اور کوشش کے ناکام پاتا ہے: مثلاً ایک دائم المرض ہمیشہ علاج معالجہ کرتا ہے

مگر کبھی تندرست نہیں رہتا ۔ یا ایک شخص نے بارہا کھیتی کی اور ہمیشہ نقصان اٹھایا ۔ پس دونوں صورتوں سے وہ یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ تدبیر کچھ چیز نہیں ۔ لیکن حقیقت میں ان دونوں صورتوں سے یہ نتیجہ نہیں نکلتا ، بلکہ یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ بعضی کامیابی بغیر تدبیر کے بھی ہوتی ہے اور بعضی تدبیریں غلط یا بے محل بھی ہوتی ہیں ۔ اس کی ایسی مثال ہے کہ ایک رستہ قزاقوں اور درندوں سے بے خطر ہے اور دوسرے رستے میں- قزاقوں یا درندوں کا خطرہ ہے ، لیکن کبھی کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ اُس بے خطر رستے میں بعض مسافروں کو گزند پہنچی ہے اور اُس خطرناک رستے سے بعض مسافر بہ امن و امان گزر گئے ہیں ۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ نہیں نکل سکتا کہ پہلا رستہ خطرناک اور دوسرا بے خطر ہے ۔

۳- کبھی ایسا ہوتا ہے کہ لوگ بعضے شخصوں کو (جیسے واعظ ، مولوی ، زاہد اور صوفی وغیرہم) دیکھتے ہیں کہ وہ نوکری ، حرفہ ، تجارت ، زراعت اور ظاہری حیلوں میں سے کوئی حیلہ معاش کا نہیں رکھتے مگر اُن کے سب کام نہایت عمدہ طور سے چلتے ہیں ، اور ان کی حالت اکثر دوڑ دھوپ کرنے والوں سے بہتر ہے ۔ پس اُن کے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ اگر معاش کا مدار حیلہ و تدبیر پر ہوتا تو یہ لوگ ، جو محض توکل کے سہارے پر بیٹھے ہیں اور کوئی حیلہ نہیں کرتے ، کس طرح فارغ البال رہ سکتے تھے ۔ لیکن ایسا سمجھنا بڑی موٹی غلطی ہے ۔ یہ بزرگ وار محض توکل کے سہارے پر نہیں بیٹھتے بلکہ انھوں نے دقائق حیل میں سے ایک ایسا حیلہ اختیار کیا ہے جو ظاہر بینوں کی نگاہ میں توکل معلوم ہوتا ہے ۔ محنت کا حق و فائدہ دو طرح ہوتا ہے : معیّن اور غیر معیّن ۔ معین ایسا ہے جیسے ڈاکٹر کی فیس جو اس کے ہر پھیرے میں بیمار کو دینی پڑتی ہے ۔ یا جیسے پادری کی تنخواہ جو مشن سے اُس کے لیے مقرر ہے ۔ اور

غیر معیّن ایسا ہے جیسے ہندوستانی طبیب کا نذرانہ کہ کسی بیمار سے ایک روپیہ ، کسی سے دو روپے ، کسی سے اور زیادہ وصول ہوتا ہے ، اور کسی سے کچھ نہیں ملتا ۔ پس جو لوگ اپنی قوم میں وعظ یا درس یا تلقین وغیرہ کرتے ہیں اور اس خدمت کی کوئی اُجرت مقرر نہیں کرتے ، وہ گویا طبیبوں کی طرح قوم میں غیر معیّن نذرانے کے مستحق بنتے ہیں ۔ اور حق یہ ہے کہ اگر وہ راستی ، دیانت اور آزادی سے یہ کام کریں تو اُن کا یہ استحقاق تسلیم کے قابل ہے ۔ لیکن افسوس ہے کہ جس قوم میں نہ دولت ہو ، نہ علم ہو ، نہ اہل علم اور اہل اللہ کی کچھ عظمت ہو ، وہاں معاش کا مدار ایسی غیر معیّن آمدنی پر رکھنے میں راست بازی قایم نہیں رہ سکتی ۔ 'احیاءالعلوم' میں کسی بزرگ کا یہ قول لکھا ہے کہ ”سب بندے خدا کے رزق سے متمتع ہوتے ہیں مگر بعضے ذلت کے ساتھ جیسے سائل ، اور بعضے مشقت اور انتظار کے بعد جیسے تاجر ، اور بعضے بے وقعتی کے ساتھ جیسے پیشہ ور ، اور بعضے عزت کے ساتھ جیسے صوفی ۔“ یعنی اُن لوگوں کے سوا ، جو خدا پر تکیہ کیے خانقاہوں اور مسجدوں میں بیٹھے ہیں ، اور کوئی عزت سے روٹی نہیں کھاتا ۔ شاید مسلمانوں کے عروج کے زمانے میں ایسا ہی ہو مگر زمانۂ حال میں ہم بالکل اس کے برخلاف دیکھتے ہیں ۔ اب اُن لوگوں کے سوا جو مشقت سے معاش حاصل کر سکتے ہیں ، اور کوئی عزت سے روٹی نہیں کھاتا ۔ اور اگر انصاف سے دیکھو تو ہر زمانے میں یہی لوگ اصل عزت کے مستحق ہونے چاہئیں ، کیوں کہ اگر دنیا سے یہ گروہ بالکل مفقود ہو جائے اور لوگ خدا پر توکل کر کے خانقاہوں اور مسجدوں میں بیٹھ رہیں تو چند روز میں ساری دنیا کا خاتمہ ہو جائے ۔

ایک اور سبب تدبیر کے بے کار اور لاحاصل سمجھنے کا یہ ہوتا ہے کہ جس قوم میں زمانے کے موافق علوم و فنون کی تعلیم نہیں ہوتی

اور اُن کا تجربہ اور واقفیت محدود ہوتی ہے ، اُن کی تدبیریں اکثر غلط یا غیر مفید ہوتی ہیں ۔ اور اس سبب سے جب کہ وہ پے در پے ناکامیاں دیکھتے ہیں تو لاچار ہو کر تدبیر کو محض ہیچ و پوچ جاننے لگتے ہیں : مثلاً جو شخص نوکری کی لیاقت نہیں رکھتا وہ نوکری تلاش کرتا ہے ، یا جو تجارت کے اصول سے واقف نہیں وہ تجارت کر بیٹھتا ہے ۔ ظاہر ہے کہ ایسے لوگ شاذو نادر کامیاب ہو سکتے ہیں ۔ پس جب وہ متواتر ناکامیاں دیکھتے ہیں تو تدبیر سے اُن کا جی چھوٹ جاتا ہے ۔

اصل یہ ہے کہ کامیابی کے لیے تین شرطیں نہایت ضروری ہیں :

۱۔ محنت ۔ ۲۔ علم ۔ ۳۔ ہنر ۔

اگر ان میں سے ایک شرط بھی نہ پائی جائے گی تو کام حسبِ دل خواہ سرانجام نہ ہوگا ۔ مثلاً :

۱۔ ایک شخص نہ تو پیمایش کے اصول سے واقف ہے اور نہ پیمایش میں مشّاق ہے ۔

۱۔ دوسرا شخص پیمایش کے اصول تو جانتا ہے مگر اُس نے کبھی پیمایش نہیں کی ۔

۳۔ تیسرا شخص پیمایش کے اصول بھی جانتا ہے اور اُس میں مشّاق بھی ہے ۔

اب ان تینوں شخصوں نے مختلف رقبوں کی پیمایش شروع کی ۔

(الف) پہلا شخص کسی طرح صحیح پیمایش نہیں کر سکتا ۔

(ب) دوسرا شخص بہت دیر میں نہایت دقت سے تھوڑے سے رقبے کی پیمایش کر سکتا ہے ۔

(ج) تیسرا شخص نہایت آسانی سے تھوڑے سے عرصے میں دوسرے شخص سے دس گنے رقبے کی صحیح پیمایش کر سکتا ہے ۔

پھر جس قدر علم اور ہنر زیادہ ہوگا اُسی قدر کامیابی زیادہ

ہوگی ۔ مثلاً :

(د) چوتھا شخص اگر پلین ٹیبل یا پریزمٹک کے ذریعے سے پیمایش کرے گا تو تیسرے شخص سے بھی زیادہ صحیح اور جلد پیمایش ہوگی ۔

ہماری قوم چوں کہ معاش کے اُن علوم و فنون سے بالکل بے بہرہ ہے جو اس زمانے میں درکار ہیں ، اس لیے جب وہ کسی کام میں ہاتھ ڈالتے ہیں تو اُن کا ہاتھ ہمیشہ اوچھا پڑتا ہے اور آخر کو تھک کر وہ یہ کہہ اُٹھتے ہیں کہ ”تدبیر سے کچھ نہیں ہو سکتا“ ۔

یہ تمام اسباب ، جو اوپر بیان کیے گئے ، سب بہ منزلہ فروعات کے ہیں اور ان سب کا اصل اصول ایشیا کی تعلیم اور اُس کی سوسائٹی ہے ، جس کا ذاتی خاصہ یہ ہے کہ وہم کو غالب اور عقل کو مغلوب کرتی ہے ۔ ایشیا کا ہر متنفس ہوش سنبھالتے ہی چاروں طرف ایسی آوازیں سنتا ہے جو اُس کی ہمت کو پست اور حوصلے کو تنگ کرنا چاہتی ہیں اور رفتہ رفتہ وہم کو اُس کی طبیعت پر ایسا مسلط کر دیتی ہیں کہ جن قویٰ کی بدولت وہ اشرف المخلوقات قرار پایا ہے، وہ بالکل مضمحل ہو جاتی ہیں ۔

اگرچہ ایشیا کی تمام قوموں میں اوہام کا غلبہ اور عقل کی مغلوبیت برابر پائی جاتی ہے ، لیکن چوں کہ مجھ کو خاص مسلمانوں کی حالت سے بحث ہے ، اس لیے میں خاص کر انھی کا ذکر کرتا ہوں ۔ مثلاً اولاد جو ماں باپ کی بے پروائی یا نالیاقتی یا فرطِ محبت کے سبب نالایق ہو جاتی ہے ، تو اُس کا الزام ہمیشہ تقدیر کے ذمے لگایا جاتا ہے ، اور یہ کہا جاتا ہے کہ تقدیر کے بگڑے کو کوئی سنوار نہیں سکتا ۔ جنون ، خفقان ، بخار ، سرسام اور اکثر بیماریوں کے علاج سیانوں اور عاملوں سے کرائے جاتے ہیں ۔

اگر کسی کو کوئی ناگہانی صدمہ پہنچ جائے ، تو اکثر یہ

سمجھا جاتا ہے کہ اُس کو کسی برے کام کی سزا ملی ہے ، گو اُس برے کام کو اُس صدمے سے کچھ علاقہ ہو یا نہ ہو ۔ مثلاً گھوڑے سے اس لیے گر پڑا کہ سادات کی بے ادبی کی تھی ۔ مجنون اس سبب سے ہو گیا کہ خلیفہ پر تبرّا کیا کرتا تھا ۔ فالج اس سبب سے گرا کہ مسجد میں ناپاک چلا گیا تھا ۔ لنگڑا اس وجہ سے ہو گیا کہ شہید صاحب کی قبر پر جوتیوں سمیت چڑھ گیا تھا ۔

جس شخص نے اپنی محنت سے دولت کمائی ہے یا باپ دادا کی میراث اُس کو پہنچی ہے ، یا جو شخص صاحب اولاد ہے ، یا جس کی اولاد سعادت مند ہے ، اُس پر خدا کی ایک خاص اور غیر معتاد عنایت سمجھتے ہیں جس کا نام اقبال ہے ۔ اور جو شخص ایسا نہیں ہوتا اُس کو خدا کے ایک خاص اور غیر معتاد غصے میں گرفتار جانتے ہیں جس کا نام ادبار ہے ۔

مکان اور مویشی اور عورتیں مبارک یا نحس سمجھی جاتی ہیں ۔ دیوانِ حافظ اور دیگر کتابوں سے فالیں دیکھی جاتی ہیں ۔ جانوروں اور اور چیزوں سے اچھے یا برے شگون لیے جاتے ہیں ۔ جن ، بھوت اور پریاں وغیرہ مانی جاتی ہیں ۔ مزاروں سے مرادیں مانگی جاتی ہیں اور اُن پر نذریں چڑھائی جاتی ہیں ۔

عربی ، فارسی اور اُردو ، جوکہ مسلمانوں کی زبانیں ہیں ، ان تینوں زبانوں کا لٹریچر اسی قسم کے اوہام اور خیالات سے بھرا ہوا ہے ۔ جس وقت سے بچہ مکتب میں بیٹھتا ہے ، برابر یہی تعلیم پاتا ہے ۔ گھر میں چھوٹے بڑے سے یہی سبق پڑھتا ہے ، باہر ہمجولیوں سے یہی آوازیں سنتا ہے ۔ اسی طرح بے شمار اور ہزار در ہزار اوہام باطلہ ہیں جنھوں نے چاروں طرف سے اُن کو جکڑ بند کر رکھا ہے ۔

شاید یہاں یہ خیال پیدا ہو کہ یہ خیالات مسلمانوں میں مذہب سے پھیلے ہیں ، مگر ادنٰی غور کے بعد یہ شبہ رفع ہو سکتا ہے ۔

سوپر نیچرل (خلافِ عقل و قیاس) باتیں ، جن سے یہ خیالات اور اوہام ترقی کر سکتے ہیں ، جس قدر 'بائبل' سے مفہوم ہوتی ہیں ، اُن کا عشر عشیر بھی قرآن مجید میں نہیں پایا جاتا ، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ :

"قرآن مجید میں ایک بات بھی فطرت الٰہی کے خلاف نہیں ہے"

حالانکہ بائبل کی ماننے والی قومیں ، یعنی اہل یورپ میں ان خیالات و اوہام کا کہیں نام بھی نہیں ۔ یورپ کے کروڑوں آدمی جو بائبل کے ایک ایک حرف کو الہامی مانتے ہیں ، ان میں سے ایک بھی ایسا نہ ہوگا جو اہل ایشیا یا اہل اسلام کی مانند اوہام میں گرفتار ہو ۔ اور اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ایشیا میں یا خاص کر اہل اسلام میں اوہام کا غلبہ اور عقل کی مغلوبیت مذہب سے ہرگز پیدا نہیں ہوئی بلکہ ایسے اسباب سے پیدا ہوئی ہے جو ایشیا میں پائے جاتے ہیں اور یورپ میں نہیں پائے جاتے ۔

ہنری ٹامس بکل[1] نے اپنی 'تاریخ تمدن' میں نہایت عمدگی سے یہ بات ثابت کی ہے کہ جن ملکوں میں نیچرل فنامنا یعنی قدرتی ظہور نہایت تعجب خیز اور دہشت انگیز ہوتے ہیں ، وہاں خواہ مخواہ وہم غالب اور عقل مغلوب ہو جاتی ہے ۔ اور جب تک بذریعۂ تعلیم

---

[1] ۱- ہنری ٹامس بکل (Henry Thomes Bueckle) ۲۴ نومبر ۱۸۲۲ء کو بہ مقام لی واقع کنٹ (انگلستان) ایک دولت مند تاجر کے ہاں پیدا ہوا ۔ اس نے ساری عمر تحصیل علم اور خدمت علم میں گزار دی ۔ انتہا یہ کہ اس شوق میں ساری عمر شادی بھی نہیں کی ۔ بکل کو دنیائے علم میں خاص شہرت اس کی تصنیف ہسٹری آف سویلیزیشن (History of Civilization) کی وجہ سے حاصل ہے ۔ اس کتاب کا اُردو ترجمہ 'تاریخ تمدن' کے نام سے عرصہ ہوا انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد دکن کی جانب سے دو جلدوں میں شائع ہو چکا ہے ۔ بکل نے ۱۸۶۲ء میں بمقام دمشق انتقال کیا جہاں وہ بیماری کی وجہ سے بہ غرض تبدیلیِ آب و ہوا گیا ہوا تھا ۔ (اسماعیل)

یا دیگر اسباب سے وہم کو مغلوب اور عقل کو غالب نہیں کیا جاتا ، وہ ممالک اسی حالت میں گرفتار رہتے ہیں ۔ وہ لکھتا ہے :

''ایشیا ، افریقہ اور امریکا میں بہ نسبت یورپ کے بیرونی دنیا نہایت عظیم الشان ہے ۔ صرف پہاڑ اور قدرتی سرحدوں کا ، جو ہمیشہ قایم اور ثابت رہتی ہیں ، یہ ذکر نہیں ہے بلکہ اتفاق فنامنا کا بھی یہی حال ہے ۔ مثلاً زلزلہ ، طوفان ، وبا وغیرہ جو کہ ان ملکوں میں بہ نسبت یورپ کے بہت زیادہ ہوتے ہیں اور بہت نقصان پہنچاتے ہیں ۔ وہ خطرے جو بار بار ظہور کرتے ہیں آن سے بھی وہی نتیجے پیدا ہوتے ہیں جو قدرت کے دائمی مظاہر سے ظاہر ہوتے ہیں کیونکہ دونوں حالتوں میں وہم اور تصورات زیادہ ہوتے ہیں ، گرم ملکوں میں بہ نسبت اور جگہ کے اس قسم کے واقعات بہت ہوتے ہیں اور اسی سبب سے گرم ملکوں میں وہم غالب رہتا ہے ۔ مثلاً زلزلہ ، جو کہ بڑا اور عجیب واقعہ ہے اور جس کا ظہور ہمیشہ دفعتاً ہوتا ہے اور جس میں جانیں بھی بہت ہلاک ہوتی ہیں ، ملک پیرو میں اکثر واقع ہوتا ہے اور ہر مرتبہ کے زلزلے میں عموماً دہشت اور خوف بڑھ جاتا ہے ۔ پس جب کہ دل ہمیشہ خائف و ترسان رہتا ہے اور انسان ایسے ایسے حوادث دیکھتا ہے کہ جن سے نہ بچ سکتا ہے ، نہ جن کو سمجھ سکتا ہے ، تو اس کو اپنی مجبوری اور عاجزی کا یقین ہو جاتا ہے اور وہم حد سے زیادہ بڑھ جاتا ہے اور عقل پر غالب ہو کر انسان کے دل میں بے اصل خیالات پیدا کر دیتا ہے ۔ ایشیا کی شائستگی کا مرکز یعنی ہندوستان بھی نیچرل فنامنا سے خوف زدہ ہے ۔ علاوہ آن خطروں کے جو گرم آب و ہوا میں وقتاً فوقتاً ہوتے رہتے ہیں ، ایشیا میں ایسے بڑے پہاڑ ہیں جو آسمان کو چھوتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں اور جن کی اطراف سے ایسے بڑے بڑے دریا نکلتے ہیں جن کی دھار کسی ہنر سے پھر نہیں سکتی اور جن پر آج تک کوئی پل نہیں بندھا ۔ علاوہ ازیں ناقابل گزر جنگل بھی ہیں اور ایسے جن کی حد نہیں ۔ پھر آن کے بعد غیرمتناہی ویرانے ہیں جن سے انسان کو یہ نصیحت ہوتی ہے کہ ہم نہایت کمزور ہیں اور نیچر کے زور کا مقابلہ کرنے کے قابل نہیں ۔ خشکی کے دونوں طرف بڑے بڑے سمندر ہیں جن میں ہمیشہ طوفان آتے رہتے ہیں ۔ اور آن سے ایسا نقصان ہوتا ہے کہ ویسا یورپ میں جانتے بھی نہیں ۔ اور ایسا دفعتاً زور شور سے ہوتا ہے کہ اس کی گزند سے بچنا غیر ممکن ہے ۔ ایشیا کے وہ حصے جہاں اعلیٰ درجے کی شایستگی ہوئی (جیسے ہندوستان) یورپ کے نہایت شایستہ حصوں کی نسبت متعدد طبعی اسباب کی وجہ سے زیادہ تر نا تندرست ہیں ۔ بڑی بڑی وبائیں جو مختلف اوقات میں یورپ میں آئیں ، وہ سب مشرق سے آئیں ، جو گویا آن کی قدرتی پیدایش کی جگہ ہے اور جہاں وہ نہایت مہلک ہوتی ہیں ۔ جتنی سخت بیماریاں اب تک یورپ میں موجود ہیں منجملہ ان کے شاذ و نادر ہی کوئی بیماری وہاں کی ہوگی ۔ اور سب سے بڑی بیماریاں سنہ عیسوی کی پہلی صدی میں (اور اس کے بعد) گرم ملکوں سے آئیں ۔ برخلاف اس کے یورپ میں نیچرل فنامنا نے وہم کو محدود اور سمجھ کو دلیر کیا اور انسان کو اپنی قوتوں پر بھروسا ہوا ۔ علم کی ترقی میں آسانی اور دلیری ہوئی ، تحقیقات کے شوق نے ترقی پائی اور علم کی طرف رغبت پیدا ہوئی جس پر تمام آیندہ ترقیاں موقوف ہیں ۔ یورپ کی شایستگی کا مرکز یعنی یونان جو کہ مثل ہندوستان کے جزیرہ نما ہے ، آس کی حالت بالکل ہندوستان کے برخلاف ہے ۔ جیسے ہند میں ہر شے بڑی اور خوفناک ہے ویسے ہی یونان میں ہر شے چھوٹی اور کمزور ہے ۔ خود یونان ایک بہت چھوٹا سا ملک ہے اور ایک سکڑے سمندر میں واقع ہے جہاں سے بہ کمال آسانی گزر ہو سکتا ہے ۔ آب و ہوا یہاں کی نہایت صحت بخش ہے ۔ زمین پر زلزلے بہت کم آتے ہیں ، طوفان اور بگولے سے کم ضرر پہنچتا ہے ، وحشی اور

موذی جانور بھی شمار میں کم ہیں ۔ یونان کے اونچے سے اونچے پہاڑ ہمالہ کے ایک تہائی سے بھی کم بلند ہیں ۔ دریاؤں کا یہ حال ہے کہ شمالی اور جنوبی یونان میں چند چشموں کے سوا کچھ نہیں ملتا اور وہ بھی پایاب ہیں اور گرمی میں خشک ہو جاتے ہیں ۔ پس ان دونوں ملکوں کی موجودات کے اختلاف کے سبب خیالات میں بھی اختلاف پیدا ہوا ۔ کیوں کہ جس قدر خیالات ہوتے ہیں وہ کچھ تو خود دل ہی کی پیداوار ہوتے ہیں اور کچھ دنیا کی بیرونی صورت کو دیکھنے سے پیدا ہوتے ہیں ۔ ہندوستان جن چیزوں سے گھرا ہوا ہے اُن سے خوف اور دہشت پیدا ہوئی اور یونان میں انھی سے اطمینان حاصل ہوا ۔ وہاں انسان کا دل خائف ہوا اور یہاں انھی باتوں سے ہمت اور دلیری پیدا ہوئی ۔ ہندوستان میں ہر قسم کی دقتیں ایسی بے شمار اور ایسی خوف ناک اور بہ ظاہر اس قدر سمجھ سے باہر در پیش آئیں کہ زندگی کی ہر ایک مشکل بات کا سبب بہ مجبوری ایسا قرار دینا پڑا کہ جو انسان کی قدرت سے باہر ہو ۔ جب کسی بات کا سبب سمجھ میں نہ آیا ، فوراً وہم اور تصور نے اپنا عمل کیا اور آخر وہم کا غلبہ ایسا خطرناک ہو گیا کہ سمجھ مغلوب ہو گئی اور اعتدال جاتا رہا ۔ یونان میں چوں کہ نیچر خوف ناک اور بہت چھپی ہوئی نہ تھی ، اس سبب سے وہاں انسان کے دل پر خوف کم غالب ہوا اور لوگ خیال پرست کم ہوئے ۔ طبعی اسباب کے دریافت کرنے پر توجہ ہوئی اور علم طبیعی ایک چیز قرار پایا اور انسان کو رفتہ رفتہ اپنی قوت اور اقتدار کا علم ہوتا گیا اور وہ ایسی دلیری سے واقعات کی تحقیقات کرنے لگا کہ اس قسم کی جرأت اُن ملکوں میں ہرگز نہیں ہو سکتی جہاں آزادی نیچر کے دباؤ سے مظلوم ہو رہی ہے اور جہاں ایسے واقعات پیدا ہوتے رہتے ہیں جو سمجھ میں نہیں آ سکتے‘‘ ۔ انتہی ملخصاً

اس کے بعد ٹامس بکل نے ہندوستان اور یونان کا مقابلہ لٹریچر

اور مصوری وغیرہ میں کیا ہے جس سے نہایت واضح طور پر ثابت ہوتا ہے کہ ایشیا میں اوہام کا غلبہ مذہب کے سبب سے نہیں ، بلکہ قدرت کے خوف ناک ظہوروں کے سبب سے انسان کے دل میں پیدا ہوا ہے ۔ اور خاص کر ان دو ملکوں کا مقابلہ اس لیے کیا ہے کہ ایشیا اور یورپ کے مرکز یہی دونوں ملک قرار دیے گئے ہیں ۔ ظاہر ہے کہ جیسے خیالات مرکز میں پیدا ہوں گے ، وہی محیط تک پھیلیں گے ۔ اور یہی سبب ہے کہ ایشیا کے تمام ملکوں میں جہاں ٨٧ کروڑ ٥ لاکھ آدمی آباد ہیں ، تقریباً ایک ہی سے خیالات اور ایک ہی سے اوہام طبیعتوں پر چھائے ہوئے ہیں ۔

ان تمام اسباب کے سوا ، جو اوپر ذکر کیے گئے ، اور بھی اسباب ہیں جو انسان کے دل میں اپنی مجبوری کا خیال پیدا کرتے ہیں اور اس کو بڑے بڑے کاموں میں اقدام نہیں کرنے دیتے ۔ لیکن ہم خیال کرتے ہیں کہ اس قدر بیان بھی اصلِ مدعا کے ذہن نشین کرنے کے لیے کافی ہوگا ۔ جن قوموں نے تدبیر اور کوشش کی ہے ، وہ جلدی یا دیر میں ضرور کامیاب ہوئی ہیں اور ایسی ایسی مشکلوں پر غالب آئی ہیں جن کے حل ہونے سے یہ قول اُن کے ہاں ضرب المثل ہو گیا کہ Nothing is impossible (یعنی کوئی چیز ناممکن نہیں ہے) پس جب تک ہماری قوم کے دل میں بھی ایسے خیالات پیدا نہ ہوں گے ، تب تک امید نہیں ہو سکتی کہ ترقی اور تمدن کی فہرست میں ہمارا نام درج ہو سکے اور خلافتِ رحمانی کا ادنٰی سے ادنٰی درجہ بھی ہمارے ہاتھ آئے ۔ فقط

۳

قرآن مجید میں اب نئی تفسیر
کی
گنجائش باقی ہے یا نہیں ؟

(رسالہ 'معارف' علیگڑھ بابت دسمبر ۱۸۹۹ع اور 'حیات جاوید' ضمیمہ)

سرسید کے انتقال کے بعد جو بکثرت مضامین اُن پر ملک کے مشہور ادیبوں نے لکھے تھے ، یہ مضمون بھی اُن ہی میں سے ایک ہے ، جو مولانا نے اپنے ہم وطن اور دوست مولوی وحید الدین سلیم کی فرمائش پر لکھا تھا ۔ وہ اُن دنوں علی گڑھ سے ایک ماہوار رسالہ 'معارف' کے نام سے نکالتے تھے جسے وہ بعد میں پانی پت لے آئے تھے ۔ ۱۸۹۹ع میں 'معارف' میں چھپنے کے بعد جب ۱۹۰۱ع میں مولانا نے سرسید کی لائف 'حیات جاوید' شائع کی تو اُس کے ضمیمے میں بھی یہ مضمون نقل کیا تھا ۔ اس مضمون میں مولانا نے یہ بتایا ہے کہ اگرچہ متقدمین نے قرآن کریم کی ہزاروں تفسیریں لکھی ہیں اور کوئی بات باقی نہیں چھوڑی ، مگر پھر بھی قرآن کریم کے حقایق و معارف ایسے ہیں کہ وہ کبھی ختم نہیں ہوں گے اور ہر شخص اپنے ذوق ، اپنے علم اور اپنی واقفیت کے مطابق اُن آیات کی تفسیر اور تاویل کرتا ہے ، جو محکمات اور متشابہات کے نام سے مشہور ہیں ۔ اسی لیے سرسید کو ضرورت ہوئی کہ نئے تقاضوں اور نئے حالات کے مطابق قرآن شریف کی تفسیر لکھیں اور جدید تعلیم یافتہ اور انگریزی علوم سے متاثر اصحاب کے لیے ایک ایسی جدید تفسیر قرآن مجید کی پیش کریں جو اُن کے ملحدانہ خیالات کی اصلاح کر سکے ۔ چناں چہ سرسید نے چند پاروں کی تفسیر لکھی مگر اُن کے بعض بہت بڑے مددگاروں کو بھی اُن کی پیش کردہ تاویلات میں سے اکثر سے اتفاق نہیں ہوا ؛ مثلاً خود مولانا حالی ، نواب محسن الملک اور نواب اعظم یار جنگ مولوی چراغ علی ۔ بہرحال مولانا کا مضمون ذیل میں درج کیا جاتا ہے (اسماعیل)

سرسید کی تفسیر جس میں بیسیوں آیات کے معانی جمہور مفسرین کے خلاف لکھے گئے ہیں ، اُس کی نسبت پہلا شبہ جو ہر شخص کے دل میں پیدا ہوتا ہے ، وہ یہ ہے کہ باوجود بے شمار تفسیروں کے ، جو گزشتہ تیرہ سو برس میں وقتاً بعد وقتٍ قرآن مجید کی لکھی گئی ہیں ، اب تفسیر قرآن کے متعلق ایسا کون سا مرحلہ باقی رہ گیا ہے جس کو علمائے سلف نے طے نہ کر لیا ہو ؟ اولاً حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ، جن کے برابر قرآن کا علم کسی اُمتی کو نہیں ہو سکتا ، جن آیتوں کے معانی بیان کرنے کی ضرورت تھی ، خود زبان مبارک سے اُن کا مطلب ارشاد فرما دیا ۔ پھر آپ کے بعد (۲) صحابہ[1] (۳) تابعین[2] (۴) تبع تابعین[3] اور (۵) علمائے اُمت نے ، جو یقیناً

---

[1] صحابہ : یعنی وہ مقدس اور محترم بزرگ جنہوں نے آں حضرت صلعم کا فیض صحبت حاصل کیا ۔ (اسماعیل)

[2] تابعین : یعنی وہ اصحاب جنہوں نے صحابہ سے اکتساب فیض کیا ۔ (اسماعیل)

[3] تبع تابعین : یعنی علمائے اُمت کا وہ گروہ جس نے تابعین کی صحبت اُٹھائی ۔ (اسماعیل)

ہمارے زمانے کے لوگوں سے بہتر قرآن سمجھنے والے تھے ، قرآن کی ایک ایک آیت اور ایک ایک لفظ کو بالکل حل کر دیا ۔ پس زمانۂ حال کے مفسر کے لیے اس کے سوا کوئی منصب باقی نہیں رہا کہ وہ اُن ہی تفسیروں کا ماحصل جو علمائے سلف لکھ گئے ہیں ،

۱۔ زیادہ شرح و بسط ،

۲۔ یا زیادہ اختصار ،

۳۔ یا زیادہ فصاحت و بلاغت کے ساتھ بیان کر دے ،

۴۔ یا ایک زبان سے دوسری زبان میں اُن کا ترجمہ کر دے ۔

یہ منصب اب کسی کا نہیں ہے کہ ایک بھی آیت کے معنی ایسے بیان کرے جو تیرہ سو برس میں کسی نے نہ بیان کیے ہوں ۔ چنانچہ اسی شبہے کی بنا پر بعض ستم ظریفوں کو کہتے سنا ہے کہ ”جو مطلب قرآن کا سرسید نے بیان کیا ہے وہ نہ خدا کو سوجھا ، نہ نبی کو ، نہ صحابہ و تابعین کو اور نہ دیگر علمائے اُمت کو ۔“

اس مضمون میں ہم کو اسی شبہ کا حل کرنا مقصود ہے ۔ مگر پہلے اس سے کہ اصل مقصود بیان کیا جائے ، چند باتیں ذہن نشین کر لینی ضروری ہیں :

۱۔ ایک یہ کہ محکمات و متشابہات کے الفاظ ، جو قرآن مجید میں وارد ہوئے ہیں ، اُن سے کیا مراد ہے ؟

شاہ ولی اللہؒ کے نزدیک جیسا کہ ’حجۃ اللہ البالغہ‘ میں مذکور ہے :

(الف) محکمات وہ آیتیں ہیں جن میں ایک معنی سے زیادہ کا احتمال نہ ہو ۔

(ب) متشابہات وہ ہیں جن میں متعدد معنوں کا احتمال ہو مگر مقصود ایک معنی سے زیادہ نہ ہوں ۔

اس سے ظاہر ہے کہ قرآن مجید میں جس قدر آیتیں ایسی ہیں جن

میں معانیِ متعددہ کا احتمال ہو سکتا ہے ، وہ سب متشابہات کے تحت میں مندرج ہیں ۔

۲۔ دوسرے یہ کہ قرآن مجید میں متشابہات کے لانے سے شارع کا کیا مقصد تھا ؟ امام رازی نے اس کی کئی وجہیں بیان کی ہیں مگر سب سے عمدہ وجہ جس کو اُنھوں نے تمام وجوہ پر ترجیح دی ہے ، یہ ہے کہ ”قرآن ایک ایسی کتاب ہے جس میں خواص و عوام سب کو حق کی طرف بلایا گیا ہے اور عوام کی طبیعتیں ادراک حقایق سے بعید ہوتی ہیں ۔ مثلاً اگر اُن کے سامنے ایک ایسی ہستی کا بیان کیا جائے جو نہ جسم ہے ، نہ کسی مکان میں ہے اور نہ اُس کی طرف اشارہ ہو سکتا ہے ، تو اُن کو یہی خیال ہوگا کہ ایسی چیز معدوم محض کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے ؟ پس مقتضائے حکمت یہی تھا کہ اُن کو ایسے الفاظ کے ساتھ خطاب کیا جائے جو من وجہٍ اُن کے خیالات سے مناسبت رکھتے ہوں ۔“

شاہ صاحب نے اسی مطلب کو ’حجۃ اللہ البالغہ‘ میں اس طرح بیان کیا ہے کہ : ”شارع نے محض لوگوں کی معمولی سمجھ کے موافق جو دقایقِ علم و حکمت تک پہنچنے سے پہلے اُن کی اصل خلقت میں ودیعت تھی ، اُن سے خطاب کیا ہے ۔ اوز اسی لیے (اُن کی سمجھ کے موافق) فرمایا ”الرحمٰن علی العرش استوی ۔“

اس کے بعد لکھتے ہیں کہ : ”آں حضرتؐ نے ایک حبشیہ عورت سے پوچھا کہ ”خدا کہاں ہے ؟“ اُس نے آسمان کی طرف اشارہ کیا ۔ آپ نے فرمایا ”یہ مومنہ ہے“ یعنی آں حضرتؐ نے باوجودیکہ آپ خدا تعالیٰ کو کسی خاص جہت میں ہونے سے منزہ جانتے تھے ، اُس کے آسمان کی طرف اشارہ کرنے کو اُس کے ایمان کے لیے کافی سمجھا اور اس دقیق بات کے سمجھانے کو مناسب نہ جانا کہ وہ ذات اقدس جہت اور مکان سے پاک ہے ۔

ان سب حوالوں سے ظاہر ہے کہ قرآن میں وہ تمام روحانی اور اعلیٰ مقاصد ، جو عموماً انسان کی فہم و ادراک سے اور خاص کر عرب کے اُمیوں کی سمجھ سے بالاتر تھے اور جن پر بالاجمال ایمان لانا کافی تھا ، اُن کو مجاز و استعارے اور تمثیل کے پیرائے میں بیان کیا گیا ہے تاکہ اُمی اور حکیم دونوں اپنی اپنی سمجھ کے موافق اس سے ہدایت حاصل کریں ۔

عہد عتیق کی کتابیں ، جن کو مسلمان ، یہودی اور عیسائی سب آسمانی کتابیں مانتے ہیں ، چوں کہ وہ اُس زمانے میں القا کی گئی تھیں جب کہ انسان کی سمجھ نہایت ابتدائی حالت میں تھی ، اس لیے اُن میں قرآن سے کہیں زیادہ کلام کی بنیاد مجاز اور استعارے پر رکھی گئی ہے ۔ تمام عہد عتیق کی کتابیں اور صحیفے متشابہات سے بھرے ہوئے ہیں ۔ جیسے :

”خدا کا طوفان نوحؑ پر اس قدر رونا کہ اُس کی آنکھیں آشوب کر آئیں ۔“

ایک دوسرے موقع پر اُس کا ”ایسا ہنسنا کہ کچلیاں نظر آنے لگیں ۔“

سرکشوں کا اُس کو کھجا کر غصہ دلانا اور اُس کی ناک میں دھوئیں کا سا اثر کرنا ۔

اُس کے سانس کا گندھک کے سیلاب کی مانند ہونا ۔

شہر اشور کا اُس کی آواز سے تباہ ہونا اور اس کا اشور والوں کو لٹھوں سے مارنا وغیرہ وغیرہ ۔

ایک جگہ ’کتاب یرمیاہ‘ میں یروشلم کی تباہی پر خدا تعالیٰ اپنا غصہ اس طرح ظاہر کرتا ہے : ”اے میری انتڑیوں ! اے میری انتڑیوں ! میرے دل کے پردے میں درد ہے ۔ میرے دل کی ایسی گھبراہٹ ہے کہ میں چپ نہیں رہ سکتا ۔ اے میری جان ! تو نے

ُترئی کی آواز اور لڑائی کی للکار سنی ، شکست پر شکست کی خبر ہوئی ۔ یقیناً تمام سر زمین برباد ہو گئی ۔ میرے خیمے اچانک اور میرے پردے ایک دم میں غارت کیے گئے ۔ کب تک میں یہ جھنڈا دیکھا کروں اور ُترئی کی آواز سنا کروں ۔“

زبور میں ایک جگہ خدا تعالیٰ داؤدؑ کے مقرب اور محبوب ہونے کو اس طرح بیان کرتا ہے :

”میں نے تجھے جنا ہے ، میں آج کے دن تیرا باپ ہوا ۔“

دوسری جگہ زبور ہی میں خدا کے انتقام لینے کا بیان اس طرح ہے : ”آخر خداوند خواب سے بیدار ہوا اور اُس پہلوان کی طرح جو شراب پی کر عربدہ کرے ، اپنے دشمنوں کے پچھاڑ ماری ۔“

غرض کہ تمام عہد عتیق کی کتابیں اسی قسم کے متشابہات سے مالا مال ہیں جن میں روحانی تعلیم جسمانیات کے پیرائے میں لکھی گئی ہے ۔ اسی لیے شاہ ولی اللہؒ صاحب انبیاء کے خواص کے ذکر میں لکھتے ہیں :

”و من سیرتھم ان لایکلموا الناس الا علی قدر عقولھم التی خلقوا علیھا و علومھم التی ھی حاصلۃ عندھم باصل الخلقۃ ۔“

۳۔ تیسرے یہ بات بھی سمجھ لینی ضروری ہے کہ متشابہات کی تاویل جس کی نسبت قرآن مجید میں کہا گیا ہے ”و ما یعلم تاویلہ الا اللہ“ اس سے کیا مراد ہے ؟ ظاہر ہے کہ اس آیت کے یہ معنی قرار دینے تو بالکل غلط ہیں کہ متشابہات کی تاویل کا علم اجمالاً یا تفصیلاً کسی طرح پر انسان کو نہیں دیا گیا ورنہ مسلمانوں کا یہ دعویٰ غلط ہو جائے گا کہ ہمارے دین میں عیسائیوں کے مسئلہ تثلیث کی مانند کوئی ایسا راز سربستہ نہیں ہے جو انسان کی عقل اور سمجھ سے بالاتر ہو ۔

امام نووی شرح صحیح مسلم میں تاویل متشابہات کے متعلق

لکھتے ہیں :

’’ یبعد ان یخاطب اللہ عبادہ بما لا سبیل لاحد من الخلق الی معرفتہ و قد اتفق اصحابنا و غیرھم من المحققین علی انہ یستحیل ان یتکلم اللہ تعالٰی بما لا یفید ۔‘‘

یعنی ’’بعید از عقل ہے کہ اللہ جل شانہ اپنے بندوں سے ایسے کلام کے ساتھ خطاب کرے جس کے معنی سمجھنے کی کوئی سبیل کسی مخلوق کے لیے نہ ہو ۔ اور ہمارے علمائے مذہب اور اُن کے سوا اور محققین اس بات پر متفق ہیں کہ خدا تعالٰی کا ایسے کلام کے ساتھ متکلم ہونا ، جو مفید معنی نہ ہو ، محال ہے ۔‘‘

غرض کہ آیت مذکور کے ہرگز یہ معنی نہیں ہیں کہ انسان کو تاویل متشابہات کا علم مطلقاً نہیں دیا گیا ، بلکہ یہ معنی ہیں کہ خاص کر مبدء و معاد کے متعلق جو باتیں انسان کی سمجھ بوجھ سے باہر ہیں اور جن کا بیان آیات متشابہات میں بطور مجاز و استعارہ کے واقع ہوا ہے اور جن پر ایمان لانے کو ’’یومنون بالغیب‘‘ کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے ، اُن کی حقیقت اور کنہ خدا کے سوا کوئی نہیں جان سکتا ۔ اور اس لیے انسان جن الفاظ و عبارات سے اُن حقایق کو تعبیر کرے گا وہ تعبیر ناقص اور ادائے معنی مقصود سے قاصر ہوگی ۔

طیبی شرح مشکٰوۃ میں لکھتا ہے کہ :

’’المتشابہ الذی یحذر منہ ھو صفات اللہ تعالٰی التی لا کیفیۃ لھا والاوصاف القیمۃ التی لا سبیل الی ادراکھا بالقیاس والاستنباط و لا سبیل الی استحضارھا فی النفوس ۔‘‘

یعنی ’’جن متشابہات کے اتباع سے بچنے کا حکم ہے ، وہ صفاتِ باری تعالٰی یا قیامت کے حالات کا بیان ہے جو قیاس اور استنباط سے دریافت نہیں ہو سکتا اور نہ لوگوں کو اُس کا تصور دلانے کی کوئی سبیل ہے ۔‘‘

لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ انسان یہ بھی نہیں سمجھ سکتا کہ آیات متشابہات میں وہ اسرار و حقایق بطور استعارہ یا تمثیل کے بیان ہوئے ہیں اور الفاظ اپنے حقیقی معنوں میں استعمال نہیں ہوئے ۔ مثلاً سورۃ کُوّرَت میں ہول قیامت کا بیان ان لفظوں میں کیا گیا ہے : ’’و اذا العشار عطلت‘‘ یعنی ’’جب کہ عنقریب بیانے والی اونٹنیاں چُھٹی پھریں گی اور اُن کی کوئی خبر نہ لے گا ۔‘‘ بے شک ہول قیامت کی جس کیفیت کو اس تمثیل میں بیان کیا گیا ہے ، اُس کے ادراک سے انسان کی عقل قاصر ہے ، اور اُس کی قدرت سے باہر ہے کہ اُس کیفیت کو کسی لفظ یا عبارت کے ذریعے سے پورا پورا ادا کر سکے ، لیکن یہ سمجھنا اُس کی طاقت سے باہر نہیں ہے کہ یہ بیان اُس کیفیت کی تمثیل ہے ۔ اور ایک اونٹ چرانے والی قوم جس کی دولت اونٹ اور اونٹنیوں کے سوا کچھ نہ تھی ، اُس کو ہولِ قیامت کا تصور دلانے کے لیے کوئی اسلوب اس سے زیادہ بلیغ نہیں ہو سکتا ۔ کیوں کہ عرب اپنی الف و عادت کے سبب اس بات کو ناممکن سمجھتے تھے کہ جب اونٹنی بیانے کے قریب ہو ، اس وقت مالک اُس کی نگرانی سے غافل ہو جائے ۔ پس اُنھوں نے اُس وقت کو کیسا ہول ناک تصور کیا ہوگا جب کہ ایسی اونٹنیوں کی خبر گیری کا ہوش باقی نہ رہے گا ۔

لیکن یہاں یہ شبہہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر تاویل متشابہات کا علم خدا تعالٰی کے ساتھ مخصوص نہ تھا تو سلف صالح تاویل کرنے کو کیوں ناجائز سمجھتے تھے ، اور جو تاویل کا مرتکب ہوتا تھا اُس سے کس لیے مواخذہ کیا جاتا تھا ۔ چناں چہ حضرت عمرؓ نے صبیغ بن عسلؒ کو اتباع متشابہ پر سزا دلوائی اور مدینے سے جلاوطن کر کے بصرے کو بھجوا دیا ۔ اور جب امام مالکؒ سے ’’استواء علی العرش‘‘ کا مطلب پوچھا گیا تو اُنھوں نے اس کے سوا کوئی جواب نہیں دیا کہ ’’استواء‘‘ کے معنی معلوم ہیں اور اُس کی کیفیت مجہول ہے اور

اُس پر ایمان لانا واجب ہے اور اُس سے سوال کرنا بدعت ہے ۔‘‘

سو اس شبہے کا جواب یہ ہے کہ جس زمانے میں قرآن نازل ہوا اس وقت اہل کتاب تحریفِ کتبِ مقدسہ کے سبب سے نہایت بدنام تھے ۔ وہ اکثر اپنے اغراض فاسدہ کے لیے کتب مقدسہ کے معنی لوگوں کو غلط بتاتے تھے اور اس طرح دین میں رخنہ ڈالتے تھے ۔ چناں چہ قرآن مجید میں جا بجا ان پر تحریف کا الزام لگایا گیا ہے اور بہت سی حدیثیں اس مضمون کی صحاح وغیرہ میں موجود ہیں ۔ بلکہ خود اہل کتاب نے تسلیم کیا ہے کہ بلاشبہہ قدیم یہودی اور عیسائی عالم بائیبل کی کتابوں میں تحریف معنوی کے مرتکب ہوتے تھے ۔ ظاہر ہے کہ تحریف سے زیادہ کوئی چیز دین کے حق میں خطرناک نہیں ہو سکتی اور اہل کتاب اُس کی مثال قایم کر چکے تھے ۔ اور چوں کہ مسلمانوں کو بنی اسرائیل سے روایت کرنے کی اجازت تھی اور دونوں اصول دین میں عموماً باہم دگر مشابہت رکھتے تھے ، اس لیے مسلمانوں کا سب سے زیادہ میل جول اہل کتاب کے ساتھ تھا لہٰذا اُن میں تحریف کا فتنہ پھیلنے کا قوی احتمال تھا ۔ چناں چہ منجملہ بہت سی بندشوں کے ، جو شارعؐ نے اسلام میں انسداد تحریف کے لیے باندھیں ، ایک یہ تھی کہ آیات متشابہات کے معنی میں چھان بین کرنے کی مذمت کی گئی اور قرآن میں صاف کہہ دیا گیا کہ : ’’فاماّ الذین فی قلوبھم زیغ فیتبعون ما تشابہ منہ ابتغاء الفتنۃ وابتغاء تاویلہ‘‘ اور آں حضرتؐ نے عموماً قرآن کی تفسیر کی نسبت فرمایا کہ ’’من فسر القرآن برأیہ فلیتبؤ مقعدہ ۔‘‘ اور جھوٹی روایت کرنے کی نسبت فرمایا ’’من کذب علی متعمداً فلیتبؤ مقعدہ من النار ۔‘‘

اسی بنا پر سلف صالح متشابہات کی تاویل سے کوسوں دور بھاگتے تھے ۔ باوجودیکہ وہ تشبیہ کے عقیدے سے بالکل مبرا تھے اور جس بات میں تشبیہ کا ادنٰی شائبہ پاتے تھے اُس سے حذر کرتے تھے ، پھر

بھی جو آیتیں تشبیہ پر دلالت کرتی تھیں ، اُن کی تاویل سے ہمیشہ سکوت کرتے اور اُن کے ظاہری معنوں سے ہرگز تجاوز نہ کرتے تھے ۔ اور کہتے تھے کہ ہم آیات متشابہات کے ظاہری معنوں پر ایمان رکھتے ہیں اور ان کے اصلی معنوں کی ، جو خدا نے مراد رکھے ہیں ، تصدیق کرتے ہیں اور اُن کا علم خدا پر چھوڑتے ہیں ، کیوں کہ اُن کے سمجھنے کی ہم کو تکلیف نہیں دی گئی ۔ بعضے یہاں تک احتیاط کرتے تھے کہ مثلاً ’ید‘ یا ’وجہ‘ یا ’استوا‘ کا ترجمہ تک دوسری زبان میں نہیں کرتے تھے ۔ اور اگر کسی ایسی آیت کے ترجمے کی ضرورت ہوتی تھی تو اُنھی الفاظ کو بعینہ ترجمے میں رکھ دیتے تھے ، حالانکہ عربی زبان میں شاعری نزولِ قرآن کے وقت حد کمال کو پہنچ چکی تھی ، استعارہ و کنایہ اور اقسام مجاز سے مالامال تھی اور اُسی زبان میں قرآن نازل ہوا تھا ۔ باوجود اس کے علماے سلف محض اس نیت سے کہ دین میں فتنہ پیدا نہ ہو اور اہل اسلام میں مثل اہل کتاب کے تحریف کا باب مفتوح نہ ہونے پائے ، تاویل متشابہات اور تفسیر بالرائے سے اجتناب کرتے تھے ، اور جہاں تک ممکن ہوتا تھا متشابہات قرآن کے الفاظ کو اُن کے حقیقی معنوں پر مقصود رکھتے تھے اور بغیر سخت ضرورت کے ان کو مجازی معنوں پر محمول نہ کرتے تھے ۔ اور کسی آیت کے تفسیر کرنے پر جب تک کوئی روایت اُس کی مؤید نہ ہو ، عموماً مبادرت نہ کرتے تھے ۔ حالانکہ تفسیر بالرائے سے ممانعت ہونے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ کسی آیت کے معنی ، جب تک کہ اس کی تفسیر کسی حدیث سے ثابت نہ ہو ، بیان کرنے جائز نہیں ہیں ۔ چناں چہ امام غزالی اور صاحبِ ’مجمع البحار‘ اور دیگر محققین نے تصریح کی ہے کہ اگر حدیث مذکور کے یہ معنی ہوں تو آں حضرت صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم کا ابن عباس کے حق میں یہ دعا کرنا کہ ’’اللھم فقھہ فی الدین و علمہ التاویل‘‘ نعوذ باللہ

بے کار ٹھیرتا ہے ۔ باوجود اس کے کہ سلف صالحین جہاں تک ہو سکتا تھا بغیر روایت کے سنے تفسیر قرآن میں دم نہ مارتے تھے تا کہ جس مصلحت سے شارع ؑ نے تفسیر بالرائے کی ممانعت فرمائی ہے وہ مصلحت فوت نہ ہو اور تحریف کا رستہ محدود رہے ۔

لیکن یہ مصلحت اُسی وقت تک محدود رہ سکتی تھی جب تک کوئی اور اس سے بھی زیادہ ضروری اور مہتم بالشان مصلحت پیش نہ آئے ۔ چنان چہ ایسا ہی ہوا کہ جو آیتیں بظاہر تشبیہ پر دلالت کرتی تھیں ، جب اُن کے اصلی معنی بیان کرنے سے علما نے سکوت کیا اور اُن کو محض حقیقی معنوں پر مقصود رکھا ، تو ایک طرف تو خود مسلمانوں میں حشویہ اور غلاۃ شیعہ ، عقیدۂ تشبیہ میں غلو کرنے لگے اور دوسری طرف جوں جوں یونانی فلسفے کا رواج زیادہ ہوتا گیا اُسی قدر آیات متشابہات کے معنوں پر زیادہ چون و چرا ہونے لگی اور مخالفین طرح طرح کے شبہات قرآن پر وارد کرنے لگے ۔ اب علماے اسلام کو اس کے سوا کچھ چارہ نہ تھا کہ سلف صالح نے جو محض از راہ مصلحت زبانوں پر مُہر لگا رکھی تھی ، اُس کو توڑ دیا جائے اور جو الفاظ قرآن مجید میں در حقیقت مجاز و استعارہ کے طور پر اطلاق کیے گئے ہیں ، بہ قدر ضرورت اُن کے اصلی معنی صاف صاف بیان کیے جائیں ۔

چنان چہ سب سے پہلے علماے معتزلہ نے تاویل متشابہات کی راہ کھولی ۔

آخر کو اسلام میں عموماً یہ قاعدہ مسلم ٹھیر گیا کہ جب نقل اور عقل میں تعارض واقع ہو تو نقل کے ایسے معنی لینے چاہئیں جن سے وہ تعارض رفع ہو جائے ؛ یعنی جب نص شرعی کے حقیقی معنی دلیلِ قاطعِ عقلی کے خلاف ہوں تو اُس کو اصول عربیت کے موافق مجازی معنوں پر محمول کرنا چاہیے اور یہی معنی تاویل کے ہیں ۔

یہ اصول علم کلام کی عام کتابوں مثل مقاصد ، مواقف ، تفسیر کبیر ، درر غرر ، تہافۃ الفلاسفہ اور فصل المقال ، قاضی ابن رُشد وغیرہ وغیرہ میں مفصل بیان کیا گیا ہے ۔ اور شیخ حسین آفندی طرابلسی نے ، جو ابھی ایک کتاب موسوم بہ ‘حمیدیہ’ حکماے زمانۂ حال کے مقابلے میں لکھی ہے ، اس میں بھی اس اصول کو قاعدۂ مسلمۂ اہل اسلام قرار دیا ہے ۔ بلکہ شیخ موصوف نے اپنے ملک کے تعلیم یافتہ نوجوان مسلمانوں کو ، جو معجزات حسیّہ کو علوم جدیدہ کے خلاف سمجھتے ہیں ، یہ ہدایت کی ہے کہ :

”علیہم ان یقنعوا بما تقبله عقولهم ثم ما لم تقبله و یرفضه البرهان العقلی القاطع یرجعون فیه الی التاویل الجامع بین النقل والعقل“ (حمیدیہ ، صفحہ ۳۸) ”یعنی اُن کو چاہیے کہ جس بات کو اُن کی عقل قبول کرے اس پر قناعت کریں اور جس بات کو وہ قبول نہ کرے اور برہان عقلی اس کے منافی ہو ، تو تاویل کی طرف رجوع کریں جس سے عقل اور نقل میں تطبیق ہو جائے ۔“

اگرچہ ابوالحسن اشعری ، جو فرقۂ اشاعرہ کے سرگروہ ہیں ، متشابہات کی تاویل کو جائز نہیں سمجھتے مگر اُن کی یہ ممانعت صرف اُن راسخ الاعتقاد مسلمانوں کے لیے مخصوص معلوم ہوتی ہے جن کے دل ہر قسم کے وساوس اور شبہات سے پاک ہیں ۔ کیوں کہ ضرورت کے وقت ، کیا معتزلی اور کیا اشعری اور کیا اَور اسلامی فرقے ، سب کو ناگزیر متشابہاتِ کتاب و سنت کی تاویل کرنی پڑتی ہے ۔ امام غزالی جو خود بھی اشعری المذہب ہیں ، ”رسالۃالتفرقۃ بین الاسلام والزندقۃ“ میں لکھتے ہیں کہ ”اسلام کا کوئی فرقہ ایسا نہیں جو تاویل کا محتاج نہ ہوا ہو ۔ سب سے زیادہ تاویل سے بچنے والے امام احمد بن حنبل ؒ ہیں ، باوجود اس کے وہ سب سے زیادہ بعید تاویلات کرنے پر مجبور ہوئے ہیں ۔“

اس مقام پر ہم ایک آیت بطور مثال کے اس غرض سے لکھتے ہیں تاکہ معلوم ہو جائے کہ آیات متشابہات کے معنی ابتدا میں کیا سمجھے جاتے تھے اور پھر رفتہ رفتہ علم و حکمت کی ترقی اور زمانے کی ضرورتوں سے اُن کے کیا معنی قرار دیے گئے ۔

آیۃ الکرسی میں جو جملہ ''وسع کرسیہ السمٰوٰت والارض'' آیا ہے ۔ اُس کی تفسیر میں امام رازی نے جو کچھ لکھا ہے ، اس سے پایا جاتا ہے کہ 'کرسی' کو پہلے ایک جسم عظیم (جو آسمان و زمین پر محیط ہے) سمجھا جاتا تھا ۔ بعضے اُسی کو عرش اور بعضے عرش و کرسی دونوں کو جدا جدا جسم سمجھتے تھے ۔ بعضے کرسی کو خدا کے قدم رکھنے کی جگہ کہتے تھے ۔ یہاں تک کہ مسلمانوں میں علوم حکمیہ نے رواج پایا اور علما کو زمانے کی ضرورتوں نے مجبور کیا کہ مہرِ سکوت کو توڑ دیا جائے اور عرش و کرسی وغیرہ الفاظ سے جو معنی اصل مقصود ہیں ، وہ صاف صاف بیان کیے جائیں ۔

چنانچہ امام رازی نے علماے شافعیہ میں سے قفال کا یہ قول آیۃِ مذکور کی تفسیر کے متعلق نقل کیا ہے کہ ''خدا تعالیٰ نے اپنی ذات و صفات کے بیان میں لوگوں سے ایسے الفاظ کے ساتھ خطاب کیا ہے جن کو وہ اُمرا و سلاطین کے لیے استعمال کرتے ہیں ۔ مثلاً اس نے کعبے کو اپنا گھر بتایا ہے جس کے گرد وہ بادشاہوں کے محلوں کی طرح طواف کرتے ہیں ۔ اور اس کی زیارت کا حکم دیا جس طرح وہ بادشاہوں کے دربار میں حاضر ہوتے ہیں ۔ اور حجر اسود کو اپنا دایاں ہاتھ قرار دیا اور اُس پر بوسہ دینے کا حکم کیا جس طرح کہ وہ سلاطین کے ہاتھوں پر بوسہ دیتے ہیں ۔ اسی طرح قیامت کے حساب کتاب کے موقع پر ملائکہ اور انبیاء اور شہدا کا حاضر ہونا بیان فرمایا اور اسی طرح اپنے لیے عرش یعنی تخت قرار دیا اور فرمایا کہ ''الرحمٰن علی العرش استویٰ ۔'' پھر اپنے تخت کی نسبت یہ کہا کہ

''و کان عرشہ علی الماء'' اور پھر فرمایا ''و تری الملئکۃ حافین من حول العرش یسبحون بحمد ربھم'' اور فرمایا ''و یحمل عرش ربک فوقھم یومئذ ثمانیۃ'' اور کہا ''الذین یحملون العرش و من حولہ'' اور اپنے لیے کرسی قرار دی اور فرمایا ''وسع کرسیہ السمٰوٰت والارض ۔''

اس کے بعد امام رازی کہتے ہیں :

''اذا عرفت ھذا فنقول کل ما جاء من الالفاظ الموھمۃ التشبیہ فی العرش والکرسی فقد ورد مثلھا بل اقوی منھا فی الکعبۃ و الطواف و تقبیل الحجر و لما توافقنا ھٰھنا علی ان المقصود تعریف عظمۃ اللہ و کبریائہ مع القطع بانہ منزہ عن ان یکون فی الکعبۃ فکذا الکلام فی العرش و الکرسی ۔''

یعنی ''جب تم قفال کا قول سن چکے تو اب میں کہتا ہوں کہ جتنے الفاظ موہم تشبیہ عرش و کرسی کے متعلق واقع ہوئے ہیں ، ویسے ہی بلکہ اُن سے زیادہ موہم تشبیہ کعبے اور طواف اور بوسۂ حجر اسود کے متعلق آئے ہیں ۔ پس جب ہم نے یہاں اتفاق کر لیا کہ الفاظ سے محض خدا کی عظمت و کبریائی کا تصور دلانا ہے ، اور خدا کی نسبت یقین ہے کہ وہ کعبے میں ہونے سے پاک ہے ، تو ہم کو ایسا ہی عرش و کرسی کی نسبت سمجھنا چاہیے ۔''

لیکن چوں کہ اُس زمانے کی علمی تحقیقات نہایت محدود تھی اس لیے بہت سے شبہات ، جو ہمارے زمانے میں قرآن کی نسبت پیدا ہو سکتے ہیں ، اُس زمانے میں اُن کا خطرہ بھی کسی کے دل میں نہیں گزرتا تھا ، اور اس وجہ سے بہت سی آیات متشابہات جو در حقیقت تاویل طلب تھیں ، اُن کی تاویل کرنے کی ضرورت علماے سلف کو محسوس نہیں ہوئی ۔ مثلاً جب تک یونانی فلسفہ اسلام میں نہیں پھیلا اور الفاظ قرآنی میں شک اور وسوسے نے راہ نہیں پائی ، لوگ اُن آیتوں کے الفاظ کو (جن سے زمین کا مثل فرش کے

بچھا ہوا ہونا مفہوم ہوتا ہے) اُن کے حقیقی معنوں پر محمول کرتے تھے ۔ اور اب تک بھی اُن ملکوں کے بعض علما[۱] جہاں کسی زمانے میں یونانی فلسفے کا رواج نہیں ہوا ، زمین کو مثل فرش کے بچھا ہوا سمجھتے ہیں ۔ مگر جب علم و حکمت کا مسلمانوں میں رواج ہوا اور دلائل قاطعہ سے زمین کی کُرویّت ثابت ہو گئی تو علمائے متکلمین کو تصریح کرنی پڑی کہ قرآن میں جو زمین کی نسبت الفاظ 'فرشنٰہا' اور 'دحاھا' اور ''طحٰہا' اطلاق کیے گئے ہیں وہ اپنے حقیقی معنوں پر محمول نہیں ہیں ۔ لیکن چوں کہ اُس وقت تک زمین کی حرکت کا مسئلہ سائنس کے درجے تک نہیں پہنچا تھا اس لیے قرآن کے بعض الفاظ ، جو بہ ظاہر زمین کے ساکن ہونے پر دلالت کرتے ہیں ، اُن کی کچھ تاویل نہیں کی گئی ۔ یا مثلاً جن آیتوں سے مینہ کا آسمان سے برسنا سمجھا جاتا ہے ، جب تک قرآن کے الفاظ میں کسی نے چون و چرا نہیں کی ، لوگ اُن آیتوں کو اُن کے حقیقی معنوں پر محمول کرتے تھے ۔ مگر جب دلائل سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ مینہ در حقیقت آسمان سے نہیں برستا تو لفظ 'سماء' جو قرآن میں جابجا وارد ہوا ہے ، اُس سے مجازی معنی ، یعنی جانبِ فوق مراد لی گئی ۔ لیکن چوں کہ اُس وقت یہ تحقیق نہیں ہوا تھا کہ آسمان در حقیقت کوئی جسمِ محیطِ عالم مثل

گول گنبد کے ، جیسا کہ بہ ظاہر نظر آتا ہے ، نہیں ہے بلکہ تمام ثوابت اور سیّارے فضائے بسیط میں بکھرے ہوئے ، اور ایک عجیب کرشمۂ قدرت سے ، جس کا نام جاذبیہ یعنی کشش ہے ، اپنی اپنی جگہ قائم ہیں ، اس لیے جو الفاظ کہ آسمان کے موجود یا مجسم ہونے پر بہ ظاہر دلالت کرتے تھے ، اُن کی کچھ تاویل نہیں کی گئی ۔

اسی سبب سے قرآن مجید کی بہت سی آیتیں اور بہت سے الفاظ ایسے باقی رہ گئے جن میں در حقیقت تاویل کی ضرورت تھی مگر چونکہ وہ ضرورت کسی کو محسوس نہیں ہوئی اس لیے اُن کی تاویل کرنے کا کسی کو خیال نہیں آیا ۔ اور سب سے بڑا مانع تاویل متشابہات پر جرأت کرنے کا یہ تھا کہ امام ابوالحسن اشعری ، جو تاویل متشابہات کے باب میں سلف صالح کے پورے مقلد تھے اور اس لیے اُس کو بغیر اشد ضرورت کے جائز نہیں سمجھتے تھے ، اُن کے مذہب نے چوتھی صدی ہجری کے آخر میں ترقی کرنی شروع کی اور چھٹی صدی میں وہ تقریباً تمام ممالک اسلامیہ میں پھیل گیا ۔ اور معتزلہ جنھوں نے ملاحدہ اور دیگر مخالفین اسلام کے مقابلے میں سب سے پہلے تاویل متشابہات کی ضرورت کو محسوس کیا تھا اور اس کو عندالضرورت واجب سمجھتے تھے ، جوں جوں اشاعرہ کے مذہب کو ترقی ہوتی گئی اسی قدر وہ اور اُن کا مذہب اور اُن کے اصول اور اُن کی تصنیفات ناپید ہوتی گئیں ۔ اکثر بادشاہوں نے جبراً اشعری مذہب کو رواج دیا اور معتزلہ کے اصول کا استیصال کیا ، یہاں تک کہ رفتہ رفتہ دنیا سے معدوم ہو گئے ۔ یہی وجہ ہے کہ آج تمام اسلامی دنیا میں زیادہ تر اشاعرہ کی تفسیریں پائی جاتی ہیں جن میں بغیر سخت ضرورت کے متشابہات کی تاویل میں کسی نے دم نہیں مارا ۔ اور جس قدر تاویلات ان تفسیروں میں منقول ہیں اُن کا ماخذ زیادہ تر وہی معتزلہ کی تفاسیر ہیں جو ایک آدھ کے سوا اب بالکل مفقود ہیں ۔ صرف اُن کے اقوال جستہ جستہ

---

[۱] شیخ حسین آفندی نے رسالہ 'حمیدیہ' میں اپنے زمانے کے ایک قشری عالم کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ''دین اسلام میں امریکہ کے وجود پر اعتقاد رکھنا جائز نہیں کیوں کہ اس سے زمین کی کُرویّت کا اعتقاد کرنا لازم آتا ہے جو اسلامی عقیدے کے خلاف ہے ۔'' شیخ اس کی نسبت لکھتے ہیں کہ ''اس نادان نے اپنی جہالت سے مسلمانوں کو اس بات پر مجبور کیا ہے کہ محسوس چیز کا انکار کردیں اور اپنے دین کو لوگوں کی نظر میں مضحکہ بنائیں ۱۲ ۔'' (حالی)

اشاعرہ کی تفسیروں میں پائے جاتے ہیں ۔ چناں چہ قفال[۱] جن کا قول 'کرسی' کی تفسیر میں امام رازی[۲] نے نقل کیا ہے ، وہ بھی معتزلہ میں شمار کیے گئے ہیں ۔

اگرچہ امام ابوالحسن[۳] اشعری سے ، جیسا کہ علامہ شہرستانی[۴] نے 'ملل و نحل' میں لکھا ہے ، ایک قول یہ بھی منقول ہے کہ عندالضرورت تاویل کرنی جائز ہے اور اسی بنا پر اشاعرہ بھی مثل دیگر فرقوں کے جہاں نقل اور عقل میں تعارض واقع ہو ، تاویل کو جائز سمجھتے ہیں ، لیکن جہاں تک دیکھا جاتا ہے وہ متشابہات کی تاویل پر حتی المقدور جرأت نہیں کرتے ۔ شاہ ولی اللہ صاحب[۵] 'حجة اللہ البالغہ' میں لکھتے ہیں :

''من اصول الدین ترک الخوض بالعقل فی المتشابہات من الکتاب والسنة'' اس کے بعد فرماتے ہیں ''و من ذلک (ای من المتشابہات) امور کثیرة لا یدریٰ أ ارید حقیقة الکلام و اقرب مجاز الیہا و ذالک فیما لم یجمع علیہ الامة و لم ترتفع فیہ الشبہة ۔''

---

[۱] قفال : محمد بن علی بن اسماعیل ان کا نام تھا ۔ بڑے مشہور عالم گزرے ہیں ۔ تفسیر ، حدیث ، فقہ اور علوم ادبیہ کے امام تسلیم کیے جاتے ہیں ۔ ۳۶۵ھ میں وفات پائی ۔ (اسماعیل)

[۲] امام رازی : 'تفسیر کبیر' کے مصنف اور تاریخ اسلام میں اعلیٰ پایے کے عالم شمار ہوتے ہیں ۔ بہت سے علوم میں کامل دست گاہ رکھتے تھے ۔ ۵۴۴ھ میں پیدا ہوئے اور ۶۰۶ھ میں وفات پائی ۔ (اسماعیل)

[۳] ابوالحسن اشعری : فرقۂ اشاعرہ کے بانی ، علم کلام کے زبردست عالم اور قریباً ۴۰۰ کتابوں کے مصنف تھے ۔ ۲۶۰ھ میں بصرے میں پیدا ہوئے اور ۳۲۴ھ میں بغداد میں انتقال کیا ۔ (اسماعیل)

[۴] شہرستانی : مسلمانوں میں مشہور متکلم گزرے ہیں ۔ 'الملل والنحل' ان کی کتاب نہایت مشہور ہے ۔ ۴۶۷ھ میں پیدا ہوئے اور ۵۴۸ھ میں وفات پائی ۔ (اسماعیل)

یعنی ''قرآن اور حدیث میں از قبیل متشابہات بہت سے بیانات ہیں جن کی نسبت نہیں معلوم کہ آن کے حقیقی معنی مقصود ہیں یا ایسے مجازی معنی جو حقیقت سے قریب تر ہوں ، اور یہ تردد آن بیانات میں ہے جن کی نسبت اجماع امت سے فیصلہ نہیں ہوا اور اشتباہ رفع نہیں ہوا ۔''

شاہ صاحب کے اس قول سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ آن کے نزدیک قرآن مجید میں بہت سے مقامات ایسے باقی ہیں جن میں حقیقی اور مجازی دونوں معنوں کا احتمال ہے ۔ اور باوجودیکہ صدہا تفسیریں نہایت مبسوط لکھی جا چکی ہیں مگر آج تک کسی مفسر نے اس بات کا فیصلہ نہیں کیا کہ آن مقامات پر ، جو الفاظ حقیقی اور مجازی دونوں معنوں کو متحمل ہیں ، آن سے در حقیقت حقیقی معنی مقصود ہیں یا مجازی ۔

قطع نظر اس محققانہ کلام کے جو شاہ صاحب نے متشابہات کے باب میں لکھا ہے ، 'تفسیر کبیر' اور 'حجةاللہ البالغہ' کے دیگر حوالوں سے ، جو ہم پہلے دے چکے ہیں ، صاف پایا جاتا ہے کہ خدا کا کلام جو کافۂ انام کی ہدایت کے لیے نازل ہوتا ہے ، آس کا طرز بیان ایسا ہونا چاہیے کہ ہر طبقے اور ہر درجے اور ہر زمانے کے لوگ اپنی اپنی سمجھ اور معلومات کے موافق آس سے ہدایت پا سکیں ۔ جب انسان کی معلومات نہایت محدود اور آس کی سمجھ محض ابتدائی حالت میں ہو ، آس وقت بھی آس کی تعلیم سے وہی نتیجہ حاصل ہو جو علم انسانی کے منتہائے ترقی پر پہنچنے کے وقت حاصل ہو ، ورنہ آس کی نسبت یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ وہ کافۂ انام کی ہدایت کے لیے نازل ہوا ہے ۔ اور اس تقدیر پر امکان سے خارج ہے کہ جب تک انسان میں علمی ترقی کرنے کی قابلیت باقی ہے ، کلام الٰہی نئی تفسیروں سے بالکل مستغنی ہو جائے ۔ کیوں کہ جس قدر انسان پر حقایق موجودات زیادہ منکشف ہوتے جائیں گے ، آسی قدر کلام الٰہی کے معنوں سے زیادہ پردے مرتفع ہوں گے ۔

علامہ ابن الحاج اپنی مشہور کتاب 'مدخل' میں لکھتے ہیں :

قال علیہ الصلوۃ والسلام فی القرآن ''لاتنقضی عجائبہ ولا یخلق علی کثرۃ الرد فعجائب القرآن لا تنقضی الی یوم القیٰمۃ فکل قرن لابد لہ ان یاخذ منہ فوائد جمۃ خصہ اللہ تعالٰی بھا و ضمھا الیہ برکۃ ھذہ الامۃ مستمرۃ الی یوم الساعۃ ۔''

یعنی '' آں حضرت صلعم نے قرآن کے باب میں فرمایا ہے کہ ''اس کے عجائب یعنی دقایق و اسرار ، جو اس میں مضمر ہیں ، ختم نہ ہوں گے اور وہ باوجود بار بار دہرانے کے پرانا نہ ہوگا ۔'' پس قرآن کے عجائب قیامت تک ختم ہونے والے نہیں ہیں اور اس لیے ہر زمانے کے لوگوں کو چاہیے کہ اس سے فوائد کثیرہ ، جو ان کے حصے میں آئے ہیں ، حاصل کریں تا کہ اس اُمت کی برکت روز قیامت تک جاری رہے ۔''

اس کے بعد علامہؒ موصوف لکھتے ہیں :

''قال علیہ الصلوۃ والسلام ''مثل امتی کمثل المطر لایدری اولہ خیر ام آخرہ'' یعنی فی البرکۃ والخیر والدعوۃ الی اللہ تعالٰی و تبئین الاحکام ۔''

یعنی ''آں حضرت صلعم نے فرمایا کہ ''میری اُمت کی مثال مینہ کی سی ہے جس کا نہیں معلوم اول بہتر ہے یا آخر'' یعنی برکت اور خیر میں لوگوں کو خدا کی طرف بلانے میں اور احکام الٰہی کے بیان کرنے میں ۔''

دونوں مذکورۂ بالا حدیثوں سے ، جو علامہ ابن الحاج نے نقل کی ہیں ، صاف ظاہر ہے کہ قرآن کے عجائب اور دقایق ہمیشہ وقتاً فوقتاً انسان پر ظاہر ہوتے رہیں گے ۔ اور جس طرح امت کے اول قرنوں میں قرآن کے بہت سے دقایق و اسرار حقیقت پر ظاہر ہوئے ہیں ، اسی طرح اُس کے اخیر قرنوں میں بہت سے دقایق و اسرار دنیا پر

منکشف ہوں گے ۔

امام حجۃ الاسلام غزالیؒ اس باب میں لکھتے ہیں کہ :

''کم من معان دقیقۃ من اسرار القرآن یخطر علی قلب المتجردین للذکر والفکر یخلو عنھا کتب التفاسیر ولا یطلع علیھا افاضل المفسرین ۔''

یعنی ''قرآن کے ایسے بہت سے دقایق و اسرار ، جن سے تفسیر کی کتابیں خالی ہوتی ہیں اور بڑے بڑے مفسروں کو اُن کی خبر نہیں ہوتی ، اُن لوگوں کے دلوں پر کھلتے ہیں جو ہمہ تن قرآن کے ذکر اور فکر میں محو ہو جاتے ہیں ۔''

ابتدائی اعتراض کا جواب :

(قرآن مجید میں مزید تفسیر کی گنجائش باقی نہیں ہے)

اوپر کے بیان سے غالباً اس بات میں کچھ شبہہ نہ رہا ہوگا کہ باوجود بے شمار تفسیروں کے ، جو گزشتہ تیرہ سو برس میں لکھی گئیں ، قرآن کی تفسیر سے ابھی استغنا نہیں ہوا ۔ بہت سے مقامات اس میں اب بھی ایسے موجود ہیں جن کے معنی متعین نہیں ہوئے اور بہت سے عجائب اور دقائق و اسرار ایسے باقی ہیں جو امت پر ہنوز منکشف نہیں ہوئے ۔ اب صرف یہ دیکھنا باقی ہے کہ جن مقامات کی نسبت شاہ صاحب نے لکھا ہے کہ اجماع امت سے یہ فیصلہ نہیں ہوا کہ وہاں الفاظ اپنے حقیقی معنوں میں بولے گئے ہیں یا مجازی معنوں میں ، آیا عندالضرورت اجماع امت کے خلاف اُن مقامات میں خوض کرنا اور ان متشابہ الفاظ کے معنی متعین کرنا مناسب ہے یا نہیں ؟ اور اگر مناسب ہے تو اسلام کو اب ایسی ضرورت در پیش ہے یا نہیں کہ خرق اجماع پر مبادرت کی جائے اور جن متشابہات کی تاویل سے اب تک سکوت کیا گیا ، اُن کے معنی صاف صاف بیان کیے جائیں ۔

ہم دیکھتے ہیں کہ ابتدائے اسلام سے اس قاعدے پر برابر عمل ہوتا چلا آیا ہے کہ ضرورتیں ممنوعات کو مباح و جائز

کر دیتی ہیں ۔

ایک زمانہ تھا کہ صحابہ اور تابعین کسی مسئلے پر رائے اور قیاس سے گفتگو کرنے کو نہایت مکروہ جانتے تھے ۔ چناں چہ ابن مسعودؓ سے کسی نے کوئی مسئلہ پوچھا ۔ چوں کہ اُن کو اُس کے متعلق کوئی حدیث معلوم نہ تھی ، انھوں نے کہا ”میں مکروہ جانتا ہوں اس بات کو کہ تیرے لیے حلال کر دوں ، جس کو خدا نے حرام کیا ہے اور حرام کردوں جس کو خدا نے حلال کیا ہے ۔“

ابن عمرؓ نے جابر بن زید فقیہِ بصرہ سے کہا کہ ”قرآن و حدیث کے بغیر کوئی فتویٰ نہ دینا ۔ اگر تونے ایسا کیا تو خود بھی ہلاک ہوگا اور اَوروں کو بھی ہلاک کرے گا ۔“

ابو سلمہؓ جب بصرے میں آئے تو انھوں نے حسن بصریؓ سے کہا ”میں نے سنا ہے کہ تم اپنی رائے سے فتویٰ دیتے ہو ، سو کبھی بغیر قرآن و حدیث کے فتویٰ نہ دینا ۔“

شعبیؓ سے کسی نے پوچھا کہ ”جب تم لوگوں سے کوئی مسئلہ پوچھا جاتا تھا تو تم کیا کرتے تھے ؟“ انھوں نے کہا ”جب ہمارے مجمع میں کسی سے کوئی سوال پوچھا جاتا تھا تو ایک دوسرے کی طرف اشارہ کرتا تھا کہ اس کے سوال کا جواب دو ، اور دوسرا تیسرے کی طرف ، یہاں تک کہ پھر اول شخص تک سوال کی نوبت پہنچتی تھی ۔“ یعنی جب کسی کو اُس مسئلے کے متعلق کوئی روایت معلوم نہ ہوتی تھی تو جواب دینے سے سکوت کرتے تھے اور قیاس کو بالکل دخل نہ دیتے تھے ۔

مگر آخرکار ضرورتوں نے قیاس کو ایسا ضروری چیز بنا دیا کہ وہ کتاب و سنت کا ہم پلہ اور دلائلِ شرعیہ سے ایک دلیل قرار دیا گیا ۔

ایک زمانہ تھا کہ ’قدر‘ کے مسئلے پر گفتگو کرنا ممنوع سمجھا جاتا تھا کیوں کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس زمانے کی مصلحت کے موافق اس مسئلے میں خوض کرنے سے منع فرمایا تھا اور لوگوں کو ’قدر‘ کے متعلق بحث کرتے ہوئے دیکھ کر نہایت غیظ و غضب میں ارشاد کیا تھا کہ ”أبھذا اُمرتم ام بھذا اُرسلت“ مگر جب ضرورت داعی ہوئی تو علماء کو چار ناچار اُس پر بحث کرنی پڑی ۔

بنی اُمیہ کے عہد میں جب استحکام سلطنت کے لیے سخت خوں ریزیاں ہونے لگیں اور ارکان سلطنت سے لوگوں نے متعجب ہوکر پوچھا کہ کیوں مسلمان قتل کیے جاتے ہیں ؟ تو اُن کو یہ جواب ملا کہ ”القدر خیرہ و شرہ من اللہ تعالیٰ“ آخر کار علماء کو یہ عقدہ حل کرنا پڑا اور اس ’قدر‘ کے معنی بتانے پڑے اور یہ مسئلہ علم کلام کا ایک نہایت اہم اور ضروری مسئلہ قرار دیا گیا ۔

چوتھی صدی ہجری تک اسلام میں تقلیدِ شخصی کا بالکل وجود نہ تھا ۔ عوام کو جب کوئی واقعہ پیش آتا تو جس مذہب کے عالم سے چاہتے تھے مسئلہ پوچھتے تھے ۔ اور خواص کو جب احادیث نبوی یا آثار صحابہ و تابعین میں کوئی بات اطمینان کے قابل نہ ملتی تھی تو جس فقیہ کے قول کو چاہتے تھے ، اختیار کرتے تھے ، خواہ اہل مدینہ سے ہو یا اہل کوفہ سے ۔ مگر اس کے بعد وقتاً فوقتاً ایسے اسباب پیدا ہوتے گئے کہ رفتہ رفتہ تقلید شخصی قرین مصلحت سمجھی گئی ۔ حالاں کہ صحابہ اور تابعین اور تبع تابعین کا اس امر پر ہمیشہ اجماع رہا کہ نہ وہ خود کسی خاص شخص کا ہر ایک بات میں اتباع کرتے تھے اور نہ اَوروں کا ایسا کرنا پسند کرتے تھے ۔ مگر زمانے کی ضرورتوں نے مجبور کیا کہ ہر شخص ائمہ اربعہ[1] میں سے

---

[1] ائمہ اربعہ سے مراد حضرت امام ابو حنیفہ ، امام شافعی ، امام مالک اور امام احمد بن حنبل ہیں جن کی نسبت سے اسلام کے چار فرقے حنفی ، شافعی ، مالکی اور حنبلی کہلاتے ہیں ۔ (اسماعیل)

کسی امام کو تمام احکام میں اپنا مقتدا قرار دے ، ورنہ اسلام میں طرح طرح کے فتنے پیدا ہوں گے اور جس کا جو جی چاہے گا سو کرے گا ۔ چناں چہ آج تک تمام ممالک اسلامیہ میں تقلید شخصی کی پابندی برابر چلی آتی ہے اور کوئی شخص علی الاعلان اس پابندی سے آزاد نہیں ہو سکتا ۔

متشابہات کی تاویل میں ، جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے ، جب تک شک اور وسوسے کا زمانہ نہیں آیا ، کسی نے دم نہیں مارا مگر آخر کار اس زمانے کی ضرورتوں کے موافق علماء کو تاویل پر مبادرت کرنی پڑی ۔ اور یہ بات کچھ قرآن مجید ہی کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ تمام الہامی کتابیں اور صحیفے جو انبیاے بنی اسرائیل پر نازل ہوئے ، چوں کہ اُن میں کثرت سے آیات متشابہات وارد ہوئی تھیں ، اس لیے اگرچہ ایک مدت دراز تک لوگ ان کو حقیقی معنوں پر محمول کرتے رہے ، مگر جس قدر علم انسانی ترقی کرتا گیا اُسی قدر اُن کے مجازی معنی جو اصل مقصود تھے ، منکشف ہوتے گئے ۔ یہودی ، جیسا کہ 'ملل و نحل' شہرستانی سے ظاہر ہوتا ہے ، زمانۂ دراز تک متشابہاتِ توریت کو جن کی چند مثالیں ہم اوپر لکھ چکے ہیں ، عموماً اُن کے حقیقی معنوں پر محمول کرتے تھے مگر آخر کار علماے یہود میں سے وقتاً فوقتاً ایسے لوگ اُٹھنے شروع ہوئے جنھوں نے اس بات کو ظاہر کیا کہ تمام آیات متشابہات مأول ہیں ۔ چناں چہ فرقۂ یوذ عانیہ اور موشکانیہ اور دونوں فرقوں کی بہت سی شاخیں جملہ متشابہات توریت کی تاویل کرتی ہیں اور برخلاف عامہ یہود کے ذات باری کو اوصاف بشری سے منزہ جانتی ہیں ۔

قرآن مجید میں جو آیتیں یا الفاظ اب تک ایسے موجود ہیں جن کی نسبت بقول شاہ ولی اللہ صاحب کے یہ فیصلہ نہیں ہوا کہ اُن کے حقیقی معنی مقصود ہیں یا مجازی ، اگر یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ

جائے کہ اُن کے معنی متعین کرنے کا وقت اب آ پہنچا ہے تو اس کے سوا کچھ چارہ نہیں کہ فوراً یہ پردہ اٹھا دیا جائے اور جو معنی اصولِ عربیت کے موافق ایسے قرار پائیں جن سے کوئی اعتراض ، جو قدیم تفسیروں پر وارد ہوتا ہے ، رفع ہو جائے ، تو بلاتأمل وہی معنی اختیار کیے جائیں ، اگرچہ تیرہ سو برس میں کسی مفسر نے وہ معنی نہ لکھے ہوں ۔

مگر سوال یہ ہے کہ آیا ایسی ضرورت سر دست درپیش ہے جو محظورات کو مباح کر دیتی ہے ؟ سوال کا جواب یہ ہے کہ :

جو لوگ زمانے کے حال سے بے خبر ہیں اور جن کے کان میں کوئی مخالفت کی آواز نہیں پہنچی ، اُن کے نزدیک تو اس کے سوا کسی چیز کی بھی ضرورت نہیں کہ جو شخص جمہور کے خلاف ایک حرف زبان سے نکالے ، اُس کو فوراً دائرۂ اسلام سے خارج کر دیا جائے ۔ اُن کے حال پر تو یہ شعر صادق آتا ہے :

آفات بحر سے ہیں ناواقف آشنا سب
ہنستے ہیں ناخدا پر ، روتا ہے ناخدا جب

مگر وہ لوگ جو اپنی آنکھ سے دیکھ رہے ہیں کہ مغربی تعلیم جس قدر دنیا میں زیادہ پھیلتی جاتی ہے اسی قدر مذہبی عقاید اور مذہبی خیالات لوگوں کے دلوں سے کافور ہوتے جاتے ہیں ، تو اُن کو وہ ضرورت روز روشن کی طرح نظر آتی ہے ۔ وہ خوب جانتے ہیں کہ جس ضرورت نے حکماے اسلام ، یعنی قدیم متکلمین کو سلف صالح کے برخلاف تاویلِ متشابہات پر مجبور کیا تھا ، وہ ضرورت ہمارے زمانے میں حدِ غایت کو پہنچ گئی ہے ۔ اُس زمانے میں حکمت اور فلسفہ خاص کر علما و مصنفین کے گروہ میں محدود تھا ، جو معقولات کو زیادہ تر منقولات کی تقویت اور دین کی حمایت کے لیے حاصل کرتے تھے ، مگر اس زمانے میں مغربی تعلیم ضروریاتِ زندگی میں داخل ہو گئی

ہے ۔ ہر شخص ، عام اس سے کہ نوکری پیشہ ہو ، تاجر ہو یا اہلِ حرفہ ہو ، مجبور ہے کہ اولاد کو مغربی تعلیم دلوائے ، اور اس لیے مغربی علوم کی تعلیم مذہب کے حق میں بہ نسبت یونانی علوم کے زیادہ خطرناک ہوگئی ہے ۔ اس کے سوا اُس زمانے کے علوم زیادہ تر محض قیاسات پر مبنی تھے اور اس لیے جو شبہات اُن سے مذہب کی نسبت پیدا ہوتے تھے ، اُن کے دفعیے کے لیے اکثر حالتوں میں صرف 'لا نسلّم' کہہ دینا کافی تھا ۔ مگر اس زمانے میں علم کی بنیاد تجربے اور مشاہدے اور استقراء پر رکھی گئی ہے اور اس لیے جو شکوک اب مذہب کی نسبت پیدا ہو سکتے ہیں وہ صرف 'لانسلّم' کہہ دینے سے رفع نہیں ہو سکتے ۔

غرض کہ گزشتہ اور موجودہ صدی میں علم و حکمت نے بے انتہا ترقی کی ہے ۔ ہزاروں باتیں ، جو پہلے معلوم نہ تھیں ، اب معلوم ہوئی ہیں ۔ بہت سی باتیں ، جو پہلے صحیح مانی جاتی تھیں ، اب غلط ثابت ہوئی ہیں ۔ بہت سی باتیں جو پہلے ممکن الوقوع مانی جاتی تھیں ، اب غیر ممکن الوقوع مانی جاتی ہیں ۔ یہاں تک کہ علوم قدیمہ اور علوم جدیدہ میں زمین آسمان کا فرق ہو گیا ہے ۔

اگرچہ ممکن ہے کہ آیندہ کوئی ایسا زمانہ آئے کہ زمانۂ حال کے اکثر مسلّمات غلط ثابت ہو جائیں لیکن چوں کہ حال کی تحقیقات کا مدار صرف قیاسی اور ظنی باتوں پر نہیں بلکہ زیادہ تر تجربے اور مشاہدے پر ہے ، اس لیے بہت ہی کم احتمال اس بات کا ہے کہ جو علوم اور مسائل سائنس کے درجے کو پہنچ گئے ہیں اُن میں آیندہ کسی قسم کی تبدیلی واقع ہو ۔ پس جو باتیں قرآن میں بظاہر زمانۂ حال کی تحقیقات کے خلاف معلوم ہوتی ہیں ، جب تک کہ اُس تحقیقات کو غلط ثابت نہ کیا جائے ، ضرور ہے کہ یا تو قرآن کو حقایق محققہ کے برخلاف تسلیم کریں اور یا اس کے ایسے معنی بیان

کریں جو زمانۂ حال کی تحقیقات کے برخلاف نہ ہوں ۔ مگر ہم قرآن میں بہت سی ایسی آیات متشابہات پاتے ہیں کہ اگر اُن کو مجازی معنوں پر محمول کیا جائے تو نہ ہم کو اصول عربیت کے خلاف تکلفاتِ لایعنی کرنے پڑتے ہیں اور نہ قرآن کے اسلوب بیان سے تجاوز کرنا لازم آتا ہے ۔ اور باوجود اس کے زمانۂ حال کے شبہات جو اُن آیتوں کی قدیم تفسیر پر وارد ہوتے ہیں ، بالکل رفع ہو جاتے ہیں ۔ اور اس لیے کوئی وجہ نہیں ہے کہ اُن آیتوں کو صرف اس خیال سے کہ جمہور مفسرین نے اُن کو ہمیشہ حقیقی معنوں پر مقصود رکھا ہے ، ہم مجازی معنوں پر محمول نہ کریں ۔

جو لوگ سرسید کی تفسیر کی نسبت کہتے ہیں کہ ''جو معنی قرآن کے انھوں نے لکھے ہیں ، نہ وہ خدا کو سوجھے نہ رسول کو'' سو شاید سرسید کی بعض تاویلات کی نسبت یہ کہنا صحیح ہو مگر ان کی تمام تفسیر کی نسبت ایسا کہنا محض ستم ظریفی ہے ۔

یہ بات تو خدا ہی کو معلوم ہے کہ جو معنی سرسید نے قرآن کے بیان کیے ہیں وہ خدا اور خدا کے رسول کو سوجھے تھے یا نہیں ، مگر اس میں شک نہیں کہ ان معنوں کا اُس زمانے میں ، جب کہ قرآن نازل ہوا ، مخاطبین پر ظاہر کرنا شارعؑ کے مقصود کے بالکل برخلاف تھا ۔

ہم اوپر بحوالہ 'تفسیر کبیر' اور 'حجۃ اللہ البالغہ' کے لکھ چکے ہیں کہ قرآن میں انسان کی سیدھی سادی سمجھ کے موافق (جو علم و حکمت تک پہنچنے سے پہلے اُس کی خلقت میں ودیعت تھی) خطاب کیا گیا ہے اور بہت سے حقایق مجاز و استعارہ و تمثیل کے پیرائے میں بیان کیے گئے ہیں تاکہ جب تک مخاطبین اپنی عقل طبعی سے ترقی کرکے علم و حکمت کے اعلیٰ درجے تک نہ پہنچیں ، اُس وقت تک جو معنی اُن الفاظ سے بہ ظاہر متبادر ہوں ، اُن ہی پر قانع رہیں ، مگر

جوں جوں حقائق اشیا اُن پر منکشف ہوتے جائیں، اُسی قدر اُن الفاظ کے معنیِ مقصود اُن پر کھلتے جائیں۔ پس جو معنی قرآن کے آیندہ ایسے بیان کیے جائیں جو اصول عربیت اور اسلوب قرآن کے خلاف نہ ہوں اور باوجود اس کے اُن کے اختیار کرنے سے کوئی اعتراض، جو قدیم تفسیروں پر وارد ہوتا ہے، بخوبی رفع ہوتا ہو، اُن کی نسبت صرف اس بنا پر کہ نزول قرآن کے وقت اُن کو شارعؑ نے بیان نہیں کیا، یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ معنی خدا کو سوجھے نہ رسول کو۔

قرآن مجید میں بہت سی آیتیں ’جبر‘ پر اور بہت سی ’قدر‘ پر دلالت کرتی ہیں مگر آں حضرت صلعم نے مسئلہ‘ جبر و قدر کی نسبت اس کے سوا کچھ نہیں فرمایا کہ لوگوں کو اس پر بحث کرتے ہوئے دیکھ کر نہایت ناراضی ظاہر کی اور اس پر بحث کرنے سے منع فرمایا۔ باوجود اس کے جب ضرورت داعی ہوئی تو صحابہ ہی کے وقت میں اُس پر بحث شروع ہوگئی۔ چناں چہ عمرو بن عاص اور ابو موسیٰ اشعری میں جو اس مسئلے کے متعلق گفتگو ہوئی، وہ ’ملل و نحل‘ شہرستانی میں مذکور ہے۔ اور پھر مفسرینِ اشاعرہ نے بمقابلہ معتزلہ کے اُن آیات کی تفسیر میں، جو جبر یا قدر پر دلالت کرتی ہیں، اس مسئلے کے متعلق کوئی تیر اپنے ترکش میں باقی نہیں چھوڑا۔ پھر کیا کوئی اشعری یہ کہہ سکتا ہے کہ جو معنی ان آیتوں کے ہمارے علما اور ائمہ نے بیان کیے ہیں، وہ خدا کو سوجھے نہ خدا کے رسول کو۔

یہاں تک جو کچھ ہم نے بیان کیا اس سے صرف اس قدر ثابت کرنا مقصود تھا کہ قرآن مجید میں باوجود بے شمار تفسیروں کے، جو گزشتہ تیرہ سو برس میں لکھی گئیں، اب تک نئی تفسیر کی گنجائش باقی ہے۔ اب ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ:

(١) سرسید نے جن آیتوں کی تفسیر جمہور مفسرین کے خلاف

لکھی ہے، وہ کہاں تک اصول عربیت اور اسلوب قرآن کے موافق ہے؟

(٢) جن اعتراضات کے رفع کرنے کی غرض سے انھوں نے جمہور سے اختلاف کیا ہے، اُن کے رفع کرنے کی فی الواقعہ ضرورت ہے یا نہیں؟

(٣) جو معیار قرآن کے الہامی ہونے کا انھوں نے قرار دیا ہے، اس کے سوا کوئی دوسرا معیار قرار پا سکتا ہے یا نہیں؟ سو ان عنوانوں پر ہم آیندہ اپنے خیالات ظاہر کریں گے[1]۔ وما توفیقی الا باللہ۔

---

[1] ان تینوں عنوانوں پر مولانا حالی نے بعد میں کوئی مستقل مضمون نہیں لکھا۔ البتہ ’حیاتِ جاوید‘ میں جو ١٩٠١ع میں شائع ہوئی، ان موضوعات پر بحث کی ہے۔ (اسماعیل)

۴

مسلمانوں میں مسئلۂ خیرات

یہ بہت ہی پُر اثر ، دل چسپ اور نصیحت آمیز مضمون مولانا حالی نے سنہ ١٣٢٦ھ مطابق سنہ ١٩٠٨ع میں ''انجمن بہبود مسلمانان دہلی'' کو اُس کے سیکرٹری کی فرمائش پر لکھ کر بھیجا تھا ۔ مجھے علم نہیں کہ یہ مضمون کہیں چھپا ہے یا نہیں ؟ میں نے اسے مولانا کے اپنے ہاتھ کے لکھے ہوئے مسودے سے نقل کیا تھا ۔

اس لاجواب مضمون میں مولانا نے یہ بتایا ہے کہ سوال کرنا اور بھیک مانگنا کتنا برا اور مذموم فعل ہے ۔ شروع مضمون میں آن یہ کثرت حدیثوں کا آپ نے عطر نکال کر پیش کیا ہے جو سوال نہ کرنے کے متعلق آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہیں ۔ اور پھر بہت سے واقعات اس قسم کے بیان کیے ہیں کہ آں حضرتؐ نے کس کس طرح لوگوں کو سوال کرنے سے روکا اور اُن کو محنت مشقت سے کام کرنے کی ترغیب دی ۔ آخر میں مسلمانوں کو نصیحت کی ہے کہ وہ کسی غیرمستحق کو ہرگز خیرات نہ دیں ۔ بالخصوص عورتوں کو یہ تاکید کی ہے کہ ہٹے کٹے بھیک مانگنے والوں کو کچھ دینا بجائے نیکی اور بھلائی کرنے کے اُلٹا گناہ کا مرتکب ہونا ہے ۔ (اسماعیل)

بھیک مانگنے کی جس قدر مذمت اسلام میں کی گئی ہے ، شاید ہی کسی مذہب میں اس کی اس قدر برائی کی گئی ہوگی ۔ کچھ کم ڈیڑھ سو روایتیں سوال کی مذمت میں حدیث کی مختلف کتابوں سے 'کنز العمال' میں نقل کی گئی ہیں ۔

سوال کے انسداد کو رسول خدا صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم اس قدر مہتم بالشان تصور فرماتے تھے کہ جس طرح آپ توحید اور نمازِ پنج گانہ کی تعلیم کو ضروری سمجھتے تھے ، اسی طرح لوگوں کو سوال سے باز رکھنے میں ہمتِ عالی مصروف رکھتے تھے ۔ چناں چہ عبدالرحمٰن بن عوف بن مالک اشجعی سے روایت ہے کہ ہم نو یا آٹھ یا سات آدمی آں حضرت صلعم کی خدمت میں حاضر تھے کہ آپ نے ہم سے فرمایا ''کیا تم خدا کے رسول سے بیعت نہیں کرتے ؟'' ہم نے فوراً ہاتھ بڑھایا ، مگر چوں کہ ہم چند ہی روز پہلے بیعت کر چکے تھے ، ہم نے عرض کیا ''یا رسول اللہ! ہم تو ابھی بیعت کر چکے ہیں ، آپ ہم سے کس بات پر بیعت لیتے ہیں ؟'' آپ نے فرمایا ''اس بات پر کہ خدا کی عبادت کرو ، اُس کے ساتھ کسی کو شریک مت کرو اور احکام الٰہی بجا لاؤ'' اور پھر آہستہ ارشاد فرمایا ''ولا تسآءلوا الناس شیئاً'' (یعنی لوگوں سے کچھ نہ مانگو) اس روایت کے بعد عبد الرحمٰن کہتے ہیں کہ میں نے اس کے بعد اُن لوگوں میں سے (جنھوں نے بیعت کی تھی) بعض کو دیکھا کہ اگر کسی کے ہاتھ سے سواری کی حالت میں کوڑا بھی گر جاتا تھا تو وہ اس خیال سے کہ کہیں یہ بھی سوال میں داخل نہ ہو ، کسی راہ چلتے سے اپنا کوڑا نہ مانگتا تھا ۔''

سوال نہ کرنے کی اس قدر تاکید صرف اسی واسطے کی ہے کہ گداگری پیشہ نہ ہو جائے اور آسے آج کل کی طرح ذریعۂ معاش نہ بنا لیا جائے ۔ کیوں کہ دوسری حدیثوں سے یہ بھی ثابت ہے کہ

’’ایک دوسرے کی مدد کرو‘‘ اور ’’اپنے کاموں میں دوسرے بھائیوں سے مشورہ لو‘‘ اور جیسے زکوٰۃ اور خیرات وغیرہ لینے کی حدیثیں ہیں ، جیسے اُس وقت بعض رقوم کو قوم سے وصول کرکے اسلام کی ضروری خدمات کے صرف کے واسطے بیت المال میں جمع رکھا جاتا تھا ، اسی طرح اگر اب بھی قوم کی اہم ضروریات کے واسطے روپیہ فراہم کیا جائے تو یہ گداگری نہیں ہے اور نہ یہ ’’تساءلوا الناس شیئاً‘‘ میں آسکتا ہے ۔ ورنہ اگر ’’کچھ نہ مانگو‘‘ کے مطلق معنی مراد لیے جائیں تو دنیا کا سارا معاملہ درہم برہم ہو جاتا ہے ۔

اس حدیث سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ بیعت مذکور کا اصل مقصد خاص کر سوال کرنے کی برائی اُن کے ذہن نشین کرنی تھی ۔ جن باتوں کی تصریح پہلی بیعت میں فرما چکے تھے اُن کی تکرار اس موقع پر بطور یاد دہانی کے تھی ، نہ کہ اصل مقصود ۔ نیز بیعت کرنے والوں کا بعد بیعت کے سوال سے اس قدر بچنا بھی اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ بیعت کا اصل مقصد صرف سوال کرنے کی ممانعت تھی اور بس ۔

بے شمار روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آں حضرت صلعم سائل سے نہایت نفرت کرتے اور جو شخص بغیر اضطراری حالت کے سوال کے ذریعے سے کچھ وصول کرتا تھا اُس کو اُس کے حق میں حرام سمجھتے تھے ۔ جو شخص ایک وقت کی بھی خوراک موجود ہونے پر سوال کرے اُس کی نسبت فرماتے کہ ’’وہ اپنے لیے کثرت سے آتشِ دوزخ طلب کرتا ہے‘‘ ۔

آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بار بار فرمایا ہے کہ :

’’تم میں سے جو شخص اپنی رسی لے کر پہاڑ پر جائے اور وہاں سے لکڑیوں کا گٹھا باندھ کر اپنی پشت پر لائے اور اس کو فروخت کرے تا کہ خدا تعالیٰ اس کی حاجت رفع کر دے ، یہ اس

کے حق میں بہت بہتر ہے بہ نسبت اس کے کہ وہ لوگوں سے بھیک مانگے ، پھر وہ اُس کو کچھ دیں یا دھتکار دیں ۔‘‘

عائذ ابن عمر سے روایت ہے کہ آپؐ نے فرمایا ’’اگر تم لوگ جانو کہ سوال کرنے کے کیا نتائج ہیں ، تو کوئی شخص سوال کرنے کے لیے دوسرے شخص کی طرف رخ نہ کرے ۔‘‘

اگر کوئی فلاسفر یا اکانومسٹ (ماہر اقتصادیات) اس مطلب کو بیان کرتا تو زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتا تھا کہ :

’’جس قدر قوم میں بھیک مانگنے والوں کی کثرت زیادہ ہو جاتی ہے اسی قدر قوم کی دولت میں ، محنت و جفاکشی میں ، غیرت و حمیت میں ، ہمت و اولوالعزمی میں گھاٹا ہوتا جاتا ہے ۔ مفلسوں کو کاہلی اور بے غیرتی کی ترغیب ہوتی ہے اور دولت مندوں کا بہت سا روپیہ ایسی جماعت کی تعداد بڑھانے اور تقویت دینے میں صرف ہوتا ہے جن کا وجود سوسائٹی کے حق میں سمِ قاتل کا حکم رکھتا ہے ۔‘‘

مگر جو جامعیت مذکورۂ بالا حدیثِ نبوی میں پائی جاتی ہے ، وہ اُس فلاسفر یا اکانومسٹ کے اس لمبے چوڑے بیان میں ہرگز نہیں پائی جاتی ۔

حدیث کے الفاظ جس طرح مذکورۂ بالا سوشل (معاشرتی) اور مورل (اخلاق) خرابیوں کو شامل ہیں ، اسی طرح اُن تمام روحانی آفتوں اور بیماریوں پر حاوی ہیں جو سوال کی مذموم عادت سے سائل کو عارض ہوتی ہیں ۔

سائل خدا کو صرف بھیک مانگنے کا ایک اوزار جانتا ہے جس کی نسبت آں حضرت صلعم نے فرمایا ہے کہ ’’ملعون من سأل لوجہ اللہ ۔‘‘

اُس کے دل میں نبی کی عظمت اس سے زیادہ نہیں ہوتی کہ جب

خدا کے ساتھ رسولوں کا بھی واسطہ دیا جاتا ہے تو ایک مسلمان آدمی کو خواہ مخواہ کچھ نہ کچھ دینا ہی پڑتا ہے ۔

وہ قیامت کے معنی شاید اس کے سوا کچھ نہیں سمجھتا کہ خیرات دینے والے کو وہاں ایک کے عوض ستر ستر ملیں گے ۔

سائل اپنے اندوختے کو ، جو بھیک کے ذریعے سے اُس نے پیدا کیا ہے ، چھپاتا ہے اور باوجود استطاعت کے اپنی ناداری کا اظہار کرتا ہے اور اس طرح کفران نعمت ، دروغ گوئی اور مکاری کے سخت ترین گناہوں کو اپنی کامیابی کا ذریعہ گردانتا ہے ۔

بس جن جامع الفاظ میں رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے بھیک مانگنے کی مذمت فرمائی ہے ، اس سے زیادہ جامع الفاظ سمجھ میں نہیں آ سکتے ۔ یہاں ایک بات قابل غور ہے ، یعنی یہ کہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم نے سوال کرنے پر تو اس قدر لے دے کی ہے کہ بے شمار مرفوع حدیثیں سوال کی مذمت کے متعلق کتبِ احادیث میں موجود ہیں ، مگر غیر مستحق سائلوں کا سوال پورا کرنے والوں کی مدح یا ذم کہیں صراحت کے ساتھ نہیں فرمائی ۔ اس کی وجہ ادنٰی تامل سے معلوم ہو سکتی ہے ۔

آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیماتِ مقدسہ (جیسا کہ محققین نے بیان کیا ہے) دو قسم کی تھیں :

(١) ایک وہ تعلیم تھی جس کی نسبت آپ کو حکم تھا :

''بلّغ ما انزل الیک من ربک و ان لم تفعل فما بلغت رسالۃ ۔''

یعنی ''اے رسول! پہنچادے لوگوں کو وہ احکام جو خدا کی طرف سے تجھ پر نازل ہوئے ہیں ۔ اور اگر تو نے اُن کو نہ پہنچایا تو خدا کے پیغام کی کچھ تبلیغ نہ کی ۔''

یہ تعلیم تو ایسی لازمی اور لابدی تھی کہ کسی حالت یا کسی مصلحت کے مقتضا سے اس میں سکوت یا کوتاہی نہیں

ہو سکتی تھی ۔

(٢) دوسری تعلیم وہ تھی جو دنیوی مصالح سے علاقہ رکھتی تھی اور جس کی نسبت آپ نے ارشاد فرمایا تھا کہ ''انتم اعلم بامور دنیا کم'' (یعنی تم اپنے دنیوی معاملات کو مجھ سے زیادہ جانتے ہو) ۔

اس تعلیم میں ملکی اور قومی مصلحتوں کے لحاظ سے ممکن تھا کہ سکوت یا تاخیر کی جائے ، یا بجائے تصریح کے کنایۃ" بیان کی جائے ۔

چوں کہ غیرمستحق سائلوں کا سوال پورا کرنا زیادہ تر سوشل (معاشرتی) خرابیوں کا موجب تھا اور سوال پورا کرنے والوں کی مدح یا ذم تبلیغ رسالت سے کچھ علاقہ نہ رکھتی تھی ، اس لیے رسول خدا صلعم نے جس صراحت کے ساتھ سوال کی مذمت فرمائی ، ویسی صراحت کے ساتھ غیر مستحق سائلوں کا سوال پورا کرنے والوں کی مذمت نہیں فرمائی ۔

علاوہ ازیں اُس وقت عرب کے عام خیالات کے لحاظ سے سائل کا سوال رد کرنا (خواہ وہ مستحق ہو یا غیر مستحق) غایت درجے کی دنائت سمجھی جاتی تھی ، اور یہ بات نبوت کی شان سے بعید تھی کہ جو امر قوم میں اس قدر حقارت کی نظر سے دیکھا جاتا ہو (اور اس کے متعلق کچھ کہنا یا نہ کہنا تبلیغِ رسالت سے کچھ علاقہ نہ رکھتا ہو) قوم کو علی الاعلان اُس کی ترغیب دی جائے ۔

بہ ایں ہمہ اگرچہ آپ نے علی الاعلان غیرمستحق سائلوں کا سوال رد کرنے کی تاکید نہیں فرمائی لیکن خود سوال کرنے کی اس قدر مذمت کرنے سے صاف پایا جاتا ہے کہ آپؐ ملک میں سائلوں کی تعداد بڑھنے کو نہایت مکروہ جانتے تھے اور ظاہر ہے کہ کوئی چیز سائلوں کی تعداد بڑھانے والی ایسی نہیں ہے جیسے ہر مستحق و غیرمستحق سائل کا سوال پورا کرنا ۔

اس کے سوا متعدد روایتوں کے فحوائے کلام سے پایا جاتا ہے

کہ آپ غیرمستحق سائلوں کا سوال پورا کرنے سے خوش نہ ہوتے تھے ۔ چناں چہ ابو سعید سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا ''قسم ہے خدا کی جو (غیرمستحق) سائل میرے پاس سے اپنا مطلب حاصل کر کے لے جاتا ہے ، وہ مطلب نہیں ہے اس کے حق میں مگر ایک آگ ۔'' یہ سن کر حضرت عمرؓ نے عرض کیا ''آپ کیوں اُس کا مطلب پورا کرتے ہیں ؟'' آپ نے فرمایا ''کیا کیا جائے ، لوگ تو مانتے نہیں اور خدا تعالیٰ ردِ سوال کو مجھ سے پسند نہیں کرتا ۔''

اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ کسی کا سوال رد نہ کرنے کو آپ اپنی خصوصیات میں شمار کرتے تھے اور قرآن مجید کی متعدد آیتیں بھی جیسے ''و امّا السائل فلا تنہر'' اور ''انک لعلٰی خلق عظیم'' اور ''فبما رحمۃ من اللہ لنت لھم و لو کنت فظاً غلیظ القلب لا نفضوا من حولک'' اس خصوصیت پر دلالت کرتی ہیں ۔ پس عامۂ امت کو اس خاص معاملے میں آپ کا اتباع کرنا گویا اپنے تئیں آں حضرتؐ کی خصوصیات میں شریک گرداننا ہے ۔

لیکن اس باب میں سب سے عمدہ 'مشکوٰۃ' کی وہ حدیث ہے جس میں آں حضرت صلعم نے سائل کے ساتھ برتاؤ کرنے کا طریقہ تعلیم فرمایا ہے ۔ یعنی انصار میں سے ایک شخص آپ کی خدمت میں کچھ مانگنے کے لیے حاضر ہوا ۔ آپ نے پوچھا ''کیا تیرے گھر میں کچھ بھی نہیں ؟'' اُس نے عرض کیا ''کیوں نہیں ، ایک موٹی سی کمبلی ہے ، اُسے کچھ اوڑھتا ہوں ، کچھ بچھاتا ہوں اور ایک پیالہ ہے جس میں پانی پیتا ہوں'' ۔ آپ نے فرمایا ''دونوں کو میرے پاس لے آ ۔'' وہ دونوں چیزیں لے کر حاضر ہوا ۔ آپ نے اُن کو ہاتھ میں لے کر لوگوں سے فرمایا ''ان کو کوئی خریدتا ہے ؟'' ایک شخص بولا ''میں ایک درہم کو خریدتا ہوں'' ۔ پھر آپ نے دو یا تین بار فرمایا ''کوئی ایک درہم سے زیادہ دے سکتا ہے ؟'' ایک شخص نے کہا ''میں دو درہم دیتا ہوں'' آپ نے کمبلی اور پیالہ اُسے دے کر دو درہم لے لیے اور اُس انصاری سے فرمایا کہ ایک درہم کا تو کھانا لے جا کر اپنے گھر میں پہنچا اور دوسرے درہم کی کلھاڑی خرید کر میرے پاس لا ۔ وہ کلھاڑی خرید لایا ۔ آپ نے اپنے دست مبارک سے ایک لکڑی کا دستہ اس میں ٹھونک دیا اور فرمایا ''جا لکڑیاں کاٹ اور بیچ ۔ اب میں تجھ کو پندرہ دن تک نہ دیکھوں'' ۔ وہ شخص چلا گیا اور لکڑیاں کاٹ کاٹ کر بیچنے لگا ۔ پندرہ دن کے بعد جب آں حضرت کی خدمت میں دوبارہ حاضر ہوا تو اُس کے پاس دس درہم جمع ہو گئے تھے ۔ اُس نے اُن میں سے کچھ کا تو کپڑا خریدا اور کچھ سے کھانے کا سامان مول لیا ۔ آپ نے فرمایا ''یہ تیرے لیے اس سے بہتر ہے کہ جب تو قیامت کے دن آئے تو تیرے چہرے پر بھیک مانگنے کا داغ ہو ۔ دیکھ ، سوال کرنا صرف اُس شخص کو حلال ہے جو سخت محتاج ہو یا جس کے ذمے بھاری تاوان ہو یا جس کی گردن پر خوں بہا ہو ۔''

اس حدیث سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جہاں تک ممکن ہو ، سائل کو سوال کرنے سے روکا جائے اور سوال کرنے کی برائی اور محنت و مشقت کرنے کی خوبی اس کے ذہن نشین کی جائے ۔ مگر اس زمانے کے سائلوں کی بے غیرتی اور ڈھٹائی اتنی حد سے گزر گئی ہے کہ کسی کی فہمائش یا ممانعت کا اُن پر کوئی اثر نہیں ہو سکتا ۔ اور نیز عام آدمیوں کی فہمایش میں وہ تاثیر پیدا ہونی محالات سے ہے جو رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی دل سوزی اور شفقت بھری نصیحتوں میں ہوتی تھی ، لہٰذا اس وقت اس طریقے پر عمل نہیں ہو سکتا ۔

نظر بہ حالاتِ موجودہ ہم کو اس کے سوا کچھ چارہ نہیں کہ غیرمستحق سائلوں کی داد و دہش سے یک قلم ہاتھ روک لیا جائے اور

جہاں تک ہو سکے مستحقین کی امداد کی جائے جو باوجود استحقاق کے کسی سے سوال نہیں کرتے ۔ یا جو سخت مجبوری اور ناداری کی حالت میں سوال کرتے ہیں ۔ غیرمستحق سائلوں کے ساتھ کوئی سلوک اور کوئی بھلائی اس سے بڑھ کر نہیں ہو سکتی کہ اُن کو اس بے غیرتی اور بے شرمی کے پیشے سے باز رکھا جائے ۔

ملک و قوم کے حق میں کوئی احسان اس وقت اس سے زیادہ نہیں ہو سکتا کہ بھیک مانگنے کا بد ترین پیشہ ، جو مرض متعدی کی طرح افراد قوم میں سرایت کرتا جاتا ہے اور جس سے روز بروز بھیک منگوں کی تعداد ملک میں زیادہ ہوتی جاتی ہے ، رفتہ رفتہ اس کی بیخ کنی کی جائے ۔

تاریخ بتاتی ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد مدت دراز تک ممالک اسلامیہ میں سوال کرنا نہایت مذموم سمجھا جاتا تھا اور طرح طرح سے اس کا انسداد کیا جاتا تھا ۔

روایت ہے کہ حضرت عمرؓ نے ایک سائل کی آواز سنی اور یہ سمجھ کر کہ بھوکا ہے ، اس کو کھانا کھلانے کا حکم دیا ۔ تھوڑی دیر میں اُس کی آواز پھر سنائی دی ۔ معلوم ہوا کہ یہ وہی سائل ہے اور کھانا کھانے کے بعد اب پھر مانگتا ہے ۔ آپ نے اس کو بلوایا اور دیکھا کہ اُس کی جھولی روٹیوں سے بھری ہوئی ہے ۔ آپ نے جھولی کا ایک سرا پکڑ کر اس کو اونٹوں کے آگے جھاڑ دیا اور فرمایا ’’تو سائل نہیں ہے ، تاجر ہے ۔‘‘

علامہؒ مقری تاریخ اندلس میں لکھتے ہیں کہ ’’اندلس میں جس سائل کو تندرست اور کام کے لائق دیکھتے ہیں ، اس کو نہایت ذلیل کرتے اور سخت و سست کہتے ہیں ۔ اور اسی کا نتیجہ ہے کہ یہاں اپاہج اور معذور آدمی کے سوا کوئی سائل نظر نہیں آتا ۔‘‘

مگر افسوس اور نہایت ہی افسوس ہے کہ اس زمانے میں ہر

ایک جگہ جس قدر مسلمان بھیک مانگتے نظر آتے ہیں ، اُس قدر اور کسی قوم کے آدمی نظر نہیں آتے ۔

پس سب سے پہلے مسلمانوں کا فرض ہے کہ اپنے اپنے حدود اور اختیارات میں جہاں تک اُن کی دسترس ہو ، اس نالائق اور کمینہ رسم کا انسداد کریں ۔

خاص کر ہمارے علماء اور واعظین کو لازم ہے کہ نہایت آزادی اور بے باکی کے ساتھ وعظ کی مجلسوں میں سوال کی مذمت ، جو حدیثوں میں وارد ہوئی ہے ، اور جو مضر نتیجے سائلوں کی کثرت سے قوم کے حق میں پیدا ہوتے ہیں ، اور اسراف اور فضول خرچی کی برائی جو قرآن مجید میں جا بجا بیان ہوئی ہے ، عام مسلمانوں کے ذہن نشین کریں ۔

خاص کر زنانی مجلسوں میں عورتوں کو ، جو ہر فقیر کو مستجاب الدعوات اور اُس کی آواز کو غیب کی آواز سمجھتی ہیں ، ان لوگوں کے مکر و فریب سے آگاہ کرنا چاہیے ۔ اُن کے دلوں میں بٹھا دیا جائے کہ ہٹے کٹے بھیک مانگنے والوں کو کچھ دینا بجائے نیکی اور بھلائی کرنے کے اُلٹا گناہ کا مرتکب ہونا ہے ۔ کیوں کہ جس قدر ایسے لوگوں کو دیا جاتا ہے اسی قدر مستحق بیواؤں ، یتیموں اور ہمسایوں کی حق تلفی ہوتی ہے ، اُسی قدر بھیک مانگنے کا ناپسندیدہ طریقہ زیادہ رواج پاتا ہے اور اُسی قدر قوم میں کام کے آدمیوں کی کمی ہوتی ہے ۔

۲۔ اصلاحی مضامین

۱

زمانے کے موافق اپنا حال بناؤ

('تہذیب الاخلاق' جلد ۶ ، نمبر ۱۵ بابت یکم ذی‌الحجہ ۱۲۹۲ھ
صفحہ ۲۰۶ تا ۲۱۲)

اس مضمون کا عنوان مولانا حالی نے صرف 'زمانہ' رکھا تھا۔ اس میں بڑی خوبی اور ہم دردی کے ساتھ مولانا نے مسلمانوں کو اس بات کی تلقین کی ہے کہ تقلید اور پرانی وضع داری کو چھوڑ کر اپنی حالت کو موجودہ زمانے کے موافق بناؤ ، جب ہی تم ترقی اور عروج اور عزت اور شہرت حاصل کر سکتے ہو ، اور جب ہی دوسری ترقی کرنے والی قوموں کے بالمقابل اپنی ہستی کو قائم رکھ سکتے ہو۔ اس کے لیے مولانا نے بہت سی تاریخی مثالیں دے کر اس بات کو ثابت کیا ہے کہ انھی افراد نے دنیا میں نام وری اور شہرت حاصل کی جنھوں نے زمانے کا ساتھ دیا اور ''در مع الدھر کیف دار'' کے زریں مقولے پر عمل کیا۔ لیکن بقول مولانا زمانے کے ساتھ ساتھ چلنے کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ ''مثلاً بے دینی اور الحاد کے زمانے میں دین اور مذہب سے ہاتھ اٹھا بیٹھیں اور عیش و عشرت کے زمانے میں جفا کشی اور محنت سے دست بردار ہو جائیں یا جہاں خوشامد کا بازار گرم ہو وہاں خوشامدی بن جائیں اور جہاں مسخرہ پن کا زور ہو وہاں غیرت اور حمیت کو

> بالائے طاق رکھ دیں ۔“
>
> مولانا کا مطلب زمانے کا ساتھ دینے سے یہ ہے کہ اخلاق ، تعلیم ، تہذیب ، شائستگی اور عام معاشرت میں جو باتیں ہم دوسری قوموں میں اچھی پائیں اُن کو اختیار کر لیں اور جو خرابیاں ، نقائص اور برائیاں دیکھیں اُن سے اجتناب کریں ۔ یعنی ”خذ ما صفا دع ما کدر“ پر عمل کریں اور تعلیم ، تہذیب اور ترقی کی دوڑ میں کسی سے پیچھے نہ رہیں ۔ لیکن جو لوگ اپنے باپ دادا کے پرانے مسلک کے پابند رہنا چاہتے ہیں اور قدیم رسم و رواج کے دل دادہ ہیں اور اُن ہی فرسودہ خیالات کو معیار شرافت و تہذیب سمجھتے ہیں اور زمانۂ حال کی کسی اچھی بات کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ، وہ روز بروز فلاکت ، نکبت اور ہلاکت کے گڑھے میں گرتے چلے جائیں گے اور کوئی نہیں جو اُنھیں بچا سکے ۔ (اسماعیل پانی پتی)

زمانے کی نیرنگیاں مشہور اور اس کی تلون مزاجیاں ضرب المثل ہیں ۔ وہ سدا ایک حال پر نہیں رہتا ، وہ ہمیشہ ایک چال پر نہیں چلتا ۔ وہ گرگٹ کی طرح برابر رنگ بدلتا رہتا ہے ۔ وہ اُس پتھر کی طرح ، جو پہاڑ کی چوٹی سے لڑھکایا جائے ، ہزاروں پلٹے کھاتا چلا جاتا ہے ۔ وہ جو روپ بھرتا ہے اس کے چہرے پر کھل جاتا ہے ۔ وہ جو ٹھاٹھ بدلتا ہے اُس کا رنگ ساری مجلس پر چھا جاتا ہے ۔ وہ کبھی دن کی روشنی میں اور کبھی رات کی تاریکی میں ، کبھی گرمی کی تپش میں اور کبھی جاڑے کی ٹھر میں ظہور کرتا ہے ، پر کسی بھیس میں اُس کا رنگ جمے بغیر نہیں رہتا ۔ جب وہ دن کا بانا بدلتا ہے تو رات کے سارے عمل باطل کر دیتا ہے ۔ سوتوں کو نیند سے جگاتا ہے ، نکموں کو کام پر لگاتا ہے ، طبیعتوں سے سستی کو دور کرتا ہے اور دلوں کو اُمنگوں سے بھر دیتا ہے ۔ جب وہ رات کا برقع اوڑھتا ہے تو دن کی ساری کائنات حرفِ غلط کی طرح مٹا دیتا ہے ۔ مزدوروں کا دل محنت سے اُچاٹ کرتا ہے ، جفاکشوں کو بستر راحت کی طرف کھینچ کر لاتا ہے اور ساری دنیا پر غفلت کا پردہ ڈال دیتا ہے ۔ گرمی میں اس کی بازی کا نقشہ کچھ اور ہے اور جاڑے میں اُس کی حکومت کا ڈھنگ کچھ اور ۔

مبارک ہیں وہ جنھوں نے اس کے تیور پہچانے اور اُس کی چال ڈھال کو نگاہ میں رکھا ۔ جدھر کو وہ چلا اس کے ساتھ ہو لیے اور جدھر سے اُس نے رخ پھیرا اُس کے ساتھ پھر گئے ۔ گرمی میں گرمی کا سامان کیا اور جاڑے میں جاڑے کی تیاری کی ۔ دن کو دن کی طرح بسر کیا اور رات کو رات کی طرح کاٹا ۔ اور بدنصیب ہیں وہ جنھوں نے اس کی پیروی سے جی چرایا اور اُس کی ہمراہی سے ناک چڑھائی ۔ گرمی پڑنے پر اُنھوں نے جاڑے کے کپڑے نہ اُتارے اور ہلکے پھلکے نہ بنے ۔ دن نکلا ، پر اُنھوں نے کروٹ نہ بدلی اور خواب شبینہ سے بیدار نہ ہوئے ۔ اور اب وہ بہت جلد دیکھیں گے کہ پیچھے کون رہا اور منزل تک کون پہنچا ؟

جو لوگ زمانے کی پیروی نہیں کرتے ، وہ گویا زمانے کو اپنا پیرو بنانا چاہتے ہیں ، مگر یہ اُن کی سخت خام خیالی ہے ۔ چند مچھلیاں دریا کے بہاؤ کو نہیں روک سکتیں اور چند جھاڑیاں ہوا کا رخ نہیں پھیر سکتیں ۔ اسی لیے ایک پختہ کار شاعر نے کہا ہے : ع

زمانہ با تو نسازد تو با زمانہ بساز

اور عرب کے ایک حکیم کا قول ہے کہ ”در مع الدھر کیف دار“ ۔

(یعنی جدھر کو زمانہ پھرے اُس کے ساتھ پھر جاؤ) شیخ اکبر[1] فرماتے ہیں کہ ''صر ھیولٰی لکل صورۃ'' (یعنی اپنی ذات میں ایسی قابلیت پیدا کرو کہ جس رنگ کو چاہے فوراً قبول کر لے) یہ اس لیے فرمایا کہ زمانہ کبھی انقلاب سے خالی نہیں رہتا اور اُس کا مقابلہ انسان ضعیف البنیان سے نہیں ہو سکتا ۔ پس انسان میں ایسی قابلیت ہونی ضرور ہے کہ جیسی ضرورت دیکھے ویسا بن جائے تاکہ زمانے کا کوئی انقلاب اُس کو سخت صدمہ نہ پہنچائے ۔ آندھی کے پُرزور حملے اُن ہی تناور درختوں کو نقصان پہنچاتے ہیں جو اپنی جگہ سے ٹلنا نہیں چاہتے ، پر چھوٹے چھوٹے لچک دار پودے جو ہوا کے ہر جھوکے کے ساتھ جھک جاتے ہیں ، ہمیشہ برقرار رہتے ہیں ۔

اس بات کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ عارضی یا چند روزہ کامیابی مقتضاے وقت کی مخالفت میں بھی حاصل ہو سکتی ہے ، مگر جو لوگ دنیا میں آ کر کامیابی کا پورا پورا استحقاق حاصل کر گئے ، وہ وہی تھے جنھوں نے مقتضاے وقت کو ہاتھ سے نہ دیا اور جیسا زمانہ دیکھا ویسے بن گئے ۔

حکیم اوحدالدین انوری[2] ، جس نے اپنے زمانے کے تمام علوم

---

[1] ۱۔ محی الدین ابن عربی ملقب بہ شیخ اکبر : فتوحات مکیہ اور فصوص الحکم کے مصنف ، بہت سے علوم بالخصوص تصوف اور فلسفے کے زبردست عالم ، اندلس کے شہر مرسیہ میں ۱۷ رمضان ۵۶۰ھ کو پیدا ہوئے ۔ کثیرالتصانیف ، آزاد ، نڈر اور نہایت صاف بیان شخص تھے ۔ آپ نے ۶۳۸ھ میں بمقام دمشق رحلت کی اور میدانِ قاسیون میں دفن ہوئے ۔ (اسماعیل)

[2] ۲۔ انوری فارسی زبان کا اعلٰی درجے کا شاعر ، بڑا حکیم اور فلسفی تھا ۔ اہل سخن اسے پیغمبر سخن مانتے ہیں ۔ اس کو نجوم کا بھی دعوٰی تھا جس کی بدولت بڑی بڑی تکلیفیں اٹھائیں ۔ سلطان سنجر کے دربار سے بھاگ کر بلخ چلا گیا ۔ بلخ والوں سے ناراض ہو کر بلخ اور اہل بلخ کی ہجو میں ایک قصیدہ لکھا ۔ اس پر لوگوں نے ناراض ہو کر ۵۸۲ھ میں اسے قتل کر ڈالا ۔ (اسماعیل)

میں کامل دست گاہ حاصل کی تھی اور پھر عجم کے اُن تینوں شاعروں میں شمار کیا گیا جو ''پیمبر شعر'' مانے گئے ہیں[1] ، اگر وہ مقتضاے وقت کی پیروی نہ کرتا تو یہ شہرت اور عزت اُس کو ہرگز حاصل نہ ہوتی ۔ وہ خراسان کی ایک بستی زاکان نامی میں ٹھہرا ہوا تھا کہ اتفاق سے اُس عہد کے ملک الشعرا ابوالفرح سنجری کا لشکر بھی وہیں آ کر ٹھہرا ۔ انوری نے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ یہ سارا جلوس سنجری کے ساتھ ہے ۔ کہا : ''سبحان اللہ ! علم کا مرتبہ ایسا بلند اور میں اس قدر مفلس ۔ میں ایسا ذلیل اور اس شخص کو یہ جاہ و حشمت ۔ اب مجھ کو بھی قسم ہے جو شاعر ہی بن کر نہ دکھاؤں''۔ چناں چہ اُسی رات کو ایک قصیدہ سلطان سنجر[2] کی مدح میں لکھ کر تمام کیا جس کا مطلع یہ ہے :

گر دل و دست بحر و کاں باشد
دل و دست خدائیگاں باشد

پھر تمام عمر شاعری کی بدولت خوش حال اور فارغ البال رہا اور دنیا میں شہرت اور بلند نامی حاصل کی ۔

---

[1] ۱۔ اس فقرے میں ذیل کی مشہور و معروف رباعی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے :

در شعر سہ کس پیمبرانند — ہر چند کہ 'لا نبی بعدی'
ابیات و قصیدہ و غزل را — فردوسی و انوری و سعدی

(اسماعیل)

[2] ۲۔ سلطان سنجر : فارس کا نہایت مشہور اور علم دوست بادشاہ تھا ۔ ۱۰۹۲ع میں تخت پر بیٹھا ۔ ۱۱۵۳ع میں ترکمانوں پر حملہ کیا ، وہاں گرفتار ہو گیا ۔ چار سال تک اُن کی قید میں رہا ۔ اس کی غیرحاضری میں اس کی بیوی سلطانہ خاتون نہایت قابلیت اور خوبی کے ساتھ حکومت کرتی رہی ۔ سنجر آخر قید سے فرار ہوا اور تھوڑے ہی دن حکومت کرنے پایا تھا کہ ۱۱۵۷ع میں پیغام اجل آ گیا ۔ (اسماعیل)

ایک مجلس میں شیخ ابوالفضل[1] کے کمالات اور ترقیات کا مذکور تھا۔ ایک صاحب بولے ”وہ بایں ہمہ کمالات اگر اس زمانے (یعنی انیسویں صدی) میں ہوتا تو شاید عدالتوں میں عرضی نویسی کرکے اپنا پیٹ پالتا“۔ ہم نے کہا ”اگر وہ اس زمانے میں ہوتا تو ہرگز اپنی کامیابی کا ذریعہ اُس لیاقت کو نہ گردانتا جس کی بدولت اُس نے سولھویں صدی عیسوی میں ترقیات حاصل کی تھیں بلکہ اس عہد میں وہ کم سے کم ایم۔ اے۔ یا ایل۔ ایل۔ ڈی کا درجہ ضرور حاصل کرتا۔ اور کچھ نہیں تو لندن کے کسی نامی گرامی اخبار کا کارسپانڈنٹ (نامہ نگار) ضرور ہوتا۔“ یہ ہمارا ایک سرسری جواب تھا جو اُس وقت بلا تامل زبان سے نکل گیا۔ مگر اب غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ جواب بالکل صحیح تھا۔ ابوالفضل کی ذات میں ہر زمانے کا رنگ بدلنے کی ایسی قابلیت تھی کہ وہ جس زمانے میں ہوتا اُس زمانے کی حیثیت کے موافق ضرور اپنے ہم چشموں میں ممتاز ہوتا۔ وہ ایک رقعے میں، جو غالباً اُس نے اپنے باپ کے نام لکھا ہے، تحریر کرتا ہے کہ ”بعض لوگ میری نسبت یہ کہتے ہیں کہ ایک طالب علم کو اس قدر منصب جلیل تک پہنچا دینا بادشاہ کو زیبا نہ تھا۔ اس لیے میری بھی اب یہی تمنا ہے کہ سپہگری کا کوئی کار نمایاں دکھاؤں“۔ اُس کا یہ قول نرا دعویٰ ہی دعویٰ نہ تھا

---

[1] شیخ ابوالفضل: نہایت فاضل، بڑا ادیب اور شہنشاہ اکبر کا وزیر اعظم تھا۔ ’آئین اکبری‘ اور ’اکبر نامہ‘ اس کی مشہور تصانیف ہیں۔ فیضی کا بھائی اور شیخ مبارک کا بیٹا تھا۔ ۹۵۸ھ میں پیدا ہوا اور صرف ۳۳ سال کی عمر میں وزیر اعظم ہو گیا۔ جہانگیر کے اشارے پر نرسنگھدیو نے ۱۰۱۱ھ میں اسے قتل کر ڈالا۔ (اسماعیل)

بلکہ اُس نے مرتے وقت نرسنگھ[1] دیو بندیلے کے مقابلے میں اپنی قابلیت کا جوہر سب پر ظاہر کر دیا۔ مقابلے کے وقت اُس کے اکثر ہمراہی بھاگ گئے تھے اور چند آدمی جو بچے تھے، وہ اس کو یہ صلاح دے رہے تھے کہ اس تھوڑی سی جمعیت پر بندیلے کا مقابلہ کرنا مصلحت نہیں۔ مگر وہ نہایت ترشی سے یہ کہہ کر کہ ”مگر بگریزم؟“ اکیلا فوج مخالف میں جا گھسا۔ لیکن چوں کہ پیمانۂ عمر لبریز ہو چکا تھا، گھوڑا ٹھوکر کھا کر گرا اور اس کے گرتے ہی مخالفوں نے شیخ کا کام تمام کر دیا۔

سلطان شہاب الدین[2] غوری کو مورخوں نے بہت سخت اور تند مزاج لکھا ہے اور اس کے ثبوت کے لیے اُس کی وہ زیادتی پیش کرتے ہیں جو فتح اجمیر کے بعد اُس سے ظہور میں آئی، یعنی کئی ہزار آدمی، جو فتح کے بعد بچ رہے تھے، اُن سب کو تیغ بیدریغ کے حوالے کیا۔ مگر باوجود اس کے اُس کی سختی اور تند مزاجی کو اس سبب سے مذموم نہیں سمجھا کہ جس فتنہ و فساد کے زمانے میں وہ

---

[1] نرسنگھ دیو بندیلہ: دکن کا ایک لٹیرا اور قزاق تھا۔ جب اکبر بادشاہ نے ابوالفضل کو دکن کی مہم پر بھیجا تو نرسنگھ دیو نے شہزادہ سلیم کی تحریک سے ابوالفضل پر اس مہم کی واپسی پر اُجین کے قریب حملہ کیا۔ ابوالفضل کمال شجاعت اور بہادری سے لڑا لیکن مارا گیا۔ (اسماعیل)

[2] شہاب الدین غوری: افغانستان کے پہاڑی علاقے غور کا حاکم، ہندوستان میں سلطنتِ اسلامیہ کی بنیاد ڈالنے والا اور نہایت اولوالعزم بادشاہ تھا۔ اس نے ۱۲۰۲ء تک حکومت کی ہے۔ ہندوستان پر پہلے حملے میں پرتھی راج والیِ دہلی و اجمیر سے شکست کھا کر واپس لوٹ گیا۔ مگر تیسرے سال ۱۱۹۳ء میں پرتھی راج کو تھانیسر کے مقام پر بڑی سخت شکست دی جس میں تقریباً ایک سو پچاس راجے پرتھی راج کی امداد کے لیے اپنی اپنی فوجیں لے کر آئے تھے۔ اس فتح سے تمام شمالی ہندوستان شہاب الدین کے قبضے میں آ گیا۔ واپسی پر شہاب الدین اپنے غلام قطب الدین نامی کو ہندوستان کا بادشاہ کرکے چھوڑ گیا جس کی اولاد نے مدتوں یہاں سلطنت کی۔ (اسماعیل)

متسلط ہوا تھا اُس کے لیے ایسے ہی مزاج کا بادشاہ ہونا سزاوار تھا ۔

جس طرح دنیا کی بہبودی کا مدار مقتضاے وقت کی موافقت پر ہے ، اسی طرح دین کی کامیابی بھی اسی پر موقوف ہے ۔ کتاب مقدس (توریت) میں خدا تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ‌السلام کی بڑی تعریف اس بات پر کی ہے کہ وہ مصریوں کے تمام علوم میں کامل تھے ۔ اس سے ثابت ہوا کہ نبوت جیسا جلیل‌القدر منصب بھی اُسی شخص کو عطا ہوتا ہے جس میں زمانۂ حال کے حسب حال ہونے کی پوری پوری قابلیت ہوتی ہے ۔

ہمارے نبیِ برحق علیہ‌الصلوٰۃ والسلام نے جو دعوتِ اسلام میں نمایاں کامیابی حاصل کی ، اُس کا بڑا ذریعہ عبارات قرآنی کی حلاوت اور ملاحت تھی ، جس کا مدار بالکل مقتضاے وقت کی موافقت پر تھا ، کیوں کہ اس وقت شعر و شاعری کے شور سے تمام عرب گونج رہا تھا اور فصاحت و بلاغت کے دعوے نہایت توجہ سے سنے جاتے تھے ۔ کوئی کمالِ علمِ ادب کے ہم پلہ نہ سمجھا جاتا تھا اور کوئی ہتھیار تیغِ زبان کے برابر کارگر نہ ہوتا تھا ۔

آں حضرت (صلعم) کے بعد پہلی اور دوسری خلافت میں جو اسلام کو ترقیِ روز افزوں نصیب ہوئی اور کوئی فتنہ ایسا حادث نہ ہوا جو اس کے زور و طاقت کی مزاحمت کرتا ، اُس کا اصلی سبب اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ منصب خلافت کے لیے آگے پیچھے ایسے دو شخص انتخاب کیے گئے جن کا چلن اور برتاؤ بالکل مقتضاے وقت کے موافق تھا ۔ اور اس سبب سے زمانہ اُن کا معین و مددگار بن گیا ۔ چناں چہ اسی مصلحت کے لیے آں حضرت صلی اللہ علیہ و سلم نے جناب مرتضویؓ کے استخلاف کی نسبت ”وانی لا اراکم فاعلین[1]“

۱- یعنی میں تمھیں کرنے والا نہیں دیکھتا ۔ (اسماعیل)

فرمایا اور شیخینؓ[1] کی نسبت کچھ تردد ظاہر نہ فرمایا ۔

عمر فاروقؓ[2] کی شدت چوں کہ مقتضاے وقت کے موافق تھی ، اس لیے مزرعۂ اسلام کے حق میں ابر رحمت کا کام کر گئی اور عثمان[3] ذی النورینؓ کی مروت ، جو اُنھوں نے مروان[4] بن الحکم وغیرہ کے ساتھ برتی ، چوں کہ وہ مقتضاے وقت کے موافق نہ تھی

۱- شیخین سے مراد حضرت ابوبکرصدیق اور عمر فاروق ہیں ۔ (اسماعیل)

۲- عمر فاروق : صدیق اکبر کے جانشین اور اسلام کے دوسرے خلیفہ تھے ۔ آپ کے عہد مبارک میں تمام عراق ، عرب ، شام ، ایران اور مصر کے ممالک مسلمانوں کے قبضے میں آئے اور اسلام کو وہ شوکت حاصل ہوئی جس کی نظیر مستقبل میں پھر نہ مل سکی ۔ ساڑھے دس سال خلافت کرنے کے بعد صبح کی نماز پڑھتے ہوئے ایک غلام کے ہاتھ سے شہید ہوئے ۔ آپ نے ۱۳ھ (۶۳۴ء) سے ۲۳ھ (۶۴۴ء) تک خلافت کی ۔ آپ کا بے نظیر عدل ، انتہا درجے کی سادگی اور خوش انتظامی مشہور و معروف ہے ۔ (اسماعیل)

۳- عثمان ذی النورین : اسلام کے تیسرے خلیفہ تھے ۔ فارس کے اکثر شہر ، شاہ روم کا علاقہ اور شمالی افریقہ کے بعض ممالک آپ کے عہد میں اسلامی حکومت میں شامل ہوئے ۔ نہایت رحم دل ، رقیق القلب اور منکسرالمزاج تھے ۔ ۱۲ سال خلافت کرنے کے بعد ۷۵ سال کی عمر میں شہید ہوئے ۔ آپ نے ۲۳ھ (۶۴۴ء) سے ۳۵ھ (۶۵۶ء) تک خلافت کی ۔ (اسماعیل)

۴- مروان بن الحکم : حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا حقیقی عم زاد بھائی اور بڑا عیار شخص تھا ۔ اسی کی شرارتیں اور چالاکیاں حضرت خلیفۂ ثالثؓ کی پُر الم شہادت کا باعث ہوئیں ۔ بنی اُمیہ کی حکومت قائم ہونے پر یہ اپنی ہوشیاری سے معاویۂ ثانی کی وفات کے بعد ۶۴ھ (۶۸۶ء) میں تمام دنیاے اسلام کا بادشاہ ہو گیا ۔ مگر صرف ۲۹۸ دن حکومت کرنے پایا تھا کہ اس کی بیوی زینب نے ۳ رمضان ۶۷ھ مطابق ۱۲ اپریل ۶۸۷ء کو اسے زہر دے کر مار ڈالا ۔ (اسماعیل)

اسی لیے اس فتنۂ عظیم کی اصل قرار دی گئی جو آپ کے آخر عہد خلافت میں رونما ہوا اور جس کا نتیجہ آپ کی شہادت تھا ۔

ایک زمانے میں مقتضائے وقت یہ تھا کہ محدثین اسلام (اس خیال سے کہ رسول مقبولؐ کے ارشادات تمام و کمال فراہم ہو جائیں) روایات کے اخذ کرنے میں رطب و یابس کی کچھ تمیز نہ کرتے تھے ۔ پھر دوسرے زمانے کا مقتضا یہ ہوا کہ ان کی روایتوں کی تنقید اور ان کے راویوں کی چھان بین کی جائے اور صحیح کو سقیم سے ، قوی کو ضعیف سے ، معروف کو منکر سے اور ثابت کو موضوع سے جدا کیا جائے ۔ اگر وہ پہلا طبقہ مقتضائے وقت کا لحاظ نہ کرتا تو علم نبیؐ کا ایک بڑا حصہ ضائع ہو جاتا ۔ اور اگر یہ دوسرا گروہ کھڑا نہ ہوتا تو حق و باطل اور صدق و کذب کا امتیاز دشوار ہو جاتا ۔

بڑی دلیل اس بات کی کہ مقتضائے وقت کا لحاظ ضروریاتِ دین سے ہے ، وہ روایت ہے جس کو مسلم[1] نے ابو ہریرہ[2] سے روایت کیا ہے : اس روایت کا ماحصل یہ ہے کہ آن حضرت صلعم نے ایک موقع پر ارشاد فرمایا کہ ”جو شخص صدق دل سے لا الہ الا اللہ کہے گا وہ ضرور بخشا جائے گا ۔“ عمر فاروقؓ یہ سن کر حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ ”اس بشارت سے لوگ اعمال صالحہ کی بجا آوری میں قصور کریں گے ۔“ آپؐ نے فاروق اعظمؓ کی اس

---

[1] ۱- مسلم : امام مسلم بن حجاج نیشاپوری بہت بڑے محدث اور امام المحدثین حضرت امام بخاری کے خاص اور ممتاز شاگردوں میں سے تھے ۔ صحاح ستہ کی کتابوں میں 'صحیح بخاری' کے بعد آپ کی کتاب کا درجہ ہے جو عام طور پر 'صحیح مسلم' کے نام سے مشہور ہے ۔ ۲۰۴ھ میں پیدا ہوئے اور ۲۶۱ھ میں انتقال فرمایا ۔ (اسماعیل)

[2] ۲- ابو ہریرہ : حضور صلعم کے بڑے پایے کے صحابیوں میں سے تھے ۔ ۵۷ھ میں وفات پائی ۔ (اسماعیل)

رائے کو پسند فرمایا اور تاوقتیکہ روایات کی تدوین کرنے کی ضرورت نہ پڑی ، یہ خوش خبری تمام امت میں عام نہ ہوئی ۔

الغرض دنیا کی بہبودی یا دین کی کامیابی مقتضائے وقت کی موافقت کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی ۔

مگر اس موافقت سے ہماری یہ مراد ہرگز نہیں کہ مثلاً بے دینی اور الحاد کے زمانے میں دین و مذہب سے ہاتھ اٹھا بیٹھیں ، اور عیش و عشرت کے زمانے میں جفاکشی اور محنت سے دست بردار ہوجائیں ، یا جہاں خوشامد کا بازار گرم ہو وہاں خوشامدی بن جائیں ، اور جہاں مسخرہ پن کا زور ہو وہاں غیرت اور حمیت کو بالائے طاق رکھ دیں ۔ نہیں ہماری رائے میں کوئی برے سے برا زمانہ ایسا نہیں ہوتا جس میں مقتضائے وقت کے موافق کوئی نہ کوئی جائز طریقہ کامیابی کا موجود نہ ہو ۔

جب فلسفۂ یونانیہ یونانی زبان سے عربی زبان میں منتقل ہوا اور بطلیموس[1] اور ارسطو[2] کے خیالات عرب اور عجم کے گلی کوچوں میں منتشر ہو گئے ، تو الحاد اور بے دینی نے لوگوں کے دلوں میں چٹکیاں لینی شروع کیں ۔ یہاں تک کہ نصوص قرآنی اور احادیثِ نبوی

---

[1] ۱- بطلیموس : مصر کا مشہور مہندس ، علم نجوم و ہندسہ کا ماہر ، پہلا جغرافیہ دان اور ہیئت کی مشہور کتاب ”مجسطی“ کا مصنف ہے ۔ اس نے پہلے پہل کرۂ ارض کا نقشہ بنایا اور نظام شمسی کی تحقیقات کی ۔ ۸۰ برس کی عمر میں ۲۴۷ قبل مسیح میں وفات پائی ۔ (اسماعیل)

[2] ۲- ارسطو : معروف بہ ارسطاطالیس ۔ حکمائے یونان کا سرگروہ ۔ شہنشاہ سکندر اعظم کا استاد اور افلاطون کا شاگرد تھا ۔ صرف ، نحو ، ادب ، معانی ، علم الاخلاق ، سیاست مدن ، طبیعیات ، الٰہیات اور ریاضیات کا زبردست عالم تھا ۔ اہل علم میں 'معلم اول' کے نام سے مشہور ہے ۔ ۲۸۴ ق م میں پیدا ہوا اور ۲۲۲ ق م میں وفات پائی ۔ (اسماعیل)

پر دھڑادھڑ اعتراض ہونے لگے اور جا بجا دین میں رخنے نکلنے لگے، اس وقت علماء کے فروغ اور کامیابی کے دو طریقے پائے جاتے تھے : ایک ناجائز دوسرا جائز۔

ناجائز طریقہ یہ تھا کہ مسائل فلسفیہ کی تائید کر کے الحاد کی آگ کو اور مشتعل کر دیتے اور آزادی جیسی من بھاتی چیز کو دنیا میں پھیلا کر دنیوی فروغ حاصل کرتے۔

جائز ذریعہ یہ تھا کہ شریعت اور حکمت میں تطبیق یا مسائل حکمیہ کی تغلیط کر کے الحاد کی آنچ سے دین کو بچاتے اور معترضوں کی زبانؔ بند کرتے۔

چناں چہ علمائے اسلام نے (شکر اللہ سعیھم) یہی جائز طریقہ اختیار کیا اور فلسفۂ یونانیہ کے مقابلے میں ایک جدا فلسفہ قائم کیا جو اہل اسلام میں 'علم کلام' کے نام سے مشہور ہے۔

جلال الدین اکبر کا زمانہ (جیسا کہ اکثر موورخوں نے لکھا ہے) ظاہرا بے دینی اور الحاد کا زمانہ ثابت ہوتا ہے اور اس سبب سے ممکن ہے کہ بہت سے لوگوں کی کامیابی کا ذریعہ یہی بے دینی اور الحاد ہو۔ مگر تاریخ کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس کے عہد میں کامیابی کا بڑا ذریعہ شجاعت و بہادری یا فضل و کمال اور علم و ہنر تھا۔ کیوں کہ اُس کے درباریوں اور مقربوں میں کوئی آدمی ایسا نہیں معلوم ہوتا جس نے بغیر کسی کمال یا ہنر کے محض بے دینی اور الحاد کے ذریعے سے معتدبہ امتیاز حاصل کیا ہو۔ بلکہ اس کے ارکان دولت میں ایسے آدمی پائے جاتے ہیں جو اپنے مذہبی قواعد کے نہایت پابند تھے اور جنھوں نے اپنے فضل و کمال کی بدولت بادشاہ کے دل میں جگہ پائی تھی، جیسے ملا فتح اللہ شیرازی[1] مسلمانوں کے،

۱- ملا فتح اللہ شیرازی : دربار اکبری کا نہایت گراں پایہ عالم اور مقتدر رئیس تھا۔ باوجود تقدسِ مذہبی کے، علوم عقلیہ مثلاً ہیئت و ہندسہ،
(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

اور راجا ٹوڈرمل[1] ہندوؤں میں۔ یہ دونوں شخص اکبری دور میں مذہب کے نہایت متعصب گنے جاتے تھے۔ بہ ایں ہمہ ملاؔ نے اپنے علوم عقلیہ و نقلیہ کے سبب اور راجا نے حساب سیاق کی مہارت سے یا دانش مندی اور حسن تدبیر کی جہت سے دربار شاہی میں جو مرتبہ حاصل کیا، وہ سب پر روشن و ہویدا ہے۔

بہرحال جہاں کامیابی کے دو چار ناجائز طریقے پائے جاتے ہیں، وہاں کوئی نہ کوئی جائز طریقہ بھی ضرور موجود ہوتا ہے۔ اور جو کامیابی اُن ناجائز طریقوں سے حاصل ہوتی ہے وہ اُس کامیابی کے برابر کبھی پائدار اور مستحکم نہیں ہوتی جو جائز طریقے سے حاصل ہو سکتی ہے۔ ہم نے بارہا تجربہ کیا ہے کہ جن درباروں میں مثلاً خوشامد کا بازار گرم تھا اور جہاں حاکم کی مرضی کے خلاف بولنا جرائمِ کبیرہ کے ارتکاب سے زیادہ خطرناک سمجھا جاتا تھا، جب وہاں کوئی سچا اور آزاد طبیعت کا آدمی پہنچا تو اگرچہ اس کو چند روز اپنی آزاد طبیعت کی کسی قدر روک تھام کرنی پڑی، لیکن آخر اُس کی راستی اپنا رنگ جمائے بغیر نہ رہی، رفتہ رفتہ اُسی کا قول معتبر ٹھہرا اور اُسی کی صلاح نیک سمجھی گئی۔

ان تمام شہادتوں سے ہم بہ آسانی یہ نتیجہ نکال سکتے ہیں کہ ہندوستان کی اکثر قومیں جو روز بروز اقبال مند ہوتی جاتی ہیں اور

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ)
نجوم، رمل، حساب، طلسمات اور نیرنجات خوب جانتا تھا۔ خصوصاً علم ہیئت میں نہایت کامل تھا اور علوم عربیہ حدیث، تفسیر اور علم الکلام سے بھی بخوبی واقف تھا۔ ۹۹۷ھ میں بمقام کشمیر وفات پائی۔ (اسماعیل)

۱- ٹوڈرمل : عہد اکبری کا بہت بڑا محاسب اور قانون مال گذاری کا مدون تھا۔ شہنشاہ جلال الدین اکبر کا بڑا معتمد علیہ تھا۔ اکبر اسے اپنے بہترین رفیقوں میں سے سمجھتا تھا۔ اس کا سال انتقال ۱۵۸۹ع ہے۔
(اسماعیل)

مسلمانوں کی قوم بد اقبالی کے بھنور اور ذلت کی دلدل سے کسی طرح نہیں نکلتی ، اس کا سبب اس کے سوا کچھ نہیں کہ اور لوگ اپنی حالت کو زمانے کے موافق بناتے جاتے ہیں لیکن مسلمان اپنی وضع داری کو ہاتھ سے نہیں دیتے ۔

اے ہندوستان کے مسلمانو ! کیا تم ابھی اسی عالم میں ہو ، جس میں تمھارے آبا و اجداد زندگی بسر کر گئے ہیں ؟ اور کیا تم اسی کھیتی کے پروان چڑھنے کے منتظر ہو ، جس میں تمھارے بزرگوں نے تخم افشانی کی تھی ؟ مدت ہوئی کہ وہ عالم گزر گیا اور وہ کھیتی دریا برد ہو گئی ۔ ذرا آنکھیں کھولو اور دیکھو کہ تم کون ہو اور کہاں ہو ؟ تمھاری گرہ میں جو دام ہیں وہ بازار میں آج پھوٹی کوڑی کو نہیں چلتے ۔ تمھاری دوکان میں جو مال ہے اسے کوئی مفت بھی لینا نہیں چاہتا ۔ تمھارے چراغ میں جو تیل تھا وہ جل گیا اور تمھاری کھیتی میں جو پانی تھا وہ سوکھ گیا ۔ دیکھو ، تمھاری ناؤ بودی ہے اور دریا دم بدم چڑھتا جاتا ہے ۔ تمھارا قافلہ پیادہ ہے اور منزلیں کٹھن آتی جاتی ہیں ۔

اس تمہید سے ناظرین کو ضرور یہ خیال پیدا ہوگا کہ ہم آگے چل کر اپنی قوم کو انگریزی پڑھنے ، میز کرسی لگانے ، کوٹ پتلون پہننے اور چھری کانٹے سے کھانے کی ترغیب دیں گے ، کیوں کہ ظاہرا زمانۂ حال کا مقتضا یہی ہے ۔ مگر ان کو یاد رہے کہ ہماری مراد اس تمہید سے یہ ہرگز نہیں ہے بلکہ ہم یہ کہتے ہیں کہ وہ جس بری حالت میں ہیں اس سے نکلنے کی جو سیدھی راہ نظر آئے اسی راہ کو اختیار کریں اور جس طرح ہو سکے اپنا قدم آگے بڑھائیں ۔ کیوں کہ زمانہ بہ آواز بلند کہہ رہا ہے ”من استویٰ یوماہ فہو مغبون[1]“ یعنی ”جس کے دو دن ایک حالت پر گزریں وہ خسارے میں رہا ۔“ اور در و دیوار سے یہ صدا آ رہی ہے کہ : ع

یا قدم آگے بڑھاؤ ورنہ لو راہ عدم

دنیا میں آج کل ایک عام گھوڑ دوڑ کا تماشا ہو رہا ہے ۔ ہر گروہ کے شاہ سوار جوق جوق اس میں آتے ہیں اور اپنے اپنے ہنر دکھا جاتے ہیں ۔ کچھ ان میں سے گجر دم آتے ہی برق خاطف کی طرح ایک آنِ واحد میں گزر گئے ، کچھ ان سے پیچھے پہنچے ، کچھ راہ میں ہیں مگر افتاں و خیزاں چلے جاتے ہیں ۔ کتنوں نے اپنے گھوڑوں کی ابھی باگ اٹھائی ہے ، کتنے چلنے کی تیاری کر رہے ہیں ، لیکن بہتوں کو ابھی گھوڑ دوڑ کی خبر بھی نہیں پہنچی ۔ ان کے گھوڑے تھان پر بندھے ہوئے ہیں اور خود آرام سے پڑے سوتے ہیں ۔ شاید وہ اس وقت بیدار ہوں گے جب گھوڑ دوڑ کا وقت نکل جائے گا اور وہ ہاتھ ملتے رہ جائیں گے ۔ اے مسلمانو! ہم کو خوف ہے کہ وہ ناکام گروہ کہیں تمھاری ہی قوم نہ ہو ، اور وہ ہاتھ جو حسرت سے ملے جائیں گے ، تمھارے ہی ہاتھ نہ ہوں ۔

اے مسلمانو ! تم کو یہ بھی معلوم ہے کہ جو شے تم کو ابھرنے نہیں دیتی وہ کیا ہے ؟ اور جس کے سبب تم جنبش نہیں کر سکتے ، وہ کون سی بندش ہے ؟

یاد رکھو وہ تمھاری بیہودہ تقلید ہے جس نے تم کو مذہبی امور ہی میں مجبور اور بے اختیار نہیں کیا بلکہ تجارت میں ، زراعت میں ، علم و ہنر میں ، حرفے اور پیشے میں ، غرض ہر کام میں تمھاری عقلوں پر پردہ اور ہر راہ میں تمھارے پاؤں میں بیڑی ڈال رکھی ہے اور تم کو اس پرند جانور کی مانند بے بس کر رکھا ہے جس کے پر کٹے ہوں اور آنکھیں سی ہوئی ہوں ۔ نہ تم میں طاقتِ پرواز ہے نہ نگاہِ دور بیں ۔ تقلید نے تم کو تمام دینی اور دنیوی ترقیوں سے فارغ البال کر رکھا ہے اور تمھارے کان میں یہ پھونک دیا

---

[1] یہ حضور خاتم النبیین محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے ۔ (اسماعیل)

ہے کہ جو کچھ کرنا تھا سو اگلے کر گئے ، اب اس سے زیادہ کرنا غیر ممکن ہے ۔ تمھارے نزدیک جس قطع کی کشتی طوفانِ نوح میں بنائی گئی تھی ، اُس سے بہتر کوئی وضع انسان کے ذہن میں نہیں آ سکتی اور جو پیشہ آج سے ہزار برس پہلے تمھارے بزرگوں نے اختیار کیا تھا اُس کے سوا کسی حیلے سے تم روٹی نہیں کما سکتے ۔ تمھارے نزدیک تمام عقل انسانی پہلے طبقوں پر تقسیم ہو گئی اور اُنھوں نے تمھارے لیے کوئی موقع ایسا نہ چھوڑا جس میں تم کو اپنی انسانیت سے کچھ کام لینے کی ضرورت پڑے ۔ شیخ[1] نے 'قانون' میں بدنِ انسان کی تشریح جو لکھ دی سو لکھ دی اور محمد حسین دکنی 'برہان قاطع' میں لغات فارسی کی جو تحقیق کر گیا سو کر گیا ۔ اب کون ہے جو 'قانون' سے کچھ بڑھ کر لکھ سکے یا 'برہان' میں کوئی عیب نکال سکے ؟ تم صرف اُنھی لوگوں کی تقلید نہیں کرتے جن کے ساتھ تم کو حسنِ عقیدت ہے بلکہ طب میں جالینوس[2] کی ، منطق میں ارسطو کی ، ہندوستان کی رسموں میں ہندوؤں کی تقلید کو بھی

---

[1] ۱۔ شیخ الرئیس ابوعلی حسین بن علی بن سینا حکمائے اسلام میں بڑا حاذق طبیب اور بے نظیر فاضل گزرا ہے ۔ صرف و نحو ، زبان دانی ، طب ، ہندسہ و ہیئت ، منطق اور فلسفہ وغیرہ تمام مروجۂ وقت علوم و فنون میں صرف ۱۶ سال کی عمر میں وہ کمال پیدا کیا کہ شیخ (پروفیسر یا اُستاد) کے لقب سے پکارا جانے لگا ۔ 'قانون' اس کی طبی تصانیف میں ایسی جامع کتاب ہے جس کی نظیر نہیں ۔ اس کے علاوہ مختلف علوم و فنون پر اس نے اور بھی بہت سی کتابیں لکھی ہیں ۔ ۳ صفر ۳۷۵ھ کو پیدا ہوا اور ۵۳ سال کی عمر میں درد قولنج سے ۴۲۸ھ میں وفات پائی ۔ (اسماعیل)

[2] ۲۔ جالینوس : یونان کا مشہور حکیم اور اعلیٰ درجے کا طبیب تھا ۔ ۱۳۰ قبل مسیح میں پیدا ہوا اور ۲۰۱ قبل مسیح میں وفات پائی (اسماعیل)

اُسی قدر ضروری جانتے ہو جس قدر مذہب میں امام اعظم[1] کی تقلید تمھارے نزدیک واجب و لازم ہے ۔ اگر کسی کو اس بات میں تأمل ہو تو نکاحِ بیوگان کے معاملے میں غور کرے اور دیکھے کہ اُس کا مجوز کون ہے اور مانع کون ؟ اور ہندوستان کے عام مسلمانوں نے مجوز کے حکم کی تعمیل کی ہے یا مانع کا کہنا مانا ہے ۔

اسی تقلید کی بدولت تم میں ایک اور مرض پیدا ہو گیا ہے جس نے تمھاری رہی سہی ہمت خاک میں ملا دی ہے اور تم کو بالکل اپاہج کر دیا ہے ؛ پوچھو وہ کیا ہے ؟ وہ خانہ خراب وضع داری ہے جس کی ہدایت سے تم ترقی کرنے والوں کو متلون مزاج سمجھتے ہو اور ڈھور ڈنگروں کی طرح سدا ایک حالت پر رہنے کو کمال نفس انسانی قرار دیتے ہو ۔

ہندوستان کے وضع داروں کی یہ رائے ہے کہ آدمی اپنی زندگی میں جو طریقہ یا جو حالت اختیار کر لے اُس کو آخر عمر تک ترک نہیں کرنا چاہیے ۔ جوانی میں اگر ڈاڑھی چڑھانے کی عادت ہو جائے تو سنِ شیخوخت تک اس وضع کو نباہنا ضرور ہے ، اور بچپن میں اگر کامدار ٹوپی پہننے کا لپکا پڑ جائے تو بڑھاپے کے جھریائے ہوئے چہرے کو بھی اُس سے محروم نہیں رکھنا چاہیے ۔[2]

---

[1] ۱۔ امام اعظم : نعمان بن ثابت نام ، ابوحنیفہ کنیت اور امام اعظم لقب ہے ۔ ۸۰ھ میں پیدا ہوئے ۔ اہل سنت والجماعت کے امام ، بہت بڑے فقیہ ، مجتہد اور محقق شریعت تھے ۔ خلیفۂ وقت نے باوجود اصرار کے عہدۂ قضا قبول نہ کرنے کی وجہ سے قید کر دیا تھا اور وہیں ۱۵۰ھ میں خفیہ طور پر زہر دے کر اس آفتابِ علم کا خاتمہ کر دیا گیا ۔ (اسماعیل)

[2] ۲۔ اس موقع پر یہ حقیقت بہت دل چسپ ہے کہ وضعداری کی مذمت کرنے کے باوجود خود مولانا حالی انتہا درجے کے وضعدار تھے ۔ مگر یہ وضعداری نہایت شریفانہ تھی ۔ (اسماعیل)

چناں چہ معتبر راویوں سے سنا گیا ہے کہ دو بزرگوار نجف خانی جن کا سن شریف ساٹھ پینسٹھ سے متجاوز ہو گیا تھا اور نہایت متقی اور متورع آدمی تھے ، ہر جمعہ کو شاہ عبدالعزیز[1] صاحب کے درس میں حاضر ہوا کرتے تھے ۔ شاہ صاحب بھی اُن کی کمال تعظیم کرتے تھے ۔ با ایں ہمہ تقدس دونوں حضرات ڈاڑھی گھٹواتے تھے ۔ بعضے منہ پھٹ آدمیوں نے ، جو اُن پر اعتراض کیا تو یہ فرمایا کہ ہم خود اس حرکت سے منفعل ہیں مگر کیا کریں جو وضع قدیم سے اختیار کر لی ہے اُس کے خلاف کرتے ہوئے شرم آتی ہے ۔

اسی طرح ایک شریفوں کی بستی میں ایک صاحب سن رسیدہ بڑے نمازی اور پرہیزگار تھے مگر عشاء کی نماز کبھی نہ پڑھتے تھے ۔ لوگوں نے سبب پوچھا تو فرمایا کہ بچپن میں تو اس سبب سے نہ پڑھی کہ کھانا کھاتے ہی شام سے سو رہتے تھے ، جوانی میں لہو و لعب مانع رہا ، اب بڑھاپے میں نئی بات کرتے ہوئے جی ہچکچاتا ہے ۔

خیر ہم اپنے قدما کی اس رائے پر اعتراض نہیں کرتے کیوں کہ اُس زمانے کا مقتضا یہی تھا ۔ سلطنت مغلیہ پر زوال آ چکا تھا ۔ ترقی کی راہیں فتنہ و فساد کے سبب چاروں طرف سے مسدود تھیں ، طبیعتوں پر مایوسی اور افسردگی چھائی ہوئی تھی ۔ ایسے وقت میں تنزل کے جس قدر آثار مسلمانوں میں پائے جاتے ، تھوڑے تھے ۔ مگر ہم کو اپنے ہم عصروں کے حال پر بے اختیار رونا آتا ہے جو اس امن اور آزادی کے زمانے میں بھی وضع داری کے حصار سے باہر

---

[1] ۱۔ شاہ عبدالعزیز : ہندوستان کے قابلِ فخر اور مایہ ناز محدث حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے نامور فرزند اور نہایت قابل اور عالمِ با عمل بزرگ تھے ۔ تفسیر فتح العزیز ، تحفہ اثنا عشریہ اور سرّ الشہادتین آپ کی مشہور کتابیں ہیں ۔ ۱۱۵۹ھ (۱۷۴۶ع) میں پیدا ہوئے اور ۱۲۳۹ھ (۱۸۲۴ع) میں انتقال فرمایا ۔ (اسماعیل)

نہیں نکلتے اور مقتضائے وقت کو نہیں دیکھتے ۔ نہ آپ ترقی کرنا چاہتے ہیں اور نہ اوروں کی ترقی کو پسند کرتے ہیں ۔ جو شخص اپنی پست حالت سے نکل کر اچھی حالت میں آنا چاہتا ہے ، اُس کو نرا متلون مزاج یا بے استقلال ہی نہیں بتاتے بلکہ اس پر انواع و اقسام کی رائیں لگاتے ہیں جن میں سب سے ہلکا الحاد کا فتویٰ ہے ۔

شایستہ ملکوں میں آج کل ترقی کی یہ صورت ہے کہ جو شخص پانچ سات برس کہیں پردیس میں رہ آتا ہے وہ اس قابل نہیں رہتا کہ وطن میں پہنچ کر اُسی وقت وہاں کی عام مجلسوں میں شریک ہوجائے ۔ جتنے دنوں وہ باہر رہتا ہے اتنی مدت میں وہاں اس قدر ترقی ہوجاتی ہے کہ یہ وہاں پہنچ کر ایک دوسرا عالم دیکھتا ہے اور اپنے تئیں اس شعر کا مصداق پاتا ہے :

عبارت کوتہ و دل تنگ و خاصان ملک زیبا
چہ داند مرد صحرائی طریق کارسازی را

سچ یہ ہے کہ آیۃ ''کل یوم ھو فی شان'' کے معنی ایسے ہی ملکوں میں جا کر کھلتے ہیں ، اور انسان کا اشرف المخلوقات اور خلیفۃ الرحمان ہونا وہیں جا کر ثابت ہوتا ہے کہ ہندوستان میں اور خاص کر ہمارے بھائی مسلمانوں میں ، جن کی حالت کو دیکھ کر خدا تعالیٰ کی قدرت اور اس کی فیاضی ایک خاص حد تک محدود معلوم ہوتی ہے اور اس آیت کے معنی صرف اعتقاداً تسلیم کرنے پڑتے ہیں کہ[1] ''ولقد کرمنا بنی آدم و حملنٰھم فی البر و البحر و رزقنٰھم من الطیبات و فضلنٰھم علی کثیر ممن خلقنا تفضیلا ۔''

---

[1] ۱۔ یہ آیت پندرھویں پارے اور سورۂ بنی اسرائیل کے ساتویں رکوع کے آخر میں ہے ، یعنی ''اور البتہ ہم نے بزرگی دی انسان کو اور اس کو بحر و بر پر حاکم بنایا اور تمام پاکیزہ اشیاء میں اس کے لیے سامان معاش رکھے اور جتنی چیزیں ہم نے پیدا کی ہیں اُن میں سے اکثر پر انسان کو فضیلت دی ۔'' (اسماعیل)

بار خدایا! ہماری قوم کو تقلیدِ بے جا اور وضع داریِ بے سروپا سے نجات دے اور اُن کو دینی اور دنیوی ترقیات پر آمادہ کر ۔ اُن کا ادب اُن کو قدماء سے آگے نہیں بڑھنے دیتا اور اُن کی وضع‌داری اُن کو پستی سے بلندی کی طرف نہیں جانے دیتی ۔ کاش! یہ بے ادب اور متلون مزاج ہی بن کر قدم آگے بڑھائیں اور جوہرِ قابل کی قدر پہچانیں جو تُو نے بنی نوع انسان کے تمام اگلے اور پچھلے طبقوں کو یکساں عنایت کیا ہے :

سر روحانیاں داری بلے خود را نہ دیدستی
بخواب خود درآ تا قبلۂ روحانیاں بینی

۲

بدگمانی

(از رسالہ 'تہذیب الاخلاق' بابت ۱۲۹۶ھ مطابق ۱۸۷۹ع صفحہ ۳۱)

> 'بدگمانی' پر شاید اس سے بہتر مضمون آج تک کسی نے نہیں لکھا ۔ نہایت ہی دل نشیں زبان میں اور بڑی سلاست اور روانی کے ساتھ اس میں مولانا نے بدگمانی کے نقصانات گنوائے ہیں ۔ مضمون دل چسپ بھی ہے اور اثر انگیز بھی ، مگر اس مضمون کا نقطۂ مرکزی یہ ہے کہ جو عام بدگمانی اور بدظنی عام طور پر علی گڑھ کالج سے پیدا ہو رہی تھی ، جو اُس وقت نیا نیا قائم ہوا تھا ، اُسے دور کیا جائے اور مسلمانوں کو ترغیب دی جائے کہ وہ اپنے بچے علی گڑھ کالج میں تعلیم کے لیے بھیجیں ۔ (محمد اسماعیل)

بدگمانی انسان کی ایک ایسی بدخصلت ہے جس سے اکثر خود بدگمانی کرنے والے کو ، نیز اُس شخص کو جس پر وہ بدگمانی کرتا ہے ، تھوڑا یا بہت نقصان ضرور پہنچتا ہے ۔ اسی واسطے کلام الٰہی میں ارشاد ہوتا ہے کہ ''یا ایہا الذین آمنوا اجتنبوا کثیراً من الظن ان بعض الظن اثم ۔''

یعنی ''اے دین دارو! بہت بدگمانیوں سے بچو ۔ بے شک بعضے گمان گناہ ہیں ۔''

بدگمانی کرنے کی عادت اکثر نکمی تعلیم اور ناقص سوسائٹی سے انسان کے دل میں پیدا ہوتی ہے ۔

(۱) مثلاً ایک سچا مسلمان محض انصاف کی رو سے عیسائی پادریوں کے اخلاق کی تعریف تمھارے سامنے کرتا ہے ؛ اب اگر تم سدا سے ایسی صحبتوں میں رہے ہو جہاں غیر مذہب کے آدمیوں کا نام ہمیشہ حقارت سے لیا جاتا ہے تو تم کو غالباً یہ گمان ہوگا کہ یہ شخص عیسائی مذہب کی طرف میلان رکھتا ہے یا در پردہ عیسائی ہے ۔

(۲) یا مثلاً ایک شخص شیعی اپنے ہم مذہبوں سے کہتا ہے کہ ائمہ علیہم السلام نے تبرا کرنے سے منع کیا ہے ۔ اب اگر وہ لوگ ہمیشہ سے خود بھی تبرا کرتے رہے ہیں اور اپنے مجتہدوں سے بھی سنتے رہے ہیں تو ضرور اُس کو شیعوں کا مخالف اور سنیوں کا طرف دار خیال کریں گے ۔

(۳) اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی دوسرے شخص کو اپنے نفس پر قیاس کرکے اُس سے بدگمان ہو جاتا ہے ؛ مثلاً ایک شخص اپنے ملک یا قوم کی بھلائی میں بے غرضانہ کوشش کرتا ہے ، مگر اُس ملک یا اُس قوم کے وہ آدمی جو خود غرضی میں ڈوبے ہوئے ہیں ، اُس کی کوشش کو بھی خود غرضی ہی پر محمول کرتے ہیں ۔

(۴) یا مثلاً ایک شخص اہل یورپ کو ، جو کہ حاکم وقت ہیں ، سچا اور راست باز اور خوش معاملہ سمجھ کر اُن سے زیادہ میل جول رکھتا ہے ، مگر وہ لوگ اُن سے اس حیثیت سے نہیں ملتے ، تو وہ اُس کو بھی اپنی طرح ایک خوشامدی اور گوں گیرا اور گھاتیا سمجھتے ہیں ۔

(۵) بعض اوقات ناواقفیت اور بے علمی سے بھی سخت بدگمانی پیدا ہوتی ہے ؛ مثلاً ایک شخص انگریزی طریقے پر کھانے پینے کو اس لیے پسند کرتا ہے کہ اس کے تجربے میں وہ طریقہ صحت کے واسطے نہایت مفید ثابت ہوا ہے مگر جن لوگوں کو اس طریقے کا تجربہ نہیں ہوا ، وہ اس شخص کی نسبت طرح طرح کی بدگمانیاں کرتے ہیں ۔

(۶) یا مثلاً ایک دانا گورنمنٹ ، جو مختلف قوم و مذہب کی رعایا پر حکم ران ہے ، اپنے مدارس میں کسی خاص مذہب کی تعلیم کو جاری نہیں رکھتی ، مگر جو لوگ اُس گورنمنٹ کے دانش مندانہ اصول سے ناواقف ہیں ، وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ گورنمنٹ ہمارے مذہب کو نیست و نابود کرنا چاہتی ہے ۔

(۷) کبھی بدگمانی کا سبب یہ ہوتا ہے کہ جن لوگوں کے اخلاق و عادات قوم کے عام اخلاق و عادات کے برخلاف ہوتے ہیں اُن کی نسبت سوء ظن پیدا ہوتا ہے ؛ مثلاً ایک قوم میں حد سے زیادہ بناوٹ ، تکلف ، ساختگی اور ظاہرداری کا دستور ہے ۔ اب اگر کوئی شخص اُس قوم میں روکھا پھیکا ، سادہ مزاج اور کھرا پایا جائے گا وہ ضرور ایک متکبر ، مغرور ، بدمزاج اور اکل کھرا تصور کیا جائے گا ۔

(۸) یا مثلاً ایک خاندان کے آدمی اکثر مُسرف ، فضول خرچ ، لہو و لعب میں زندگی بسر کرنے والے اور نمایش پر مرنے والے ہیں ۔ اب اگر اُن میں کوئی شخص اُس روش کے خلاف پایا جائے گا تو گو وہ کیسا ہی فیاض ، جوان مرد ، بامروت اور کنبہ پرور مگر کفایت شعار اور منتظم ہو ، خاندان کے تمام آدمی اُس کو خسیس ، دنی الطبع ، کنٹک اور مکھی چوس خیال کریں گے ۔

(۹) بعضے لوگ اس دھوکے میں کہ ہمارا ذہن دور دور پہنچتا ہے اور ہم لوگوں کے دل کی بات سمجھ لیتے ہیں ، اکثر بدگمانیاں کیا کرتے ہیں ؛ مثلاً ایک شخص گورنمنٹ کے کسی قانون یا کسی پالیسی کو رعایا کے حق میں مضر سمجھ کر اس پر آزادانہ اعتراض یا نکتہ چینی کرتا ہے ، مگر ’’وہ دل کی بات سمجھنے والے لوگ‘‘ یہ کہتے ہیں کہ چوں کہ یہ شخص گورنمنٹ کو آزادی پسند جانتا ہے لہٰذا اس پردے میں گورنمنٹ پر اپنی لیاقت اور دانش مندی

ظاہر کرنی چاہتا ہے ۔

(۱۰) یا مثلاً ایک شخص مذہب اور حکمت میں اس لیے تطبیق کرتا ہے کہ جب قوم میں حکمت شائع ہو جائے تو قوم کے تعلیم یافتہ نوجوان مذہب کو عقل کے خلاف سمجھ کر اُس سے تجاوز نہ کریں ۔ مگر وہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ شخص گورنمنٹ کے ایما سے یا گورنمنٹ کے خوش کرنے کے لیے لوگوں کو لامذہب اور ملحد بنانا چاہتا ہے تاکہ سلطنت کو مذہبی مخالفت اور تعصبات کا کھٹکا نہ رہے ۔

(۱۱) اکثر بدگمانی کا سبب یہ بھی ہوتا ہے کہ کسی ایک برائی یا ایک غلطی کی وجہ سے ، جو کہ بشریت کا خاصہ ہے ، انسان کی تمام خوبیوں پر خاک ڈال دی جاتی ہے اور اُس کی کسی بات پر نیک گمان نہیں کیا جاتا : مثلاً ایک سچا ، راست باز اور دیانت دار آدمی کسی معاملے میں غلطی سے کوئی ایسی بات کر بیٹھا جو راستی کے خلاف معلوم ہوتی ہے ، تو اس کے بعد اب وہ کسی معاملے میں راست باز نہیں سمجھا جاتا ۔

(۱۲) یا مثلاً ایک لائق اور دانش مند آدمی سے کوئی ایسی لغزش ہوگئی جو عقل کے خلاف معلوم ہوتی ہے ، تو پھر اُس کی رائے پر اعتماد نہیں کیا جاتا ۔

(۱۳) بعضے لوگ بات کا محل اور موقع نہ سمجھنے سے بھی بدگمان ہو جاتے ہیں : مثلاً ایک شخص سچی محبت اور بے ریا عشق کے جوش میں حضور رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو کبھی صرف محمدؐ ، کبھی صرف ابوالقاسمؐ ، کبھی آمنہ کا اکلوتا بیٹا اور کبھی بنی سعد کی بکریاں چرانے والا اپنی بے ساختہ تحریروں میں لکھ جاتا ہے اور تعظیم کے رسمی اور عرفی الفاظ نہیں لکھتا ، تو وہ لوگ جو حسن بیان اور لطف تحریر کی گھاتوں سے واقف نہیں ہیں اور تعظیم کو

انھی رسمی اور عرفی الفاظ میں منحصر جانتے ہیں ، ضرور خیال کریں گے کہ اس شخص کے دل میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی کچھ عظمت نہیں ہے ۔

(۱۴) یا مثلاً اسلام کا ایک ظریف رفارمر دوسرے رفارمر کو اپنی پرائیویٹ تحریر میں لکھتا ہے کہ ”میں نے یہاں بہتیرے جال ڈالے مگر کوئی پنچھی دام میں نہ آیا“ تو سادہ لوح مسلمان یا زاہدِ خشک اگر وہ خط دیکھ پائیں گے تو اُن کو اس بات کا پختہ یقین ہو جائے گا کہ ان لوگوں نے اسلام کے برخلاف سازش کر رکھی ہے اور یہ مسلمانوں کو مرتد کرنا چاہتے ہیں ۔ مگر ایک سمجھ دار آدمی صرف یہ کہہ کر خاموش ہو جائے گا کہ ایسی ظرافت رفارمر کی شان سے بعید ہے ۔

(۱۵) ابلہانہ حزم و احتیاط بھی اکثر بدگمانی کا باعث ہوتی ہے : مثلاً ایک خوش معاملہ اور دانا گورنمنٹ ملکی معاملات کی صفائی کے لیے ہمسایہ ملک میں اپنا مشن بھیجنا چاہتی ہے ۔ مگر اُس ملک کے ارکان سلطنت یہ سمجھ کر کہ مبادا اس مشن کے آنے سے ہماری حکومت یا اقتدار میں کچھ فرق آ جائے ، مشن کو اپنے ملک میں نہیں آنے دیتے ۔

(۱۶) یا مثلاً ایک ہائی اسکول یا کالج سے اکثر طالب علم لائق ، نیک چلن اور صاحب علم ہوکر نکلتے ہیں مگر ایک وہمی مزاج رئیس اس خیال سے کہ مبادا میری اولاد وہاں جاکر غیر جنس لڑکوں کی صحبت میں آوارہ ہو جائے اپنی اولاد کو وہاں نہیں بھیجتا ۔

یہ تمام اسباب جو بدگمانی کے لکھے گئے ، سرسری نظر میں سب ایک دوسرے سے جدا معلوم ہوتے ہیں مگر غور کرنے کے بعد ظاہر ہوتا ہے کہ یہ سب ایک عام سبب سے پیدا ہوتے ہیں جس کو بدگمانی کا اصل اصول سمجھنا چاہیے ۔ جس بدبخت قوم کا اخلاق قوام

بگڑ جاتا ہے اور اس کے تمام فرقوں میں ناراستی اور بے دیانتی شائع ہو جاتی ہے تو اُس قوم کے خاص و عام کو مجبوراً نہ صرف اپنی قوم سے بلکہ ساری دنیا سے بدگمان ہونا پڑتا ہے ۔

جب لوگ متواتر دوستوں سے بیوفائی اور بھائی بندوں سے دغا اور بے مہری دیکھتے ہیں ، اور خود بھی اُن کے ساتھ ویسا ہی برتاؤ برتتے ہیں تو اُن کو تمام جہان میں کوئی صادق دوست نظر نہیں آتا ۔ جب وہ علماء کی بد دیانتی اور مشائخوں کا مکر و فریب اور زاہدوں کی ریاکاری اور عابدوں کی جو فروشی اور گندم نمائی دیکھتے ہیں تو اُن کو ساری دنیا مکر و زور سے بھری ہوئی معلوم ہوتی ہے ، اور فرشتے پر بھی اُن کو نیک گمان نہیں ہوتا ۔ وہ نہ صرف غیروں سے بلکہ خود اپنے سے بھی بدگمان ہو جاتے ہیں ۔ جس طرح وہ سب کو جھوٹا اور مکار اور خود غرض سمجھتے ہیں اسی طرح وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ لوگ ہم کو جھوٹا اور مکار اور خود غرض سمجھتے ہیں ۔ اور اسی لیے وہ کوئی وعدہ بغیر تاکید شدید کے زبان سے نہیں نکالتے اور کوئی روایت بغیر سوگند اور قسم کے نہیں بیان کرتے اور کوئی بات بغیر سند اور شہادت کے نہیں کہتے ، خواہ مخاطب کی طرف سے درخواست ہو یا نہ ہو ۔ گویا وہ یہ جتاتے ہیں کہ ہماری کوئی بات اعتبار کے قابل نہیں ہے ۔ اُن کو جا بہ جا خوشامد اور تملق کرنا پڑتا ہے ، کیوں کہ وہ جانتے ہیں کہ ہماری خیر خواہی اور دوستی پر بغیر ایسی باتوں کے یقین نہیں آ سکتا ۔ تم نے اکثر نمود اور شیخی کرنے والوں کو دیکھا ہوگا کہ ایک آدھ جھوٹا سچا گواہ اُن کے ساتھ ہر وقت لگا رہتا ہے ۔ جب وہ کوئی واقعہ بیان کرتے ہیں تو بات بات پر اُس گواہ کا حوالہ دیتے جاتے ہیں کہ ''یہ بھی وہاں موجود تھے ، ان سے پوچھیے ۔'' گویا وہ اپنے کو ایسا جھوٹا سمجھتے ہیں کہ اُن کی کوئی بات بغیر شہادت کے قابل تسلیم نہیں ۔ تم نے بعضے مصنفوں کو دیکھا ہوگا کہ وہ حد سے زیادہ بدیہی اور مسلّم الثبوت دعوے پر بھی جب کسی کا قول سنداً نقل کرتے ہیں تو اُس مصنف کا نام ، کتاب کا نام ، باب اور فصل کا پتا ، صفحہ اور سطر کا شمار ، سنہ طباعت ، مقام طبع ، مطبع کا نام ، اور سوائے اس کے اور بھی پتے مفصل لکھتے ہیں حالاں کہ اُن دعووں کے تسلیم کرنے میں ، جن کی تائید میں وہ یہ مفصل سندیں لکھتے ہیں ، کسی کو بھی کلام نہیں ہوتا ۔ مگر اُن کو اپنی بے اعتباری کا ایسا پختہ یقین ہوتا ہے کہ اگر اُن کی کتاب ضروری مقدار سے دس گنی زیادہ ہو جائے تو بھی وہ اس تفصیل سے باز نہیں آ سکتے ۔[1]

یہ اور ایسی ہی بے شمار مثالیں اس بات کی ہیں کہ جب کسی قوم کے عام اخلاق بگڑ جاتے ہیں تو اُس قوم کے لوگ نہ صرف اوروں سے بلکہ اپنے نفس سے بھی بدگمان ہو جاتے ہیں ۔

ہم اپنے ملک میں اور خاص کر اپنی قوم میں بدگمانی کا حال ایسا ہی دیکھتے ہیں ۔ گاہک سچے دوکان داروں کو بھی سچا نہیں جانتے ، کیوں کہ انھوں نے بڑے بڑے نیک سخنوں سے دھوکے کھائے ہیں ۔ دنیا دار آپس میں ایک دوسرے کو خائن اور بددیانت سمجھتے ہیں ، کیوں کہ انھوں نے بڑے بڑے دنیا داروں کو ایسا ہی پایا ہے ۔

---

[1] مولانا کا یہ فقرہ سمجھ میں نہیں آیا ۔ جب ہم کسی مضمون میں کسی شخص کا کوئی مقولہ درج کرتے ہیں تو ہم پر لازم ہو جاتا ہے کہ اس کا پورا حوالہ وہاں نقل کر دیں ۔ تمام دنیا کے مصنف اور مولف یہی کرتے ہیں اور اسی کو دیانت اور امانت سمجھتے ہیں ۔ بغیر حوالے کے کوئی بات خواہ وہ کتنا بڑا آدمی کہے ، قابل قبول نہیں ہو سکتی ۔ مقولے کے علاوہ بھی تاریخی اور علمی کتابوں میں حوالے دینے ضروری ہوتے ہیں تا کہ جو شخص اس مضمون پر مزید تحقیق کرنی چاہے اُسے آسانی ہو ۔ خود مولانا نے اپنے تمام مضمونوں میں دوسرے لوگوں کے مقولے بکثرت بیان کیے ہیں ۔ دوسری کتابوں کے اقتباسات اپنے دعوے کے ثبوت میں پیش کیے ہیں اور ہر جگہ مصنف اور اُس کی کتاب کا حوالہ درج کیا ہے ۔ (اسماعیل)

اگر کوئی دیانت دار کمیٹی ، قوم کی بہبودی اور اصلاح کے لیے کھڑی ہوتی ہے تو قوم کی طرف سے بجائے اعانت و امداد کے اُس کی مخالفت اور مزاحمت ہوتی ہے ، کیوں کہ قوم کے سرگروہوں کی متواتر خیانتوں نے کسی کو اعتبار اور اعتماد کے لائق نہیں چھوڑا ۔

ایک شخص کی بدگمانی سے جو مضر نتیجے پیدا ہوتے ہیں ، وہ اکثر ایک یا چند آدمیوں سے زیادہ کو نقصان نہیں پہنچاتے ۔ لیکن جب کسی ملک یا قوم کی عام طبیعتوں میں بدگمانی کا بیج بویا جاتا ہے تو اُس سے تمام ملک یا تمام قوم کو مضرت پہنچتی ہے ۔ عام بدگمانی سے اکثر ایسا ہوا ہے کہ فوج اپنے بادشاہ سے منحرف اور رعایا باغی ہو گئی ہے اور اس کے برے ثمرے فوج اور رعایا دونوں کو سال ہا سال تک بھگتنے پڑے ہیں ۔

افسوس ہے اور نہایت افسوس ہے کہ ہماری قوم میں بھی یہی عام بد گمانی پھیلی ہوئی ہے جس کے سبب سے اس کو طرح طرح کے نقصان اٹھانے پڑتے ہیں . . . . . . اور اُٹھانے پڑیں گے ۔

ابتدا میں وہ گورنمنٹ سے بدگمان تھے اور ان کو یہ خیال تھا کہ ’’سرکار ہم کو عیسائی بنانا چاہتی ہے ۔ پادری جو جا بہ جا تبلیغ عیسائیت کرتے پھرتے ہیں ، یہ سرکار ہی کی طرف سے اس کام پر مامور ہیں ، اور انگریزی مدارس بھی اسی لیے قائم کیے گئے ہیں کہ ہم لوگ رفتہ رفتہ اپنے دین سے بے خبر ہو کر آخر کو دینِ عیسوی اختیار کر لیں ‘‘۔ اس بیہودہ اور باطل خیال سے جو بے شمار نقصان انھوں نے اٹھائے ہیں ، اُن کا اندازہ کرنا مشکل ہے ۔ اگر یہ پوچھا جائے کہ :

(الف) کیوں سرکاری دفتر مسلمانوں سے خالی ہیں ؟

(ب) کیوں تجارت اور صنعت کی فہرست میں مسلمانوں کا نام نہیں پایا جاتا ؟

(ج) کیوں اُن کی ناداری اور افلاس روز بروز بڑھتا جاتا ہے ؟

(د) کیوں اُن کے خاندان برابر مٹتے چلے جا رہے ہیں ؟

(ہ) کیوں اُن کی اولاد میں بد خصلتیں سب سے زیادہ پائی جاتی ہیں ؟

(و) کیوں اُن کے رئیس اور امیر نالائق اور کندہ نا تراش ہوتے ہیں ؟

تو شاید ان سب سوالات کا جواب یہی ہوگا کہ ’’اُن کی بدگمانی سے‘‘—

اب چند سال سے قوم کی ایک خیرخواہ جماعت نے قوم کی تعلیم و تربیت کا سامان مہیا کرنے پر کمر باندھی ہے اور علی گڑھ میں ایک ایسا قومی مدرسہ قائم کیا ہے جس کی نظیر ایشیا کی تاریخ میں نہیں پائی جاتی ۔ اُس نے قوم کی بدگمانی رفع کرنے میں بھی حتی‌الامکان کوشش کی ہے اور کوئی دقیقہ اُن کی دل جمعی اور اطمینان کا فروگزاشت نہیں کیا ، مگر قوم کی بدگمانی بدستور چلی جاتی ہے ۔ وہ برابر آنکھوں سے دیکھتے اور کانوں سے سنتے ہیں کہ :

(۱) ہر سال اس مدرسے میں طالب علموں کی ایک معتد بہ مقدار توقع سے زیادہ کامیاب ہوتی ہے (حالاں کہ اُس کے قیام کو کچھ بھی زمانہ نہیں گزرا) ۔

(۲) وہاں تعلیم کے ساتھ ساتھ تربیت میں بھی بہت زیادہ اہتمام کیا جاتا ہے جس سے مسلمانوں کی اولاد کے واسطے ہمیشہ کے لیے اخلاق کی جڑ قائم ہوتی ہے ۔

(۳) وہاں طالب علموں کی حفظ صحت کا خیال بھی ، جو کہ نہایت ضروری چیز ہے ، حد سے زیادہ کیا جاتا ہے ۔

(۴) اُن کو مذہبی قواعد کا بھی کمال قدغن کے ساتھ پابند کیا جاتا ہے ۔

(۵) اُن کو دنیوی تعلیم کے ساتھ ساتھ دینی تعلیم بھی دی جاتی ہے ۔

غرض تعلیم و تربیت کا سامان وہاں اس قدر مہیا ہے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی اولاد کے لیے اس سے بڑھ کر ہرگز نہیں ہو سکتا ۔ لیکن باوجود ان سب باتوں کے بہت سے بے پروائی سے ، بہت سے عناد سے اور سب سے زیادہ بدگمانی سے اس چشمۂ فیض سے محروم ہیں ۔ اور اس قوم کی ترقی کی طرف سے ایسی سخت مایوسی ہوتی ہے جس کا تدارک ناممکن معلوم ہوتا ہے ۔ بھوکے کو کھانا اور پیاسے کو پانی میسر نہ آنے سے بھی سخت مایوسی ہوتی ہے ، لیکن یہ اُس مایوسی سے بہت کم ہے کہ کھانا اور پانی موجود ہو لیکن بیمار نہ کھانا کھا سکے نہ پانی پی سکے ۔ ایسا بیمار کوئی دم کا مہمان ہوتا ہے ۔ نہ طبیب اُس کے کام آ سکتا ہے ، نہ تیماردار اُس کی مدد کر سکتا ہے ۔

ہم نہیں کہتے کہ ہمارے مسلمان اس باب میں کسی کے کہنے سننے پر التفات کریں ، بلکہ اُن کو چاہیے کہ انصاف اور بے تعصبی سے مدرسۃ العلوم کا حال دیکھیں اور سمجھیں کہ جو کچھ ہم اُس کی نسبت کہتے ہیں ، وہ صحیح ہے یا غلط :

آفتاب آمد دلیل آفتاب
گر دلیلے بایدت زو رو متاب

۳

مزاح

(رسالۂ تہذیب الاخلاق بابت ۱۲۹۶ھ مطابق ۱۸۷۹ع صفحہ ۲۵۸)

مزاح ، جس کے معنی خوش طبعی اور خوش ذوق کے ہیں ؛ ظرافت ، جس کے معنی زیرکی اور ہوشیاری کے ہیں ؛ مطائبہ جس کے معنی شائستہ ذوق اور خوش مزاجی سے پیش آنے کے ہیں ، بد قسمتی سے ہماری زبان میں اور ہماری معاشرت میں ان الفاظ کے معنی ہنسی ، ٹھٹھا ، فحش و ہزل اور مسخریت و لغویت کے ہوگئے ہیں ۔ انتہا یہ ہے کہ ناچ گانے کی محفلوں اور رقص و سرود کی مجلسوں کو ہم ثقافت کا نام دے رہے ہیں ۔ اسی بدذوقی کی تشریح مولانا نے اس مضمون میں کی ہے اور نہایت ہی سلیس اور دل نشیں پیرائے میں بتایا ہے کہ حقیقی مزاح کسے کہتے ہیں اور آج کل اس لفظ کی کتنی مٹی پلید ہو رہی ہے ۔ وہ لفظ جس کے متعلق پہلے کہا جاتا تھا کہ ”المزاح فی الکلام کالملح فی الطعام“ آج کل کس قدر بدنام ہو گیا ہے اور کیسے بُرے معنوں میں استعمال کیا جانے لگا ہے :

مولانا کا یہ اعلیٰ درجے کا مضمون جہاں نہایت درجہ اصلاحی ہے ، وہاں مزاح کی پوری تاریخ بھی اپنے اندر محفوظ کیے ہوئے ہے ۔ مولانا نے زمانۂ جاہلیت سے لے کر اپنے زمانے تک کی مزاح کی تاریخ بڑی روانی کے ساتھ اس میں

بیان کی ہے اور بتایا ہے کہ مختلف دوروں اور مختلف سلطنتوں میں مزاح کی کیا کیا کیفیت رہی ہے۔ اخلاق اصلاح کے لیے اس مضمون کا مطالعہ نہایت نفع بخش ثابت ہوگا۔ (محمد اسماعیل)

مزاح ، جس کو غلطی سے مذاق کہنے لگے ہیں ، انسان کی ایک جبلّی خاصیت ہے جو کم و بیش تمام افراد میں پائی جاتی ہے۔

مزاح کو عربی ، فارسی اور اردو میں تین مختلف القاب دیے گئے ہیں ، یعنی :

۱۔ مطائبہ۔ ۲۔ خوش منشی۔ ۳۔ خوش طبعی۔

یہ تینوں لقب اس بات پر دلالت کرتے ہیں کہ مزاح کا موضوع لہ 'خوشی' کے سوا اور کوئی چیز نہیں ہے۔ روزانہ محنت و مشقت جو ہر انسان کا فرض ہے ، اس کے بعد ہر شخص ایسے مشغلے ڈھونڈتا ہے جن میں تھوڑی دیر دل بہلے اور دن بھر کی کوفت رفع ہو اور ایسے اوقات میں کوئی مشغلہ مزاح سے بہتر نہیں ہے۔

ہم اپنی زبان میں مزاح کا ترجمہ ہنسی ، چہل ، دل لگی ، ٹھٹھول وغیرہ کر سکتے تھے ، مگر افسوس ہے کہ اس ہماری زبان میں یہ الفاظ صرف مزاح کے مترادف نہیں رہے بلکہ اُس میں 'لُچپن ، شہدپن ، مسخرگی ، فحش ، دشنام ، بےحیائی ، دھول دھپا ، جوتی پیزار بھی شامل ہیں۔

مزاح جب تک مجلس کا دل خوش کرنے کے لیے (نہ کہ کسی کا دل دکھانے کے لیے) کیا جائے ، ایک ٹھنڈی ہوا کا جھوکا یا ایک سہانی خوش بُو کی لپٹ ہے جس سے تمام پژمردہ دل باغ باغ ہو جاتے ہیں۔ ایسا مزاح فلاسفہ و حکما بلکہ اولیا و انبیا نے بھی کیا ہے۔ اس سے مرے ہوئے دل زندہ ہوتے ہیں اور تھوڑی دیر کے لیے تمام پژمردہ کرنے والے غم غلط ہو جاتے ہیں۔ اس سے جودت اور ذہن

کو تیزی ہوتی ہے اور مزاح کرنے والا سب کی نظروں میں محبوب اور مقبول ہوتا ہے۔

برخلاف اس کے جب وہ اس حد سے بڑھنے لگتا ہے تو دم بدم ہولناک ہوتا جاتا ہے اور آخر کو اُس سے بجائے محبت کے دشمنی اور بجائے خوشی کے غم پیدا ہوتا ہے۔ وہ مزاح اخلاق کو اس طرح کھا جاتا ہے جیسے لوہے کو زنگ یا لکڑی کو گھن۔

اور اس قسم کا مزاح کرنے والا ایسا بے دید ہو جاتا ہے کہ غیروں کو ہنسانے کے لیے اپنے عزیز دوست کا خاکہ اُڑانے لگتا ہے ، وہ ایسا بےباک ہو جاتا ہے کہ (نعوذ باللہ) خدا اور رسول پر بھی اُس کی ایک آدھ پھبتی ہوئے بغیر نہیں رہتی۔

وہ ایسا کذّاب ہو جاتا ہے کہ بری خبریں جن کو سن کر خاص یا عام لوگوں کو رنج ہو ، نہایت خوشی سے اُڑاتا ہے۔

وہ ایسا بے غیرت ہو جاتا ہے کہ اس کو سخت سے سخت گالی بھی ناگوار نہیں گزرتی۔

وہ ایسا مفسد ہو جاتا ہے کہ باتوں باتوں میں لڑائی کرا دینی اُس کے نزدیک ایک کھیل اور معمولی بات ہوتی ہے۔

غرض تمام دنیا کے عیب مزاح کی زیادتی سے انسان میں پیدا ہو جاتے ہیں۔

مزاح کے بڑھنے کے مختلف اسباب ہوتے ہیں مگر ہم یہاں وہ خاص سبب بیان کرنا چاہتے ہیں جس کی وجہ سے مزاح کسی خاص قوم میں رفتہ رفتہ تمسخر اور استہزا بلکہ فحش و دشنام کے درجے کو پہنچ کر انسانی خصلت سے ایک قومی خصلت بن جاتا ہے اور اس قدر عام ہو جاتا ہے کہ اُس کی برائی اور عیب نظروں سے ساقط ہو جاتا ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ آج کل ہنسی اور چہل میں جو امتیاز ہماری

قوم کو حاصل ہے، وہ تمام ہندوستان میں کسی قوم کو حاصل نہیں ہے۔

(۱) جتنے ضلع پھکڑ بولنے والے اور پھبتیاں کہنے والے پیدا ہوتے ہیں ، اسی قوم میں پیدا ہوتے ہیں ۔

(۲) جتنی گالیاں ایک مسلمان شریف زادے کو یاد ہوتی ہیں ، کسی کو نہیں ہوتیں ۔

(۳) تمام ہندوستان میں جتنے ''پنچ اخبار'' ہیں اُن کے اڈیٹر ، پروپرائٹر (مالک) اور کارسپانڈنٹ (نامہ نگار) اسی قوم کے زندہ دل ہیں[1]۔

(۴) ہندوستانی امیروں اور امیر زادوں کی مجلس میں جتنے مسخرے اور رونق محفل پاؤ گے اسی قوم کے پاؤ گے ۔

(۵) واعظوں میں جتنے لطیفہ گو اور بذلہ سنج دیکھو گے اسی قوم کے دیکھو گے ۔

(۶) فحش اور بے حیائی کی کتابوں میں ایک بھی ایسی نہ ہوگی جس کا مصنف مسلمان نہ ہوگا ۔

(۷) مناظرے کی کتابیں اسی قوم کے عالموں کی ایسی نکلیں گی جن میں ستم ظریفی کا پورا پورا حق ادا کیا گیا ہوگا ۔

(۸) شاعروں میں کوئی ہاجی ، ہزل گو ، ریختی گو اور گندہ دہن ایسا نہ ہوگا جو قوم کا مسلمان نہ ہو ۔

---

[1] اُس وقت جو مزاحیہ اخبارات مختلف شہروں سے نکلتے تھے ، اُن میں سے بعض کے نام یہ ہیں : سرپنچ ہند لکھنؤ ، اخباروں کا قبلہ گاہ اور اُس کا ضمیمہ پنجاب پنچ لاہور ، کلکتہ پنچ کلکتہ وغیرہ ۔ مگر ان سب اخباروں کا سرپنچ ''اودھ پنچ'' لکھنؤ تھا جس کے ایڈیٹر منشی سجاد حسین تھے ۔ یہ اخبار ہزل ، فحش اور پھکڑ پن میں اُس وقت کے تمام مزاحیہ اخبارات کا سرتاج تھا ۔ شرفا کی پگڑیاں اچھالنا اور معززین کو نہایت ذلیل ناموں سے یاد کرنا اس اخبار کا دن رات کا شیوہ تھا ۔ غرض پھکڑ پن میں اپنی کوئی دوسری نظیر نہ رکھتا تھا ۔ (محمد اسماعیل)

(۹) داستان کہنے والوں میں صرف ایک شخص ایسا سنا گیا ہے جو اصل میں قوم کا مسلمان نہ تھا لیکن آخر اس کو بھی مسلمان ہونا پڑا ۔

الغرض اس قوم کی فصاحت ، ذہانت اور فضیلت جس قدر مزاح میں صرف ہوتی ہے ، ویسی کسی اور کام میں نہیں ہوتی ۔

یہاں نہایت تعجب کے ساتھ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کمینہ خصلت اسی قوم کے حصے میں کیوں آئی ہے ؟ شاید اس کا یہ جواب دیا جائے کہ تنزل کے زمانے میں ہر ایک قوم کے فضائل ، رذائل کے ساتھ بدل جاتے ہیں اور تمام کمینہ خصلتیں اور سفلہ عادتیں خاص و عام میں خواہ مخواہ پیدا ہو جاتی ہیں ، لیکن غور کرنے کے بعد یہ جواب ناکافی معلوم ہوتا ہے ، کیوں کہ ابھی یہ بات غیرمنفصل ہے کہ قومی تنزل اخلاق کے بگڑنے کا باعث ہوتا ہے یا اخلاق کا بگڑنا قومی تنزل کا باعث ہوتا ہے ۔ پس وہی سوال اب بھی باقی رہتا ہے ۔

البتہ ایک اور جواب ہمارے خیال میں آتا ہے جو غور کے قابل ہے : ادنیٰ توجہ سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مزاح کو جس قدر تعلق زبان اور الفاظ سے ہے ایسا کسی اور چیز سے نہیں ۔ خاص خاص صورتوں کے سوا ہمیشہ ہنسی اور چہل الفاظ ہی کے پیرایے میں کی جاتی ہے ۔

اُس زمانے میں جب کہ انسان کی اخلاقی تعلیم طفولیت کی حالت میں تھی اور اُس کی منہ زوری اور بدلگامی کا چنداں انسداد نہ ہوا تھا ، ضرور ہے کہ مزاح اور ظرافت نے اُن قوموں میں زیادہ رواج پایا ہوگا جن کی زبان میں اُس کی زیادہ قابلیت تھی ۔

جہاں تک ہم کو معلوم ہے ، کہہ سکتے ہیں کہ جاہلیت کے زمانے میں عرب کی زبان اُس وقت کی تمام زبانوں کی نسبت اس بات کی زیادہ قابلیت رکھتی تھی : اُس میں ایسے الفاظ کثرت سے تھے جو

دو معنی رکھتے ہوں اور دونوں ایک دوسرے کی ضد ہوں ؛ جیسے مولٰی کہ آقا اور غلام دونوں کو کہتے ہیں ۔

اُس میں ایسے الفاظ بھی بکثرت تھے جو بہت سے مختلف معنوں کے لیے وضع کیے گئے ہوں ؛ جیسے 'عین' کہ آنکھ ، چشمہ ، ذات اور سونے کو کہتے ہیں ۔

اُس میں مترادف الفاظ بھی بے شمار تھے ؛ یعنی ایک ایک معنی کے لیے کئی کئی لفظ مستعمل ہوتے تھے ، جیسے اسد ، لیث ، غضنفر وغیرہ ۔

اُس وقت عرب میں شاعری کا زور بھی اس قدر تھا کہ دنیا کی کسی زبان میں نہ تھا اور اس سبب سے مجاز ، کنایے اور استعارے کا وہاں سب جگہ سے زیادہ برتاؤ تھا ۔

یہ تمام باتیں جو اُوپر بیان کی گئیں ، ایسی ہیں جو اہل زبان کو مزاح کی طرف خود بخود مائل کرتی ہیں کیوں کہ مزاح میں زیادہ تر ایسے ہی لفظوں کا استعمال ہوتا ہے ۔

مزاح میں جو خوشی متکلم اور مخاطب کو حاصل ہوتی ہے ، وہ ایک طبعی بات ہے ۔ پس اگر اُس کی مزاحمت نہ کی جائے تو ضرور رفتہ رفتہ وہ حد اعتدال سے متجاوز ہو جاتا ہے اور تمسخر و استہزاء بلکہ فحش و دشنام تک نوبت پہنچ جاتی ہے ۔

عرب کا بھی ایسا ہی حال ہوا ؛ جس وقت خدا تعالٰی نے خاتم النبیینؐ کو مبعوث فرمایا اُس وقت یہ ذمیم خصلت اُن میں حد سے زیادہ پھیلی ہوئی تھی ۔

اُن کے ہاں سب و شتم و قذف کا کچھ عیب نہ تھا ۔

اُن کے مرد مردوں سے اور عورتیں عورتوں سے تمسخر و استہزاء کرتے تھے ۔

وہ ایک دوسرے کو برے ناموں اور برے القاب سے یاد

کرتے تھے ۔

اُن کے اشعار میں ہجو اور فحش کثرت سے ہوتا تھا ۔

چناں چہ بہت سی آیتیں قرآن میں اور بہت سی حدیثیں صحاح میں ایسی موجود ہیں ، جن سے معلوم ہوتا ہے ۔ کہ مزاح ، سخریت ، استہزا ، سب ، لعن ، قذف ، فحش ، بذأت ، لمز اور تنابز بالالقاب اُن کے ہاں شدت سے رائج تھا ۔

آنحضرت کی پاک تعلیم سے ، جیسا کہ آگے ذکر کیا جائے گا ، چند روز میں یہ تمام برائیاں نیست و نابود ہوگئیں اور صرف اس قدر مزاح باقی رہ گیا ، جو سوسائٹی کے لیے باعث زینت ہے ۔

خلاف راشدہ کے زمانے میں بھی یہی حال رہا بلکہ جو لوگ صاحب ہیبت و وقار تھے ، وہ اس پسندیدہ مزاح کو بھی پسند نہ کرتے تھے ؛ چناں چہ ایک بار حضرت عمر فاروقؓ کے سامنے چند صحابہ کے نام لیے گئے جو اُس وقت خلافت کے لائق سمجھے جاتے تھے ۔ اُنھوں نے ہر ایک کی نسبت کچھ کچھ اعتراض کیے اور حضرت علیؓ کے نام پر صرف یہ کہا کہ ”ھو رجل کثیرالدعابہ“ یعنی ان کے مزاج میں مزاح بہت ہے ۔

خلافت راشدہ کا زمانہ گزر گیا اور اسلام میں شخصی سلطنت کی بنیاد پڑی اور وہ وقت آیا جس کی نسبت مخبر صادقؐ نے ”ثم یصیر ملکاً عضوضاً“ کہا تھا تو تمام طبقات انام کو ایک خاص شخص کی مرضی اور رائے کا تابع ہونا پڑا ۔ فقیہوں نے خلفا کے جذبات نفسانی پورے کرنے کے لیے شرعی حیلے تراشنے شروع کیے ۔ شعراء کو فاسق و فاجر بادشاہوں کی مدح میں قصائد غرّا انشا کرنے پڑے ۔ مشیر اور ندیم بجائے مشورے اور صلاح نیک کے لطائف و مضحکات سے اُن کے دل لبھانے لگے ۔ چوں کہ مزاح اور ظرافت عرب کے خمیر میں تھی ، گو وہ نبیِ برحق کی تعلیم سے ایک مدت تک اس

کو بھولے رہے ، لیکن جب زمانے کی حالت خود اس کی محرک ہوئی تو پھر اپنی اصلی خاصیت پر آ گئے ، تاہم بنی اُمیہ کے عہد میں بہ سبب قرب عہد رسالت کے مزاح اور ظرافت محدود رہی ۔

بنی عباسیہ کے زمانے میں مزاح نے خوب رونق پائی ۔ بذلہ سنج مصاحبوں کی جماعت بھی سامان عیش و نشاط کا ایک جزو اعظم قرار پائی ۔ بغیر اُن کے شبستان خلافت سونا سمجھا جاتا تھا ۔ سفر اور حضر میں مصاحب اور ندیم خلیفہ کے ہمراہ رہتے تھے ۔ پھر جس قدر اُن کی فتوحات بڑھتی گئیں ، یہ رنگ بھی ان کے ساتھ پھیلتا گیا ۔ مگر اَمویہ اور عباسیہ کے اخیر زمانے تک ظاہرا فحش اور ہزل نے مسلمانوں میں چنداں رواج نہ پایا تھا ۔

البتہ ایران میں جا کر بعض اسباب ایسے جمع ہوئے کہ مزاح حد اعتدال سے بہت بڑھ گیا ؛ چناں چہ[1] سعدی شیرازی کے مطائبات اور انوری و شفائی[2] کے اہاجی و ہزلیات ، اور سب سے زیادہ فارسی مصطلحات

---

[1] ۱۔ شیخ مصلح الدین سعدی شیرازی : اعلیٰ پائے کے شاعر ، مدرسہ نظامیہ بغداد کے طالب علم ، ابن جوزی کے شاگرد اور شیخ شہاب الدین سہروردی[3] کے مرید تھے ۔ اپنی آنکھوں سے بڑے بڑے انقلابات دیکھے اور اُن سے بے انتہا متاثر ہوئے ۔ بغداد انھی کے سامنے تباہ ہوا ۔ عمر کا بڑا حصہ ایشیا اور افریقہ کی سیاحت میں گزرا ۔ پا پیادہ ۱۴ مرتبہ حج کیا ۔ فارسی غزل کے پیغمبر اور یورپ میں مشرق کے شیکسپیر تسلیم کیے جاتے ہیں ۔ گلستان ، بوستان کی تصنیف نے اُن کے نام کو غیر فانی بنا دیا ہے جن کے سینکڑوں ترجمے دنیا کی مختلف زبانوں میں ہو چکے ہیں ۔ ۵۷۱ھ (۱۱۷۵ع) میں پیدا ہوئے اور ۶۹۱ھ (۱۲۹۲ع) میں وفات پائی ۔
(محمد اسماعیل)

[2] ۲۔ شفائی : شمس الدین حسین ابن حکیم ملا شفائی اصفہان کا رہنے والا تھا ۔ تھوڑی سی عمر میں بہت سے علوم حاصل کر لیے اور فلسفے میں خاص

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

کی کتابیں اس کی گواہ ہیں ۔ وہاں ہنسی اور چہل اس درجے کو پہنچ گئی تھی کہ اصحاب فضیلت اس کی مشق بہم پہنچاتے تھے ، تاکہ اس کے ذریعے سے تقرب سلطانی حاصل کریں ۔ وہاں فحش اور ہزل کا نام 'مطائبہ' رکھا گیا تھا ۔ چناں چہ 'مطائبات سعدی' مشہور ہیں ۔ وہاں لفظ ظرافت ، جس کے معنی عربی میں زیرکی اور دانائی کے ہیں ، ہنسی اور چہل کے معنوں میں مستعمل ہونے لگا تھا (جیسا کہ آج کل ہندوستان میں بھی مستعمل ہے) یعنی وہی لوگ بڑے لائق و فائق سمجھے جاتے تھے جو ہنسی اور چُہل میں کمال رکھتے تھے ۔ یہی رنگ 'چغتائیہ' کے عہد میں فارسی زبان کے ساتھ ایران سے ہندوستان میں آیا ۔

اگرچہ اسلام کی سلطنتِ شخصیہ میں بھی بہت سے بادشاہ ، جن کو مہمات سے فرصت کم ملی یا جن کے مزاج میں قدرتی ہیبت اور وقار تھا ، نہایت سنجیدہ گزرے ہیں ، جن کے دربار میں کسی کو بیہودہ گوئی کی مجال نہ تھی ، مگر اکثر ان کے برخلاف تھے ۔ خصوصاً وہ جن کا ملک کئی کئی پشت سے خارجی حملوں سے محفوظ تھا اور نہایت اطمینان کے ساتھ عیش و عشرت میں زندگی بسر کرتے تھے ۔

انسانی نسلوں کی قدیم سے یہ خاصیت رہی ہے کہ جن کو دولت یا سلطنت وراثتاً بغیر سعی و کوشش کے ہاتھ لگی ہے اور بغیر کسی مزاحمت کے وہ اپنی حالت پر چھوڑ دیے گئے ہیں ، انھوں نے کبھی

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ)

دستگاہ رکھتا تھا ۔ مدت تک طبابت کرتا رہا ۔ چناں چہ اس کی 'ترابا دہن' اب تک مشہور ہے ۔ شاہ عباس اس کی بہت تعظیم کرتا تھا ۔ ہجوگوئی اس کی طبیعت پر زیادہ غالب تھی لیکن آخر عمر میں اس لغوگوئی سے توبہ کر لی تھی ۔ اس کی وفات ماہ رمضان ۱۰۳۷ھ میں واقع ہوئی ۔ تصنیفات میں سے مثنوی دیدۂ بیدار ، نمکدانِ حقیقت ، مہر و محبت اور ایک دیوان موجود ہے ۔ (محمد اسماعیل)

اس عطیۂ غیبی کی کچھ قدر نہیں کی ۔ وہ اُس کی نگہداشت اور محافظت سے غافل ہو کر عیش و عشرت میں ایسے منہمک ہوئے کہ دنیا و ما فیہا کو فراموش کر دیا ۔ جب وہ عیش کرتے کرتے تھک جاتے ہیں تو اُس میں کوئی نئی اختراع کرنی چاہتے ہیں اور جب اُس نئی اختراع سے بھی طبیعت سیر ہو جاتی ہے تو اُسے اور آگے بڑھانا چاہتے ہیں ۔ اب اُن کی حالت چوپاؤں اور جانوروں سے بھی بدتر ہو جاتی ہے اور اُن کے تمام فضائل مبدل بہ رذائل ہو جاتے ہیں ۔

اُن کی جرأت بے حیائی ہو جاتی ہے ۔

اُن کی سخاوت اسراف ہو جاتی ہے ۔

اُن کی شجاعت بے رحمی ہو جاتی ہے ۔

اُن کی اولوالعزمی بوالہوسی ہو جاتی ہے ۔

اُن کے مذاق ایسے فاسد ہوجاتے ہیں کہ جو لذت روح کو پند و حکمت سے ہونی چاہیے ، وہی لذت اُن کو فحش اور ہزل سے حاصل ہوتی ہے ۔

جب خود مختار بادشاہوں کی ایسی حالت ہو جاتی ہے تو ملک کے خاص و عام کو وہی روپ بھرنا پڑتا ہے جو اُن کے درخور مزاج ہو ۔ خصوصاً وہ فرقہ جو مذہب و ملت کی رو سے بادشاہ کا ہم قوم ہوتا ہے اور جس کو بہ نسبت اور قوموں کے تقرب اور حضوری کا زیادہ موقع ملتا ہے ، یا زیادہ امید ہوتی ہے ، اُس کو دربار داری اور مصاحبت کی وہ تمام لیاقتیں پورے اور اکمل طور پر حاصل کرنی پڑتی ہیں جو بادشاہ کے نزدیک لیاقتیں سمجھی جاتی ہیں ۔

اگر بادشاہ کو گانے بجانے کا شوق ہے تو ہزاروں بھلے مانس گانا بجانا سیکھتے ہیں ۔

اگر اُس کی طبیعت حسن پرستی اور ہوا و ہوس کی طرف مائل ہے تو ہزاروں اہل علم غزل ، واسوخت اور مثنوی لکھنے میں کمال بہم

پہنچاتے ہیں ۔

اگر وہ خود پسند اور خوشامد پسند ہے تو شعراء کو بھاٹ بننا پڑتا ہے اور قصیدہ گوئی میں ید طولیٰ حاصل کرتے ہیں ۔

اگر اُس کو ہنسی اور چہل سے رغبت ہے تو ہزاروں سنجیدہ اور متین آدمی مسخرہ پن اختیار کرتے ہیں ۔

یہی حال خاندان چغتائیہ[1] کے آخری دور میں ہوا ۔

ہنسی اور ٹھٹھول کی چشم بد دور اوپر ہی سے بنیاد جمتی چلی آتی تھی ، یہاں تک کہ عالمگیر[2] جیسے روکھے اور متشرع بادشاہ کے دربار میں بھی نعمت خاں[3] جیسا ظریف اور بذلہ سنج موجود تھا ۔

محمد شاہ[4] کے عہد میں ظرافت یہاں تک بڑھی کہ منجر بہ تمسخر و استہزاء ہو گئی ۔ بادشاہ ملک کا انتظام اوروں پر چھوڑ کر آپ

۱- خاندان چغتائیہ : اس خاندان نے ماوراءالنہر ، کاشغر ، بلخ ، بدخشان و غزنی وغیرہ پر ۶۲۴ھ (۱۲۲۷ع) سے ۷۷۱ھ (۱۳۷۰ع) تک ۱۴۷ سال حکومت کی اس خاندان کا بانی چنگیز خاں کا بیٹا چغتائی تھا ۔ (محمد اسماعیل)

۲- محی الدین اورنگ زیب عالمگیر : ہندوستان کے زبردست شہنشاہوں میں سے تھا ۔ سلطنتِ مغلیہ کو جتنا عروج اُس کے وقت میں ہوا ، اتنا پہلے کبھی نہیں ہوا تھا اور اُس کے بعد تو انحطاط شروع ہو گیا ۔ نہایت دین دار ، متشرع ، سخت محنتی ، جفا کش ، منتظم ، منصف مزاج ، عادل اور بارعب شہنشاہ تھا ۔ ۱۰۶۸ھ (۱۶۵۷ع) میں تخت دہلی پر متمکن ہوا اور ۱۱۱۸ھ (۱۷۰۶ع) میں انتقال کیا ۔ (محمد اسماعیل)

۳- نعمت خاں : مرزا محمد نام ، عالی تخلص اور نعمت خاں خطاب تھا ۔ شیراز سے آ کر عالم گیر کا داروغۂ مطبخ اور صرفِ خاص کا دیوان مقرر ہوا ۔ ۱۱۲۰ھ (۱۷۰۸ع) میں وفات پائی ۔ وقائع نعمت خان عالی اس کی مشہور کتاب ہے ۔ (محمد اسماعیل)

۴- محمد شاہ : خاندان مغلیہ کے دور انحطاط کے بد قسمت بادشاہوں میں سے تھا ۔ اسی کے عہد میں نادر شاہ نے دہلی پر حملہ کیا ۔ ۱۷۱۵ع میں تخت پر بیٹھا اور ۱۷۴۸ع میں مر گیا ۔ (محمد اسماعیل)

ہمہ تن عیش و عشرت میں مشغول ہوگیا اور اس کو ناچ رنگ اور شراب و کباب کے سوا کوئی شغل نہ رہا۔ تمام اعیان سلطنت بادشاہِ عہد کی طبیعت کا میلان دیکھ کر اسی رنگ میں رنگے گئے۔ امیروں میں باہم نوک جھونک ہونے لگی۔ مردوں میں نواب امیر خان[1] اور عورتوں میں نور بائی[2] ایک ایک پر پھبتیاں کہتے تھے، یہاں تک کہ برہان الملک[3] اور آصف جاہ[4] جیسے سنجیدہ آدمیوں پر بھی اُن کے وار چلتے تھے اور اُن کو بھی کبھی اپنی وضع کے خلاف جواب دینا پڑتا تھا۔

یہ رنگ رفتہ رفتہ خاص و عام میں پھیل گیا اور تمام امراء کی مجلسوں میں مسخرہ پن ہونے لگا اور اس طرح محمد شاہ رنگیلے کی بدولت تمسخر اور استہزاء اعلیٰ سے ادنیٰ تک تمام طبقوں میں پھیل گیا۔

۱۔ امیر خان: عمدۃالملک خطاب تھا اور محمد شاہ کے خاص الخاص مقربین میں سے تھا۔ الہ آباد کا صوبے دار مقرر کیا گیا مگر تھوڑے عرصے بعد واپس بلا لیا گیا کیوں کہ بادشاہ اس کو اپنے سے جدا کرنا پسند نہ کرتا تھا۔ نہایت حاضر جواب اور بیباک تھا۔ اس کی بیباکی آخر رنگ لائی۔ جب بادشاہ کے حضور میں بھی بیباکی اور گستاخی سے پیش آنے لگا تو ایک روز ناخوش ہو کر بادشاہ نے ایک شخص کو اشارہ کیا اور اس نے ۲۶ دسمبر ۱۷۴۷ء کو خنجر سے اس کا کام تمام کر دیا۔

۲۔ نور بائی: دربار محمد شاہ کی مشہور طوائف تھی۔ نادر شاہ اس کو اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا مگر خوش قسمت تھی کہ بچ گئی۔ (محمد اسماعیل)

۳۔ برہان الملک: اصلی نام محمد امین عرف سعادت خاں تھا۔ خراسان کے تاجروں میں سے تھا۔ محمد شاہ کے زمانے میں ہندوستان آیا اور اودھ کی صوبہ داری پر فائز ہوا۔ ۱۷۳۹ء (۱۱۵۲ھ) میں وفات پائی۔ اودھ کے نواب اسی کی اولاد میں سے تھے۔ (محمد اسماعیل)

۴۔ آصف جاہ: فرمانروایانِ حیدر آباد کے مورث اعلیٰ اور دربار مغلیہ کے زبردست امراء میں سے تھے۔ محمد شاہ کے وقت میں حیدر آباد کے صوبہ دار مقرر ہوئے اور ۳۰ برس تک نہایت کامیابی کے ساتھ صوبۂ دکن میں حکومت کی۔ ۱۱۶۱ھ (۱۷۴۸ء) میں وفات پائی۔ (محمد اسماعیل)

پھر جب نواب سعادت علی خان کے ساتھ دہلی کی زبان لکھنؤ میں گئی تو زبان کے ساتھ ہی ساتھ یہ رنگ بھی وہاں پہنچا اور لکھنؤ میں اس نے اور بھی ترقی پائی۔ وہاں کے اکثر کارفرما ایسے ہوئے جو تعیش و کامرانی میں محمد شاہ پر بھی سبقت لے گئے۔ اُن کے ہاں بھی مسخرہ پن کا بازار خوب گرم رہا، یہاں تک کہ نواب [1]سعادت علی خان ثانی جیسے مدبر اور ہوش مند کو بھی [2]انشاء اللہ خان بغیر چین نہ آتا تھا۔

چوں کہ مزاج اور زبان، جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے، لازم و ملزوم ہیں اور ظاہر ہے کہ دہلی اور لکھنو کو زبان اردو کے لحاظ سے تمام ہندوستان پر ترجیح ہے، اس لیے یہ دونوں شہر ہنسی اور اور چہل کے لحاظ سے بھی اور شہروں سے بالا تر رہے۔

ان تمام خرابیوں پر بھی جب تک مسلمانوں میں تھوڑی بہت تعلیم و تربیت رہی تب تک تمسخر و استہزاء نے ایک حد معین سے تجاوز نہیں کیا اور شرفا اور خواص کی مجالس میں زیادہ تر بذلہ سنجی اور لطیفہ گوئی ہی پر قناعت رہی، مگر جب نکبت اور ادبار کی گھٹا چاروں طرف چھا گئی اور بے علمی و جہالت کا بازار گرم ہوا تو شریف زادوں کو وہ صحبتیں ملنے لگیں جہاں گالی گلوچ، دھول دھپا اور جوتی پیزار ہی کا نام دل لگی تھا۔ رفتہ رفتہ یہ لچھن اور بے حیائی ادنیٰ سے اعلیٰ تک تمام خاندانوں میں وبائے عام کی طرح پھیل گئی اور اس کی برائی کا خیال کم ہوتے ہوتے تقریباً تمام قوم کے دل سے

۱۔ سعادت علی خاں ثانی: وزیر علی بن آصف الدولہ کے بعد ۲۱ جنوری ۱۷۹۸ء کو اودھ کے تخت پر بیٹھا۔ ۱۷ برس حکومت کرنے کے بعد ۱۱ جنوری ۱۸۱۳ء کو فوت ہو گیا۔ (محمد اسماعیل)

۲۔ سید انشاء اللہ خاں: میر ماشاء اللہ خاں کے بیٹے، اعلیٰ درجے کے ظریف الطبع شاعر تھے۔ دریائے لطافت ان کی مشہور کتاب ہے۔ بمقام لکھنؤ ۱۲۳۲ھ (۱۸۱۷ء) میں وفات پائی۔ (محمد اسماعیل)

بالکل جاتا رہا ۔ پہلے ساری مجلس میں ایک آدھ آدمی بذلہ سنج ہوتا تھا ، کیوں کہ اُس وقت بذلہ سنجی کے لیے ذہانت اور جودت طبع کے علاوہ کسی قدر علم و فضل بھی درکار تھا ۔ چناں چہ محمد شاہ کے دربار میں صرف نواب امیر خاں ہی ایک ایسا شخص تھا جو اس خدمت سے عہدہ برآ ہوتا تھا ۔

آج کل ہر مجلس میں ایک کثیر مجمع ظریفوں کا ہوتا ہے کیوں کہ اب بات بات میں محل بے محل فحش اور ہزل بکنا ہی داخل ظرافت سمجھا جاتا ہے اور اعلیٰ درجے کی ظرافت چند باتوں پر منحصر ہے ؛ مثلاً :

کوئی ایسا فحش بکنا جو حضارِ مجلس نے پہلے کم سنا ہو ۔

فحش کی بھری ہوئی واہی تباہی نقلیں بیان کرنی ۔

کوئی ایسا لفظ بولنا جس کے سننے سے شرم آئے ۔

کوئی ایسی حرکت کرنی جسے دیکھ کر ہنسی آئے ۔

کسی دوست کے جھوٹے سچے عیب ظاہر کرنے ۔

کوئی ایسی بات کہنی جس سے مجلس میں بیٹھے ہوئے آدمیوں میں سے کسی کا دل دکھے اور باقی سب لوگ ہنسیں ۔

کسی نئے آدمی پر ، جس سے شناسائی نہ ہو ، کوئی پھبتی کہنی ۔

کسی کی صورت دیکھ کر خواہی نخواہی قہقہہ لگانا ۔

کسی مقدس آدمی کو ، جس کا نام ہمیشہ تعظیم سے لیا جاتا ہو ، گالی سے یاد کرنا ۔

کوئی ایسی خبر آڑانی جسے سن کر سب کو رنج ہو ۔

کوئی ایسی عجیب روایت کرنی جو عادتاً محال ہو ۔

غرض ہنسنے ہنسانے ، دل دکھانے یا بےحیائی کا نام 'ظرافت' رکھا گیا ہے ۔ چوں کہ غریب اور محنتی آدمیوں کو دو چار گھڑی ہنسنے بولنے کی مہلت بہت کم ملتی ہے ، اس سبب سے فحش و دشنام

اور بیہودہ باتیں زیادہ تر آسودہ اور مرفہ الحال لوگوں میں سنی اور دیکھی جاتی ہیں ۔

اس ذمیم خصلت کی بدولت آردو زبان نے ، جو کہ خاص مسلمانوں کی زبان کہلائی جاتی ہے ، بہت کچھ وسعت پیدا کرلی ہے ۔ غالباً دنیا میں کوئی زبان ایسی نہ ہو گی جس میں ہماری زبان کی برابر گالیاں اور فحش اور بے حیائی کے الفاظ اور محاورات بھرے ہوئے ہوں ۔

ایک فاضل انگریز نے انھی دنوں میں آردو زبان کی ایک ڈکشنری انگریزی میں لکھی ہے ، جس پر انگریزی اخبار نویسوں نے یہ اعتراض کیا تھا کہ اس ڈکشنری کو فوربس اور شکسپیر پر اس کے سوا کوئی ترجیح نہیں ہے کہ اس میں ہزاروں گالیاں اور فحش محاورے ایسے ہیں جو اُن میں نہیں ہیں ۔ لیکن مصنف نے ایک مختصر جواب دے کر سب کو ساکت کر دیا ۔ اُس نے کہا :

”فوربس اور شکسپیر صرف لغات آردو کی ڈکشنریاں ہیں اور ہماری کتاب آردو کے سوا ہندوستانیوں کی طبیعت کا بھی آئینہ ہے ، جس میں اُن کے اخلاق اور خصائل و جذبات نہایت عمدہ طور سے نظر آتے ہیں ۔“

اگرچہ مصنف نے اس مقام پر 'ہندوستانیوں' کا عام لفظ لکھا ہے مگر حقیقت میں اس کتاب سے زیادہ تر مسلمانوں ہی کے اخلاق ظاہر ہوتے ہیں ، کیوں کہ جہاں تک ہم کو معلوم ہے اُس میں فحش اور بے حیائی کے وہی الفاظ ہیں جو مسلمانوں کی بول چال سے مخصوص ہیں اور خاص انھی کی سوسائٹی میں وضع ہوئے ۔

افسوس ہے کہ یہ ذمیم خصلت اب اس درجے کو پہنچ گئی ہے کہ واعظ ، جو اپنی مجلس وعظ کو گرم کرنا چاہے ، اس کو ضرور ہے کہ آیتوں اور حدیثوں کے ضمن میں کچھ تمسخر کی چاشنی بھی دیتا رہے ۔ اخبار کا مالک جو اپنے پرچے کو رونق دینی چاہے ، اُس کو اس

کے سوا کچھ چارۂ کار نہیں کہ اپنے اخبار کو ’’پنچ‘‘ بنائے ۔

مصنف جو کوئی کتاب لکھ کر اس کے حق تصنیف سے فائدہ اٹھانا چاہے ، اُس کا فرض ہے کہ اپنی کتاب کی بنیاد ہنسی اور ٹھٹھول پر رکھے ۔

شاعر جو مشاعرے کو گرم کرنا چاہے ، اُس کی تدبیر یہی ہے کہ فحش اور ہزل سے اُس کی غزل کا کوئی مصرع خالی نہ ہو ۔

اہل مناظرہ کی بڑی فتح یابی یہ ہے کہ اُن کی تحریر میں اعتراض اور جواب کی جگہ فریق مخالف پر نری پھبتیاں اور آوازے توازے ہوں ۔

دنیا کی تمام قوموں کی تفریق مذہب و ملت کے لحاظ سے کی گئی ہے : ہندو ، مسلمان ، پارسی ، یہودی اور عیسائی وغیرہ ۔ پس جو اچھی یا بری خصلت کسی خاص قوم کے ساتھ مخصوص ہو جاتی ہے ، اس سے یہ خیال پیدا ہو سکتا ہے کہ اس قوم کی مذہبی تعلیم کا مقتضا یہی ہوگا ، اور اس سے صاف ظاہر ہے کہ جو قوم خوش نصیبی سے کسی نیک خصلت میں ضرب المثل ہو جاتی ہے ، وہ نہ صرف اپنی قوم کو بلکہ اپنے مذہب کو بھی نیک نام کرتی ہے ، اور جو قوم بد نصیبی سے کسی بری خصلت میں انگشت نما ہو جاتی ہے وہ نہ صرف اپنی قوم کو بلکہ اپنے مذہب کو بھی بدنام کرتی ہے ۔

اسلام نے انسان کی تہذیب اور اصلاح میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا ۔ اس نے مزاح کو صرف وہیں تک جائز رکھا ہے جس سے خوشی حاصل ہوتی ہو اور اخلاق پر برا اثر نہ پڑتا ہو ۔

آنحضرتؐ فرماتے ہیں کہ ’’میں بھی مزاح کرتا ہوں مگر کوئی بات بے جا نہیں کہتا‘‘ ۔ آپؐ خود بھی کبھی کبھی مزاح فرماتے تھے اور اگر کوئی دوسرا شخص کوئی لطیف مزاح کرتا تھا تو مسکرا کر خاموش ہو جاتے تھے ۔ لیکن ہر وقت یا بہت مزاح کرنے کو ناپسند کرتے تھے اور سخریت و استہزا کی سخت ممانعت کرتے تھے ؛ یعنی

کسی کی حقارت یا پردہ دری کرنی جس پر لوگ ہنسیں یا کسی کی نقل اتارنی یا کوئی اور ایسی بات کرنی جس سے دوسرا شخص ذلیل ہو ۔ اور فحش اور سب و لعن کو نہایت مبغوض سمجھتے تھے ، یہاں تک کہ بتوں کو بھی سبّ کرنے سے منع فرماتے تھے ۔ ایک بار چند آدمی کفار کے اُن مقتولوں کو جو بدر میں مارے گئے تھے ، برائی سے یاد کر رہے تھے ۔ آپ سن کر ناراض ہوئے اور ان کو سخت ممانعت کی ۔ آپ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ ’’طعن کرنے والا ، لعنت کرنے والا ، فحش بکنے والا اور بیہودہ گو مومن نہیں ہے ۔‘‘

آپ کی ممانعت کا طریقہ ایسا مؤثر تھا کہ جس کو ایک مرتبہ نصیحت کی وہ ساری عمر کے لیے اس برائی سے باز آ گیا ۔ کتب احادیث میں اکثر مثالیں ایسے لوگوں کی موجود ہیں جنھوں نے صرف آپ کی ایک بار کی ممانعت پر تمام عمر فحش وغیرہ زبان سے نہیں نکالا ۔ مثلاً ایک مرتبہ آپ نے فرمایا کہ ’’اپنے ماں باپ کو گالی دینا گناہ عظیم ہے ۔‘‘ لوگوں نے عرض کیا کہ حضرت ! ایسا کون ہوگا جو اپنے ماں باپ کو گالیاں دیتا ہوگا ۔‘‘ فرمایا ’’جو شخص کسی کو ماں باپ کی گالی دے کر اُس سے اپنے ماں باپ کو گالیاں دلواتا ہے ، حقیقت میں وہی ان کا گالیاں دینے والا ہے ۔‘‘

اسلام کی یہ تعلیم عرب میں اس قدر پھیلی کہ فحش اور بےشرمی کی باتیں وہاں سے گویا بالکل مفقود ہوگئیں ۔ قرآن میں ایسی چیزوں کے بیان میں ، جن کے نام لینے سے نفرت یا شرم آتی ہے ، مجاز اور کنایہ برتا گیا ۔ مثلاً جائے ضرور کے لیے غائط کا لفظ بولا گیا ہے جس کے معنی گڑھے یا نشیب کی زمین کے ہیں ، جہاں عرب حاجت ضروری کے لیے جایا کرتے تھے ۔ یا مثلاً ہم‌بستری کے لیے ملامست ، مس اور اتیان وغیرہ کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں جن کے معنی چھونے یا آنے وغیرہ کے ہیں ۔

عرب کے لیے ، جو کہ لطف زبان اور استعارہ و کنایہ پر جان دیتے تھے ، یہ ایک نہایت عمدہ تعلیم تھی ۔ چناں چہ اسی بنا پر اُن کے ہاں صدہا استعارے ایسے لفظوں کی جگہ مستعمل ہونے لگے ، جیسے وقاع کے لیے لمس ، مسیس ، مس ، دخول ، صحبت وغیرہ ، اور بول و براز کے لیے قضائے حاجت ، تغوط ، تبرز وغیرہ ، اور عورتوں کے لیے فی الحجر ، من وراء الستر ، ام الاولاد وغیرہ ۔ اس قسم کی تہذیب عرب میں ایسی پھیلی تھی کہ جتنا بدن کپڑوں سے اکثر ڈھکا رہتا ہے اس کا نام لینا خلاف شرم و حیا سمجھا جاتا تھا ۔

ایک بار خلیفہ عمر بن عبدالعزیز کی بغل میں کچھ نکلا ، لوگ عیادت کو گئے اور پوچھا ''من این خرج'' خلیفہ نے جواب میں صاف طور پر بغل کا نام نہ لیا بلکہ یہ کہا ''خرج من باطن البدن''

مزاح و ظرافت بھی عرب میں خلفائے اُمویہ کے عہد تک بہت کم رہی ، لوگ اُس وقت اپنی اولاد کو مزاح سے بھی ایسا ہی منع کرتے تھے جیسے اور برائیوں سے ۔

بہرحال اسلام نے اس بات میں ہدایت و ارشاد کا پورا پورا حق ادا کر دیا تھا اور ایک ایسی قوم سے جن کی سرشت میں ظرافت اور مزاح پیدا کیا گیا تھا ، اس کو گویا بالکل نیست و نابود کر دیا تھا ۔ لیکن بدنصیبی سے وقتاً فوقتاً ایسے اسباب جمع ہوئے کہ یہ خصلت مسلمانوں میں بڑھتے بڑھتے انتہا کے درجے کو پہنچ گئی اور جس قوم کو نبیِ برحق نے اُس سے ہمیشہ کے لیے پاک کرنا چاہا تھا وہ داغ بدنامی بن کر ہمیشہ کے لیے اُن کی پیشانی پر لکھی گئی اور پورا ہوا وہ جو کلام الٰہی میں ارشاد ہوا تھا کہ ''انك لا تهدی من احببت و لکن الله یهدی من یشاء'' ۔ یعنی ''اے نبی ! تو اپنے پیاروں کو ہدایت نہیں کر سکتا ، بلکہ خدا جس کو چاہتا ہے ہدایت کرتا ہے ۔

یورپ کی قوموں نے جس طرح اور تمام اخلاق برائیوں کی اصلاح

کی ہے اسی طرح انھوں نے اس برائی کو بھی مٹایا ہے ۔ اُن کے ہاں فحش اور ہزل اس طرح مفقود ہوا ہے کہ لغت کی کتابوں میں اُس کا پتا نہیں لگتا ۔ انھوں نے مشرق کتابوں کے ترجمے جو اپنی زبانوں میں کیے ہیں ، اُن میں جہاں فحش و ہزل کا موقع آ گیا ہے وہاں اُس مطلب کو ایسے لطیف پیرایے میں ڈھال کر لکھا ہے جس میں فحش باقی نہ رہے اور مدعا بخوبی ادا ہو جائے ۔ اُن کی مجلسوں میں یا اُن کی تحریروں میں اگر مزاح کی باتیں ہوتی ہیں تو اس قدر لطیف اور دقیق ہوتی ہیں کہ ہم لوگ اُس کو مشکل سے مزاح کہہ سکتے ہیں ۔ جنگ روم و روس کے آغاز میں ایک نہایت لطیف مطائبہ وزیر ہند اور اُن کی لیڈی کا کسی اخبار میں نقل کیا گیا تھا ، اُس کو سن کر ہمارے ایک مسلمان دوست سخت متعجب ہوئے اور فرمانے لگے کہ اس میں کون سی بات ظرافت کی ہے ۔

اُن کی ہنسی اور چہل کا سب سے بڑا نمونہ پنچ اخبار ہوتے ہیں جن میں وہ حد سے زیادہ ظرافت خرچ کرتے ہیں ، مگر اُن کی ظرافت ہمیشہ کسی نہ کسی غرض پر مبنی ہوتی ہے ، نری ظرافت ہی نہیں ہوتی ؛ مثلاً :

کسی قانون کی اصلاح ہو ۔
گورنمنٹ کی کوئی غلط پالیسی بدل جائے ۔
کسی باب میں قوم کو غیرت دلائی جائے ۔

ایسی ظرافت ہمارے نزدیک عین حکمت[1] ہے اور ہماری قوم کے

---

[1] مولانا کو انگریزی لٹریچر دیکھنے کا موقع نہیں ملا ورنہ وہ اُس کے متعلق ہرگز ایسی حسن ظنی نہ کرتے ۔ جتنا فحش اُن کے ناولوں میں بھرا ہوتا ہے ، جیسی عریاں تصویریں اُن کے رسالوں میں شائع ہوتی ہیں ، جیسا ہزل اُن کے مزاحیہ اخباروں میں استعمال ہوتا ہے اور جیسے مخرب اخلاق اُن کے سینما ہوتے ہیں ، وہ کوئی چھپی ڈھکی بات نہیں ۔ (اسماعیل)

بعض رفارمر ، جو کبھی کبھی مزاح کے پیرائے میں کوئی مضمون لکھتے ہیں ، گو وہ بالفعل ناعاقبت اندیشوں کو ناگوار گزرتے ہیں لیکن بہت جلد وہ زمانہ آنے والا ہے کہ اُن کی نہایت تعظیم کی جائے گی اور اُن کے دل دوز فقرے اور دل شکن طعنے شفیق استاد کی زد و کوب سے زیادہ قدر کے لائق سمجھے جائیں گے ۔

۴

کیا مسلمان ترقی کر سکتے ہیں ؟

(از رسالہ تہذیب الاخلاق بابت ۱۲۹۷ھ (۱۸۸۰ع) صفحہ ۱۱۸)

جو قوم ترقی کے بعد تنزل کے درجے پر پہنچ جاتی ہے وہ ایک ایسی ابتر حالت میں ہوتی ہے کہ اس کے دوبارہ ترقی کرنے سے اکثر لوگ مایوس ہو جاتے ہیں ، یا یوں کہو کہ اُس کی قابلیت کا جوہر نظروں سے چھپ جاتا ہے ، یہاں تک کہ اگر وہ ترقی کرنے کا ارادہ کرتی ہے تو اس کی سعی ایک حرکتِ مذبوحی سمجھی جاتی ہے اور اگر وہ سنبھلنا چاہتی ہے تو اُس پر سنبھالے کا گمان کیا جاتا ہے ۔ یہی حال آج کل ہماری قوم کا ہے ۔

اگرچہ بعضے مومن مسلمان ، جو کبھی اپنی نسبت بُرا گمان نہیں کرتے ، مسلمانوں کی قوم کو اب بھی اعلیٰ درجے کی ترقی کے قابل سمجھتے ہیں ، لیکن امید ہے کہ وہ جس قدر زمانے کے حالات سے واقف ہو کر دنیا کی ترقیات کا اندازہ کریں گے اور جس قدر اپنی ترقی کے مواقع پر غور فرمائیں گے ، اسی قدر اُن کی رائے کی غلطی اُن پر ظاہر ہو جائے گی ۔

البتہ جو لوگ مسلمانوں کی بہبودی سے بالکل مایوس ہیں اور اس بات کا یقین رکھتے ہیں کہ ”ان میں کسی قسم کی ترقی کا مادہ باقی نہیں رہا اور ان کی اصلاح میں کوشش کرنے والے ایک محال بات کے پیچھے پڑے ہیں“ اُن کی رائے نہایت غور اور توجہ کے

لایق ہے۔ کیوں کہ جن لوگوں کی یہ رائے ہے وہ ہماری قوم میں اعلیٰ درجے کے لایق آدمی ہیں اور ہماری موجودہ حالت، جس سے بدتر کوئی حالت نہیں ہو سکتی، سراسر انھی کی رائے کی تائید کرتی ہے۔ یعنی وہ ایک ایسا دعویٰ کرتے ہیں جس کا ثبوت خود اُن کے دعوے ہی میں موجود ہے۔ ایک ایسے بیمار کی نسبت، جس کی طاقت روز بروز زائل ہوتی جا رہی ہو، جس کی غذا بالکل مفقود ہو، جو علاج معالجے سے سو سو کوس بھاگتا ہو، یہ کہنا کہ ”وہ چند روز کا مہمان ہے“ ایک ایسا دعویٰ ہے کہ آپ ہی اپنی دلیل ہے۔

وہ خیالات جو مسلمانوں کے ترقی نہ کر سکنے کے متعلق عام طور پر پیش کیے جاتے ہیں

پہلا خیال: مذہب مانع ترقی ہے

وہ لوگ (جن کی رائے اوپر بیان کی گئی) مسلمانوں کی موجودہ حالت کی شہادت کے سوا اور بھی دلیلیں پیش کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ:

> ”مسلمانوں کی مذہبی تعلیم ہی دنیوی ترقی کے لیے مانع ہے۔ پس تاوقتیکہ مسلمان مذہب سے دست بردار نہ ہوں، دنیوی ترقی نہیں کر سکتے۔ لیکن اس صورت میں وہ مسلمانوں کی ترقی نہ ہوگی بلکہ ایک ایسی قوم کی ترقی ہوگی جس سے اسلام کا کچھ تعلق نہ ہو۔“

ہمارے نزدیک یہ ایک دل چسپ فقرہ ہے جو مسلمانوں کی ترقی و تنزل کی بحث کے وقت ہمیشہ استعمال کیا جاتا ہے۔

دنیا میں کوئی قوم شائستہ یا ناشائستہ ایسی نہیں ہے جس کی مذہبی تعلیم اب یا کسی وقت دنیوی ترقیات کی مانع نہ خیال کی گئی ہو۔

اور سب قوموں کو جانے دو، عیسائی قومیں جو اس وقت

دنیوی ترقیات میں تمام دنیا سے فایق ہیں اور علم و دولت کے ساتھ ساتھ اپنے مذہب کو بھی ترقی دے رہی ہیں، اُن کا مذہب ہمارے مروجہ مذہب سے بھی زیادہ دنیوی ترقی کا منافی سمجھا جاتا تھا۔ جس وقت یورپ میں علم و حکمت کا ستارہ چمکا اور مذہبی خیالات اس کی روشنی میں مضمحل ہونے لگے، اُس وقت مذہبی پیشواؤں اور خود گورنمنٹ کی طرف سے کون سی مزاحمت تھی جو نہیں ہوئی۔ جن لوگوں نے مذہب کو حشو و زوائد سے پاک کرنا چاہا اور آزادانہ تحریر و تقریر کرنی شروع کی، اُس وقت اُن کو کیسے کیسے سخت عذاب دیے گئے۔ ہزاروں آدمی جلائے گئے اور ہزاروں نہایت سخت تکلیفیں اور اذیتیں پہنچا کر ہلاک کیے گئے۔

۱۳۹۴ع میں وکلف جو عیسائی مذہب کا مصلح تھا اور جس نے کتبِ مقدسہ کو انگلستان کی زبان مروجہ میں ترجمہ کیا تھا، اس کے معتقدوں کو سخت عذاب دیے گئے۔

۱۴۱۳ع میں آزادیِ مذہب کی بیخ کنی کے واسطے قانون جاری کیے گئے۔

۱۵۳۹ع میں سکاٹ لینڈ میں مصلحانِ مذہب پر انواع و اقسام کے ظلم کیے گئے اور ساٹھ آدمی بدعت کے الزام پر جلتی آگ میں جلائے گئے۔

۱۵۵۵ع میں کئی رفارمر بدعتی ہونے کے الزام میں جلائے گئے اور تمام قیدخانے اس قسم کے بدعتیوں سے بھر گئے۔

۱۶۴۱ع میں جب کہ آئرلینڈ میں بغاوت ہوئی تو چالیس ہزار پروٹسٹنٹ قتل کیے گئے۔

سترھویں صدی عیسوی کے اخیر تک ارسطو کی حجتوں نے تمام یورپ کے مدارس کو ایسا جکڑ بند کر رکھا تھا کہ وہ مذہب کی رکن رکین سمجھی جاتی تھیں اور یہ تمام بندشیں اُس وقت تک نہ

ٹوٹیں جب تک کہ لارڈ بیکن[1] نے نہایت زور آور تحریروں سے اُن کو نہ توڑا۔

کوپرنیکس[2] نے جس وقت سیّارات کی نسبت اپنی تحقیقات ظاہر کی تو تمام کلیسا نے یک زبان ہو کر اس کو مردود ٹھہرایا۔

گلیلیو[3] نے ۱۶۰۹ع میں دوربینیں بنائیں اور سیّارات کے متعلق بہت سے حالات مشاہدہ کیے، مگر اُن کا انعام یہ ملا کہ قید کیا گیا۔ اگرچہ ہرچند اُس نے بہت زبردست اور صاف دلیلوں سے سمجھایا کہ یہ باتیں دین یا کتاب مقدس سے کچھ منافات نہیں رکھتیں مگر کسی نے التفات نہ کیا۔

غلامی کے موقوف کرنے میں یورپ کو بےشمار مزاحمتیں پیش آئیں۔

---

[1] ۱۔ فرانسس بیکن: انگلستان کا نامور ادیب اور زبردست فلسفی تھا۔ ۲۲ جنوری ۱۵۶۱ع کو پیدا ہوا۔ اس کا باپ نکولس بیکن ملکہ ایلزبتھ کا مُہر بردار اور وزیر تھا۔ بڑے ہو کر اپنے باپ کے بعد ۱۶۱۷ع میں یہ عہدہ اس کو ملا۔ مرغی کے گوشت کے نہ سڑنے کا تجربہ کرتے ہوئے سردی لگ کر ۹ اپریل ۱۶۲۶ع کو ۶۶ برس کی عمر میں انتقال کیا۔ (محمد اسماعیل)

[2] ۲۔ کوپرنیکس (Copernicus): یورپ کا نہایت مشہور سائنس دان ہے۔ ۱۴۷۳ع میں پولینڈ میں پیدا ہوا۔ اُس نے یورپ میں سب سے پہلے اس مسئلے کی اشاعت کی کہ زمین سورج کے گرد گھومتی ہے اور نظام شمسی کا مرکز آفتاب ہے، نہ کہ زمین۔ ۱۵۴۳ع میں وفات پائی۔ (محمد اسماعیل)

[3] ۳۔ گلیلیو (Galileo): یورپ کے بڑے اور مشہور سائنس دانوں میں سے ہے۔ دوربین کو اسی نے درجۂ تکمیل تک پہنچایا۔ ۸ فروری ۱۵۶۴ع کو اٹلی کے شہر فلارنس میں پیدا ہوا۔ اس کا عقیدہ تھا کہ زمین گول ہے اور آفتاب کے گرد گھومتی ہے۔ اس جرم میں پوپ کے دربار سے اس پر کفر

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

لوتھر[1] کی کتاب جو پوپ لیو دہم[2] کے برخلاف لکھی گئی تھی، ۱۵۲۰ع میں جلائی گئی۔ اسی طرح کے اور بےشمار واقعات پیش آئے جن کے بیان کرنے کا یہ محل نہیں ہے۔

آخر تعلیم نے تمام اِلف و عادت اور تعصبات کو دبا لیا اور عیسائی مذہب بقدرِ ضرورت وقتاً فوقتاً حشو و زوائد سے پاک ہوتا رہا۔ اب وہی عیسائی قومیں ہیں کہ جس طرح دنیوی ترقیات میں تمام دنیا سے سبقت لے گئی ہیں، اُسی طرح اپنے مذہب کی اشاعت اور حمایت میں تمام عالم کی قوموں سے زیادہ سرگرم ہیں۔

پس یہ خیال کہ مسلمان جب تک اپنے مذہب سے دست بردار نہ ہوں، دنیوی ترقی نہیں کر سکتے، صحیح نہیں معلوم ہوتا۔

اصل یہ ہے کہ ہر مذہب ایک مدت کے بعد اپنی اصلیت سے متجاوز ہوتے ہوتے ایک طومارِ طویل الذیل ہو جاتا ہے اور جب

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

کا فتویٰ صادر ہوا اور گرفتار کرکے روما طلب کیا گیا، جہاں اس پر ایسی سختیاں ہوئیں کہ مجبور ہو کر اس نے اس سے توبہ کی اور زمین کے گول اور متحرک ہونے سے انکار کیا۔ اس کی تمام کتابیں جن میں اس قسم کی کفریات درج تھیں، چوراہے پر رکھ کر نذر آتش کردی گئیں۔ آخر عمر میں اندھا ہو گیا تھا۔ گلیلیو کا سال وفات ۱۶۴۲ع ہے۔ (محمد اسماعیل)

[1] ۱۔ لوتھر (Luther): عیسائی مذہب کا بہت بڑا مصلح اور فرقۂ پروٹسٹنٹ کا بانی تھا۔ جرمنی میں ۱۴۸۳ع میں پیدا ہوا۔ ۱۵۱۰ع میں روما گیا۔ وہاں پوپ کی بد اطواریاں دیکھیں تو اس کا سخت مخالف ہو گیا اور اُس کے خلاف ملک میں لکچر دینے شروع کیے۔ پوپ نے ۱۵۲۰ع میں اسے کافر اور مسیحیت سے خارج کرنے کا اعلان کیا مگر اُس نے کوئی پروا نہیں کی اور پوپ کا اعلان جلا دیا۔ ۱۵۴۶ع میں وفات پائی۔ (محمد اسماعیل)

[2] ۲۔ لیو دہم (Leo X): اٹلی کا پوپ اور دنیائے مسیحیت کا پیشوائے اعظم تھا۔ ۱۴۷۵ع میں پیدا ہوا اور ۱۵۲۱ع میں مر گیا۔ (محمد اسماعیل)

تک کوئی سخت ضرورت داعی نہیں ہوتی وہ برابر بڑھتا چلا جاتا ہے ، لیکن جب زمانے کی ضرورتیں اہل مذہب کو شکنجے میں کھینچتی ہیں تو وہ مذہب کی اصلیت دریافت کرنے کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور بہت سے ملکی قوانین اور بہت سے قصے کہانیاں ، بہت سے رسم و رواج ، بہت سے بے جا تعصبات اور بہت سے ظنون و اوہام ، جو امتدادِ ایام کے سبب مذہب کے عناصر و ارکان بن جاتے ہیں ، اُن سے دست بردار ہو کر اصل مذہب پر قناعت کرتے ہیں ۔ وہ خود ایسا نہیں کرتے بلکہ زمانے کی ضرورتیں اُن کو ایسا کرنے پر مجبور کرتی ہیں ۔ مثلاً ہندوستان کا ایک شریف مسلمان جو عورت کے گھر سے باہر نکلنے کو خلافِ شرافت ہی نہیں بلکہ خلافِ شریعت بھی جانتا ہے ، جب اہل و عیال کے ساتھ سفرِ حج کرتا ہے تو اس کو مجبوراً پردہ نشینی کے وہ قاعدے توڑنے پڑتے ہیں جن کو وطن میں لازمۂ اسلام خیال کرتا تھا ۔ ایک شیعی مسلمان جو مشرکین کے دودھ دہی اور مٹھائی وغیرہ سے پرہیز کرتا ہے ، جب کوئی لمبا سفر کرتا ہے تو اُس کو لاچار سب کچھ گوارا کرنا پڑتا ہے ۔

اُنیسویں صدی کے آغاز میں جب محمود ثانی[1] سلطان روم نے فوج کو فرنگستانی قواعد سکھانے کی نہایت سخت ضرورت سمجھی

---

[1] ۱۔ محمود ثانی : خاندان عثمانیہ کا تیسواں تاجدار ۔ بہادر ، عالی حوصلہ ، خوش مزاج اور منتظم سلطان تھا ۔ اس کا عہد ترکی میں بہت سی اصلاحات کا موجب ہوا ۔ سب سے پہلے اسی کے زمانے میں ترکی سے اخبار جاری ہوئے ۔ ۱۲۲۳ھ (۱۸۰۸ع) میں تخت پر بیٹھا اور ساڑھے پچپن سال کی عمر پا کر ۳۲ برس حکومت کرنے کے بعد ۱۲۵۵ھ (۱۸۳۹ع) میں وفات پائی ۔ (محمد اسماعیل)

اور ینگچری[1] فرقے نے ، جن کی فوج شجاعت اور استقلال میں بے مثل اور شمار میں ایک لاکھ سے زیادہ تھی ، کافروں کی قواعد سمجھ کر اس کے سیکھنے سے انکار کیا اور کسی طرح وہ اپنی سرکشی سے باز نہ آئی ، تو آخر مجبور ہو کر اُس فرقے کے ایک ایک متنفس کو قتل کرنا پڑا ۔ اگرچہ اس فوج کے قتل ہونے سے سلطنت کو سخت صدمہ پہنچا لیکن زمانے کی ضرورتوں نے سلطان کو ایسے قتل عام پر مجبور کر دیا ۔ اور اُس دن سے فرنگستانی قواعد روم میں جاری ہو گئی ۔ بےشک ینگچری فرقے کی یہ بغاوت و سرکشی مذہبی خیالات کا نتیجہ تھی ، لیکن چوں کہ حقیقت میں اُس کی بنیاد محض تعصب پر تھی ، نہ کہ اصولِ مذہب پر اور زمانے کی ضرورتیں بھی مجبور کر رہی تھیں کہ بغیر نئے آلاتِ جنگ سے مسلح ہوئے ، اور موجودہ طرزِ نبردآزمائی سے واقف ہوئے بغیر چارہ نہیں ، اس لیے تمام علماء نے متفق اللفظ ہو کر ایک لاکھ بہادر اور کار آزمودہ فوج کے قتل کا فتویٰ دے دیا ۔

الغرض مذہبی توہمات جب ہی تک مانع ترقی رہتے ہیں ، جب

---

[1] ۱۔ ینگچری : یہ ٹرکی کی ایک خاص اور بڑی زبردست اور قواعددان فوج تھی جس کی بنیاد سلطان ارخاں کے بھائی اور وزیر علاؤالدین نے اُن عیسائی اسیران جنگ سے ڈالی تھی جو مسلمان ہو جاتے تھے ۔ رفتہ رفتہ اس فوج نے بہت بڑی طاقت حاصل کر لی اور معاملات سلطنت میں دخل دینے لگی ، اور اُس کے اشاروں پر ٹرکی سلطان معزول اور قتل ہونے لگے ۔ بڑھتے بڑھتے اس قاہرہ فوج کی تعداد ۵ لاکھ تک پہنچ گئی تھی ۔ یہ فوج اس قدر زبردست تھی کہ تمام یورپ اس کی وجہ سے ٹرکی سلطنت سے کانپتا تھا ۔ بالآخر جب اس کی سرکشی حد سے بڑھ گئی تو رمضان ۱۲۴۱ھ (۱۸۲۶ع) میں سلطان محمود ثانی نے چن چن کر اس کا ایک ایک فرد قتل کر ڈالا ۔
(محمد اسماعیل)

تک زمانے کی ضرورتیں اہل مذہب کو مجبور نہیں کرتیں ۔

آج سے تیس برس پہلے ہندوستان میں ایک مسلمان بھی ایسا نہ ہوگا جو انگریزی زبان سیکھنے کو معصیت نہ جانتا ہو ۔ لیکن اب برخلاف اس کے ایک مسلمان بھی ایسا نہ ہوگا جو انگریزی سیکھنے کو ضروری نہ سمجھتا ہو[1] ۔

کیا وہ پہلا خیال ایک مذہبی خیال نہ تھا ؟ اور اس خیال کے بدل جانے سے مسلمان اسلام سے دست بردار ہوگئے ؟ حاشا ثم حاشا ۔

پس یہ خیال بالکل غلط ہے کہ جب تک مسلمان اسلام سے دست بردار نہ ہوں ، دنیوی ترقی ہرگز نہیں کر سکتے ۔ البتہ جب تک کوئی ہم کو یہ نہ جتائے کہ کیا ضرورتیں درپیش ہیں ، تب تک نہ مذہبی توہمات ہمارے دل سے دور ہو سکتے ہیں اور نہ ترقی کا خیال ہمارے دل میں پیدا ہو سکتا ہے ؛ اور وہ شے تعلیم ہے جس کے پھیلانے میں چند باہمت لوگ کوشش کر رہے ہیں ۔ اگرچہ قوم اُن کی چیخ پکار سے بیدار نہیں ہوتی لیکن افصح المؤذّنین (یعنی زمانہ) اُن کو جلد ہوشیار کر دے گا ۔

دوسرا خیال : ایک بار تنزل کے بعد دوبارہ ترقی نہیں ہو سکتی ۔

دوسری دلیل وہ یہ پیش کرتے ہیں کہ دنیا میں کوئی قوم ایسی نہیں سنی گئی جس نے ایک بار تنزل کے درجے کو پہنچ کر دوبارہ ترقی کی ہو ۔

لیکن ہم اُن سے پوچھتے ہیں کہ دوبارہ ترقی کرنے سے کیا مطلب ہے ؟ اگر دوبارہ سلطنت حاصل کرنا مراد ہے تو ہم تسلیم کرتے ہیں (بلکہ ہمارے نزدیک اگر دنیا واقعی عالم اسباب ہے تو ممکن

---

[1] قبلہ ! اب بھی ڈھیروں ڈھیر اور غول کے غول ہیں ۔ (حاشیہ از سر سید در تہذیب الاخلاق) ۔

نہیں) کہ جو قومیں زمانۂ موجودہ کے فنون جہانبانی و کشور کشائی میں اپنے بنی نوع سے پیچھے رہ گئی ہیں ، اُن کو کبھی سلطنت اور حکومت میں استقلال کا درجہ حاصل ہو سکے ، یا جو مستقل نظر آتی ہیں اُن کا استقلال قائم رہ سکے ۔

زمانۂ قدیم اور دور متوسط میں جب کہ جنگی طاقتیں تمام قوموں کی قریباً یکساں تھیں ، اُس وقت ہر قوم سلطنت اور حکومت حاصل کرنے کی قابلیت رکھتی تھی اور خاص خاص اسباب سے کبھی یہ قوم اُس قوم پر اور کبھی وہ قوم اس قوم پر غالب آ جاتی تھی ۔

لیکن زمانۂ حال میں قواعدِ جنگ و آلاتِ حرب کے لحاظ سے دنیا کی حالت دگرگوں ہے ؛ ایک قوم آسمان پر ہے تو دوسری قوم تحت الثریٰ میں ہے ۔ اب جو قومیں ترقی کر چکی ہیں اُن کا فرض ہے کہ مغلوب قوموں کو کبھی اُن وسائل میں اپنے برابر نہ ہونے دیں جن کے سبب سے اُن کو غلبہ حاصل ہوا ہے ۔ پس ضرور ہے کہ ترقی یافتہ قوموں کا غلبہ اور رعب و داب روز بروز بڑھتا جائے ۔ اور جن قوموں نے اپنی حد سے آگے قدم نہیں بڑھایا وہ نوبت بہ نوبت مضمحل ہوتی جائیں ۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ مسلمانوں کی ترقی کے لیے کوشش کرنا محض فضول ہے ، صحیح نہیں معلوم ہوتا ۔

ہر قوم بلکہ ہر شخص کی ترقی کی ایک جداگانہ حد ہے اور اُس حد تک پہنچنا اس کا ضروری فرض ہے ۔ ایک شخص جس کے تمام اعضائے جسمانی درست اور مضبوط ہیں اور ذہن و حافظہ بھی عمدہ ہے ، بےشک ہر علم و ہنر میں ترقی کر سکتا ہے ۔ وہ جس طرح ایک اعلیٰ درجے کا فاضل ہو سکتا ہے ، ویسا ہی ایک اعلیٰ درجے کا سپاہی بھی ہو سکتا ہے ۔ لیکن ایک دوسرا شخص جس کا فہم ، ذہن اور حافظہ عمدہ ہے مگر ایک ہاتھ سے بالکل اپاہج ہے ، وہ اگرچہ ایک عمدہ سپاہی نہیں بن سکتا لیکن ایک اعلیٰ درجے کا

فاضل ضرور ہو سکتا ہے ۔ اور اس لیے اُس کا نہایت ضروری فرض ہے کہ علمی ترقیات میں جہاں تک ہو سکے ، کوشش کرے ۔

اگر دوبارہ ترقی کرنے سے یہ مراد نہیں ہے جو اُوپر ذکر کی گئی تو ہم تسلیم نہیں کرتے کہ کسی قوم نے تنزل کے بعد ترقی نہیں کی ۔

اور ملکوں کو جانے دو ، ہندوستان ہی میں ایسی قومیں موجود ہیں جو نہایت پست ہو کر دوبارہ بلند ہوئی ہیں ۔ مثلاً گجرات میں پارسی یا بنگالے میں ہندو ۔ ان دونوں قوموں کا حال ، جو دو سو برس پہلے تھا اور اُن کی موجودہ حالت ، دونوں کا مقابلہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ انھوں نے کس قدر ترقی کی ہے ۔

اس کے سوا کوئی روشن اور صاف دلیل اس بات کی نہیں ہے کہ جب گورنمنٹ کی طرف سے ہماری تعلیم ، ہماری تجارت اور ہماری صنعت و حرفت میں کوئی صریح مزاحمت نہ ہو ، تو بھی ہم ان شاخوں میں ترقی نہیں کر سکتے ۔

یہودیوں پر جب تک یورپ میں ظلم و ستم ہوتا رہا اور وہ غلامی کی حالت میں رہے ، تب تک اُن کی ترقیات ، جس قدر کہ وہ رعیت ہونے کی حالت میں کر سکتے تھے ، رکی رہیں ۔ لیکن جب سے یورپ میں آزادی پھیلی اور اُن کو رعیت کے پورے پورے حق دیے گئے ، تب سے اُن کی حالت پہلے کی نسبت نہایت بہتر ہے ۔ بعض ملکوں میں تو اُنھوں نے حکمران قوموں کے برابر حقوق حاصل کیے ہیں ۔ عموماً ہر ملک میں اُن کی حالت اچھی ہے ۔ اُن کی تجارت تمام دنیا میں پھیلی ہوئی ہے اور اُن کی دولت روز بروز بڑھتی جاتی ہے ۔ بعض دولت مند اُن میں ایسے ہیں کہ یورپ کی بڑی بڑی سلطنتیں اُن کی قرض دار ہیں ۔

تیسرا خیال : موجودہ تعلیمی کوششوں کا نتیجہ کچھ نہ نکلے گا لہٰذا کوشش بے سود ہے ۔

جو لوگ مسلمانوں کی ترقی سے بالکل مایوس ہیں ، وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ :

”اس کوشش کا نتیجہ جو کہ مسلمانوں کے بعض خیر خواہ کر رہے ہیں ، اس کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا کہ چند آدمی کسی قدر امتیاز حاصل کر لیں ۔ کیوں کہ آج تک جتنے آدمیوں کو ترقی کا خیال ہوا ہے وہ اس قدر تھوڑے ہیں کہ انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں ۔ پس اگر سو دو سو برس میں ہزار دو ہزار مسلمان ممتاز ہو گئے تو اس کو قومی ترقی نہیں کہہ سکتے ۔“

لیکن ہم پوچھتے ہیں کہ مسلمانوں کو کے دن سے ترقی کا خیال پیدا ہوا ہے ؟ اگر انصاف سے دیکھا جائے تو اس خیال کی عمر اور پرچہ ’تہذیب الاخلاق‘ کی عمر برابر نکلے گی ۔ پس جو کچھ اس قلیل عرصے میں ہوا وہ ترقی کی معمولی چال سے بہت زیادہ ہے ۔ اس کے سوا ترقی کی رفتار ابتدا میں ہمیشہ سست ہوتی ہے لیکن وہ جس قدر بڑھتی جاتی ہے اُسی قدر تیز ہوتی جاتی ہے ۔ جو بیمار روز بروز بگڑتا جاتا ہے اُس کا ادنیٰ افاقہ بھی نہایت تسلی بخش ہوتا ہے اور اگر پھر بھی کوئی غلطی نہیں ہوتی تو اُس کی صحت اور طاقت روز بروز ترقی کرتی ہے اور یہ ترقی بھی یوماً فیوماً بڑھتی جاتی ہے ۔

جو ترقی یورپ نے اٹھارھویں صدی کے شروع سے آج تک یعنی ڈیڑھ سو برس میں کی ہے ، گزشتہ تین صدیوں میں اس کا عشرِ عشیر بھی نہیں ہوا ؛ اور جو کچھ ان تین صدیوں میں ہوا اس کے مقابلے میں وہ تمام ترقیات ہیچ تھیں جو پندرھویں صدی سے پہلے سالہا سال تک وقتاً فوقتاً ہوتی رہیں ۔

چوتھا خیال : پہلے سے ترقی کُن قوموں کے برابر ہوں کہ ہم نہیں ہو سکتے لہٰذا ترقی بے فائدہ ہے ۔

بعض اوقات یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ’’جو قومیں پہلے سے ترقی کر رہی ہیں ، اُن کے برابر ایک ایسی قوم ہرگز نہیں ہو سکتی جس کو سب سے پیچھے ترقی کا خیال پیدا ہوا ۔ پس اگر بالفرض مسلمانوں نے اب ترقی کرنے کا پختہ ارادہ بھی کیا تو کچھ فائدہ نہیں ہے ، کیوں کہ ایسی حالت میں ہم اُن ترقی یافتہ قوموں سے ہمیشہ پیچھے ہی رہیں گے ۔‘‘

بے شک یہ بات صحیح ہے لیکن ہماری کوشش صرف اس بات میں ہونی چاہیے کہ ہم اپنی ہم وطن قوموں سے ، جنھوں نے ہم سے بہت پہلے قدم آگے بڑھایا ہے ، کسی چیز میں کم نہ رہیں اور اس میں کچھ شبہ نہیں کہ ہم اس کوشش میں کامیاب ہو سکتے ہیں ۔ محکوم قوموں کی ترقی ہمیشہ ایک خاص حد پر جا کر پھیکی ہو جاتی ہے جس سے آگے بڑھنے کا محل ان کے لیے باقی نہیں رہتا ۔ بس اگر ان میں سے ایک قوم آگے بڑھ گئی ہے اور دوسری قوم پیچھے رہ گئی ہے تو پسماندہ قوم کو مایوس نہ ہونا چاہیے کیوں کہ اگر راہ میں نہیں تو اخیر منزل پر جا کر دونوں مل جائیں گی ۔ اور یہ بھی ناممکن نہیں ہے کہ راہ ہی میں پچھلا قافلہ اگلے قافلے سے جا ملے ۔ کیوں کہ بعض اوقات ایسی اضطراری حالتیں پیش آتی ہیں کہ پچھلوں کو معمولی رفتار سے کسی قدر زیادہ جلد قدم اٹھانا پڑتا ہے ، یہاں تک کہ وہ راہ ہی میں اگلوں سے جا ملتے ہیں ۔

اصل مانع ترقی مایوسی اور نا آمیدی ہے

بہرحال یہ تمام موانع جو اوپر ذکر کیے گئے ، ہم کو ترقی سے مایوس کرنے والے نہیں ہیں ۔ البتہ صرف ایک بات ایسی ہے جو تمام منصوبوں اور ارادوں کو خاک میں ملا دیتی ہے اور وہ ترقی کی

طرف سے مایوسی اور نا آمیدی ہے ۔

جو قوم عام تعصب اور جہالت میں مبتلا ہوتی ہے ، وہ ہمیشہ چند ایسے روشن ضمیر آدمیوں کی ہمت اور کوشش سے روبراہ ہوتی ہے جو تعلیم کی بدولت تعصب اور جہالت کی اندھیری کوٹھری سے باہر نکل آتے ہیں ، اور قوم کی ابتر حالت دیکھ کر ان کے دل میں بے اختیار ایک ولولہ اُٹھتا ہے ، اور قومی اصلاح و ترقی کی طرف دل و جان سے متوجہ ہو جاتے ہیں ۔

اسی بنا پر ہم کو یہ آمید توی کہ جو نوجوان ہماری قوم میں اعلیٰ درجے کی تعلیم پائیں گے وہ اس کام کے ذمہ دار ہوں گے ، مگر برخلاف اس کے ہم دیکھتے ہیں کہ وہ جس قدر ایجوکیشن اور سویلزیشن (تعلیم و تہذیب) میں اعلیٰ درجہ حاصل کرتے ہیں اسی قدر قوم کی ترقی سے مایوس نظر آتے ہیں ، یہاں تک کہ وہ جن نفوس مقدسہ کو قومی ترقی کے خیال میں سرگرم پاتے ہیں اُن پر تعجب کرتے ہیں کہ یہ کیوں کوشش کر رہے ہیں ؟ اور کیوں کر کر رہے ہیں ؟

ہائی ایجوکیشن (اعلیٰ تعلیم) کی بدولت ان کی مثال ایسے شخص کی مانند ہے جو اندھیری رات میں ایک نہایت روشن کمرے سے باہر نکلتا ہے اور باہر آ کر اس کو در و دیوار کچھ نظر نہیں آتا ۔ وہ باہر چلنے پھرنے والوں کے پاؤں کی آہٹ سن کر تعجب کرتا ہے کہ یہ لوگ کیوں کر اس اندھیرے میں چل پھر رہے ہیں اور آخر گھبرا کر پھر اُسی روشن کمرے میں گھس جاتا ہے ۔ وہ اتنا توقف نہیں کرتا کہ روشنی کی چکاچوند ، جس نے اُس کی آنکھوں کو خیرہ کر رکھا ہے ، کم ہو جائے اور تاریکی میں اس کو بھی روشنی محسوس ہونے لگے اور وہ بھی اَوروں کی طرح چل پھر سکے ۔

اسی طرح ہماری قوم کے نوجوان ایجوکیٹڈ (تعلیم یافتہ) جنھوں

نے یورپ کی سویلزیشن (تہذیب) کو اپنی آنکھ سے دیکھا ہے یا تعلیم کے ذریعے سے اُس کا اندازہ کیا ہے ، وہ جب مغربی قوموں کی حالت کو اپنی قوم کی موجودہ حالت سے مقابلہ کرتے ہیں تو دونوں حالتوں میں وہ نسبت پاتے ہیں جو محض نور اور محض ظلمت میں ہے ۔ اور بےشک بادی‌النظر میں ایسی ہی نسبت معلوم ہوتی ہے ۔ لیکن حقیقت میں ایسا حال نہیں بلکہ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس اندھیرے میں کچھ اُجالا بھی ہے ۔

ہم دیکھتے ہیں کہ دو چار شخصوں کی کوشش سے چند روز میں وہ نتائج پیدا ہوئے ہیں جن کی کسی طرح توقع نہ تھی ۔ پس اگر دس بیس با لیاقت آدمی توجہ اور کوشش کریں تو بہت کچھ کر سکتے ہیں ۔

صرف دو چیزیں ہیں جن پر دنیا کی کامیابی اور ناکامی کا مدار رکھا گیا ہے :

۱- اُمید ۔
۲- نا اُمیدی ۔

ہزاروں دشوار کام جو بالیقین محال بلکہ ناممکن سمجھے گئے تھے ، اُمید کی بدولت اور کوشش کے ذریعے نہ صرف ممکن بلکہ سرانجام پائے ہیں ، اور ہزاروں سہل اور آسان کام نا اُمیدی اور ہمت ہار دینے کی وجہ سے ناتمام اور ادھورے رہے ہیں ۔ دیکھو کلمبس نے صرف اُمید ہی کے بھروسے پر ایک ایسا کام سرانجام دیا جس کو تمام عالم محال سمجھتا تھا اور کلائو نے صرف اُمید ہی کے سہارے پلاسی میں وہ فتح حاصل کی جس کے نتائج کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھے :

بجز اُمید کہ ایمان عشق کیشان است
کسے نداد تسلی دلِ زلیخا را

۵

التماس بخدمتِ برادرانِ وطن متعلق مسئلۂ حجاب

(قلمی مسودے سے نقل کیا گیا)

> یہ مضمون ۱۳۰۰ھ (۱۸۸۲ع) میں مولانا نے اپنے وطن پانی پت کے شرفا کے لیے لکھا تھا ، مگر چھاپا نہیں گیا ، بلکہ قلمی شکل میں معززین شہر کے پاس فرداً فرداً بھیجا گیا تھا ۔ یہ مضمون ہمیشہ کے لیے ناپید ہو جاتا اور اس کا کچھ بھی پتا نہ چلتا ، مگر حسن اتفاق سے اس کی ایک نقل مولانا کے قدیمی دوست حافظ محمد یعقوب صاحب مجددی کے پاس محفوظ تھی ۔ میں حافظ صاحب کا نہایت ممنون ہوں کہ میری درخواست پر انھوں نے یہ مضمون مجھے مرحمت فرما دیا ۔ (محمد اسماعیل)

آپ سب صاحب واقف ہیں کہ پردے کا حکم مسلمانوں کے ہاں ایسا ہی تاکیدی ہے جیسا اور فرائض اور واجبات کا ۔

اور تمام دنیا کی قوموں میں صرف مسلمانوں ہی کو یہ فخر حاصل ہے کہ اُن کے ننگ و ناموس کو نامحرموں کے سامنے آنے سے منع کیا گیا ہے ۔

مگر انگریزی عمل داری کی خاصیت سے آپ بخوبی واقف ہیں کہ وہ پردہ نشینی کی دشمن ہے اور عورتوں کی آزادی اور

خود مختاری کی حامی ہے ۔ اگرچہ وہ جبراً کسی کے پردے میں دست‌اندازی نہیں کرتے مگر چوں کہ آزادی اور بےقیدی ہمیشہ انسان کو مرغوب ہوتی ہے اور حکمران قوم کی پیروی کرنے کو ہر ایک کا جی چاہتا ہے ، اس سبب سے اُن کی دیکھا دیکھی ہندوستان کی اکثر پردہ نشین قوموں میں خود بخود پردہ کم ہوتا جاتا ہے ۔ ہندوؤں کی بعض قومیں جنھوں نے مسلمانوں سے پردے کی رسم سیکھی تھی ، اُن کے ہاں سے اب یہ رسم کم ہوتی جاتی ہے ۔ اور برہمو ہندو جو ایک جدید فرقہ ہندوستان میں پیدا ہوا ہے ، وہ لوگ تمام ہندوستان میں کوشش کرتے پھرتے ہیں کہ یہ رسم بالکل اس ملک سے جاتی رہے ۔ وہ برابر رسالوں اور اخباروں اور کتابوں میں پردے کے خلاف مضمون لکھ کر چھپواتے ہیں اور پردے کی برائی پر بیسیوں دلیلیں پیش کرتے ہیں ۔

مسلمانوں میں بھی بیسیوں قومیں ایسی ہیں جن کے ہاں پردے کی رسم جاری نہیں ہے ۔ صرف چار قومیں شیخ ، سید ، مغل ، پٹھان برائے نام پردے کی پابند رہ گئی ہیں ۔ مگر شہروں میں اُن کے پردے کی حقیقت یہ ہے کہ ڈولیوں میں ، بہلیوں میں اور رتھوں میں بیٹھنے کا نام پردہ رہ گیا ہے ۔ باقی بیاہ شادیوں کی مجلسوں میں اکثر جگہ پردہ بالکل اُٹھ جاتا ہے ۔

اس سے بڑھ کر شہروں اور قصبوں میں عموماً یہ خرابی پھیلی ہوئی ہے کہ شرعی محرموں کے سوا بیسیوں نا محرموں سے بھی پردہ نہیں کیا جاتا ۔ بلکہ شہروں کے لوگ ایسا خیال کرتے ہیں کہ یہ خرابی قصبات میں بہ نسبت شہروں کے زیادہ پھیلی ہوئی ہے ۔

دلی میں ایک روز ایک دوست کے مکان پر چند احباب جمع تھے اور میں بھی وہاں موجود تھا ۔ ایک شخص نہایت دریدہ دہن اور آزاد منش اتفاقاً وہاں وارد ہوئے ۔ اثنائے صحبت میں شہر کے

بعض خاندانوں کی خرابی کا ذکر چلا اور ایک صاحب نے قصبات کے لوگوں کے چال چلن کی تعریف کی ۔ اس پر اُس شخص نے کہا کہ آپ قصبات کے حالات سے واقف نہیں ہیں ، قصبات کا حال شہروں سے بدتر ہے ۔ اور خورجہ اور شاہجہاں پور کی چند مثالیں بیان کیں ۔ اُس کے بعد یہ کہا کہ قصبات جو زیادہ بدنام نہیں ہیں ، اُس کا یہ سبب ہے کہ وہاں ہر ایک خاندان کے مرد و عورت ایک دوسرے کے سامنے آتے ہیں ، اس لیے جو اندرونی خرابیاں وہاں پیدا ہوتی ہیں اُن کا اعلان بہت کم ہوتا ہے ۔ اس پر میں نے یہ کہا کہ برا کام اگر سات پردوں میں بھی کیا جائے گا تو ممکن نہیں کہ آخرکار اس کی رسوائی اور تفضیح نہ ہو ۔ پس نیک نام وہی خاندان اور وہی بستیاں رہ سکتی ہیں جو حقیقت میں ہر ایک داغ اور دھبے سے پاک ہیں ۔ اگر اندرونی خرابیوں کا اعلان کم ہوتا ہے تو کیا سبب ہے کہ قلعہ تمام دنیا سے زیادہ بدنام تھا ۔ قلعے میں تمام شاہی خاندان کے مرد و عورت ایک دوسرے کے سامنے آتے تھے اور وہاں جس قدر خرابیاں تھیں وہ اندرونی تھیں ۔ اُنھوں نے کہا کہ قلعے کی بدنامی کا سبب یہ تھا کہ وہاں اندرونی اور بیرونی دونوں طرح کی خرابیاں انتہا کے درجے کو پہنچ گئی تھیں ۔ قصبات میں بیرونی خرابیاں بالکل نہیں ہیں اور اندرونی خرابیاں بھی زیادہ نہیں بڑھیں ۔ اس تقریر پر گفتگو ختم ہو گئی ۔

اگر چہ بعض قصبات کی نسبت اُن کا یہ قول بالکل صحیح تھا مگر جہاں تک میرا علم ہے ، میں نہایت وثوق اور یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ ہمارا قصبہ آج تک ہر ایک داغ دھبے سے پاک رہا ہے اور جیسی مذموم اور قبیح باتیں بڑے بڑے شہروں میں ہمیشہ سنی جاتی ہیں ، ویسی ایک بات بھی یہاں کے شریف خاندانوں میں نہیں سنی گئی ۔

لیکن اس میں شک نہیں کہ نامحرم رشتہ داروں کے سامنے

آنے کا طریقہ، قطع نظر اس کے کہ احکام خدا اور رسول کے برخلاف ہے، اس زمانے کا رنگ ڈھنگ دیکھ کر بالخصوص نہایت خطرناک معلوم ہوتا ہے۔

جس قدر شرم و حجاب شریف خاندانوں کے مرد و عورت میں آج سے تیس چالیس برس پہلے دیکھا جاتا تھا، اب اس کا عشر عشیر بھی نہیں دیکھا جاتا۔ اس کے سوا پہلے عورتوں کے لباس کی وضع ایسی سیدھی سادی تھی کہ نا محرم رشتہ داروں کے سامنے آنے سے کوئی برا خیال پیدا نہ ہوتا تھا۔ لیکن اب حالت اس کے بالکل برخلاف ہے۔ پہلے ہر ایک محلے میں آدمیوں کی کثرت تھی، کوئی گھر ایسا نہ تھا جس میں دس پندرہ آدمی مرد و عورت موجود نہ ہوں۔ اب گھر کے گھر سُونے پڑے ہیں؛ کسی گھر میں ایک عورت رہتی ہے، کسی میں دو عورتیں رہتی ہیں۔ اس کے سوا تمام شریف خاندانوں میں چرخا کاتنے کا رواج تھا۔ مستورات جب گھر کے کاروبار سے فارغ ہوتی تھیں، چرخا پونی اور اٹیرنوں میں مصروف رہتی تھیں۔ اب اس کا رواج بہت کم گھروں میں نظر آتا ہے، اور عورتوں کی فرصت کے اوقات پان کھانے اور چھالیا کترنے میں صرف ہوتے ہیں۔ صرف بال بچوں والی عورتیں بچوں کی خبر گیری اور ان کے کھلانے، پہنانے اور نہلانے دھلانے میں کسی قدر مصروف رہتی ہیں، باقی سب بے کار رہتی ہیں، اور بے کاری تمام خرابیوں کی جڑ ہے۔ ایسی حالت میں نا محرم رشتہ داروں کا گھر میں بلاحجاب آنا نہایت خطرناک ہے۔

اگر ابھی سے اس خطرناک رسم کا انسداد نہ کیا جائے گا تو آیندہ سخت دشواریاں پیش آئیں گی۔ کیونکہ:

سرِ چشمہ شاید گرفتن بہ میل
چو پُر شد نشاید گزشتن بہ پیل

آپ نے سنا ہوگا کہ جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بی بی عایشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو، جن کی طہارت و عفت پر خدائے پاک نے قرآن مجید میں گواہی دی ہے، ایک بار دیکھا کہ اپنے باپ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالٰی عنہ کے پاس تنہا بیٹھی ہوئی کچھ باتیں کر رہی تھیں۔ آپ نے حضرت صدیق اکبر سے فرمایا کہ "اے ابوبکر! کیا شیطان کو دور سمجھتے ہو کہ اس طرح مخلی بالطبع ہو کر جوان بیٹی سے باتیں کر رہے ہو؟"

جائے غور ہے کہ جب ایسے پاک زمانے میں اور ایسے باپ اور ایسی بیٹی کی نسبت آں‌حضرت کا ایسا خیال ہو تو اس ناپاک اور نجس زمانے میں نامحرموں کی نسبت کیوں کر عفت اور طہارت کے سوا اور کوئی خیال نہیں ہو سکتا۔

شاید کوئی صاحب یہ خیال کریں کہ نا محرم رشتہ‌داروں کے سامنے آنا اس زمانے میں قدیم سے جاری ہے اور آج تک اس رسم سے کوئی قباحت یا خرابی پیدا نہیں ہوئی۔ ہاں بے شک یہ رسم قدیم سے یہاں چلی آتی ہے لیکن اس زمانے میں اور حال کے زمانے میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اس زمانے میں عورتیں محکوم تھیں اور مرد حاکم تھے۔ اس زمانے میں مرد محکوم ہیں اور عورتیں حاکم ہیں۔ اس زمانے میں بڑے سے بڑے گھر کی بیویاں جو لباس پہنتی تھیں وہ آج کل لونڈی باندیوں کے بھی خاطر میں نہیں آتا۔ جس قدر آرایش و زیبایش کے سامان آج ایک پسنہاری کو میسر آ سکتے ہیں، اس وقت امیر زادیوں کو بھی نصیب نہ تھے۔ اس زمانے میں اپنے قصبے کی پوشش اور لباس اور چال چلن کے سوا کسی غیر شہر کا لباس یا چال چلن نہ کبھی آنکھوں سے دیکھا جاتا تھا، نہ کانوں سے سنا جاتا تھا۔ اب ہر روز نت نئی تراش و خراش آنکھوں سے دیکھی جاتی ہے اور دنیا کے عجیب و غریب معاملات کانوں سے سنے جاتے ہیں۔ اس کے سوا قدیم

اور حال کے زمانے میں اور بہت سے تفاوت اور امتیاز ہیں جن کا بیان کرنا مناسب نہیں معلوم ہوتا ۔

پس آپ صاحبوں سے میری یہ درخواست ہے کہ اس معاملے کو خوب غور سے ملاحظہ فرمائیں ۔ اس کے بعد اگر آپ کے نزدیک بھی یہ رسم موقوف کرنے کے قابل ہو تو مردانہ وار اس کے انسداد کے لیے کھڑے ہو جائیں اور جہاں جہاں آپ کی دسترس ہو وہاں سے اس رسم کو موقوف کرا دیں ۔

اگرچہ کہیں کہیں اس رسم کے توڑنے میں دقتیں پیش آئیں گی لیکن وہ دقتیں اُن خرابیوں سے بہ درجہا کم‌تر ہوں گی جو اس رسم کے جاری رہنے سے خیال میں آتی ہیں ۔ جو قومیں پردے کی پابند نہیں ہیں اُن کو نہایت تعجب ہوتا ہے کہ مسلمان پردے کی دقتوں اور تکلیفوں کو کیوں کر برداشت کرتے ہیں ؟ حالانکہ ہم لوگوں کو کچھ بھی دقت معلوم نہیں ہوتی ۔ پس اگر یہ رسم بھی موقوف ہو جائے گی تو جو دقتیں اس کے بر طرف کرنے میں اس وقت معلوم ہوتی ہیں وہ چند روز کے بعد عادت میں داخل ہو جائیں گی اور کوئی اشکال باقی نہ رہے گا ۔

سب سے پہلے میں اس رسم کو اپنے عشیرہ سے موقوف کرنے پر آمادہ ہوں ، اور میرا مصمم ارادہ ہے کہ میرے کنبے میں سے جس مرد یا عورت کو میری اس تجویز سے اتفاق نہ ہوگا ، میں اُس سے ہمیشہ کے لیے ملنا جلنا چھوڑ دوں گا ۔

میری آپ صاحبوں سے بھی یہی التماس ہے کہ اگر اس رسم کو موقوف کرانا ہے تو آپ بھی ایسی ہی سختی اختیار کریں ، ورنہ اگر صرف چند گھروں سے یہ رسم اُٹھ گئی تو کوئی عمدہ نتیجہ پیدا ہونے کی توقع نہیں ہے ۔

پردے کی بابت ہماری قوم کے شیعہ اور سنی صاحبوں کو چاہیے کہ اپنے اپنے عالموں سے پردے کا شرعی قاعدہ دریافت فرما کر اُس کے موافق کاربند ہوں ۔

آپ صاحبوں کو معلوم رہے کہ میں کچھ اوپر تیس برس سے شہر دہلی میں آمد و رفت رکھتا ہوں اور کم سے کم پندرہ سولہ برس اس شہر میں میرا قیام رہا ہے ۔ ظاہر ہے کہ جو شخص اس قدر مدت تک کسی جگہ رہے ، اگرچہ وہ ایک مختصر گاؤں ہی ہو ، تو بھی اُس سے طبیعت مانوس ہو جاتی ہے ۔ چہ جائے کہ دلی جیسا شہر ، جو پردیسی کو چند روز میں اپنا دل دادہ اور مفتون کر لیتا ہے ۔ چنانچہ یہی سبب ہے کہ ہزاروں پردیسیوں نے اپنا عزیز وطن چھوڑ کر یہاں کی بود و باش اختیار کر لی ہے ۔ اس تقدیر پر مجھ کو بھی چاہیے تھا کہ میں بھی اپنے عزیز وطن سے قطع تعلق کرکے دلی کی بود و باش اختیار کر لیتا ، لیکن میں نے آج تک ایسا نہیں کیا اور ہمیشہ دلی کو پردیس سمجھتا رہا ۔ اس کا بڑا سبب یہ تھا کہ شہر اور قلعے کے اکثر خاندانوں کا حال جو سننے میں آتا تھا اور شہر کا مقابلہ اپنے قصبے کے خاندانوں کے چال چلن سے کیا جاتا تھا ، تو شہر کی سکونت اور اہل شہر کے میل جول سے نہایت نفرت اور اپنے وطن کی حد سے زیادہ قدر معلوم ہوتی تھی ۔ اور یہ ارادہ ہوتا تھا کہ اگر اتفاقات قضا و قدر سے اپنی تمام عمر دلی میں بسر ہو جائے ، تو بھی اس کو اپنا وطن بنانا اور اپنے وطن مالوف سے تعلق قطع کرنا نہیں چاہیے ۔

اگرچہ اب تک میں اپنے اس ارادے پر قائم ہوں اور میری یہ رائے ہے کہ جو شخص غیرت اور حمیت رکھتا ہو اور جس کو اپنے ننگ و ناموس کی عفت اور پاک دامنی کا خیال ہو ، اس کو قصبہ چھوڑ کر شہر میں کبھی بود و باش اختیار کرنی نہیں چاہیے ۔ لیکن افسوس ہے کہ کچھ مدت سے قصبات کی حالت بھی نازک ہوتی

جا رہی ہے اور آیندہ آثار اچھے نظر نہیں آتے ۔

ہر چند کوئی قصبہ اور کوئی گاؤں اور کوئی شہر زمانے کی زبردست تاثیروں سے کسی طرح بچ نہیں سکتا ، لیکن جب تک مسلمانوں میں اسلام باقی ہے اور شریعت کی قید سے آزاد نہیں ہوتے ، اُس وقت تک ہمارے خاندانوں کی عفت اور پاک دامنی کی حفاظت کے لیے پردے کا ایک ایسا پاک اور محکم قاعدہ موجود ہے جس پر زمانے کی تاثیر کا کوئی افسوں اور کوئی منتر چل نہیں سکتا ۔ روم اور مصر میں ترکوں نے تمام معاشرت کے طریقے بدل ڈالے ہیں ۔ مکان اور طعام اور لباس اور سواری ، غرضیکہ ہر چیز میں اہل یورپ کی پیروی اختیار کر لی ہے ۔ مگر چوں کہ شریعت کی پابندی نے پردے سے آج تک آزاد ہونے نہیں دیا اس لیے جس قدر عفت اور پاک دامنی وہاں کے مسلمانوں میں اب تک موجود ہے ، یورپ کی کسی قوم میں ، خواہ انگریز ہوں ، خواہ روسی ، خواہ فرانسیسی ، خواہ جرمن ، اس کا دسواں حصہ بھی نہیں پائی جاتی ۔

پس اے میرے بزرگو اور عزیزو ! پردے کے محکم اور مضبوط قاعدے کو ہاتھ سے نہ چھوڑو کہ اس اخیر زمانے میں صرف یہی ایک چیز باقی رہ گئی ہے جس کی بدولت ہم تمام دنیا کی قوموں پر فخر کر سکتے ہیں ۔ اور صرف یہی ایک چیز ایسی ہے جس سے قوم میں غیرت اور حمیت باقی رہ سکتی ہے ۔ و ما علینا الا البلاغ ۔

۶

اخبار نویسی اور اس کے فرائض

(اخبار رفیق ہند ، لاہور ، بابت اکتوبر ۱۸۹۲ع)

فن صحافت پر مولانا حالی کا یہ بڑا ہی قابل قدر مضمون ہے جو آج بھی ویسا ہی غور اور توجہ سے پڑھنے کے قابل ہے جیسا وہ اُس وقت تھا جب وہ لکھا گیا ، یعنی آج سے قریباً ستر برس پیشتر ۔ اس بلند پایہ مضمون میں مولانا نے اُن لوگوں کو ، جو یہ پیشہ اختیار کرنا چاہیں ، بہت کام کی باتیں بتائی ہیں اور بڑی زرین نصیحتیں کی ہیں ۔ اس مضمون کے پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مولانا نے نہایت گہری نظر سے اُس وقت کی صحافت اور صحافیوں کی حالت کا مطالعہ کیا تھا اور اس سے اُن کے دل پر جو اثر ہوا تھا اُس کو اُنھوں نے بڑی عمدگی اور لیاقت کے ساتھ بیان کیا ۔ نہ صرف بیان کیا بلکہ اخبار نویسی کی سقیم حالت کا علاج بھی بتایا اور ایسا نسخہ تجویز کیا جو مرض کے لحاظ سے نہایت عمدہ اور بہترین تھا ۔

اس مضمون میں ایک اور بات بڑے تعجب کی ہے : وہ یہ کہ یہ مضمون اخبار 'رفیق ہند' میں شائع ہوا تھا ، اور 'رفیق ہند' کے ایڈیٹر مولوی محرم علی صاحب چشتی سرسید اور اُن کے رفقاء کے نہایت شدید معاند اور

مخالف تھے ۔ اس حالت میں یہ مضمون مولانا نے اس اخبار میں اشاعت کے لیے نہ معلوم کس طرح اور کیوں بھیجا ۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ مضمون ابتداءً علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ میں شائع ہوا ہو اور وہاں سے مفید سمجھ کر مولوی محرم علی صاحب نے اپنے اخبار میں شائع کر دیا ہو ۔ (محمد اسماعیل)

ایک حکایت :

ایک شخص نے گدھوں کے سوداگر سے جا کر کہا کہ : ’’مجھ کو ایک ایسا گدھا مطلوب ہے جو نہ زیادہ چھوٹے قد کا ہو ، نہ بہت بڑے قد کا ۔ جب رستہ صاف ہو تو اچھلتا کودتا چلے اور جب راستے میں بھیڑ ہو تو آہستہ قدم اٹھائے ؛ نہ دیوار و در سے اڑتا چلے ، نہ گنجان درختوں میں سوار کو لے کر گھس جائے ۔ اگر چارہ کم دیا جائے تو صبر کرے اور پیٹ بھراؤ دیا جائے تو شکر کرے ۔ جب اس پر سوار ہوں تو چالاک بن جائے اور جب تھان پر باندھ دیں تو کان نہ ہلائے ‘‘۔

سوداگر نے جواب دیا : ’’چند روز صبر کر ۔ اگر خدا تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ سے قاضیِ شہر کو گدھا بنا دیا تو تیرا سوال پورا کر سکوں گا ۔‘‘

اس حکایت کا تعلق مضمون سے :

اگر آج کل کوئی کسی سے ایسا سوال کرے تو اُس کو قاضی کی جگہ اخبار نویس کا نام لینا چاہیے کیوں کہ قاضی میں صرف دو صفتیں ہونی ضرور ہیں :

(الف) اُس قانون کی واقفیت جس کی رو سے وہ فیصلے کرتا ہے ۔
(ب) انصاف ۔

بہ خلاف اخبار نویس کے کہ اس میں اپنے فرائض کی بجا آوری کے لیے بے شمار لیاقتوں کی ضرورت ہے ۔ ہمارے نزدیک کسی شخص کی نسبت یہ کہنا کہ ’’وہ اخبار نویسی کی پوری لیاقت رکھتا ہے‘‘ گویا اس امر کو تسلیم کر لینا ہے کہ ’’اُس کی ذات میں ہر قسم کی لیاقت اور فضیلت موجود ہے ۔‘‘

ایڈیٹر کی حیثیت :

اخبار نویس قطع نظر اس کے کہ قوم کا ناصح ، ملک کا وکیل اور گورنمنٹ کا مشیر ہوتا ہے ، وہ ایک قسم کا تاجر بھی ہے جس کو کم از کم مصارف اخبار اور اپنے حوائجِ ضروریہ کے لیے اپنی محنت کا معاوضہ ملک سے وصول کرنا پڑتا ہے ۔ پس جس طرح آزادی ، انصاف اور دیانت اس کی ذات میں ہونی ضروری ہے اسی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ اُس کے انداز بیان اور طرز تحریر میں ایک قوتِ مقناطیسی کا ہونا بھی ضرور ہے جس سے وہ پبلک کے دلوں پر فتح حاصل کر سکے ۔

آج کل کے اخباروں کی عام حالت :

مگر جہاں پبلک کے عام مذاق صحیح نہ ہوں ، جہاں ظرافت اور مسخرگی اور استہزا ، واقعات اور حقایق سے زیادہ مرغوب ہوں ، جہاں معزز اور شریف لوگوں پر پھبتیاں کہنا داخلِ حُسنِ بیان سمجھا جائے ، جہاں گورنمنٹ پر بے جا اور اندھا دھند نکتہ چینی کرنے کا نام ’’آزادی‘‘ رکھا جائے ، وہاں باوجود آزادی و انصاف و دیانت کے پبلک کے دلوں کو مسخر کرنا قریب ناممکن کے معلوم ہوتا ہے ۔

ہندوستان کے دیسی اخباروں کی عام حالت ، کیا گورنمنٹ کے نزدیک اور کیا ملک کے لایق آدمیوں کے نزدیک ، اب تک بہت بُری سمجھی جاتی ہے ۔

لیکن جس طرح کسی بستی میں زیادہ تر بوسیدہ اور شکستہ مکانوں اور کھنڈروں کا ہونا اُس بستی کے افلاس پر دلالت کرتا ہے یا کسی ملک کی شاعری میں زیادہ تر ہزل اور جھوٹ اور بد تہذیبی کا پایا جانا اس ملک کے مذاقِ فاسد پر گواہی دیتا ہے ، اسی طرح اخباروں کا بُری حالت میں ہونا اخبار نویسوں کی بے سلیقگی کی نسبت زیادہ تر اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ پبلک کا مذاق صحیح نہیں ہے ۔

بایں ہمہ اخبار نویسوں کو معذور نہیں سمجھا جا سکتا ، کیوں کہ ان کا پہلا فرض یہ ہونا چاہیے کہ وہ اپنی جادو بیانی سے پبلک کے مذاق کو ، اگر وہ فاسد ہے ، تو صحیح اور اگر صحیح ہے تو اعلیٰ درجے کا صحیح بنا دیں ۔

اخباروں کی پستی کے اسباب :

اخبار کے پست حالت میں رہنے کے دو ہی سبب ہو سکتے ہیں :

۱۔ یا تو یہ کہ اڈیٹر میں اخبار چلانے کی لیاقت نہیں ہے بلکہ اُس نے صرف یہ دیکھ کر کہ بہت سے لوگ اخبار کے ذریعے سے آسودگی کے ساتھ بسر کرتے ہیں ، اخبار کو محض ایک حیلۂ معاش سمجھ کر جاری کر لیا ہے ۔

۲۔ یا یہ کہ اڈیٹر میں کافی لیاقت موجود ہے مگر چوں کہ پبلک کا مذاق صحیح نہیں ہے ، اس لیے وہ اپنی اصلی لیاقت کو کام میں نہیں لاتا بلکہ زمانے کے تیور دیکھتا رہتا ہے کہ لوگ کس بات کو پسند کرتے ہیں اور کس بات کو نا پسند ۔ اور جو طریقہ اُن کے مذاق کے موافق ہوتا ہے اُس کو اختیار کر لیتا ہے ۔

(الف) پہلی صورت میں سوا اس کے اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ جس طرح ایک بد آواز موذن کو کچھ دینا کر کے اذان سے روکا گیا تھا ، اسی طرح ایسے اڈیٹروں کے لیے لوگ چندہ کر کے کچھ تنخواہ اِس شرط پر مقرر کر دیں کہ وہ مہربانی کر کے کبھی اخبار نہ

نکالیں ، کیوں کہ اُنھوں نے اپنی طاقت کے اندازہ کرنے میں دھوکا کھایا ہے اور اپنے لیے پیشہ انتخاب کرنے میں ویسی ہی غلطی کی ہے جیسی کوّے نے ہنس کی چال چلنے میں کی تھی ۔

(ب) لیکن دوسری صورت میں اڈیٹر سخت الزام کے قابل ہیں : وہ باوجودیکہ قوم کے ناصح ہیں مگر اس کو گمراہ کرتے ہیں اور طبیب ہو کر لوگوں کو مہلک دوا دیتے ہیں ۔ اُن کی مثال اُس طبیب کی سی ہے جو بیماروں کو دوا اور پرہیز اُن کی مرضی کے موافق بتاتا ہے اور اُن کو خوش رکھنا چاہتا ہے ، نہ کہ تندرست کرنا ۔

ایڈیٹروں کو نصیحت :

اس قسم کے اڈیٹروں کو (جن کی تعداد ملک میں بہ کثرت ہے) خوب یاد رکھنا چاہیے کہ معزّز کاموں کا صلہ روپیہ اور دولت نہیں ہے ۔ دیکھو :

ایک گویّا جو اچھی طرح گاتا ہے ،
ایک تماشاگر جو عمدہ تماشا دکھاتا ہے ،
ایک خدمت گار جو ہوشیاری اور سلیقے سے کام کرتا ہے ،
ایک طوائف جو دل‌فریب طریقے سے گاتی ناچتی ہے ،
ایک مسخرہ جو اپنے مسخرے پن سے امیروں کو خوش کرتا ہے ۔

یہ اور اس قسم کے تمام لوگ روپیہ کمانے میں علما ، حکما اور اہل کمال سے بالعموم اچھے رہتے ہیں ۔ پس اڈیٹر جو ملک کا وکیل اور گورنمنٹ کا مشیر ہونے کا دعویٰ کرتا ہے ، اگر وہ بھی صرف روپیہ کمانے کے لیے اپنے اخبار کو پبلک کے مذاقِ فاسد کا تابع رکھنا چاہتا ہے ، تو وہ بھی مذکورہ بالا اشخاص سے کچھ زیادہ وقعت نہیں رکھتا ۔

اخبار نویسی کی مشکلات :

یہ سچ ہے کہ ہمارے ملک میں جو شخص اخبار نویسی کے

فرائض پورے پورے ادا کرنے چاہیے ، اس کو اوّل اوّل کسی قدر مشکلات کا سامنا کرنا پڑے گا ۔ لیکن یاد رہے کہ سچی عزت جڑ کی طرح اندر ہی اندر پھیلتی ہے اور جھوٹی عزت پھولوں کی طرح جلد مرجھا کر خاک میں مل جاتی ہے ۔ سچی عزت نیکی کا سایہ ہے ۔ جب تک نیکی باقی ہے عزت اُس کے ساتھ ہے ۔ جو لوگ اول قدم پر مقبول اور ہر دل عزیز ہونا چاہتے ہیں ، وہ کبھی مقبول اور ہر دلعزیز نہ ہوں گے ۔ جن کاموں سے جلد فائدہ حاصل کرنے کی آرزو کی جاتی ہے اُن کے فائدے قلیل اور ناپایدار ہوتے ہیں ، مگر جو کام صبر اور استقلال کے ساتھ کیے جاتے ہیں اُن سے آخرکار وہ نتائج حاصل ہوتے ہیں جو کبھی وہم و گمان میں بھی نہ تھے ۔ کسی حکیم کا قول ہے کہ ''قسمت جلد بازوں سے چیزوں کی قیمت ٹھوک بجا کر لیتی ہے مگر صبر کرنے والوں کو مفت دیتی ہے '' ۔

اخبار نویسی کے میدان میں ترقی کرنے کی کافی گنجائش ہے :

جو لوگ اخبار نویسی کی عمدہ لیاقت رکھتے ہیں وہ ہندوستان کے دیسی اخباروں میں بہت آسانی سے فوقیت اور امتیاز حاصل کر سکتے ہیں ۔ بخلاف انگلستان کے کہ وہاں سب سے اعلی اور افضل اخبار نکالنا بظاہر امکان سے خارج معلوم ہوتا ہے ۔ ایک ایسے شخص کے لیے جو اڈیٹری کی عمدہ لیاقت رکھتا ہو ، ہندوستان کے عام اخباروں کا پست حالت میں ہونا بہت نیک فال ہے ۔ مثل مشہور ہے کہ ''جہاں کوئی بُرا نہ ہو ، وہاں اچھا کوئی نہیں ہو سکتا '' بخلاف اس کے جہاں بُرے ہی بُرے ہوں یا بُرے اچھوں سے زیادہ ہوں ، وہاں اچھا بن جانا بہت آسان ہے ۔ اسپارٹا والے سب بہادر تھے اس لیے وہاں کسی کی بہادری کی تعریف نہ ہوتی تھی ، لیکن اگر بنگال میں کوئی بنگالی شخص سپہ گری کے فن میں کمال بہم پہنچائے تو وہ تمام قوم میں سربرآوردہ ہو سکتا ہے ۔

ایک لائق اخبار نویس کے فرائض :

اگر ہندوستان میں کوئی شخص اخبار نویسی کے فن میں اصلی اور حقیقی ترقی کرنا چاہے تو :

(۱) اپنی جنرل انفورمیشن (معلومات عامہ) کو وسعت دے ۔

(۲) اپنی طرزِ تحریر میں اعتدال پیدا کرے ۔

(۳) مدح و ستایش میں مبالغے کو کام نہ فرمائے ۔

(۴) نکتہ چینی میں خیرخواہی اور سنجیدگی کو ہاتھ سے نہ دے ۔

(۵) جب تک کسی معاملے کے تمام پہلو اُس کی نظر میں نہ ہوں ، تب تک اُس پر رائے دینے میں جرأت اور جلدی نہ کرے ۔

(۶) جب تک خبر کسی معتبر ذریعے سے نہ پہنچے ، اُس وقت تک اُسے شائع نہ کرے ۔

(۷) ظرافت قدرِ ضرورت سے زیادہ کام میں نہ لائے ۔

(۸) مُلّایانہ اور طالب علمانہ بحثوں میں نہ پڑے ۔

(۹) مذہبی مباحث میں نہایت ضرورت کے بغیر دخل نہ دے ۔

(۱۰) ملک میں جو لوگ اچھے کام کرتے ہیں ان کو چمکائے اور جن سے کوئی برا کام سرزد ہو اُن سے تا بہ مقدور چشم پوشی کرے ۔

(۱۱) جن کی برائیوں سے ملک یا سوسائٹی کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہو ، اُن پر آزادانہ گرفت کرے ۔

(۱۲) تحریر میں سادگی ، متانت اور جامعیت اختیار کرے ۔

(۱۳) کارسپانڈنٹوں (نامہ نگاروں) کی دل آزار تحریروں سے ، جو اُن کی ذاتی اغراض پر مبنی ہوں ، اپنے اخبار کو پاک رکھے ۔

(۱۴) اخبار کی کتابت ، چھپائی اور صحت کا نہایت کوشش اور توجہ سے خیال رکھے ۔

(۱۵) اس امر کا خاص اہتمام رکھے کہ اخبار بالکل تاریخ معین اور

وقت مقررہ پر شائع ہوا کرے ۔

(۱۶) گورنمنٹ اور حکام کی نسبت جو کچھ لکھے اس میں ادب اور تعظیم کو نصب العین رکھے ۔ غرضکہ کوئی فرض اپنے فرائض میں سے تا بمقدور فروگزاشت نہ کرے اور کوئی بات اپنے کانشنس (ضمیر) اور انصاف و دیانت اور آزادی کے برخلاف نہ لکھے ۔

ایسا شخص جو ان تمام باتوں پر، جو بیان ہوئیں، پورے طور پر عمل پیرا ہو، اس کی نسبت امید کی جا سکتی ہے کہ وہ کبھی نہ کبھی اپنے ہم عصروں اور ہم پیشہ اشخاص میں ممتاز ہوگا ۔

اخبار نویس کا سب سے بڑا فرض :

جو مختصر فرائض ہم نے اخبار نویسی کے اوپر بیان کیے، شاید کوئی یہ سمجھے کہ اتنے فرائض ایک اکیلے آدمی سے کیوں کر ادا ہو سکتے ہیں ۔ لیکن ان سب کا اصل اصول راستی اور سچائی ہے اور یہ ایسا صاف، سیدھا، پُرامن اور بےخطر راستہ ہے جو نہایت آسانی سے بےزحمت و مشقت طے ہوتا ہے اور کبھی منزل مقصود پر پہنچانے میں خطا نہیں کرتا ۔ جس طرح ایک جھوٹ کے ترک کرنے سے تمام گناہ خود بخود ترک ہو جاتے ہیں، اسی طرح کسی پیشے میں راست بازی اور سچائی اختیار کرنے سے اس پیشے کے تمام فرائض خود بخود ادا ہوتے چلے جاتے ہیں ۔ راستی ایک سیدھی راہ ہے جس پر راہ گیر آنکھ بند کر کے چل سکتا ہے اور منزل مقصود تک پہنچ سکتا ہے ۔ لیکن جہاں اس سے بہکا، پھر جتنا آگے بڑھتا جائے گا، اتنا ہی منزل سے دور ہوتا جائے گا ۔

۷

موت کے یقین سے ہم کو کیا سبق لینا چاہیے ؟

(علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ، بابت ۱۸۹۳ع، صفحہ ۹۲۲)

> مولانا حالی کا یہ مضمون اگرچہ مختصر ہے لیکن ہرچہ بقامت کہتر بہ قیمت بہتر کا صحیح مصداق ہے ۔ اس میں مولانا نے یہ دکھایا ہے کہ جب موت یقینی ہے اور ایک نہ ایک دن یہ تلخ پیالہ ہر ایک کو پینا ہے تو کیوں نہ زندگی کے چند لمحات کو کار آمد بنایا جائے اور کیوں نہ مستعدی اور پھرتی کے ساتھ اپنے فرائض کو بجا لانے کی کوشش کی جائے، تاکہ ہمارا نیک نام دنیا میں باقی رہے اور آیندہ آنے والی نسل ہم کو نیکی اور بھلائی سے یاد کرے ۔ (محمد اسماعیل)

بےشک ہر شخص کو جس طرح اپنے ہونے کا یقین ہے، اسی طرح اس بات کا بھی یقین ہے کہ ایک دن ہم نہ ہوں گے ۔

مگر سوال یہ ہے کہ اس پچھلے یقین سے ہم کو کیا سبق لینا چاہیے ؟

(الف) کیا یہ سبق کہ تمام دنیا کو مع اپنی ہستی کے ناپائدار سمجھ کر جیتے جی مر جائیں اور خاک ہونے سے پہلے خاک ہو جائیں ؟

(ب) یا یہ نصیحت کہ اس ناگزیر وقت کے آنے سے پہلے جس قدر مہلت ملے، اس کو غنیمت سمجھ کر ہاتھ پاؤں ہلائیں ، اور خدا کی اس نعمت عظمیٰ سے جہاں تک ہو سکے ، آپ بھی فائدہ اٹھائیں اور اپنے ہم جنسوں کو بھی فائدہ پہنچائیں ؟

۱- صوفیاء اور صوفی منش شعراء کا بیان

(دنیا گزشتنی اور گزاشتنی ہے)

صوفیا اور شعرائے متصوفین نے پہلی بات پر حد سے زیادہ زور دیا ہے اور درحقیقت ایک ایسی شق اختیار کی ہے جس کو خواہی نخواہی ماننا پڑتا ہے ۔ وہ کہتے ہیں :

”دنیا اور دنیا کے سب کام ہیچ ہیں ۔ بادشاہ اور فقیر ، محل اور جھونپڑے سب گزشتنی اور گزاشتنی ہیں ۔ دنیا ایک رہ گزر ہے اور ہم سب اس کے رہ گزری ہیں ۔ مسافر کو چاہیے کہ ہر وقت منزل سے لو لگائے رکھے اور رستے کی دل فریب فضا کی طرف آنکھ اٹھا کر نہ دیکھے ۔ جب سرے سے دنیا ہی ہیچ در ہیچ ہے تو دنیا سے دل لگانا کیسا ؟ اور دنیوی ترقیات کے لیے دوڑ دھوپ کرنی کیسی ؟ ایک بلند نظر سوداگر اپنے دل میں طرح طرح کے منصوبے باندھتا ہے کہ ہندوستان سے نیل اور روئی بھر کر یورپ کو لے جاؤں گا اور وہاں سے کپڑا اور شیشے کی چیزیں لے کر پھر ایشیا میں آؤں گا ۔ ایران سے قالین خریدوں گا اور چین میں جا کر بیچوں گا ۔ چین سے چائے بھروں گا اور عرب میں جا کر فروخت کروں گا ۔ پھر وہاں سے مغرب میں جاؤں گا اور مغرب سے پھر مشرق چلا آؤں گا ۔ لیکن اکثر ایسا ہوتا ہے کہ وہ ابھی ایک سفر بھی پورا نہیں کر چکتا کہ موت کا پیغام آن پہنچتا ہے اور اس کے تمام منصوبوں کو خاک میں

ملا دیتا ہے ۔ جب کہ دنیا اور دنیا کی ہر ایک چیز ناپائدار ہے تو انسان کو چاہیے کہ ہر دم مرنے کے لیے تیار رہے اور اس تمام نمودِ بے بود کو ایک خواب کی سی نمایش یا سراب کا سا دھوکا سمجھے ۔ مال و دولت ، زن و فرزند ، باغ اور زمین سب چیزوں سے دست بردار ہو کر زادِ آخرت کی فکر کرے اور بہ قدر سدّ رمق کھانے اور پہننے کے سوا دنیا کی کسی چیز کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھے ۔“

بڑے بڑے حکیموں اور عارفوں نے اس امر پر اس قدر دلائل اور براہین قائم کی ہیں کہ حصر اور شمار سے باہر ہیں ، اور صوفی منش شاعروں کو یہ ایک ایسا دل چسپ مضمون ہاتھ لگا ہے کہ انھوں نے اپنی شاعری کی بنیاد زیادہ تر اسی پر قائم کی ہے ۔

مگر افسوس ہے کہ یہ نصیحت جیسی دل کش اور دل فریب ہے ویسی قابل عمل نہیں ۔

اگر بفرض محال تمام انسان اس نصیحت پر کاربند ہوں تو دنیا بالکل اجڑ جائے اور دنیا کے سارے کاروبار درہم برہم ہو جائیں ۔ شجاعت اور ہمت ، عقل اور تدبر ، محنت اور جفا کشی ، عدالت اور ریاست ، غرض کہ وہ سب صفتیں جو انسان کو انتظام معاش کے لیے عطا ہوئی ہیں ، یک قلم معطل اور بے کار ہو جائیں اور انسان کے لیے کوئی استحقاق خلیفۃ" اللہ بننے کا نہ رہے ۔

۲- حکما اور فلاسفروں کے خیالات

(موت کا یقین ہمیں کیوں دیا گیا ؟)

پس ظاہر ہے کہ موت کا یقین ہم کو اس لیے نہیں دیا گیا کہ ہر وقت دنیا کی بے ثباتی اور ناپائداری کے خیال میں مستغرق رہ کر زندگی سے دل سرد کر لیں اور تمام تعلقات سے بالکل دست بردار ہو جائیں ۔ موت کے انتظار میں دولتِ حیات کے فائدوں سے محروم رہیں

اور جوہر انسانیت سے ، جو خدا کا بے بہا عطیہ ہے ، جیتے جی ہاتھ دھو کر بیٹھ رہیں ۔ بلکہ اس لیے دیا گیا ہے کہ اس فانی زندگی کو غنیمت جانیں اور دنیا کو مزرعۂ آخرت سمجھ کر وہاں کے لیے جو کچھ بن آئے سو کریں ۔ اور یہ سمجھیں کہ شہر پر غنیم کی فوج دھاوا کرنے والی ہے ، تھوڑی سی دیر میں بیٹا باپ سے اور باپ بیٹے سے اور بھائی بھائی سے جدا ہوا چاہتا ہے ۔ گھر میں اسباب نقد و جنس جو کچھ ہے ، کوئی دم میں تاخت و تاراج ہونے والا ہے ۔ لوگ اونٹ اور چھکڑوں پر اثاث البیت لاد لاد کر جہاں کہیں محفوظ جگہ سنتے ہیں ، چلے جاتے ہیں ۔ کوئی قرض داروں سے اپنا قرضہ وصول کر رہا ہے تاکہ بھاگڑ کے وقت رستے کا سہارا ہو جائے ، کوئی زیور اور روپیہ زمین میں دفن کر رہا ہے تاکہ شاید غارت گروں کی دست برد سے بچ جائے ۔ اسی طرح ہر شخص اپنے اپنے کام میں مصروف ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ ایسے نازک وقت میں ذرا بھی غفلت ہوئی تو بچاؤ کی کوئی صورت باقی نہ رہے گی ، جان اور مال دونوں خطرے میں پڑ جائیں گے ۔

قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے کہ ”ہم نے موت اور زندگی کو اس لیے پیدا کیا ہے کہ دیکھیں کون اچھے کام کرتا ہے ۔“ اگر موت اس لیے پیدا ہوتی کہ سب کے دل دنیا اور مافیہا سے سرد ہو جائیں تو یوں ارشاد نہ ہوتا بلکہ یوں ہوتا کہ ”دیکھیں کون دنیا کے کاروبار چھوڑ کر الگ ہو جاتا ہے ۔“

آں حضرت صلعم فرماتے ہیں کہ ”دنیا میں ایسے رہو جیسے غریب الوطن یا راہ رو ۔ اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ ہر وقت ہوشیار اور اپنے کام میں سرگرم رہنا چاہیے کیوں کہ مقیم کی نسبت پردیسی یا راہ‌گیر زیادہ خبردار اور چوکنا رہتا ہے ۔

اچھے کاموں سے ، جن کی تحریک کے لیے موت کا کھٹکا لگایا گیا ہے ، صرف حقوق الٰہی مثلاً نماز ، روزہ ، حج ، عمرہ اور طواف وغیرہ ہی مراد نہیں ہیں بلکہ حقوق عباد اُن سے زیادہ ضروری اور اہم ہیں ۔

ہر درجے کے آدمیوں کے فرائض مختلف ہوتے ہیں

ہر فرقے اور ہر گروہ کو اس کے مرتبے اور درجے کے موافق تکلیف دی گئی ہے جس پر اُن سے باز پرس کی جائے گی ۔

۱۔ انبیاء پر نماز اور روزے کی ایسی تاکید نہیں کی گئی جیسی تبلیغ رسالت کے باب میں کی گئی ہے ۔

۲۔ بادشاہوں اور حاکموں کے لیے عدل اور مخلوق کی فریاد رسی کو سب عبادتوں سے افضل قرار دیا گیا ہے ۔

۳۔ دولت مندوں کو سب سے زیادہ اس بات کی تاکید ہے کہ اپنے تہی‌دست اور بے سرمایہ ہم جنسوں کی مدد کریں ۔

۴۔ علماء کا بڑا فرض یہ ہے کہ بنی نوع میں سے جہالت کو دور کریں اور جاہلوں کو راہ راست دکھائیں ۔

۵۔ اطباء کا بڑا فرض یہ ہے کہ بیماروں کی خبر لیں ۔

۶۔ عیال داروں کا سب سے زیادہ ضروری کام یہ ہے کہ وجہِ حلال سے کمائی کرکے اپنے عیال کی ضروریات کو رفع کریں ۔

پس دنیا میں جو کام ہو رہے ہیں ، صنعت ہو یا تجارت ، نوکری ہو یا حرفہ ، جہازرانی ہو یا قلبہ رانی ، غرض تمام کام بشرطیکہ قانون عقل اور قانون شریعت سے متجاوز نہ ہوں ، گو بظاہر دنیا کے حقیر اور فانی کام سمجھے جائیں ، مگر در حقیقت وہ ایسے ضروری فرائض ہیں کہ جب تک انسان انسان ہے ، کسی طرح اُن سے سبک دوش نہیں ہو سکتا ۔

حاصل کلام یہ ہے کہ موت کا کھٹکا اس لیے لگایا گیا ہے

کہ ہر فرقہ اور ہر جماعت اپنے فرائض مستعدی اور سرگرمی سے سرانجام کرنے میں مصروف رہے ۔

رباعی

یہاں رہنے کی مہلت کوئی کب پاتا ہے
آتا ہے اگر آج تو کل جاتا ہے
جو کرنے ہیں کام اُن کو جلدی بھگتاؤ
طلبی کا پیام وہ چلا آتا ہے[1]

---

[1] یہ رباعی خود مولانا حالی کی ہے ۔ (محمد اسماعیل)

۸

دنیا کی کل علم سے چلتی ہے یا عمل سے ؟

(تہذیب الاخلاق جلد ۱ ، نمبر ۱ ، بابت یکم شوال ۱۳۱۱ھ (۱۸۹۴ء)
صفحہ ۵-۸)

اس مضمون میں نہایت لطیف طرز پر اور بہت حکیمانہ طور پر اس امر کی تلقین کی ہے کہ علم کو عمل کے لیے حاصل کرنا چاہیے، نہ کہ محض واقفیت حاصل کرنے کے لیے ۔ جن قوموں نے اپنے علم سے عملی فائدہ اُٹھایا وہ آج دنیا میں سربلند ہیں ، اور جنھوں نے میاں مٹھو کی طرح علم حاصل کیا اور عملی میدان میں صفر رہے وہ آج دنیا میں پست اور ذلیل ہیں ۔ علم حاصل کرنے اور پھر اُس سے کام لینے کا نتیجہ اقبال اور ترقی ہے ۔ اور علم حاصل نہ کرنا یا حاصل شدہ علم سے کام نہ لینے کا نتیجہ پستی اور تنزل ہے ۔ اس مضمون میں مولانا نے دو ملکوں کے خالص اہل علم اور نرے ان پڑھ آدمیوں کا جو دلچسپ موازنہ کیا ہے ، وہ نہایت دلچسپ اور پُر اثر اور پڑھنے کے قابل ہے ۔

(محمد اسماعیل)

یہاں علم سے ہماری مراد مجرد علم ہے جو عمل سے بالکل خالی ہو ۔ اور عمل سے مراد محض عمل ہے جس میں علم کو

کچھ دخل نہ ہو۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ دنیا کی کل علم سے چلتی ہے یا عمل سے ؟

اگر ہم کو یہ بات دریافت کرنی ہو کہ چراغ کی بتی کا استعال اوکسیجن سے قایم رہتا ہے یا ہائیڈروجن سے ، یا دونوں سے ، تو ہم کو چاہیے کہ ایک دفعہ بتی کو محض اوکسیجن میں اور دوسری دفعہ محض ہائیڈروجن میں رکھ کر دیکھیں۔ اگر دونوں میں بجھ جائے تو سمجھنا چاہیے کہ ہوا کے دونوں جزوں کو اُس کے اشتعال میں دخل ہے۔ اور اگر ہائیڈروجن میں بجھ جائے اور اوکسیجن میں نہ بجھے تو جاننا چاہیے کہ اس کے اشتعال کا باعث محض اوکسیجن ہے ، نہ ہائیڈروجن۔

اسی طرح اگر ہم یہ دیکھنا چاہیں کہ دنیا کی کل علم سے چلتی ہے یا عمل سے ؟ تو ہم کو چاہیے کہ اول ایک ایسا ملک فرض کریں جس میں اہل علم و اہل نظر کے سوا کوئی کام کرنے والا اور ہاتھ پاؤں ہلانے والا نہ ہو اور پھر دیکھیں کہ وہ ملک کتنے دن آباد رہتا ہے۔ پھر ایک دوسرا ملک فرض کریں جس میں ان پڑھ محنتی مزدوروں کے سوا اہل علم کا نام و نشان نہ ہو اور پھر دیکھیں کہ وہ ملک آباد رہتا ہے یا نہیں۔

ہم اول ایک ایسا خطہ فرض کرتے ہیں جس کے باشندے جہڑاں عالم ، فلسفی ، ریاضی داں ، مصنف ، اوریٹر (Orator) ، شاعر اور بڑے فاضل ہیں مگر اُن میں کوئی خدا کا بندہ ایسا نظر نہیں آتا جو اُن واجب‌التعظیم اپاہجوں کے کھانے ، پہننے ، اوڑھنے ، رہنے سہنے اور لکھنے پڑھنے وغیرہ کا سامان مہیا کرے۔ اول تو کسی ملک میں بغیر کارکن جماعتوں کے ایسی آبادی کا وجود میں آنا ہی ناممکن ہے ؛ لیکن اگر بفرض محال کسی خطے میں ایسی ناشدنی کولونی (آبادی) چند روز کے لیے آباد ہو جائے تو اس کا انجام کیا

ہوگا ؟ ممکن ہے کہ بعض کو مطالعے کے ذوق و شوق میں ایک آدھ روز بھوک پیاس نہ لگے۔ بعض کو کسی مشکل مسئلے کے حل ہو جانے کی خوشی میں ایک دو وقت کھانے کی کچھ پروا نہ رہے یا بعض کو کسی مضمون کی دھن میں کچھ دیر تک خور و نوش کا خیال نہ آئے ، مگر بہت جلد وہ آپ کو ایک ایسی مخلوق پائیں گے جو بھوکی ہے مگر کوئی اُس کا رزاق نہیں ، ننگی ہے مگر کوئی اُس کا ستار نہیں ، حاجت‌مند ہے مگر کوئی اُس کا قاضی الحاجات نہیں۔ اب یا تو اُنھیں خود اپنے اعلٰی اور اشرف ہاتھوں سے وہ تمام حقیر اور ذلیل کام انجام دینے پڑیں گے جو عوام کالانعام کو کرنے چاہئیں اور یا فوراً اُس ملک سے ہجرت کر کے کسی ایسے خطے میں جا کر رہنا پڑے گا جہاں اُن کے لیے فرماں‌بردار بندے یا بندہ پرور خدا موجود ہو۔ دونوں حالتوں میں یہ نتیجہ نکلے گا کہ ”دنیا کی کل محض علم سے نہیں چل سکتی۔“

اس کے بعد ہم ایک دوسرا ملک فرض کرتے ہیں جس کے تمام باشندے ان پڑھ اور بےعلم ہیں مگر محنتی ، جفاکش اور اپنی ضروریات زندگی کے مہیا کرنے میں نہایت سرگرم ہیں۔ گو انھوں نے زراعت یا تجارت یا صنعت و دستکاری کے اصول کتابوں میں نہیں پڑھے مگر وہ اپنی تمام ضروریات ، جن پر انسان کی زندگی موقوف ہے ، خود مہیا کرتے ہیں۔ قدرتی خواہشیں اور نیچرل ضرورتیں اُن کو جس طرح سکھاتی گئیں اور متواتر تجربوں سے جس قدر اُن کی سمجھ بوجھ بڑھتی گئی ، وہ اپنے تمام کام برابر سرانجام کرتے رہے۔ بونا ، جوتنا ، بنج بیوپار ، صنعت اور دستکاری ، غرض کہ تمام اہم اور ضروری کام رفتہ رفتہ بقدر ضرورت انجام دینے لگے۔ اب اُن کی کوئی ضرورت بند نہیں رہتی اور کوئی کام اٹکا نہیں رہتا۔ ایک اناج پیدا کر کے لاتا ہے ، دوسرا پیستا ہے ، تیسرا پکاتا ہے اور تینوں مل کر کھاتے

ہیں ۔ ایک کپاس بوتا ہے ، دوسرا اُسے کاتتا ہے ، تیسرا بُنتا ہے ، چوتھا سیتا ہے اور چاروں مل کر پہنتے ہیں ۔ اُن کو چوری یا ڈکیتی کا مطلق خوف نہیں کیوں کہ اُن کے پاس اپنے ہاتھ پاؤں کی محنت کے سوا کوئی دولت نہیں ۔ اُن کو غنیم کے حملے کا کچھ ڈر نہیں کیوں کہ وہ اپنے ہاتھ پاؤں سے چوکس اور غنیم کے مقابلے کے لیے مستعد اور تیار ہیں ۔ اُن میں کوئی بدکار اور بدچلن نہیں کیوں کہ اُن کو اپنے کام دھندوں میں بدکاری اور بدچلنی کی فرصت نہیں ۔ اُن میں کوئی روگی اور بیمار نہیں کیوں کہ اُن میں کوئی طبیب اور ڈاکٹر نہیں ۔ اُن میں کوئی مذہبی تکرار نہیں کیوں کہ اُن میں کوئی واعظ یا ملاّ نہیں ۔ اُن میں کوئی پولٹیکل اختلاف نہیں کیوں کہ وہ سب کنسرویٹو (Conservative) ہیں ۔ اُن میں کوئی عدالتی جھگڑا نہیں کیوں کہ اُن میں کوئی وکیل اور بیرسٹر نہیں ۔ اُن میں اس کے سوا کوئی عیب نہیں کہ وہ سویلائزڈ (مہذب و تعلیم یافتہ) نہیں ، اور اس سے صاف ظاہر ہے کہ دنیا کی کل عمل سے چلتی ہے نہ علم سے ۔

اب فرض کرو کہ اس ملک کے باشندوں کا میل جول کسی ایسے ملک والوں سے ہو گیا جن کے تمام کام علمی اصولوں پر مبنی ہیں ۔ انہوں نے زراعت ، تجارت ، صنعت و دستکاری اور تمام جنگی اور ملکی مہمات میں علم ہی کو اپنا رہبر بنایا ہے ۔ کیا معمار اور کیا بڑھئی ، کیا لوہار اور کیا کمہار ، کیا درزی اور کیا کفش‌دوز ، غرض کہ تمام پیشہ ور محض علم کی ہدایت سے اپنے تمام کام سرانجام کرتے ہیں ۔

اس قسم کی باعلم و عمل قوم کے میل جول اور لین دین نے اس آباد ملک کے ان پڑھ باشندوں کو سخت نقصان پہنچایا ۔ اُن کی تجارت نے اُن کے اخراجات زندگی حد سے زیادہ بڑھا دیے ، اُن کی صنعت کے مقابلے میں ان کی صنعت ماند ہو گئی ، اُن کی دستکاری نے ان کی دستکاری کو اینڈ کر دیا ۔ مگر ایک مدت تک ان کو اس

بات کی مطلق خبر نہ ہوئی کہ ہمارے پیشہ ور کیوں بےکار ہو گئے ؟ ہماری کمائیوں میں کیوں برکت نہ رہی ؟ ہمارے اخراجات روز بروز کیوں بڑھتے جاتے ہیں ؟ اور ہماری آمدنی ہمارے اخراجات کو کیوں مکتفی نہیں ہوتی ؟

لیکن اُس غیر قوم سے جوں جوں میل جول بڑھتا گیا ، اُن کو اِن کی اور اِن کو اُن کی زبان سیکھنے کی ضرورت زیادہ ہوتی گئی ۔ انہوں نے اول اُن کی زبان سیکھی ، پھر رفتہ رفتہ اُن کے علم بھی سیکھنے لگے ۔ جن علموں کے ذریعے سے انہوں نے ہر فن میں ترقی کی تھی ، وہ علم بھی انہوں نے حاصل کیے ، مگر سوائے رٹ لینے کے کوئی عملی فائدہ اُن کے علموں سے نہ اُٹھایا ۔ وہ علم کو عمل کی غرض سے سیکھتے تھے ، انہوں نے علم کو محض علم کے واسطے سیکھا ۔ وہ اس نتیجے پر پہنچ چکے تھے کہ علم آدمی کے لیے بنا ہے مگر یہ بہ مشکل ابھی یہیں تک پہنچے تھے کہ آدمی علم کے لیے بنا ہے ۔ وہ علم سے خود بھی لذت اور فائدہ اٹھاتے تھے اور اپنے ملک اور قوم کو بھی اُس کے فوائد پہنچاتے تھے ۔ انہوں نے گونگے کی طرح گڑ کھایا اور کسی نے نہ جانا کہ کھٹا ہے یا میٹھا ۔ پو دنیا کی مختلف زبانیں اس لیے سیکھتے تھے کہ تمام عالم میں پھرتے تھے ، غیر ملکوں کے آدمیوں سے ملتے تھے ، مختلف قوموں کے علوم و فنون سے آگاہی حاصل کرتے تھے اور اُن کو اپنی زبان میں نقل کرتے تھے ۔ انہوں نے بھی اُن کی دیکھا دیکھی غیر ملکوں کی زبانیں اور غیر قوموں کی بولیاں سیکھیں ، مگر نہ اس لیے کہ غیر ملکوں میں سفر کریں اور غیر قوموں کے علوم و فنون اپنی زبان میں منتقل کریں ، بلکہ اس لیے کہ طوطے کی طرح کہیں ''حق اللہ پاک ذات اللہ'' اور کہیں ''ست گوردت داتا'' بول اُٹھیں ۔ وہ لیمپ روشن کرنے کے لیے ، میز لکھنے کے لیے ، کرسی بیٹھنے کے لیے ، گھنٹہ وقت دیکھنے کے لیے اور فرش بچھانے کے لیے

خریدتے تھے ۔ انھوں نے اُن کی ریس سے یہ سب چیزیں فراہم تو کیں مگر نہ لیمپ کو جلایا ، نہ میز پر لکھا ، نہ کرسی پر بیٹھے ، نہ گھنٹے میں وقت دیکھا اور نہ فرش کو بچھایا ۔ بلکہ کباڑی کی طرح سارا گھر اسباب سے بھر لیا ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان لوگوں کی حالت بد سے بد تر ہوتی چلی گئی ۔ علم کے ذوق و شوق میں انھوں نے ہاتھ پاؤں مارنے بالکل چھوڑ دیے اور علم کا ادب اُن کو دنیا کے ذلیل کاموں میں ہاتھ ڈالنے سے مانع ہوا ۔ اب تا وقتیکہ وہ علم کو عمل کی غرض سے نہ پڑھیں اور اس سے عملی فائدے نہ اٹھائیں تب تک ممکن نہیں کہ اُن کی حالت درست ہو ۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ دنیا کی کل علم سے نہیں چلتی بلکہ عمل سے چلتی ہے ۔

اس تمثیل سے ہمارا یہ مطلب نہیں کہ ہم کو علم کی ضرورت نہیں ۔ نہیں بلکہ ہم کو اس وقت علم کی نہایت ضرورت ہے اور ایسی ضرورت ہے جیسے پیاسے کو ٹھنڈے پانی کی ضرورت ہوتی ہے ۔ لیکن جس طرح ٹھنڈے پانی کی کُلیاں کرنے سے پیاس نہیں بجھتی بلکہ اور زیادہ بھڑکتی ہے ، اسی طرح سطحیوں کی مانند کتابوں کے الفاظ اور علوم کی اصطلاحات یاد کرنے سے اور طوطے کی طرح علمی مسائل اور قواعد ازبر کرنے سے کوئی شخص نہ آپ کو اور نہ مُلک کو کوئی اصلی فائدہ پہنچا سکتا ہے ۔ بلکہ اندیشہ ہے کہ ایسے لوگ ملک کے حق میں کہیں مضر ثابت نہ ہوں ۔

جس علم کی ہم کو ضرورت ہے وہ وہ علم ہے جو ہماری ساکن اور پژمردہ قوتوں کو متحرک اور شگفتہ اور شاداب کرے ۔ نہ کہ وہ علم جو ہمارے متحرک اور شگفتہ قویٰ کو بھی ساکن اور پژمردہ کر دے ۔ ایسے علم سے بے علمی سو درجے بہتر ہے ۔ بقول شخصیکہ :

بخشو بی بلی چوہا لنڈورا ہی جیے گا

۹

ہم جیتے ہیں یا مر گئے؟

(رسالہ تہذیب الاخلاق جلد ۱ ، نمبر ۲ بابت یکم ذی الحجہ
۱۳۱۱ھ (۱۸۹۴ع) صفحہ ۳۸-۵۲)

سرسید کے تمام رفیقوں میں یہ خصوصیت صرف مولانا حالی کو حاصل ہے کہ وہ ”اخلاق کے پیغمبر“ ہیں ۔ اُن کی بیشتر نظمیں اور اُن کے زیادہ تر مضامین اخلاق و موعظت اور وعظ و پند سے بھرے ہوئے ہوتے ہیں ۔ اُن کا دل قوم کی ہمدردی اور غم خواری میں چُور ہو رہا ہے اور اُن کا قلم قوم کی اصلاح اور درستی کے لیے طرح طرح کے نقش بناتا ہے ۔ مندرجہ ذیل مضمون اُن کے ناصحانہ مقالات میں شاہکار کی حیثیت رکھتا ہے ، جس میں اُنھوں نے قوم کی غفلت اور جمود پر خون کے آنسو بہا کر اور اُس کے عیوب جتا کر اُسے ترقی کی طرف مائل کرنا چاہا ہے ۔ بلاشبہ یہ عجیب مضمون آبِ زر سے لکھے جانے کے قابل ہے ۔ (محمد اسماعیل)

عربی میں ایک مشہور مقولہ ہے جس کے معنی ہیں : ”کام کرنا زندوں کو شایاں ہے اور بے کار رہنا مُردوں کو ۔“ اس قول کے موافق ہم دیکھنا چاہتے ہیں کہ ہماری قوم میں کچھ جان باقی ہے یا نہیں؟ سچ یہ ہے کہ اگر مستثنیٰ مثالوں سے

قطع نظر کی جائے تو نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہماری قوم میں کچھ جان باقی نہیں رہی اور بے اختیار یہ شعر زبان پر آتا ہے :

ایتها النفس اجملی جزعاً
ان الذی تحذرین قد وقعا[1]

اس بات کے بیان کرنے کی کچھ ضرورت نہیں ہے کہ قوم کی ترقی کا مدار صرف اس بات پر ہے کہ اس کے افراد میں عموماً مستعدی ، محنت اور استقلال کے ساتھ کام کرنے کی عادت پائی جائے ۔ ہم دیکھتے ہیں کہ کسی خاندان بلکہ کسی قوم میں اگر ایک شخص بھی ایسا پیدا ہو جاتا ہے جس میں یہ صفات موجود ہوں تو اُس کی ذات سے تمام خاندان بلکہ تمام قوم کو فائدہ پہنچتا ہے ۔ پس جس قوم کے افراد میں عموماً یہ خصلتیں پائی جائیں گی ، ممکن نہیں کہ وہ قوم اپنی بساط کے موافق ترقی میں کوئی ممتاز درجہ حاصل نہ کرے ۔ لیکن جہاں تک ہم اپنی قوم کی حالت پر غور کرتے ہیں ، اُس میں چاروں طرف ہم کو ایک سناٹا نظر آتا ہے ، اور وہ اسلام جو بحرِ قلزم کی طرح موجیں مارتا ہوا اٹھا تھا ، آج بحرِ منجمد کی طرح ساکن اور بے حس و حرکت معلوم ہوتا ہے ۔

آگ تھے ابتدائے عشق میں ہم
اب ہوئے خاک ، انتہا یہ ہے

ترقی کی پہلی سیڑھی اپنے تنزل کا یقین ہے اور امن و آزادی ترقی کے دو بڑے معاون ہیں ۔ ہم کو اپنے تنزل کا پختہ یقین ہو گیا ہے ۔ امن و آزادی جو برٹش حکومت کی بدولت ہم کو اس زمانے میں حاصل ہے ، وہ کسی عہد اور کسی دور میں ہندوستان کو

---

[1] یعنی اے دل ! اپنی بے قراری کو کم کر (کیوں کہ) جس بات کا تجھ کو ڈر تھا وہ تو ہو چکی ۔

نصیب نہیں ہوئی ۔

ترقی کے نمونے بھی اپنے ہم وطنوں میں ہم رات دن اپنی آنکھ سے دیکھتے ہیں ۔

ترقی کی قابلیت ہم میں بھی اُسی قدر ہے یا ہونی چاہیے جس قدر کہ ہندوستان کی اعلیٰ سے اعلیٰ قوم کو قدرت نے عطا کی ہے ۔

باوجود ان تمام باتوں کے ہم دیکھتے ہیں کہ ترقی کی روح ہم میں اب تک پیدا نہیں ہوئی ۔ ہم خوب جانتے ہیں کہ ہم کو کچھ کرنا چاہیے لیکن کچھ کرتے نہیں ۔

ہم کو بھوک شدت سے لگی ہوئی ہے مگر چاہتے ہیں کہ کہیں سے پکا پکایا ہاتھ لگ جائے تو کھا لیں ۔

ہم پیاس کے مارے مرے جاتے ہیں مگر منتظر ہیں کہ کوئی خدا کا بندہ ہمارے حلق میں آ کر پانی چوا جائے ۔

ہم توکل کو اس لیے ضروری نہیں سمجھتے کہ اس میں خدا پر بھروسا کرنا ہوتا ہے ، بلکہ اس لیے کہ توکل کی بدولت ہم کو ہاتھ پاؤں ہلانے نہیں پڑتے ۔

ہم تدبیر کو اس لیے بے سود خیال نہیں کرتے کہ وہ تقدیر الٰہی کا مقابلہ نہیں کر سکتی ، بلکہ اس لیے کہ تقدیر کے حیلے سے ہم کو کچھ کرنا نہیں پڑتا ۔

ہم دنیا اور دنیا کے کاموں کو اکثر فانی اور حقیر بتاتے ہیں مگر نہ اس لیے کہ فی الحقیقت ہم دنیا کو ایسا ہی سمجھتے ہیں بلکہ صرف اس لیے کہ ہم کو ہاتھ پاؤں ہلانے نہ پڑیں ۔

ہم اُس حیلہ جُو لومڑی کی طرح انگور کے خوشوں سے اس لیے ناک نہیں چڑھاتے کہ اُن کو کھٹا سمجھتے ہیں بلکہ اس لیے کہ اُن کے توڑنے میں ہم کو دقت معلوم ہوتی ہے ۔

ہم کہتے سب کچھ ہیں مگر کرتے کچھ نہیں ۔ ہماری حالت

ہم کو جھٹلاتی ہے اور ہمارے افعال ہمارے قول کی تکذیب کرتے ہیں ۔

ہم قدریہ اور جبریہ دونوں فرقوں کو گم راہ بتاتے ہیں مگر ہم خود قدری بھی ہیں اور جبری بھی ۔ ہمارے دعوے قدریوں کے سے ہیں اور ہمارے کام جبریوں جیسے ، ہماری زبان قدری ہے اور ہمارا دل جبری ۔

مسلمانوں میں قوت عملی کا فقدان اور اس کی چند مثالیں :

اگرچہ ہم میں لایق آدمیوں کا قحط ہے ، تاہم کم و بیش مصنف ، لکچرار اور شاعر ہم میں موجود ہیں ۔ ہمارے مصنفین کو یہ شکایت ہے کہ پڑھنے والوں میں قوتِ منفعلہ نہیں اور پڑھنے وللوں کو یہ شکایت ہے کہ مصنفوں میں قوت فاعلہ نہیں ۔ ہمارے اسپیکر اور لکچرار جب کچھ بولتے ہیں تو بعض اوقات اُن میں قومی جوش کسی طرح کم نہیں معلوم ہوتا ۔ ہمارے شاعر جب کچھ پڑھتے ہیں تو قومی ہم دردی اُن کے ایک ایک لفظ سے ٹپکتی ہے ، مگر فی الحقیقت اُن کے کلام میں اور فونوگراف کی آواز میں کچھ فرق نہیں ہوتا ۔ گویا ایک ہوا بھری ہوئی تھی ، جب وہ نکل گئی تو اب بالکل خالی ہیں ۔

ہماری قوم میں انگریزی تعلیم جو [پریکٹیکل آدمی (عملی یعنی کام کرنے والے اشخاص) پیدا کرنے کا دعویٰ کرتی ہے] چشم بد دور روز بروز بڑھتی جاتی ہے اور تعلیم یافتہ اصحاب کی تعداد میں ہر سال معقول اضافہ ہوتا رہتا ہے ۔ مگر افسوس ہے کہ مستثنیٰ صورتوں کے سوا عملی قوت اور سیلف ہلپ (اپنی مدد آپ) کا مادہ اُن میں تعلیم کے بعد اتنا بھی نہیں رہتا جتنا کہ مدرسے میں داخل ہوتے وقت وہ اپنے ساتھ لائے تھے ۔

ان میں سے ایک گروہ وہ ہے جس کی بڑی دوڑ بی اے یا ایم اے کی ڈگری حاحل کرنے کے بعد یہ ہے کہ مڈل پاس کیے ہوئے طلبہ کی طرح سرکاری نوکری کے لیے ادھر اُدھر سلسلہ جنبانی کرتا پھرے اور ذریعوں اور سفارشوں کی تلاش میں ایک مدت تک سرگردان و پریشان رہے ۔ اُن کو اپنے دست و بازو پر اتنا بھی بھروسا نہیں ہوتا جتنا کہ چرندوں اور پرندوں کو اپنی قوت لایموت کی تلاش میں ہوتا ہے ۔ وہ وجہِ معاش کو غلامی یعنی نوکری ہی میں منحصر جانتے ہیں ۔ اُن میں اور ایک غریب اورینٹل سکالر (عربی یا فارسی کے عالم) میں صرف اتنا ہی فرق ہوتا ہے کہ اُنھوں نے زمانے کی ضرورت کے موافق باقاعدہ غلامی کا پیشہ سیکھا ہے اور اس بےچارے نے نہیں سیکھا ۔ ان میں سے جن کو سرکاری نوکری مل جاتی ہے ، اُن کو چار ناچار کتاب بالاے طاق رکھنی پڑتی ہے اور لکھنے پڑھنے سے ہمیشہ کے لیے دست بردار ہونا پڑتا ہے ۔ اُن کی مثال بعینہ اُس بد قسمت عربی گھوڑے کی سی ہے جس کو گھوڑ دوڑ کے لیے تیار کیا گیا ہو اور پھر بجائے گھوڑ دوڑ کے چھکڑے یا ہل میں جوتا گیا ہو ۔

مگر وہ عالی ہمت گریجویٹ ، جو نوکری کو پسند نہیں کرتے یا نوکری اُن کو پسند نہیں کرتی ، اُن کا حال پہلوں سے بھی گیا گزرا ہے ۔ اگر وہ چھکڑے یا ہل میں جوت دیے جاتے تو کچھ کام بھی آتے ، لیکن اب وہ کسی کام کے نہیں ۔ اُن کی کوششیں اکثر بے مصرف ہوتی ہیں جن سے نہ اُن کو اور نہ کسی اور کو کچھ فائدہ پہنچتا ہے ۔ اُن کو رومن ایمپائر (سلطنت روم) کی تمام ہسٹری اور اُس کے تنزل کے اسباب ازبر ہوتے ہیں مگر اپنی ہستی کی مطلق خبر نہیں ہوتی ۔ وہ یورپ کے مصنفوں ، موجدوں اور رفارمروں کے کام نہایت فخر کے ساتھ بیان کرتے ہیں ، لیکن سوائے اس کے کہ اُن کے کارنامے بیان کرکے اپنی واقفیت کی داد چاہیں ، خود

کچھ نہیں کرتے اور نہ کر سکتے ہیں ۔ وہ ہندوستانیوں کے حقوق جو گورنمنٹ کے ذمے ہیں ، کمال ادب سے بیان کرتے ہیں مگر اُن کے ، اُن کے خاندان کے اور اُن کی قوم کے حقوق ، جو خود اُن کے ذمے ہیں ، اُن پر کبھی غور نہیں کرتے ۔ وہ گورنمنٹ کے انتظام پر نکتہ چینی کرنے میں آندھی ہیں مگر اپنے گھر کے انتظام سے محض بے پروا ۔

ہمارے بہت سے نوجوان ولایت سے تعلیم پا کر آئے ہیں اور اُس پارس کی پتھری کو چھو آئے ہیں جو مس کو طلا کر دیتی ہے ۔ وہ اپنی عمر کا ایک عمدہ حصہ اُس قوم میں بسر کر آئے ہیں جو حب وطن اور قومی ہمدردی کو اپنا دین و ایمان سمجھتی ہے ۔ انھوں نے برسوں اس ملک کی ہوا کھائی ہے جہاں انسان علم و عمل کے سائے میں پرورش پاتا ہے ۔ مگر جب وہ مع الخیر ہندوستان میں پہنچتے ہیں تو اکثر کی حالت بعینہ اس شعر کی مصداق ہوتی ہے :

مکے گیا ، مدینے گیا ، کربلا گیا
جیسا گیا تھا ویسا ہی چل پھر کے آ گیا

حبّ وطن اور قومی ہمدردی اُن میں اتنی بھی باقی نہیں رہتی جتنی کہ وہ یہاں سے اپنے ساتھ لے کر جہاز میں سوار ہوئے تھے ۔ قوم سے اُن کو نفرت ہو جاتی ہے اور ہندوستانی سوسائٹی میں شریک ہونے سے اُن کو شرم آنے لگتی ہے ۔ جس حقارت سے کہ انگریز ہندستانیوں کو دیکھتے ہیں ، وہ اُن سے بھی زیادہ حقارت کی نگاہ سے ہم وطنوں کو دیکھنے لگتے ہیں ۔ انگریز اُن کو ہاف سویلائزڈ (نیم وحشی) کہتے ہیں تو وہ اُن کو ان سویلائزڈ (وحشی مطلق) کا خطاب دیتے ہیں ۔ وہ اپنی قوم کو ترقی اور اصلاح کے نا قابل بتاتے ہیں اور اس لیے اُن کی بھلائی کے لیے مطلق کوشش نہیں کرتے بلکہ جو لوگ ایسے کاموں میں کوشش کرتے ہیں ، اُن کی کوششوں پر

ہنستے ہیں اور اُن کو بے سود خیال کرتے ہیں ۔ یہ تمام شہادتیں اس بات کی ہیں کہ ہماری قوم میں عملی قوت باقی نہیں رہی ۔

کبھی کبھی ہمارے بھائیوں کے دل میں ایک غیر معمولی جوش دودھ کے اُبال سے بھی زیادہ خود بخود اٹھتا ہے ۔

کبھی وہ اپنے چند ہم خیال آدمیوں کو متفق کر کے ایک انجمن محض قوم کی بھلائی کے لیے منعقد کرتے ہیں ۔

کبھی مسلمانوں کی تعلیم کے لیے کوئی اسلامی یا انگریزی مدرسہ قائم کرتے ہیں ۔

کبھی کوئی رسالہ یا اخبار محض قوم کے فائدے کی غرض سے جاری کرتے ہیں ۔

اسی طرح کبھی ایک تدبیر اور کبھی دوسری تدبیر خاص قوم کی بھلائی کے لیے کرتے ہیں اور اکثر ان تدبیروں کے محرک جہاں تک ہم کو معلوم ہے ، فی الواقعہ نہایت خلوص اور صدق دل سے ان کاموں کو شروع کرتے ہیں ، اور ان کا یہ دلی ارادہ ہوتا ہے کہ تادم واپسیں ان کاموں میں کوشش کریں گے اور اُن کو ترقی دیں گے ۔ مگر در حقیقت اُن کی حرکت ایک حرکت مذبوحی ہوتی ہے ۔ وہ ایک ہی دو جست کے بعد بالکل ٹھنڈے پڑ جاتے ہیں ۔ اُن کا کوئی منصوبہ (الا ماشاء اللہ) پورا نہیں ہوتا ۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ جو کچھ ہم کرنا چاہتے ہیں ، وہ نہیں کر سکتے ؛ جس کے یہ معنی ہیں کہ ہم میں قوت عملی باقی نہیں رہی ۔

ہم میں ہزاروں بلکہ لاکھوں ایسے سمجھ دار آدمی موجود ہیں جو پرانی بیہودہ رسموں کو برا جانتے ہیں ۔ شادی اور غمی میں جو بے دریغ روپیہ صرف ہوتا ہے ، اُس کو محض فضول اور لغو بلکہ گناہ اور معصیت سمجھتے ہیں ۔ جو لوگ ایسے موقعوں پر سودی روپیہ قرض لے کر خرج کرتے ہیں ، اُن پر نہایت افسوس کے ساتھ ہاتھ

LIBRARY
Anjuman Taraqqi Urdu (Hind)

ملتے ہیں ۔ مگر جب ویسا ہی موقع خود اُن کو پیش آتا ہے تو آنکھیں بند کرکے اُسی کوئیں میں آپ کود پڑتے ہیں جس میں اوروں کو گرتے دیکھ کر افسوس کرتے تھے ۔ اکثر لوگ لڑکیوں کی تعلیم کو نہایت ضروری سمجھتے ہیں اور دل سے اس بات کے خواہاں ہیں کہ ان کی تعلیم کا مناسب اور قابل اطمینان طریقے سے رستہ نکلے ۔ اس باب میں لوگوں کی ترغیب اور تحریص کے لیے کتابیں اور رسالے تصنیف کرتے اور اخباروں میں مضامین لکھتے ہیں ، مگر عملی طور پر کوئی کارروائی ان سے نہیں ہو سکتی ، اور زبانی جمع خرچ کے سوا وہ کوئی عملی کرشمہ نہیں دکھا سکتے ۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ عملی قوت ہم میں باقی نہیں رہی ۔

ہم میں ہزاروں بلکہ لاکھوں ایسے ہیں جو تنگیِ معاش کے سبب نہایت حیران و پریشان ہیں اور چاہتے ہیں کہ جس حیلے سے روٹی میسر آئے ، وہ طریقہ اختیار کریں ۔

بعضے بیوپار کرتے یا دوکان کھول کر بیٹھتے ہیں ۔ اگر اپنے پاس کافی سرمایہ نہیں ہوتا تو چند اور اشخاص کو بھی اپنے ساتھ شریک کر لیتے ہیں ۔ لیکن سوا اُن لوگوں کے جو قدیم سے تجارت پیشہ رہے ہیں ، باقی سب ہمیشہ نقصان اُٹھاتے ہیں ؛ دوالہ نکالتے ہیں ، مقروض ہوتے ہیں اور پھر کبھی بھول کر بیوپار یا دوکان کا نام نہیں لیتے ۔ بعضے کھیتی میں قسمت آزمائی کرتے ہیں ، بعضے صیغہٴ تعمیراتِ سرکاری میں ٹھیکے لیتے ہیں ۔ بعضے پریس جاری کرتے ہیں ، بعضے اخبار نکالتے ہیں ، مگر جہاں دیکھیے اخیر نتیجہ ہمیشہ ناکامی ، خسارہ اور مایوسی ہوتی ہے ۔ اور اس سے ثابت ہوتا ہے کہ عملی قوت ہماری قوم میں باقی نہیں رہی ۔

اگر کسی خاندان میں حسنِ اتفاق سے ایک کماؤ پیدا ہو جاتا ہے تو تمام خاندان اُس کے سہارے پر فکرِ معاش سے فارغ البال

ہو جاتا ہے ۔ ایک کماتا ہے اور بیس کھاتے ہیں ۔ ایک شکاری ہے اور بیس اس کے فضلہ خوار ہیں ۔ وہ کماتے کماتے تھک جاتا ہے مگر یہ کھاتے کھاتے نہیں تھکتے ؛ کھاتے ہیں اور غرّاتے ہیں ۔ مرغی اپنی جان سے جاتی ہے اور کھانے والوں کو مزہ نہیں آتا ۔ یہ سب کچھ اس لیے ہوا کہ ہم میں قوتِ عمل باقی نہیں رہی ۔

آٹھ برس سے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا سالانہ اجلاس مختلف شہروں میں صرف اس لیے ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی ترقی کی جو تدبیر کسی کے ذہن میں آئے وہ اُس کو مجمعِ عام میں پیش کرے ، اور جو تجویز بعد بحث و مباحثہ کے اتفاق یا کثرتِ رائے سے صائب اور معقول قرار پائے اُس سے عام مسلمانوں کو مطلع کیا جائے ، تاکہ جو باتیں اُن کے کرنے کی ہوں اُن کو عمل میں لائیں ۔ لیکن آج تک کانفرنس کی ایک اصلاح پر بھی غالباً کسی نے عمل نہیں کیا ۔ بلکہ بجائے اس کے کہ خود اپنے دل میں شرمندہ ہوں ، اُلٹے کانفرنس کی کارروائیوں پر نفرین کرتے ہیں اور اُس کو محض لغو اور بے سود بتاتے ہیں ۔ اس سے ظاہر ہے کہ جس طرح اُن میں قوتِ عمل باقی نہیں ، اسی طرح وہ اپنے فرائض کو بھی نہیں سمجھ سکتے ، اور مثل جمادات کے اپنے آپ کو کسی تکلیف کا مکلف نہیں جانتے ۔

ہماری قوم میں جو اس قابل ہیں کہ ترقی و تنزل کے مفہوم کو سمجھتے ہیں اور اپنے میں اور دوسری ترقی یافتہ اقوام میں اُن کو کم و بیش فرق محسوس ہوتا ہے ، وہ دو حال سے خالی نہیں ؛ یا پرانے خیال والے ہیں یا نئے خیال والے ۔ جو پرانے خیالات رکھتے ہیں اور قومی تنزل کے اخیر نتائج کا بخوبی اندازہ نہیں کر سکتے ، وہ اس حیلے سے سعی و کوشش کو بے سود بتاتے ہیں کہ دنیوی تنزل اور دنیوی ترقی سب ہیچ ہے ۔ انجام دونوں کا فنا ہے ۔ ہم کو صرف وہاں کی فکر کرنی چاہیے جہاں ہمیشہ رہنا ہے اور بس ۔

نئے خیال والے ، جو ترقی و تنزل کی ماہیت اور اس کے نتائج سے بخوبی واقف ہیں اور دیگر اقوام کی ترقی اور اپنے تنزل میں جو نسبت ہے اس کو سمجھے ہوئے ہیں ، اُن میں اکثر کا یہ قطعی فیصلہ ہے کہ مسلمانوں کی قوم ہرگز اُبھرنے والی نہیں ۔ اُس کا ضعف کسی ایسے مرض کے سبب سے نہیں ہے جو ردأتِ مادہ سے عارض ہوا ہو تاکہ اُس کو قابلِ علاج سمجھا جائے ، بلکہ اُس سبب سے ہے کہ اس میں حرارتِ غریزی باقی نہیں رہی ، اور اس لیے اس کو سنبھالنے کی کوشش کرنی محض بےفائدہ ہے ۔

الغرض کیا پُرانے خیال والے اور کیا نئے خیال والے ، دونوں عموماً سعی و کوشش کو عبث اور رائگاں خیال کرتے ہیں ۔ پہلے اس لیے کہ ترقی ضروری نہیں اور پچھلے اس لیے کہ ترقی ممکن نہیں ۔ اِسی طرح ہمارے بعضے گروہ کچھ نہیں کر سکتے اور بعضے کچھ کرتے نہیں ۔ اور یہ بہت بڑا ثبوت اس بات کا ہے کہ ہماری قوم میں عملی قوت باقی نہیں رہی ۔

عملی قوت والوں سے وہ لوگ مراد نہیں ہیں جو محنت مزدوری اور پیشے یا حرفے کے ذریعے سے بری بھلی طرح اپنا پیٹ پالتے ہیں ۔ ایسے لوگ تو مُردہ سے مُردہ قوم میں بھی ، جب تک کہ اُس قوم کے تھوڑے بہت افراد دنیا میں موجود ہیں ، ضرور ہے کہ پائے جائیں ۔ کیوں کہ :

ایں شکمِ بے ہنرِ پیچ پیچ　　صبر ندارد کہ بسازد بہ پیچ

نہیں بلکہ وہ لوگ مراد ہیں جو زمانے کی رفتار کے موافق نہ صرف باتوں سے بلکہ کاموں سے قوم کے لیے خود نمونہ بن کر اُس کو ترقی کی طرف مائل کریں ۔ مثلاً معاشرت میں جو خرابیاں اُن کو نظر آئیں ، صرف اُن کی برائی اور مذمت کرنے ہی پر اکتفا نہ کریں بلکہ خود ان کو ترک کر کے قوم کے لیے مثال قایم کریں ۔ معاش

کے وہ جائز ذریعے جو قوم کی اکثر جماعتوں میں معیوب گنے جاتے ہیں ، جیسے دوکان داری یا صنعت و دستکاری ، اُن کو خود اختیار کر کے ان جماعتوں کی جھجک دور کریں ۔ تجارت کے وہ اصول جن کے ذریعے سے کم مقدور آدمی بھی بڑی بڑی تجارتیں کر سکتے ہیں ، اُن پر خود کاربند ہو کر قوم میں تجارت کا چرچا پھیلائیں ۔ اسی طرح ترقی کی ہر شاخ میں خود کچھ کر کے دکھائیں تاکہ اور لوگ بھی اُن کی دیکھا دیکھی وہی رستہ اختیار کریں ۔ تعلیم جو ترقی کی جڑ ہے ، اس کی اشاعت میں دم سے ، قدم سے ، درم سے ، قلم سے غرض ہر طرح کوشش کریں ۔

مختصر یہ ہے کہ تعلیم یافتہ نوجوان ، جن کو ترقی کا مقدمة الجیش کہنا چاہیے ، وہ اپنی اپنی قابلیت اور اپنے اپنے مذاق کے موافق ایسے کام اختیار کریں جو اولاً خود اُن کے حق میں اور ثانیاً قوم اور ملک دونوں کے حق میں مفید ہوں ۔

لیکن افسوس ہے کہ ایسے آدمی قوم میں نایاب ہیں ، اور اسی لیے ہم کو اس میں شک کرنے کی کوئی وجہ نہیں کہ ہمارے قوائے متحرکہ بالکل معطل اور بے کار ہو گئے ہیں ۔ ہماری جرأت اور دلیری مفقود ہو گئی ہے ۔ ہم میں ہمت اور اولوالعزمی کا نام و نشان نہیں رہا ۔ ہم کہنے کو انسان ہیں لیکن جمادات سے بدتر ، ہم بظاہر زندہ ہیں لیکن حقیقت میں مردہ ۔

پس ہماری قوم میں جن بزرگوں کو قومی ترقی کا خیال ہے ، اُن کو غور کرنا چاہیے کہ یہ عام خاموشی اور سناٹا ، جو ہماری قوم میں ہر طرف نظر آتا ہے ، اور یہ مُردنی جو ہمارے تمام طبقوں پر چھائی ہوئی ہے ، آیا یہ محض ایک اتفاقی بات ہے جس کا کچھ فکر نہیں کرنا چاہیے ، بلکہ ایک دوسرے اتفاق کا منتظر رہنا چاہیے جس سے تمام قوم کی حالت خود بخود بدل جائے ؟ یا ایسا نہیں ہے ؟ بلکہ یہ

وبائے عام نہایت زبردست اور قوی اسباب سے تمام قوم میں پھیلی ہے اور جب تک کہ نہایت زبردست تدبیروں سے اس کا تدارک نہ کیا جائے گا اور آیندہ نسلوں کی تعلیم میں عملی تربیت کی روح نہ پھونکی جائے گی ، اس وقت تک مسلمانوں میں قومی زندگی پیدا ہونی دشوار ہے ۔

بالفعل ہم اس مضمون کو یہیں ختم کر دیتے ہیں لیکن آیندہ ہم بتائیں گے کہ مسلمانوں میں یہ عام سکون و انجماد کہاں سے آیا ہے ؟ اور اُن کے قوائے عملیہ کیوں معطل و بےکار ہو گئے ہیں ؟ اس کے بعد ہم اپنی سمجھ کے موافق کسی موقع پر یہ بیان کریں گے کہ وہ کون سی تدبیریں ہیں جن سے ہماری آیندہ نسلوں میں ایکٹوٹی (Activity) پیدا ہونے کی امید ہو اور اُن کے قوائے عملیہ از سرِ نو شگفتہ و شاداب ہو سکیں ۔

۱۰

حسب اور نسب

(تہذیب الاخلاق ، جلد ۱ ، نمبر ۴ ، بابت یکم محرم ۱۳۱۲ھ (۱۸۹۴ع) صفحہ ۶۳-۶۵)

اس مختصر لیکن نہایت مفید مضمون میں مولانا حالی نے یہ بتایا ہے کہ انسان کے لیے نسب کی بزرگی کوئی چیز نہیں ، کیوں کہ یہ ایسی چیز ہے کہ اس میں اس کے ساتھ تمام بنی آدم شریک ہے ۔ پس کسی کو کسی پر بڑائی نہیں ۔ رہا حسب یعنی ذاتی و صفاتی شرافت تو وہ دو تین یا تین چار پشت سے زیادہ باقی نہیں رہتی ۔ پس بزرگوں اور آبا و اجداد کے نسب اور حسب پر فخر و ناز کرنا کوئی وقعت نہیں رکھتا ۔ اس لیے اب اور آیندہ دوسروں سے ممتاز اور نمایاں وہی اصحاب ہوں گے جو نسلی حسب کے خیال کو چھوڑ کر ذاتی حسب کی فکر کریں گے ۔ اور باپ دادا کا نام جپنے کی بجائے خود اُن جیسا یا اُن سے بہتر ہونے کی کوشش کریں گے

(محمد اسماعیل)

مسلمانوں میں انسان کے خاندان کے متعلق اکثر یہ دو لفظ مستعمل ہوتے ہیں : حسب اور نسب ۔

(الف) نسب آدمی کی اصل اور نژاد کو کہتے ہیں ۔

(ب) حسب اُس شرف اور بزرگی کا نام ہے جو کسی شخص کی علمیت یا نبوت یا سلطنت یا دولت یا درویشی یا کسی اور فضیلت کے سبب اس کے خاندان میں ہمیشہ یا چند پشتوں تک باقی رہے ۔

پس نسب کے لحاظ سے ، جیسا کہ ظاہر ہے ، تمام بنی نوع انسان ایک درخت کی ڈالیاں یا ایک ڈالی کے پتے ہیں ۔ ایک کو دوسرے پر کسی طرح کی فوقیت اور ترجیح نہیں ہے ۔ امیرالمومنین علی مرتضیٰؓ فرماتے ہیں ۔

الناس من جهة التمثال اکفاء ابوهم آدمؑ والام حوّاء

یعنی انسان بہ اعتبار پیکر عنصری کے ایک دوسرے کے ہمسر ہیں ۔ اُن کا باپ آدمؑ ہے اور ماں حوّا ۔

پس جو کچھ تفوق اور بڑائی ایک دوسرے پر ہے ، وہ محض حسب کے لحاظ سے ہے ، نہ کہ نسب کے لحاظ سے ۔

اس بارے میں کہ حسب کی بزرگی کتنے عرصے تک قایم رہتی ہے ، مشہور مورخ ابن خلدون[1] اپنی تاریخ کے مقدمے میں حسب ذیل رائے ظاہر کرتے ہیں :

“حسب یعنی خاندانی شرافت اکثر چوتھی نسل میں زائل ہو جاتی ہے ،

---

[1] ابن خلدون : مسلمانوں میں سب سے بڑا تاریخ داں گزرا ہے ۔ اس کی مشہور و معروف تالیف جس کا نام ”کتاب العبر فی دیوان المبتداء و الخبر“ ہے ، فن تاریخ میں بڑے پایے کی کتاب مانی جاتی ہے ۔ اس تاریخ کا ”مقدمہ“ فلسفۂ تاریخ کا بے مثل نمونہ ہے ۔ ابن خلدون تونس (افریقہ) میں ۱۳۳۲ء میں پیدا ہوا اور ۱۴۰۶ء میں ۷۶ سال کی عمر پا کر وفات پائی ۔ اس نے اپنی بے نظیر کتاب میں اقوام عرب کی تاریخ اور بربریوں کے حالات ابتدا سے چودھویں صدی کے آخر تک کے بیان کیے ہیں ۔ اہل علم کے نزدیک اس کی تاریخ نہایت مستند اور صحیح مانی جاتی ہے ، مگر تاریخ سے زیادہ اُس کا ”مقدمہ“ قابل قدر ہے ۔ (محمد اسماعیل)

کیوں کہ جو شخص خاندان کا بانی ہوتا ہے ، اس کو خوب معلوم ہوتا ہے کہ میں نے کیسی کیسی مشقتوں سے یہ عزت حاصل کی ہے ، اس لیے وہ اُن محاسن اور خوبیوں کو ، جن کے ذریعے سے اُس کو امتیاز حاصل ہوا ہے ، کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتا ۔ پھر اُس کا بیٹا جس نے باپ کا طریقہ دیکھا ہے ، اُن محاسن اور خوبیوں کی قدر کرتا ہے جن سے باپ کو یہ مرتبہ حاصل ہوا تھا ۔ اور وہ بھی اکثر باپ ہی کا طریقہ اختیار کرتا ہے ۔ مگر باپ اور بیٹے میں ایسا ہی فرق رہتا ہے جیسا دیکھنے والے اور سننے والے میں ہوتا ہے ۔ گویا باپ نے جو چیز آنکھوں سے دیکھی تھی ، بیٹے نے اُس کو کانوں سے سنا ہے ۔ اب تیسری نسل آتی ہے اور وہ محض تقلیداً باپ دادا کی ڈگر اختیار کرتی ہے لیکن ابھی تک خاندانی عظمت کا طلسم ویسا ہی بندھا رہتا ہے ، اور بظاہر دادا اور پوتے کے طریقے میں کچھ فرق معلوم نہیں ہوتا ۔ مگر چوتھی نسل میں وہ طلسم بالکل ٹوٹ جاتا ہے : یہ نسل باپ دادا کی خوبیوں کو ملیامیٹ کر دیتی ہے اور یہ خیال کرتی ہے کہ ہمارے خاندان کی عزت کچھ ہمارے بزرگوں کی کوشش اور اکتساب سے پیدا نہیں ہوئی بلکہ ابتدائے آفرینش سے یہ خاندان اسی طرح ممتاز چلا آیا ہے ۔ اور اس خاندان کا ذاتی خاصہ یہی ہے کہ اَوروں سے ممتاز رہے ۔ اس خیال خام میں وہ بغیر اس کے کہ تعظیم و تکریم کا استحقاق پیدا کریں ، آپ کو اپنی قوم یا قبیلے سے بالاتر سمجھنے لگتے ہیں اور اُن سے اپنی تعظیم و تکریم کے خواہاں ہوتے ہیں ، اور اُن خوبیوں کو فراموش کر دیتے ہیں جن کے سبب سے اُن کے خاندان کی تعظیم و تکریم ہوتی تھی ۔“

اس کے بعد وہ لکھتے ہیں :

“چوتھی پشت کی قید بہ اعتبار اکثر کے لگائی گئی ہے ورنہ بعض گھرانے اس سے بھی پہلے بگڑ جاتے ہیں ۔ اور کبھی ایسا بھی

ہوتا ہے کہ پانچویں یا چھٹی پشت تک خاندان بنا رہتا ہے۔ ”

جس زمانے میں قاضی ابن خلدون نے یہ رائے قائم کی تھی، اس وقت گو مسلمانوں کی طاقتیں متفرق اور پراگندہ ہو گئی تھیں مگر پھر بھی ان میں بہت کچھ جان باقی تھی۔ جو خاندان ابھرتا تھا اس کی ہوا چند پشتوں تک بندھی رہتی تھی۔ اگر کوئی خاندان دینی عظمت کی وجہ سے ممتاز ہوتا تھا تو اس کا احترام لوگوں کی خوش اعتقادی کے سبب کئی کئی پشتوں تک باقی رہتا تھا۔ جو خاندان دنیوی اعتبارات سے وجاہت پیدا کرتا تھا، خود سلطنت اس کی پشت پناہ ہوتی تھی اور اس کی مراعادت اور بزرگ داشت متعدد نسلوں تک جاری رہتی تھی۔ بایں ہمہ دو تین پشت سے زیادہ کوئی خاندان موقر و محترم نہیں رہ سکتا تھا۔

جب اس زمانے ستا یہ حال تھا تو اس زمانے میں ہم مسلمان خاندانوں کی نسبت، خاص کر ہندوستان میں کیا خیال کر سکتے ہیں۔ اول تو آج کل ہماری قوم میں کسی خاندان کا ابھرنا ایسا ہی خلافِ قیاس معلوم ہوتا ہے جیسے سورج کی روشنی میں چھوٹے چھوٹے ستاروں کا نظر آنا۔ لیکن اگر برسبیل ندرت کسی خاندان کا کوئی ممبر کچھ امتیاز حاصل کر بھی لے تو وہ امتیاز اسی کی ذات تک محدود رہتا ہے۔ دینی عظمت کی وجہ سے تو فی زماننا کسی شخص کا مرجعِ خلائق بننا نہایت ہی مشکل ہے، کیوں کہ خوش اعتقادی روز بہ روز زمانے سے رخصت ہوتی جاتی ہے۔ اور اگر کوئی ایسی مثال پائی بھی جائے تو باپ کی مرجعیت بیٹے تک جب ہی منتقل ہو سکتی ہے جب کہ بیٹا فضل و کمال میں اگر باپ سے برتر و افضل نہ ہو تو اس کے برابر ضرور ہو۔ دنیوی امتیاز کا اس زمانے میں یہ حال ہے کہ ہر شخص کی عزت اور اعتبار کا اسی کی ذات پر خاتمہ ہو جاتا ہے۔ جس گورنمنٹ کے ہم تحت ہیں، وہ کسی اعلیٰ خاندان کو ادنیٰ خاندان پر بغیر ذاتی استحقاق کے ترجیح نہیں دیتی۔

خود انگلستان میں ایک لارڈ کا بیٹا مقابلے کے امتحان میں ایک موچی کے لڑکے کے برابر بٹھایا جاتا ہے، اور سوائے اس کے کہ امتحان میں اس سے سبقت لے جائے، کسی طرح اس پر ترجیح حاصل نہیں کر سکتا۔ جب انگلستان میں یہ حال ہے تو ایسی حالت میں ہندوستان کی نسبت کیا توقع کی جا سکتی ہے۔

پس آج کل کسی خاندان کا امتیاز بدون اس کے قائم نہیں رہ سکتا کہ ہر نسل اپنے سے پچھلی نسل کی تعلیم و تربیت میں جہاں تک ممکن ہو، کوشش کرے اور اپنے بعد اس کو ایسی حالت میں چھوڑ جائے کہ زمانہ اس کو عزت کی نگاہ سے دیکھے اور اس کی قدر کرے۔ نہ اس لیے کہ وہ بڑے باپ کی اولاد ہے بلکہ اس لیے کہ وہ خود بڑائی کی مستحق ہے۔ اضافی خوبیوں کو ہمارے مقتداؤں نے ہمیشہ حقیر و ناچیز سمجھا ہے اور انسان کا کمال محض اس کی کسبی اور ذاتی خوبیوں پر منحصر رکھا ہے۔ چنانچہ امیرالمومنین علی مرتضیٰ فرماتے ہیں:

ان الفتیٰ من یقول ھا انا ذا   لیس الفتیٰ من یقول کان ابی

یعنی ”مرد وہ ہے جو کہے کہ میں ایسا ہوں، نہ کہ وہ جو یہ کہے کہ میرا باپ ایسا تھا۔ ”

اکثر لوگ اس خیال سے کہ ہمارے بعد ہماری اولاد عزت و آبرو سے دنیا میں زندگی بسر کرے، اس کے واسطے جایداد خرید کر چھوڑ جاتے ہیں، مگر ان کی تعلیم و تربیت کا کچھ خیال نہیں کرتے؛ گویا وہ چاہتے ہیں کہ ہماری اولاد صرف نالائق ہی نہ رہے بلکہ بدچلنی میں بھی شہرۂ آفاق ہو۔ جہل اور جوانی اور اس کے ساتھ بےفکری، جہاں یہ تینوں چیزیں جمع ہو گئیں، پھر خاندان کا اللہ ہی مالک ہے۔

۱۱

مسلمانوں میں عملی قوت کیوں نہیں رہی ؟

(محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میگزین علی گڑھ ، جلد ۲ ، نمبر ۷
جولائی ۱۸۹۵ع)

جو عام جمود مسلمانوں کی قوم پر چھایا ہوا ہے ، اس مضمون میں مولانا نے اُس کی تفصیلات بیان کی ہیں ۔ مولانا اس جمود کا ذمہ دار مسلمانوں کی شخصی حکومتوں کو ٹھیراتے ہیں جنھوں نے ہر دور اور ہر زمانے میں قوم کے قوائے عملیہ کو بےکار کر دیا ۔ لیکن اب جب کہ یہ دور گزر گیا ہے ، تو ایسے حالات پیدا ہو رہے ہیں کہ اگر مسلمان ہاتھ پاؤں ہلانا اور ترقی کرنا چاہیں تو عروج اور رفعت حاصل کر سکتے ہیں ۔ اُن حالات کی بھی مولانا نے مضمون کے آخر میں نشان دہی کی ہے ۔
(محمد اسماعیل)

یہ بات مسلّم ہے کہ مسلمانوں میں عملی قوت باقی نہیں رہی ۔ یہاں ہم صرف اس قدر بیان کرنا چاہتے ہیں کہ یہ عام خاموشی اور سناٹا ، جو ہماری قوم میں ہر طرف نظر آتا ہے اور یہ مُردنی جو ہمارے تمام طبقوں پر چھائی ہوئی ہے ، یہ کوئی اتفاقی بات نہیں ہے بلکہ ایسے زبردست اور قوی اسباب پر مبنی ہے جن کا اثر کسی خاص جماعت یا خاص فرقے پر محدود نہیں رہا ، بلکہ اُس نے تمام قوم

کے قوائے عملیہ کو معطل اور بےکار کر دیا ہے ۔

اکثر مسلمانوں کی نسبت کہا جاتا ہے کہ وہ بالطبع کاہل اور سُست ہیں اور اُن کی کاہلی اور سستی کو اسلام کی طرف منسوب کیا جاتا ہے ۔ چنانچہ پنجاب کے ایک معزز افسر نے پنجاب کی مردم شماری کی رپورٹ میں لکھا تھا :

''پنجاب کے رہنے والوں پر مذہب اسلام کا اختیار کر لینا نہایت برا اثر پیدا کرتا ہے ۔ وہ اُن کو مغرور اور مشیخت مآب بنا دیتا ہے ۔ اُن کی طبیعت کو حق حلال اور ریاض کا لقمہ حاصل کرنے سے پھیر دیتا ہے ۔ کیوں کہ سستی اور کاہلی اور بناوٹ خاص اوصاف ہیں جو مسلمانوں میں پائے جاتے ہیں اور جن سے مسلمانوں اور ہندوؤں میں تمیز ہوتی ہے ۔''

در حقیقت نہ مسلمان بالطبع کاہل اور سست ہیں اور نہ اسلام نے اُن کو ایسا بنا دیا ہے ، بلکہ یہ تمام کاہلی اور سستی اور یہ عام سکون و انجماد ، جو ہماری رگ و پے میں سما گیا ہے ، یہ وہ ترکہ ہے جو نہ صرف ہم کو بلکہ تمام ایشیائی قوموں کو اُن کے آباو اجداد کی میراث میں پہنچا ہے ۔

ایشیائی طرز حکومت ، جو ایک طاقت کو اعتدال سے بڑھانے والی اور اُس کے سوا تمام طاقتوں کو ملیامیٹ کرنے والی ہے ، اُس نے ایشیا کی کسی قوم میں جان باقی نہیں چھوڑی ۔

خود مختار سلطنت میں ، عام اس سے کہ بادشاہ ظالم ہو یا منصف ، رعیت بعینہ ایسی ہوتی ہے جیسے غسّال کے قبضے میں میت ۔ ان کو سوائے اس کے کہ مویشی اور چوپاؤں کی مانند بُری یا بھلی طرح اپنا پیٹ بھر لیں اور اپنی جسمانی ضروریات کو جس طرح ہو سکے ، پورا کر لیں ، ملک یا قوم کی بُرائی یا بھلائی سے کچھ سروکار نہیں ہوتا ۔ خدا کی سلطنت میں تو کوئی اپنے تئیں مختار

سمجھتا ہے اور کوئی مجبور ، مگر خود مختار سلطنت میں ہر شخص کا فرض ہے کہ اپنے تئیں مجبور جانے ، کیوں کہ ہرمتنفس کو اس بات کا یقین ہوتا ہے کہ ملک اور قوم کے حق میں برائی یا بھلائی بادشاہ اور اُس کے ارکان کے سوا کوئی نہیں کر سکتا ۔

حضرت معاویہ بن ابی سفیان سے اُن کے عہد حکومت میں ایک شخص نے زمانے کی شکایت کی ۔ انھوں نے کہا ''نحن الزمان ، من رفعناہ ارتفع و من وضعنا اتضع'' ۔ یعنی ''تو کس کی شکایت کرتا ہے ؟ زمانہ تو ہم ہیں ۔ جس کو ہم نے بلند کر دیا وہ بلند ہو گیا اور جس کو پست کر دیا وہ پست ہو گیا ۔''

جو امور مصالح عامہ سے علاقہ رکھتے ہیں ، خود مختار سلطنت میں اُن سے پبلک کو کچھ سروکار نہیں رہتا ۔ مسلمانوں کے دور دورے میں ہزاروں مدرسے اور شفاخانے ممالک اسلامیہ میں جاری ہوئے مگر شاید ہی کوئی مثال ایسی نکلے کہ رعایا نے باہم مجتمع ہو کر کوئی مدرسہ یا شفاخانہ جاری کیا ہو ۔ قریباً تمام مدرسے اور شفاخانے یا بادشاہوں کے قائم کیے ہوئے پاؤ گے یا اُن کے وزراء اور اُمراء کے ۔

کمزوروں اور مظلوموں کی اعانت کرنا یا حق‌داروں کے حقوق دلوانے میں کوشش کرنا یا عاملوں کے ظلم و تعدی کی شکایت کرنا خودمختار سلطنت میں ایسا ہی جرم ہوتا ہے جیسے بغاوت اور سرکشی ۔ نوشیروان[1] جیسے عادل بادشاہ کے سامنے اس کے عاملوں

---

[1] ۱۔ نوشیروان : ایران کے خاندان ساسانیاں کا بیسواں شہنشاہ اور نہایت ہی عادل اور منصف مزاج انسان تھا ۔ اس کا عہد ایران میں ساسانیوں کے کمال عروج کا زمانہ سمجھا جاتا ہے ۔ سب سے پہلے اسی نے بغداد کو اپنا دارالسلطنت بنایا ۔ قیصر روم سے لڑ کر اُس پر فتح پائی ۔ ۵۳۱ع میں تخت پر بیٹھا اور ۴۸ سال حکومت کرنے کے بعد ۵۷۹ع میں فوت ہوا ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اسی کے زمانے میں ۵۷۱ع میں پیدا ہوئے تھے ۔ (محمد اسماعیل)

کی رشوت ستانی اور ظلم کی کوئی صریح شکایت نہ کر سکتا تھا ۔ جن موبدوں کا وہ نہایت ادب کرتا تھا ، جب اُن سے ملک کا حال پوچھتا تھا تو وہ محض رمز و کنایہ میں ایسی باتیں عرض کرتے تھے ۔

خود مختار سلطنت میں بعض اوقات ضعیفوں کی حمایت کرنے کا قانوناً امتناع ہوتا تھا ۔ ہندوستان کی قدیم سلطنتوں میں جب کہ منوشاستر[1] کے موافق عمل درآمد ہوتا تھا ، کسی کی یہ مجال نہ تھی کہ شودر کو وید یا مذہبی کتابوں کی تعلیم دے سکے یا اس کو کسی برتر فرقے کے برابر حقوق دلوا سکے ۔

اگر بالفرض قانوناً ایسا صریح امتناع نہ ہو ، تو بھی ایشیائی طرز حکومت کا طبعی اقتضا یہی تھا کہ ملک کی برائی بھلائی سے سلطنت کے سوا کسی کو کچھ سروکار نہ ہو ۔ کسی حکیم کا قول ہے کہ ''خود مختار سلطنت میں صرف ایک شخص ملک کا خیرخواہ ہوتا ہے اور بس'' ۔ جان اسٹوارٹ مل[2] کہتے ہیں کہ ''[1]اگر کسی کو ایسا بنا دو کہ ملک کے لیے کچھ نہ کر سکے تو اُس کو اپنے ملک کی کچھ پروا نہ رہے گی ۔''

۱۔ جو شخص ہمیشہ صرف دماغ سے کام لے گا اس کے اعضا و جوارح یقیناً بے کار ہو جائیں گے ۔

---

[1] ۱۔ منوشاستر : یعنی منومہاراج کا مرتب کیا ہوا ضابطہ قوانین ملکی و مذہبی ۔ زمانہ قدیم میں منو نام ایک قانون داں نے ایک بڑی ضخیم کتاب ملکی ، اخلاق ، معاشرتی اور مذہبی ضوابط اور قوانین کی تصنیف کی تھی جو 'منو سمرتی' کے نام سے مشہور ہے ۔ سلطنتیں اُسی کے مطابق ہر امر کا فیصلہ کرتی تھیں ۔ (محمد اسماعیل)

[2] ۲۔ جان اسٹوارٹ مل (John Stuart Mill) : انگلستان کا اعلیٰ درجے کا فلاسفر اور پولیٹیکل اکانمی کا ماہر تھا ۔ ۱۸۲۳ع میں پیدا ہوا اور ۱۸۹۶ع میں فوت ہوا ۔ (محمد اسماعیل)

۲- جو باپ تمام مہمات خانگی کا بوجھ اپنے سر دھر لیتا ہے اور کوئی کام اپنی اولاد سے نہیں لیتا اس کے مرنے کے بعد اولاد کو گھر تھامنا مشکل ہو جاتا ہے -

۳- جس گھر کی بیوی کو کسی کا کام پسند نہیں آتا اور خود ہر ایک کام اپنے ہاتھ سے کرنے کا شوق ہوتا ہے ، اس گھر کی لڑکیاں اور نوکرانیاں کاہل اور سست ہو جاتی ہیں -

۴- تم اپنے نوکروں میں سے صرف ایک نوکر کو اپنا معتمد بنالو اور سب بڑے بڑے کام ہمیشہ اسی سے لیا کرو ، تو اس طرح تمہارے دوسرے ملازم کاہل اور نکمے ہو جائیں گے -

جب ایسی سرسری اور اتفاقی شخصیت و امتیاز سے یہ نتائج پیدا ہوتے ہیں تو ایک ایسے شخص کی خود مختاری سے ، جو حاکم علی الاطلاق مانا گیا ہو ، رعیت میں کیا جان باقی رہ سکتی ہے -

الغرض اس میں شک نہیں کہ خود مختار سلطنت رعیت کے قوائے عملیہ کو بالکل معطل اور بے حس و حرکت کر دیتی ہے - نہ وہ ملکی معاملات کے متعلق دم مار سکتے ہیں ، نہ مذہبی امور میں کوئی بات خلاف جمہور زبان پر لا سکتے ہیں ، نہ قوم کی سوشل خرابیوں کی اصلاح کر سکتے ہیں - اور صرف اپنی مادی اغراض مہیا کرنے کے سوا پبلک کاموں سے کچھ سروکار نہیں رکھتے - ان میں صبر و تحمل اور قناعت روز بروز زیادہ ہوتی جاتی ہے مگر ہمت ، دلیری ، اولوالعزمی ، غیرت و حمیت کم ہوتے ہوتے چند نسلوں کے بعد بالکل فنا ہو جاتی ہے -

لیکن بایں ہمہ دوسری محکوم قوموں میں (جن کو سلطنت کا ایسا سہارا نہیں ہوتا جیسا بادشاہ کی قوم کو ہوتا ہے) عملی قوت بالکل زائل نہیں ہوتی - چوں کہ فوجی اور ملکی خدمات میں ان کا حصہ بہ نسبت حکمران قوم کے کم ہوتا ہے اور اس کے سوا اور بہت سی رعایتوں سے ، جو حکمران قوم کے لیے مخصوص ہوتی ہیں ، محکوم قومیں کم مستفید ہوتی ہیں - اس لیے چار ناچار ان کو زیادہ تر بنج بیوپار ، کھیتی اور دستکاری وغیرہ پر اپنی معاش کا مدار رکھنا پڑتا ہے - اور اس طرح ان میں سلف ہلپ (اپنی امداد آپ) کا مادہ روز بروز بڑھتا جاتا ہے اور عقلِ معاش زیادہ ہو جاتی ہے -

برخلاف اس کے حکمران قوم میں سلف ہلپ کا ملکہ بالکل باقی نہیں رہتا - ان کا مدارِ معاش اکثر بادشاہی ملازمت یا جاگیر ، منصب ، ملک ، مدد معاش اور معافی وغیرہ پر ہوتا ہے - تجارت ، زراعت اور دستکاری کو وہ عیب سمجھنے لگتے ہیں اور سلطنت کے سہارے پر کوئی ایسا حیلہ اختیار نہیں کرتے جس میں ان کو محض اپنے دست و بازو پر بھروسا ہو - ان کا حال بعینہ اس چھت کا سا ہوتا ہے جو محض اڑواڑ کے سہارے پر تھمی ہوئی ہے - ادھر اڑواڑ ہٹی اور ادھر چھت گری -

یہی بپتا ہماری قوم پر پڑی ہے - کچھ تو طرزِ حکومت نے ہماری حالت میں سکون و انجماد کی بنیاد ڈالی اور کچھ قومی سلطنت کے سہارے نے ہمارے رہے سہے قوائے عملیہ کو معطل کر دیا اور نسلاً بعد نسلٍ یہ حالت منتقل ہوتی چلی آئی - یہاں تک کہ کاہلی ، سستی ، بیکاری ، افسردگی ، مایوسی اور بزدلی ہماری قومی خصلتیں بن گئیں اور شدہ شدہ بزرگوں کی میراث ہم تک پہنچی - اس صورت میں کون کہہ سکتا ہے کہ یہ خصلتیں خود بخود ہم میں پیدا ہو گئی ہیں یا ہم اپنی نالایقی سے ایسے مردار اور اپاہج بن گئے ہیں یا (نعوذ باللہ) اسلام نے ہم کو ایسا بنا دیا ہے :

چہ کند گر پیٔ دوراں نہ رود چوں پرکار
ہر کہ در دائرۂ گردشِ ایّام افتاد

لیکن ہم کو یاد رکھنا چاہیے کہ ہماری یہ حالت خواہ کسی ہو ، خواہ موروثی ، خواہ اختیاری ہو ، خواہ اضطراری ، خواہ اس کے باعث ہم خود ہوئے ہوں ، خواہ زمانے کے واقعات اس کا سبب ہوں ، لیکن جب تک ہم اس حالت کو نہ بدلیں گے کسی طرح معذور نہیں سمجھے جا سکتے اور الزام سے بری نہیں ہو سکتے ۔ غلام جب تک غلام ہے ، بےشک حقیر و ذلیل سمجھا جائے گا ، خواہ وہ خود غلام بن گیا ہو اور خواہ جبر سے اس کو غلام بنایا گیا ہو ۔

یہ سچ ہے کہ زمانۂ گزشتہ کے واقعات نے ہم کو گرا دیا ہے لیکن موجودہ زمانے کے حالات ہم کو ابھار رہے ہیں جو مندرجہ ذیل ہیں :

۱۔ ملک بیرونی حملوں اور اندرونی جھگڑوں سے بالکل پاک ہے ۔
۲۔ طرزِ حکومت بجائے اس کے کہ ترقی کی مانع ہو ، اس کی معین اور مددگار معلوم ہوتی ہے ۔
۳۔ آزادی نے ہمارے طوق اور زنجیریں کاٹ ڈالی اور ہماری مشکیں کھول ڈالی ہیں ۔
۳۔ ہماری ہم وطن قومیں پستی سے بلندی کی طرف چڑھ رہی ہیں اور تمام دنیا میں ترقی کی پکار پڑ رہی ہے ۔
۵۔ خود ہماری ترقی کا حیرت انگیز سامان ہم ہی میں سے ایک زبردست ہاتھ نے ہمارے لیے مہیا کر دیا ہے ، اور ثابت کر دیا ہے کہ اس مردہ قوم کے مسیحا اسی قوم میں موجود ہیں[1] ۔
۶۔ ہماری آسمانی کتاب ہم کو ترقی کا سیدھا راستہ بتا رہی ہے اور بزدلی و ذلت سے بچنے کی تدبیر ہم کو سمجھا رہی ہے ۔

---

[1] مولانا حالی کی مراد سید احمد خاں سے ہے ۔ (محمد اسماعیل)

سنو وہ فرماتی ہے : ’’اطیعوا اللہ و رسولہ ولا تنازعوا فتفشلوا و تذھب ریحکم و اصبروا ۔‘‘ یعنی ’’خدا اور رسول کا حکم مانو اور آپس میں جھگڑا مت کرو جس سے تم بزدل ہو جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی ۔ اور ثابت قدم رہو ۔‘‘

غرض کہ ترقی کے اسباب اور ترغیبیں کثرت سے ہمارے گرد و پیش موجود ہیں ۔ گو کہ افسردگی اور کم ہمتی نے ہم کو دبا لیا ہے ۔ لیکن پھر آخر ہم انسان ہیں جماد نہیں ۔ اگر بالفرض ہم حیوانِ ناطق نہیں تو جسم نامی حساس متحرک بالارادہ ضرور ہیں ۔ اگر ہم میں قومی سپرٹ نہیں ہے تو اسلامی روح ضرور ہے ۔ وہ اسلام جس کی ابتدائی حیرت انگیز ترقیاں قیامت تک یادگار رہیں گی اور جو اس تنزل اور پستی کے زمانے میں بھی نئی اور پرانی دنیا کے ایک ایک کھونٹ میں توحید کا ڈنکا بجا رہا ہے :

یاراں بکوے عشق گزارے نمی کنید
اسباب جملہ حاضر و کارے نمی کنید
چوگانِ کام در کف و گوے نمی زنید
بازی چنیں بدست و شکارے نمی کنید
ترسم کزیں چمن نبرید آستین گل
کز گلبنش تحملِ خارے نمی کنید

۱۲

تجارت کا اثر عقل اور اخلاق پر

(محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میگزین بابت ۱۸۹۶ع صفحہ ۳۴۳)

> اس مضمون میں نہایت دل نشین اسلوبِ بیان کے ساتھ مولانا نے یہ بتایا ہے کہ دنیوی ترقی اور عروج حاصل کرنے کے لیے تجارت سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں ، اور انسانی عقل اور انسانی اخلاق کو جلا دینے والی اور آگے ترقی دینے والی اگر کوئی چیز ہے تو وہ تجارت ہے ۔ نوکری اور ملازمت انسان کو پستی اور تنزل یا کم از کم سکون و جمود کی طرف مائل کرتی ہے ، مگر تجارت انسان کو بلند خیالی ، اعلیٰ اخلاق اور دوراندیشی کی تعلیم دیتی ہے ۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ غلامی سے نجات دیتی ہے ۔ مضمون میں ملازمت اور تجارت کا موازنہ مولانا نے بڑی خوبی سے کیا ہے اور مقالے کے آخر میں تجارت کے فوائد بڑی تفصیل سے بیان فرمائے ہیں ۔ (محمد اسماعیل)

جس طرح بڑے بڑے کامیاب تاجر نوکری کو نہایت حقارت کی نظر سے دیکھتے ہیں اور اس کو ایک ادنیٰ درجے کی غلامی اور آزادی کی برباد کرنے والی سمجھتے ہیں ، اسی طرح وہ لوگ جنھوں نے علم و فضل یا مناصب و خدمات کی وجہ سے امتیاز حاصل کیا ہے ، بیوپار اور دوکانداری کو قوائے ذہنی اور عقل و اخلاق

کے حق میں نہایت مضر بتاتے ہیں ۔ مگر حق یہ ہے کہ تجارت میں ہمیشہ وہی لوگ کامیاب ہوئے ہیں اور ہوتے ہیں جن کے اخلاق درست اور عقل سلیم ہوتی ہے ۔ ایک لائق مصنف لکھتا ہے :

> ’’تجارت کے برابر کوئی چیز انسان کے اخلاق کی کسوٹی نہیں ہے ۔ ایک عالم جو محض کتابوں کے مطالعے اور فلسفیانہ استدلال و احتجاج میں رات دن مصروف رہتا ہے ، وہ خود نہیں جانتا کہ میں کیا چیز ہوں ؟ اگر وہ اپنی حقیقت سے آگاہ ہونا اور اپنی عقل اور اخلاق کی آزمایش کرنی چاہتا ہے تو اس کو چاہیے کہ بازار میں قدم رنجہ فرمائے ، تب اس کو بہت جلد معلوم ہو جائے گا کہ وہ دانش مند اور نیک آدمی ہے یا احمق اور شریرالنفس ۔ اس کی کامیابی اور ناکامی خود اس کو اپنی حقیقت سے خبردار کر دے گی ۔‘‘

پس جو قوم تجارت سے کچھ تعلق نہیں رکھتی اس کے کسی فرد کی نسبت قطعی طور پر یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ دانش‌مند اور نیک‌نہاد ہے یا احمق اور بد نہاد ۔

اگرچہ تاجر ہمیشہ مذہب یا کانشنس کی ہدایت سے اپنے اخلاق کی اصلاح نہیں کرتا بلکہ وہ اپنی کامیابی اسی میں سمجھتا ہے کہ اس کی دیانت داری ، خوش معاملگی اور راست بازی پر لوگوں کو اعتماد ہو ، لیکن جیسا کہ خصائل انسانی کا خاصہ ہے ، رفتہ رفتہ یہ خصلتیں جو اس نے بہ ضرورت اختیار کی تھیں ، اس کی طبیعت ثانی بن جاتی ہیں ۔

یہ کہنا کہ تجارت قوائے عقلیہ کے حق میں مضر ہے ، واقعے کے بالکل خلاف ہے ۔ جس قدر تاجر کو اپنی عقل و تدبر سے کام لینے کی ضرورت ہوتی ہے ، ایسی اور کسی پیشے والے کو نہیں ہوتی ۔

نوکری پیشہ کو اپنی نوکری پر قائم رہنے یا ترقی حاصل کرنے کے لیے صرف اپنے معمولی فرائض ادا کرنے کی ضرورت ہے ، اور کسان کی

کامیابی فقط اس کی محنت اور بخت و اتفاق پر موقوف ہے ، مگر تاجر کو باوجود اُن تمام فرائض کے ، جو ایک سچے تاجر کو ادا کرنے ضرور ہیں ، ہر وقت عقل سے مشورہ لینے اور ایک شطرنج باز کی طرح نت نئی چال چلنے کی ضرورت ہوتی ہے ۔ مثلاً :

۱۔ وہ ہر وقت زمانے کے تیور دیکھتا اور پبلک کے دل ٹٹولتا رہتا ہے ۔

۲۔ ایک وقت اُس کو قرض لے کر کام چلانا بہت مفید پڑتا ہے مگر دوسرے وقت قرضے کی بدولت اُس کو نقصان عظیم اٹھانا پڑتا ہے ۔

۳۔ اُس کو اپنے گاہکوں کی نسبت فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ کن کو نقد سودا دینا چاہیے اور کن کو اُدھار ؟

۴۔ کبھی نہایت قلیل فائدے پر بلکہ برابر سرابر مال فروخت کر ڈالنا اُس کے حق میں مفید ہوتا ہے اور کبھی اُس کے فروخت کرنے میں جس قدر زیادہ دیر ہوتی جاتی ہے اسی قدر اُس کی قیمت بڑھتی جاتی ہے ۔

۵۔ اکثر اوقات اُس کو فائدۂ کثیر کے لالچ میں راست بازی کے خلاف عمل درآمد کرنے کی ترغیب ہوتی ہے مگر اسی کے ساتھ اس بات کا بھی خوف دامن گیر ہوتا ہے کہ اگر یہ راز کھل گیا تو پھر اعتبار نہ رہے گا ۔

غرض کہ اسی قسم کی بےشمار حالتیں جن میں انسان متردد ہوتا ہے کہ کون سی حالت اختیار کی جائے ، تاجر کو قدم قدم پر پیش آتی ہیں اور اس کو عقل و تدبیر سے کام لینے اور کامل غور و فکر کرنے پر مجبور کرتی ہیں ، اور اس طرح تاجر کی عقل معاش روز بروز جِلا پاتی جاتی ہے ۔

نوکری پیشہ یا کاشت کار کو اس قسم کے مرحلے بہت کم پیش

آتے ہیں ۔ یہ لوگ معمولی قواعد کی شارع عام پر آنکھیں بند کیے چلے جاتے ہیں ۔

نوکری پیشہ اگر اپنے فرائض دیانت اور محنت کے ساتھ انجام دیتا ہے تو اُس کو اس بات کا مطلق اندیشہ نہیں کہ میری وجہِ معین میں کچھ کمی ہو جائے گی ۔

کاشت کار کی کامیابی زیادہ تر آسمانی مدد پر منحصر ہے جس میں انسانی عقل و تدبیر کو کچھ دخل نہیں ۔

اس لیے پہلا عدم ضرورت کے سبب اور دوسرا عدمِ قدرت کے سبب عقل اور تدبیر سے بہت کم کام لیتا ہے ۔

مگر تاجر خوب جانتا ہے کہ ذرا چال چوکا اور مصیبت میں گرفتار ہوا ۔ اس وجہ سے اُس کو نہایت پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑتا ہے ۔

یہی وجہ ہے کہ جو قوم تجارت سے کچھ تعلق نہیں رکھتی اور نوکری کے سوا کسی اور ذریعے سے معاش پیدا نہیں کرتی ، چند نسلوں کے بعد اُن میں تدبیرِ معاش کا مادہ باقی نہیں رہتا ، کیوں کہ جس طرح کسی عضو کے معطل اور بے کار رکھنے سے اس کی قوت زائل ہو جاتی ہے اور اُس میں سکت باقی نہیں رہتی ، اسی طرح قوائے ذہنیہ سے جب کچھ کام نہیں لیا جاتا تو وہ بالکل از کار رفتہ ہو جاتے ہیں ۔ اگرچہ یہ ممکن ہے کہ اس قوم میں مستثنیٰ مثالیں ایسے اشخاص کی پائی جائیں جو اعلیٰ درجے کی عقلِ معاش رکھتے ہوں لیکن ایسے مستثنیات سے قاعدۂ کلیہ نہیں ٹوٹ سکتا ۔

اس دعوے کے ثبوت میں ہم کو کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں ؛ ہندوستان کے مسلمانوں کی مثال اس کے ثبوت کے لیے کافی ہے ۔ جہاں تک غور کیا جاتا ہے ہندوستان کی قوموں میں عقلِ معاش کے لحاظ سے جیسے مسلمان پیٹے معلوم ہوتے ہیں ایسی کوئی قوم نہیں معلوم

تو سرے سے عام مسلمانوں ہی کی تعداد سرکاری دفتروں اور عدالتوں میں بہ مقابلہ ہندوستان کی دوسری قوموں کے نہایت کم ہے ، اور پھر خاص کر مسلمانوں کی مذکورہ بالا نسلیں جو اس مقام پر زیر بحث ہیں ، اُن کا گورنمنٹ سروس (سرکاری ملازمت) میں اتنا بھی حصہ نہیں جتنا کہ آٹے میں نمک ۔ اس کا سبب چاہو یہ قرار دو کہ انھوں نے اپنے تئیں گورنمنٹ کی خدمات کے لائق نہیں بنایا اور چاہو یہ سمجھو کہ چوں کہ اُن کے آباو اجداد کو کسی فارن گورنمنٹ (بیرونی سلطنت) میں نوکری کی خاص لیاقت بہم پہنچانے کی ضرورت نہ تھی ، اس لیے ہریڈیٹیری جینیس (Heriditery genius) کے قاعدے کے موافق اولاد میں بھی اُس کی لیاقت پیدا نہیں ہوئی ۔

دونوں صورتوں میں نتیجہ نکلے گا کہ مذکورۂ بالا نسلوں کے مسلمان عقلِ معاش کے لحاظ سے اپنی ہم وطن قوموں سے نہایت پست حالت میں ہیں ، اور اس کا سبب ، جہاں تک غور کیا جاتا ہے ، اس سے بہتر خیال میں نہیں آتا کہ پشت ہا پشت سے اُن کا ذریعۂ معاش صرف اسلامی سلطنتوں کی ملازمت پر منحصر رہا اور تجارت سے جو کہ عقل کی ترقی دینے والی اور جلا کرنے والی ہے ، کبھی ان کو سروکار نہیں رہا ۔

جس طرح تجارت سے قومی عقلِ معاش ترقی پاتی ہے ، اسی طرح عمدہ اخلاق اور نیک خصلتیں صرف تجارت ہی کے ذریعے سے تمام قوم میں شائع ہوتی ہیں ۔ جز رسی اور کفایت شعاری ، جس کے بغیر کسی خاندان بلکہ کسی قوم کا وقار دنیا میں قائم نہیں رہ سکتا ، صرف تجارت ہی کی بدولت تمام قوم میں سرایت کرتی ہے ۔ اگرچہ ممکن ہے کہ ہر ایک قوم میں ، خواہ وہ قوم تجارت پیشہ ہو اور خواہ نوکری پیشہ ، کچھ افراد جز رسی اور کفایت شعاری کے ساتھ موصوف پائے جائیں ، لیکن ہمارے نزدیک کوئی قوم عام طور پر

جز رس اور کفایت شعار نہیں ہو سکتی جب تک کہ عام طور پر اس میں تجارت شائع نہ ہو ۔

یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کی وہ مسلمان قومیں جو ابتدا سے روزگار پیشہ چلی آتی تھیں ، اُن کی نسل میں رفتہ رفتہ جز رسی اور کفایت شعاری کا مادہ بالکل معدوم ہو گیا ہے ۔ ایک شریف مسلمان جو ہمیشہ اپنے دوستوں اور عزیزوں کے ساتھ سلوک کرتا رہتا تھا اُس کا افسوس کے ساتھ یہ کہنا ہمیشہ یاد رہے گا :

> ‘‘اگر میں اپنے کسی بے مقدور مسلمان کا دس روپے ماہوار ہمیشہ کے لیے مقرر کردوں ، تو بھی مجھے اُمید نہیں کہ وہ اپنی حالت درست کرسکے ، لیکن اگر میں اپنے کسی بےمقدور ہندو دوست کو ایک دفعہ دو روپے دے دوں تو مجھ کو یقین ہے کہ وہ انھی دو روپوں سے رفتہ رفتہ اپنی حالت درست کر لے گا اور پھر کبھی مجھ سے مدد کا خواست گار نہ ہوگا ۔’’

تجارت کے اصول ، جن کی پابندی کرنی تاجر کو لازم ہوتی ہے ، خود بخود اُس کو جز رس اور کفایت شعار بنا دیتے ہیں ۔ ایک مہاجن کی نقل مشہور ہے کہ اس کا بیٹا آوارہ اور بدچلن ہوگیا تھا ۔ اُس نے باپ کی بہت سی دولت اس کی زندگی ہی میں اُڑا دی ۔ ہرچند باپ ملامت اور نصیحت کرتا تھا مگر اس کے کان پر جوں بھی نہ رینگتی تھی ۔ آخر جب مہاجن مرنے لگا تو اُس نے بیٹے کو وصیت کی کہ جو کچھ مال و دولت میں چھوڑتا ہوں ، اس کے خرچ کرنے نہ کرنے کا تجھ کو اختیار ہے ، کیوں کہ تیرے سوا میرا کوئی وارث نہیں جس کو یہ مال و دولت دے جاؤں ۔ لیکن ایک نصیحت کرتا ہوں ، اس کو کبھی نہ بھولنا ؛ اور وہ یہ ہے کہ ایک سے لے کر ہزار تک جو کچھ خرچ کرے اور جو کچھ خرچ کے بعد باقی رہا کرے ، اُس کو ہر روز ‘بہی’ میں لکھ لیا کیجیو اور ہمیشہ آج کا

حساب کل اور کل کا حساب برسوں دیکھتا رہیو ۔ بیٹے نے ایسا ہی کیا اور چند ہی روز میں جب اُس نے دیکھا کہ سرمایہ روز بروز گھٹتا جاتا ہے تو دفعةً اُس کی آنکھیں کھل گئیں اور اپنے گھر کو سنبھال لیا ۔

جس طرح تجارت سے جز رسی اور کفایت شعاری کی بنیاد تمام قوم میں پڑتی ہے اسی طرح تحمل ، بردباری ، نرمی اور مرافقت بغیر تجارت کے کسی قوم کی قومی خصلت نہیں بنتی ۔ جس طرح سلطنت اور حکومت کا میلان ظلم اور تشدد اور غرور و نخوت کی جانب ہوتا ہے اسی طرح تجارت کا اقتضا یہ ہے کہ وہ تند مزاجوں کو دھیما ، مغروروں کو خاکسار ، سخت کلاموں کو شیریں زبان اور جباروں کو منکسرالمزاج بناتی ہے ۔ تاجر کی ضرورتیں ایسی ہیں کہ جب تک وہ تحمل و بردباری اور شیریں زبانی اختیار نہ کرے ، ہرگز اپنے پیشے میں کامیاب نہیں ہو سکتا ۔

ایک مصنف لکھتا ہے کہ ”دنیا میں سب سے زیادہ خوش اخلاق اور شیریں زبان یہودی لوگ ہیں ۔ نہ فرانسیسی ، نہ اٹلی والے اور نہ جرمن ۔ اور یہی وجہ ہے کہ دنیا میں کوئی قوم یہودیوں کے برابر دولت مند نہیں “۔ اسی سبب سے جو قومیں تجارت پیشہ ہوتی ہیں ، ایک مدت کے بعد اُن کی نسلیں فطرةً اُن خصلتوں پر مجبول پیدا ہوتی ہیں کیوں کہ اولاد کے جسمانی اور نفسانی قویٰ اپنے آبا و اجداد کے جسمانی اور نفسانی قویٰ کے تابع ہوتے ہیں ۔ جس طرح قوی اور تنومند ماں باپ کی اولاد تنومند ہوتی ہے ، اسی طرح متحمل و بردبار ماں باپ کی اولاد ، مستثنیٰ صورتوں کے سوا ، ضرور ہے کہ متحمل و بردبار پیدا ہو ۔

راست بازی اور خوش معاملگی بھی تجارت کی کامیابی کے لیے نہایت ضروری ہے کیوں کہ جو تاجر راست باز اور خوش معاملہ

نہیں ہوتا اُس کی ساکھ شہر یا ملک میں کبھی نہیں بندھ سکتی ۔ اگر وہ فریب یا بدمعاملگی سے کبھی کامیاب بھی ہو جاتا ہے ، تو بہت جلد اُس کا خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے : اس لیے تاجر کو مجبوراً راست باز اور خوش معاملہ بننا پڑتا ہے ۔ ہم ہمیشہ بازاروں میں اپنی آنکھ سے دیکھتے ہیں کہ جو دوکاندار گاہکوں کو دھوکا نہیں دیتے اور اپنا مال سب کے ہاتھ ایک ہی نرخ پر بیچتے ہیں ، وہ چند روز میں اپنے ہم پیشوں سے سبقت لے جاتے ہیں ، یہاں تک کہ اُن کی کامیابی دیکھ کر اوروں کو بھی وہی طریقہ اختیار کرنا پڑتا ہے ۔ اور اس طرح ممکن ہے کہ رفتہ رفتہ بازار میں راست بازی پھیل جائے ۔

اگرچہ اس بات کا انکار نہیں ہو سکتا کہ دنیا میں ابھی تک راست باز تاجروں کی تعداد بہ مقابلہ ”جو فروش گندم نماؤں“ کے بہت کم ہے ، لیکن اس سے تجارت کے پاک دامن پر کوئی دھبا نہیں لگتا ۔ جس طرح علم کا خاصہ ہے کہ وہ براہ راست نیکی کی راہ سجھاتا ہے لیکن باوجود اس کے بہت سے اہل علم اپنی بداعمالیوں سے علم کو بدنام کرتے ہیں ، اسی طرح اگرچہ تجارت براہ راست آنسٹی (دیانتداری) اور راست بازی کی تعلیم دیتی ہے ، لیکن نالائق تاجر چند روزہ منفعت کے لیے بد دیانتی اور فریب اختیار کر کے تجارت کی پائدار برکتوں سے محروم رہتے ہیں ۔

ایک دانش مند امریکن مصنف اپنے ملک کے تاجروں کو اس طرح نصیحت کرتا ہے :

> ”جس قدر تمھاری تجارت میں راست بازی اور خوش معاملگی زیادہ ہوگی ، اسی قدر تمھارا کام جلد ترقی کرے گا ۔ تجارت کی ذات میں بھلائی اور نیکی کے سوا کچھ نہیں ہے مگر انسان نے اپنی بدی سے اُس کو بُرا بنا دیا ہے ، اور اپنی خیانت اور بد دیانتی سے اس کے پاک دامن پر داغ لگا دیا ہے ۔ اگر تم

تجارت میں کامیاب ہونا چاہتے ہو تو تمام مکرو فریب چھوڑ دو اور سانپ کی چال نہ چلو، جو کمینہ پن سے بجائے پاؤں سے چلنے کے پیٹ کے بل چلتا ہے۔ بلکہ ایسا کرو کہ تمھاری دوکانیں، گودام اور منڈیاں عزت اور دیانت داری کے مندر ہوں اور اپنی منڈیوں کے دروازوں پر کندہ کرادو کہ جو کوئی اس احاطے میں داخل ہوگا اس کو امان دی جائے گی۔“

اصل یہ ہے کہ جب تک کسی ملک کی تجارت وہاں کے تعلیم یافتہ گروہ کے ہاتھ میں نہیں آتی بلکہ جاہلوں اور نالایقوں کے پنجے میں پھنسی رہتی ہے، تب تک تجارت کی کامیابی کا بھید عام نظروں سے مخفی رہتا ہے۔ اکثر نفع یا نقصان کو امورات تقدیری میں شمار کرتے ہیں جن میں انسان کی عقل و تدبیر کچھ کام نہیں دے سکتی (حالانکہ وہ تدبیر سے ایک دم غافل نہیں رہتے)، بعضے چالاکی اور عیاری کو بیوپار کے لوازمات میں سے جانتے ہیں۔ لیکن فی الحقیقت تاجر کی کامیابی کا مدار زیادہ تر اُس کی راست بازی اور خوش معاملگی پر ہوتا ہے، جس پر پورا پورا یقین بغیر تعلیم و تربیت کے حاصل نہیں ہو سکتا۔ ایک مصنف لکھتا ہے کہ:

> ”تجارت کی کامیابی کے لیے زیادہ ضرورت صرف علم کی ہے، نہ کہ تجربے کی، کیوں کہ تجربہ علم حاصل کرنے کے متعدد ذرائع میں سے ایک ذریعہ ہے۔ عاقل اپنی عقل اور علم سے سبق لیتے ہیں اور کم عقل تجربے سے، مگر نہایت بیوقوف ضرورت سے، اور چوپائے نیچر سے۔“

اسی مصنف کا قول ہے کہ:

> ”وہ وقت قریب ہے جب کہ تجارت ہر قسم کے ذہنی اور عقلی پیشوں سے مقابلہ کر سکے گی۔ زمانۂ آیندہ کا تاجر ضرور دانشمند اور لایق شخص ہوگا جو مصنوعی اور قدرتی چیزوں کا زمین

> پر تقسیم کرنے والا ہوگا۔ اب وہ اتفاقات روز بروز کم ہوتے جاتے ہیں، اور قریب ہے کہ بالکل معدوم ہو جائیں، جن سے ایک نالایق تاجر، جو بار بار غلطیاں کرتا ہے، مدت دراز تک دوالہ نکلنے سے محفوظ رہ سکے۔“

اصلی جرأت اور دلیری بھی جیسی تجارت کی بدولت انسان میں پیدا ہوتی ہے، ایسی کسی اور پیشے کے ذریعے سے نہیں ہوتی۔ شاید وہ لوگ جو تجارت اور دلیری میں منافات سمجھتے ہیں، اس بات کو سن کر متعجب ہوں، مگر ان کو یاد رکھنا چاہیے کہ دلیری یا بزدلی کسی خاص فرقے کے ساتھ خصوصیت نہیں رکھتی۔ ممکن ہے کہ ایک سپاہی یا سپہ سالار نہایت بزدل ہو اور ایک بیوپاری بہت بہادر ہو۔ جس طرح بہادروں کو میدان جنگ میں دلیری اور شجاعت کے کام کرنے پڑتے ہیں اسی طرح ہر شخص کو اپنی روزانہ زندگی میں اکثر موقعوں پر دلیری سے کام کرنا پڑتا ہے۔

کبھی راستی اور ایمان داری سے کام کرنے میں طرح طرح کے خطرے ہوتے ہیں۔

کبھی حرص اور طمع انسان کی نیت ڈانواں ڈول کر دیتی ہے۔

اکثر دوسروں کا سہارا چھوڑ کر اپنے دست و بازو پر بھروسا کرتے ہوئے جی ہچکچاتا ہے۔

اکثر اوقات ارادوں میں تزلزل واقع ہو جاتا ہے۔ صریح ایک کام کو مفید جانتے ہیں مگر چوں کہ کبھی اس کو نہیں کیا، اُس میں ہاتھ نہیں ڈالتے۔

بعض اوقات اپنے فرائض کاہلی سے یا کسی کے لحاظ سے یا کسی کے خوف سے پورے کرنے دشوار معلوم ہوتے ہیں۔

غرض کہ اسی قسم کے بے شمار مواقع ہیں جہاں دلیری کی ضرورت ہوتی ہے۔ پس جو شخص ایسے موقعوں پر دلیری اور جرأت ظاہر

کرتا ہے اور خوف یا مروت یا دل کی کمزوری پر غالب آجاتا ہے ، اس کی دلیری اور جرأت فی الحقیقت میدان جنگ کی دلیری اور شجاعت سے بدرجہا زیادہ تعریف کے لائق ہے ۔ اور اس قسم کے مواقع جیسے کہ تاجر کو پیش آتے ہیں ، دنیا میں کسی شخص کو پیش نہیں آتے ۔ وہ لاکھوں من غلہ ایسے اتفاقات کے بھروسے پر جو اس کے اختیار سے باہر ہیں ، بے دھڑک خرید کر کوٹھے اور کھتیاں بھر لیتا ہے ، وہ لاکھوں کی بدنی بدتا ہے اور نقد روپیہ بائع کی جھولی میں ڈال کر محض امید کے سہارے پر بیٹھ رہتا ہے ۔ وہ ایک ایسے شخص کے اعتبار پر ، جس کو کبھی اس نے آنکھ سے نہیں دیکھا اور جو اس سے سات سمندر پار رہتا ہے ، مال سے بھرا ہوا جہازوں کا بیڑا سمندر میں چھوڑ کر تسلی اور اطمینان سے پاؤں پھیلا کر سو رہتا ہے ۔

ایک مصنف لکھتا ہے کہ ’’ایک دور دراز ملک کا سوداگر ، جو اپنے دوسرے ہم پیشہ بھائی پر صرف خط و کتابت کے ذریعے سے اعتماد کرتا ہے اور اپنی دولت کا بھرا ہوا جہازوں کا بیڑا سمندر کی موجوں کے حوالے کر کے نچنت ہو جاتا ہے ، کوئی وجہ نہیں کہ وہ اس اعلیٰ درجے کی انسانی خوبی پر نازاں نہ ہو ۔‘‘

جو قومیں صرف اس بنا پر کہ اُن کے آبا و اجداد بڑے تلوار کے دھنی ، جنگجو اور سپاہی تھے ، اپنے تئیں بہادر اور شجاع خیال کرتی ہیں ، اُن کے لیے اپنی بہادری کی آزمایش کا اس سے بہتر کوئی موقع نہیں کہ وہ تجارت کے میدان میں آئیں ۔ اُن کو بہت جلد معلوم ہو جائے گا کہ وہ فی الواقعہ دلیر اور جری ہیں یا بزدل اور ڈرپوک ۔

تجارت کے فوائد و برکات :

الغرض تجارت کی کامیابی کے لیے جس کا مدار تاجر کے مقبول و معتمد خاص و عام ہونے پر ہے ، نہایت ضرور ہے کہ تاجر علاوہ عاقل اور مدبر ہونے کے عمدہ اخلاق اور عمدہ خصلتوں سے آراستہ ہو، اور اس لیے تجارت کو انسان کا معلم اور اتالیق کہا جائے تو کچھ بے جا نہیں ۔

۱- وہ صرف تاجر ہی کو نیکی نہیں سکھاتی بلکہ تمام ملک میں نیکی پھیلاتی ہے ۔

۲- وہ کسانوں کو ترقیِ زراعت کی ترغیب دلاتی ہے ۔

۳- وہ کاری گروں سے نوعِ انسان کی تمام آسایش و آرام کی چیزیں تیار کراتی ہے ۔

۴- وہ ایک ملک کی پیداوار دوسرے ملک اور ایک سرزمین کی برکت دوسری سرزمین میں پہنچا کر تمام دنیا کی حاجتیں رفع کرتی ہے ۔

۵- تجارت نے جو فائدے دنیا کی قوموں کو پہنچائے ہیں وہ شمار اور تعداد کی حد سے خارج ہیں ۔ ایک مصنف تجارت کی نسبت لکھتا ہے کہ ’’لڑائی جو انسان کی خوں ریز دشمن اور ملکوں کی غارت کرنے والی دیوی ہے ، اور جو اب بھی ویسی ہی مہیب اور ہولناک ہے جیسی یونان کے مشہور شاعر ہومر کے زمانے میں تھی ، اگر کبھی اس کی تیغ خون آشام ہمیشہ کے لیے میان میں کی جائے گی تو تجارت ہی کی بدولت کی جائے گی ۔

۶- تجارت نے دنیا میں شایستگی کو پھیلایا ہے ۔

۷- اُس نے تمام روے زمین پر انسان کی ضرورت اور آسایش کے سامان برابر تقسیم کیے ہیں ۔

۸- اُس نے علوم و فنون کی بیش قیمت اور مفید تحقیقاتوں اور ایجادوں کو رواج دیا ہے ۔

۹- اُس نے موجدوں کی طبیعت میں نئے نئے ایجاد و اختراع کی

تحریک پیدا کی ہے ۔

۱۰۔ وہ علم اور دین کی اشاعت میں مدد دیتی ہے ۔

۱۱۔ تجارت اور ترقی ہمیشہ ہر جگہ لازم ملزوم رہی ہیں ۔ انسان کے اندرونی قویٰ کی ترقی ، علوم و فنون کی ترقی ، جنرل انفورمیشن (معلومات عامہ) کی ترقی ، اخلاق کی ترقی ، ضوابط و قوانین کی ترقی ، آزادی کی ترقی ، غرض کہ ہر طرح کی ترقی اُس سے پیدا ہوئی ہے ۔

۱۲۔ اُس نے ہمیشہ جس چیز کو جس درجے پر پایا ہے ، اُس سے جدا ہوتے وقت اُس کو بلند سیڑھی پر چھوڑا ہے ۔

۱۳۔ وہ اول ایک ملک سے دوسرے ملک میں شایستگی کے لیے بطور طلایہ کے جا کر رستہ تیار کرتی ہے اور پھر شایستگی کو اپنے ساتھ لے کر وہاں پہنچتی ہے ۔

(الف) اُس نے وحشیوں کو انسان بنایا ہے ۔

(ب) اُس نے عوام‌الناس اور اُمرا کو بادشاہی تک پہنچایا ہے ۔

(ج) اُسی نے موروں (مسلمانوں) کو اپنے عہد میں دنیا کا عقلمند بنایا ۔

(د) اُسی نے انگریزوں کو اکیلا بلا شرکت غیرے تمام ہندوستان کا وارث ٹھہرایا ۔"

۱۳

قومی جلسوں میں نظموں کی بھرمار

(قلمی مسودے سے نقل کیا گیا ، سنہ ۱۹۰۳ع)

قومی ، مذہبی اور سیاسی جلسوں میں نظمیں پڑھے جانے کا رواج شروع سے چلا آتا ہے ۔ چناں چہ مولانا حالی بھی محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ کے سالانہ جلسوں میں اکثر اپنی نظمیں حاضرین کو سنایا کرتے تھے ، جن کو لوگ بے حد پسند کرتے تھے اور بڑے ذوق و شوق سے سنتے تھے ۔ لیکن آخر مولانا کا دل اس طرز عمل سے اُکتا گیا اور اُنھوں نے اس رسم کے خلاف ایک مضمون 'پیسہ اخبار' لاہور میں لکھا ۔ 'پیسہ اخبار' کے جس پرچے میں یہ مضمون شائع ہوا تھا وہ ہمیں نہیں ملا ۔ مگر حسن اتفاق سے اس مضمون کا کٹا پھٹا مسودہ ہمیں مولانا مرحوم کے کاغذات میں مل گیا جو خود مولانا کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے اور اُسی کی نقل ہم ناظرین کرام کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں ۔

(محمد اسماعیل)

مذکورۂ بالا عنوان سے ایک نوٹ ہفتہ وار 'پیسہ اخبار' مورخہ ۱۶ اپریل ۱۹۰۳ع میں شائع ہوا ہے جس کو پڑھ کر ہم کو اپنے وہ خیالات ظاہر کرنے کا موقع ملا ہے جو بہت دن سے اس

معاملے کے متعلق ہمارے دماغ میں گشت کر رہے تھے۔

اگرچہ یہ بات وثوق کے ساتھ نہیں کہی جا سکتی کہ اس بدعت کی بنیاد ہمارے قومی جلسوں میں کب اور کس کی تحریک سے پڑی، لیکن جہاں تک خیال کیا جاتا ہے اس کے محرک اور بانی خود نظمیں لکھنے والے اور اپنی نظمیں سنانے کی خود تقریبیں ڈھونڈنے والے معلوم ہوتے ہیں۔

چوں کہ ایک مدت سے قدیم طرز کی شاعری متروک ہوتی جاتی ہے اور اُس کے مشاعرے بند ہوتے جاتے ہیں، اس لیے اُن لوگوں کے لیے جو قدیم طرز کی شاعری سے متنفر ہو گئے ہیں، سوائے قومی جلسوں کے اپنے کلام کی داد لینے کا کوئی اور موقع باقی نہیں رہا۔ پس ضرور تھا کہ وہ اپنا کمال ظاہر کرنے اور اُس کی داد لینے کے لیے ایک دوسرا میدان تلاش کریں۔

ہم نہ قدیم شاعری کے مخالف ہیں اور نہ جدید شاعری کے مزاحم، بلکہ ایک لحاظ سے جدید شاعری کے زیادہ مؤید ہیں۔ لیکن ہماری رائے میں نئی شاعری کو ترقی دینے کا مقام بجائے قومی جلسوں کے نئی طرز کے مشاعروں کو، جن کا نمونہ ایک دفعہ پہلے لاہور میں قائم ہو چکا[1] ہے، قرار دینا چاہیے۔

نئی طرز کی شاعری سے ہماری مراد یہ ہے کہ قدیم دستور کے موافق اُس میں شعرا کو مصرع طرح نہ دیا جائے بلکہ کسی مضمون کا عنوان دے کر اس پر نظمیں لکھوانی چاہییں اور اس بات کا اختیار کہ وہ کس بحر یا کس صنف میں ترتیب دی جائیں، خود شعراء کے ہاتھ میں ہونا چاہیے۔

نئی طرز کی شاعری میں سوائے اس کے کہ لوگوں نے کہیں کہیں مسلمانوں کے تنزل کا رونا رویا ہے، اور مضامین کی طرف بہت ہی کم توجہ کی گئی ہے، حالاں کہ نیچرل مضامین کا ایک وسیع و ناپیدا کنار میدان موجود ہے جس میں ہمارے شعراء طبیعت کی جولانیاں اور فکر کی بلند پروازیاں دکھا سکتے ہیں۔

برخلاف اس کے قومی جلسوں میں اگر مقتضائے مقام کے موافق کسی مضمون پر نظم لکھی جائے تو سوائے اس کے کہ وہی قومی ترقی یا تنزل کا راگ بار بار گایا جائے، اور کیا لکھا جا سکتا ہے۔ اور اگر غیر متعلق مضامین پر نظمیں ترتیب دے کر ان جلسوں میں پڑھی جائیں تو ایسا کرنا صرف بے موقع و بے محل ہی نہ ہوگا بلکہ اہل جلسہ کے لیے، جو در حقیقت شعر و سخن سننے کے لیے نہیں بلکہ قومی مقاصد پر غور کرنے کے لیے آتے ہیں، بار خاطر اور ناگوار طبع ہوگا۔

قومی مقاصد کے لیے جو جلسے آج کل ہندوستان میں ہوتے ہیں یہ در حقیقت اہل مغرب کی تقلید ہے۔ مگر ہم نے آج تک نہیں سنا کہ اہل مغرب کے قومی جلسوں میں سوائے اسپیچوں اور لیکچروں کے شعرا کو بھی نظمیں پڑھنے کا موقع دیا جاتا ہو۔

اہل مغرب کو جانے دو، ہمارے ملک میں جو قومیں سب سے زیادہ تعلیم یافتہ اور باخبر ہیں جیسے بنگالی، مرہٹی اور پارسی اُن کے ہاں بھی جہاں تک ہم کو معلوم ہے، ایسے جلسوں میں نظمیں نہیں پڑھی جاتیں۔ اور اگر ہمارا قیاس غلط نہ ہو تو آریہ سماج اور سناتن دھرمیوں کے جلسوں میں بھی سوائے بھجن گانے کے، جو مذہبی خیالات پر نہایت عمدہ اثر رکھتے ہیں، نظمیں پڑھے جانے کا

---

[1] یہ اُس مشاعرے کی طرف اشارہ ہے جس کی بنیاد کرنل ہالرائڈ ڈائرکٹر سررشتۂ تعلیم پنجاب کے ایماء سے شمس العلما مولوی محمد حسین آزاد نے ۱۸۷۴ء میں لاہور میں ڈالی تھی۔ اس مشاعرے میں شاعروں کو بجائے مصرع طرح دینے کے کوئی مضمون دے دیا جاتا تھا کہ اس کے متعلق طبع آزمائی کریں۔

دستور نہیں ہے ۔

ہم تسلیم کرتے ہیں کہ سر سید احمد خاں مرحوم نے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس میں ایک حد تک نظمیں پڑھنا جائز رکھا تھا ، مگر اُس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ نظمیں پڑھوانے کو کانفرنس کے حق میں در حقیقت کچھ مفید سمجھتے تھے ۔ بلکہ اُس زمانے میں جب کہ مسلمان ایسے جلسوں کی اغراض سے بالکل غیر مانوس اور اُن کے نتائج سے بالکل بےخبر تھے ، ضرور تھا کہ ایجوکیشنل کانفرنس میں کچھ ایسا سامان بھی مہیا کیا جائے جس سے مسلمان بالطبع مانوس ہوں اور کانفرنس میں شوق اور رغبت سے آ کر شریک ہوا کریں ۔

لیکن اب مسلمانوں کی وہ حالت نہیں ہے ۔ اُن میں قومی کاموں کا مذاق پیدا ہو گیا ہے اور اُن کو قومی جلسوں میں بلانے کے لیے اس بات کی ضرورت اب باقی نہیں رہی کہ اُن کی دل لگی کے لیے کانفرنس میں شاعروں کی چند جوڑیاں بلائی جائیں ، اس لیے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس میں اب نظموں کا پڑھا جانا سوائے اس کے کہ اُس کو مسلمانوں کی جہالت اور وحشت کی ایک یادگار قرار دیا جائے ، اور کچھ معنی نہیں رکھتا ۔

ہاں بلاشبہ انجمن حمایت اسلام کی حالت کانفرنس کی حالت سے بالکل مختلف ہے ، کیوں کہ کانفرنس میں اول تو اطراف ہندوستان سے صرف تعلیم یافتہ لوگ ، یا کم سے کم نئے خیالات اور جدید مذاق کے لوگ آتے ہیں جو قومی مقاصد پر بحث اور گفتگو کرنے کی بخوبی لیاقت رکھتے ہیں ۔ دوسرے کانفرنس کے اجلاسوں کا اصل مقصد چندہ جمع کرنا نہیں ہے بلکہ جو مسائل مسلمانوں کی تعلیم وغیرہ کے متعلق تصفیہ طلب ہوتے ہیں اُن کی نسبت جو بات اتفاق یا کثرت رائے سے قرار پائے اُس سے مسلمان پبلک کو آگاہ کرنا اصل مقصد کانفرنس کا ہے ۔ برخلاف

اس کے انجمن حمایت اسلام میں جو سالانہ جلسہ ہوتا ہے ، اول تو اس کا اصل مقصد چندہ جمع کرنا ہے جس پر زیادہ تر انجمن کے قیام و دوام کا دار و مدار ہے ، دوسرے اس جلسے میں تعلیم یافتہ لوگوں کے علاوہ کثرت سے ایسے لوگ بھی جمع ہوتے ہیں جن کی دل چسپی کے لیے کم و بیش نظموں کا پڑھا جانا سردست فائدے سے خالی نہیں معلوم ہوتا ۔

پس ہمارے نزدیک رائے صواب یہ ہے کہ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس میں تو نظموں کا سلسلہ بالکل منقطع ہو جانا چاہیے ، لیکن انجمن حمایت اسلام میں ابھی اس سلسلے کا بالکل منقطع ہونا خلاف مصلحت معلوم ہوتا ہے ۔ لیکن جیسی کہ 'پیسہ اخبار' کی رائے ہے ، وہاں بھی اس دستور کو بتدریج گھٹانا چاہیے اور بجائے نظموں کے مذہبی وعظوں اور مفید لیکچروں کو رفتہ رفتہ ترقی دینی چاہیے ۔

۱۴

موجودہ مذہبی مناظرے

(منقول از رسالہ 'عصرِ جدید' میرٹھ جلد ۵ ، نمبر ۳ ، بابت ماہ مارچ ۱۹۰۷ء صفحہ ۸۵ تا ۸۹)

> مذہبی جنگ و جدل اور مناظروں سے جو بُری عادتیں ہمارے مناظرین میں پیدا ہو جاتی ہیں ، اس مضمون میں مولانا نے اُن کی بہت اچھی طرح نشان دہی کی ہے ۔ اس کے بعد عام مذہبی مناظروں کو چھوڑ کر صرف شیعہ اور سنی مناظروں کی طرف بحث کو پھیر دیا ہے اور لکھا ہے کہ جو طاقت اور قوت ہمیں عیسائی مذہب کے مقابلے میں خرچ کرنی چاہیے تھی ، وہ ہم باہمی جنگ و جدل میں خرچ کر رہے ہیں ، اور اس طرح کر رہے ہیں کہ اس کا کوئی نتیجہ سوائے نقصان کے نہیں ۔ (محمد اسماعیل)

امام غزالی نے 'احیاء العلوم' میں لکھا ہے کہ مناظرے سے چند کمینہ خصلتیں خواص علماء میں پیدا ہو جاتی ہیں جیسے حسد ، تکبر ، کینہ ، غیبت ، خود پسندی ، عیب جوئی ، شماتت ، نفاق ، حق بات سے انکار اور باطل پر اصرار وغیرہ وغیرہ ۔ اور سفلا و جہلا میں ان عیوب کے علاوہ اکثر گالی گلوج اور جوتی پیزار تک بھی نوبت پہنچ جاتی ہے ۔

بلاشبہ جیسی کہ 'احیاء العلوم' میں تصریح کی گئی ہے ، مناظرہ کرنے والوں میں یہ اور اسی قسم کے بہت سے رذائل مناظرے کے متعارف طریقے سے پیدا ہونے چاہئیں ۔ لیکن ہمارے نزدیک اگر مذہبی مناظرے کے مضر نتیجے ، جو اوپر بیان کیے گئے ، صرف مناظرہ کرنے والوں کی ذات ہی تک محدود رہتے اور اُن کی آنچ دور دور نہ پہنچتی تو چنداں نقصان نہ تھا مگر افسوس یہ ہے کہ یہ نتائج اصل مناظرے ہی تک محدود نہیں رہتے بلکہ وبائے عام کی طرح تمام قوم میں پھیل جاتے ہیں ۔ قوم میں جدا جدا دھڑے اور فریق بندھ جاتے ہیں ، ہر فریق دوسرے فریق کا دشمن ہو جاتا ہے اور اس طرح قوم میں پھوٹ اور نااتفاق پھیل جاتی ہے ۔

انسان کی طبیعت نزاع و خلاف اور جنگ و جدل پر مجبول ہوئی ہے ، جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہوا ہے ''و کان الانسان اکثر شئی جدلا''۔ اس کو فطرۃً سلوک اور ملاپ میں وہ لطف حاصل نہیں ہوتا جو خصومت اور جھگڑے میں حاصل ہوتا ہے ۔ پس جو اہل علم اس مضرت رساں سلسلے کو چھیڑتے ہیں وہ درحقیقت ابنائے جنس کے اُس فطری مادے کو مشتعل کرتے ہیں جو ذرا سی اشتعالک سے بھڑک اُٹھتا ہے اور پھر کسی طرح بجھائے نہیں بجھتا ۔

ہندوستان کے سنی شیعوں میں مذہبی مناظرے کی ابتدا کچھ شک نہیں کہ اہل سنت کی طرف سے ہوئی ۔ تفضیل الشیخین ، ازالۃ الخفا اور تحفۂ اثنا عشریہ سے پہلے جہاں تک ہم کو معلوم ہے کوئی چھیڑچھاڑ شیعوں کی جانب سے نہیں ہوئی ۔ ان کتابوں کی اشاعت سے پہلے :

(۱) دونوں فریق ہر ایک موقع پر شیر و شکر رہتے تھے ۔

(۲) سنی مجالسِ عزا میں برابر شریک ہوتے تھے ۔

(۳) سنیوں کی لڑکیاں شیعہ لڑکوں سے اور شیعوں کی لڑکیاں سنی لڑکوں سے بیاہی جاتی تھیں ۔

(۴) سنی قاضی شیعوں کے نکاح پڑھتے تھے ۔

(۵) دونوں فریق کے آدمی ایک مسجد میں نمازیں ادا کرتے تھے ۔

مگر جب سے مذکورۂ بالا کتابیں شائع ہوئیں اور مذہبی مناظرے دونوں فرقوں میں شروع ہوئے ، تب سے وہ تمام میل جول جاتا رہا اور باہمی اتحاد و یگانگت نفرت اور مغایرت کے ساتھ بدل گئی ۔

ہرچند کہ شیعوں نے ان کتابوں کی تردید کرتے وقت دل کے بخارات دل کھول کر نکالے ہیں مگر چوں کہ ابتدا اہل سنت کی طرف سے ہوئی ہے اس لیے شیعوں کو زیادہ الزام نہیں دیا جا سکتا ۔

میں نے سنا ہے کہ مولانا عبدالعلی بحرالعلوم نے 'تحفہ' کو دیکھ کر افسوس کیا تھا کہ اس کتاب سے یہاں کے شیعہ سنیوں میں سخت تفرقہ پڑ جائے گا ۔

اگر یہ بات صحیح ہے تو (افسوس ہے کہ) مولانا کی پیشین گوئی پوری ہو گئی ۔ دونوں فرقوں کا اختلاف منجر بہ عناد و دشمنی ہو گیا اور رفتہ رفتہ تمام روابط منقطع ہو گئے ۔

ہر سال ہندوستان کے کسی نہ کسی شہر یا قصبے میں دو چار ناگوار واقعات ایسے سننے میں آتے ہیں جن کا عدالت کو فیصلہ کرنا پڑتا ہے ، جن میں فریقین کا ہزار ہا روپیہ صرف ہو جاتا ہے اور دونوں کی تفضیح اپنے پرائے کی نظر میں جدا ہوتی ہے ۔

(اس قسم کے تمام جھگڑوں میں) جب بنائے مخاصمت کی تفتیش کی جاتی ہے تو ہمیشہ اسی قسم کی کوئی بات نکلتی ہے کہ "محمد شاہ کی ڈاڑھی بڑی تھی یا احمد شاہ کی ؟"

جو معرکہ آج کل نہ صرف ہندوستان میں بلکہ تمام دنیا میں سائنس اور مذہب کے درمیان گرم ہو رہا ہے ، اس کے مقابلے میں اہل مذہب کے یہ باہمی مناظرے نزاعِ لفظی سے زیادہ کچھ وقعت نہیں رکھتے ۔

مغربی تعلیم سے تو اب دنیا کو کسی طرح مفر نہیں اور اُس کا لازمی نتیجہ ، مستثنیٰ صورتوں کے سوا ، یا تو مذہب سے قطعی

انکار کرنا اور دلوں میں اُس کی وقعت کا باقی نہ رہنا ہے ، یا کم سے کم اس میں شکوک و شبہات کا پیدا ہونا اور مذہبی یقین کا متزلزل ہو جانا ہے ۔ ایسی حالت میں ظاہر ہے کہ اس وقت مذہب کا سب سے مقدم فرض یہ ہے کہ آپس کے جھگڑوں کو چھوڑ کر ان شکوک و شبہات کو رفع کرنے میں کوشش کریں جو مغربی تعلیم کے اثر سے پلیگ کے کیڑوں کی طرح ملک میں ترقی کر رہے ہیں ۔

چناں چہ یوروپ میں مسیحی مشنریوں نے اب اسلام اور دیگر مذاہب کی تردید کو چھوڑ کر ملحدوں اور دہریوں کی تردید پر اپنی ہمتیں مقصور کر لی ہیں اور اُن کی زیادہ تر تصنیفات اثباتِ واجب الوجود ، توحیدِ باری تعالیٰ ، بقائے روح ، حدوثِ مادہ کے اثبات ، اور جزا و سزا کے برحق ہونے پر مبنی اور دیکھی جاتی ہیں ۔

ہمارے نزدیک علمائے اسلام کو بھی ، اگر وہ اسلام اور مسلمانوں کے خیرخواہ ہیں ، یہی چاہیے کہ وہ آپس کے جھگڑوں کو خیر باد کہیں اور مغربی تعلیم ، جو اندر ہی اندر مذہب کی جڑ کاٹ رہی ہے ، اُس کے مضر نتائج سے قوم کے نوجوانوں کو بچائیں ، اور اپنے ہتھیاروں کو جو اب تک خانہ جنگی ہی میں صرف ہوتے رہے ہیں ، ملحدوں اور دہریوں کے مقابلے میں استعمال کریں ۔

آپس کے مذہبی مناظروں سے اگر اُن کا مقصد یہ ہے کہ جس مذہب کے خلاف وہ کتابیں یا رسالے لکھتے ہیں ، اُس مذہب والوں کو اپنے مذہب کی حقیقت کا یقین دلائیں ، سو اس مقصد میں تو ان کا کامیاب ہونا قریب نا ممکن کے ہے ، کیوں کہ جس طرح مذہب کا یقین عموماً دلیل و برہان سے پیدا نہیں ہوتا بلکہ بچپن کے اِلف و عادات اور والدین کی عملی تعلیم و تلقین سے پیدا ہوتا ہے ، اسی طرح وہ کسی دلیل و برہان سے زائل بھی نہیں ہوتا ۔ الاماشاًاللہ ۔

اور اگر ان کا مقصد صرف اپنے ہم مذہبوں کی تشفی اور اطمینان

کو زیادہ کرنا اور اُن کو مذہب پر ثابت قدم رکھنا ہے تو بلاشبہ اس میں کما حقہ کامیابی ہو سکتی ہے ۔

یہ نہایت شریف اور اعلیٰ مقصد ہے جو ہر مذہب کے علما کا نصب العین رہنا چاہیے ، مگر اس غرض کے لیے صرف اپنے مذہب کی حقیقت ثابت کرنا اور اُس کو دلائل و براہین سے تقویت دینا کافی ہے ۔ دوسرے مذہب کی توہین یا تنقیص کرنا اور فریق مقابل کا دل دُکھانا ضرور نہیں ہے ۔

اگرچہ مناظرہ اپنے اصلی معنوں کے لحاظ سے فی‌نفسہ نہایت مفید چیز ہے کیوں کہ مناظرے کے اصلی معنی یہ ہیں کہ دو گروہ یا دو شخص کسی مسئلے کو اس نظر سے دیکھیں کہ اُس کا کون سا پہلو صحیح ہے اور کون سا غلط ؟ اور جونسا پہلو صحیح ثابت ہو ، اس کو دونوں فریق بلاتامل تسلیم کر لیں ، لیکن ایسے مناظرے کی مثالیں بہت ہی کم سننے میں آتی ہیں ۔ ہمیشہ یہی دیکھا جاتا ہے کہ ہر ایک فریق کا مقصد دوسرے فریق کو مغلوب کرنے کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا ، اور اسی وجہ سے مناظرے کا نتیجہ ہمیشہ برا ہوتا ہے ۔

آج کل ہندوستان میں جس قدر قحط اور وبا کے انسداد کی ضرورت ہے ، اُس سے بہت زیادہ نا اتفاق کے انسداد کی ضرورت ہے ۔ اس وقت ہر ایک قوم بہ مقابلہ دیگر قوموں کے اپنا وزن قایم رکھنے کے لیے ، اور تمام ہندوستان کی قومیں گورنمنٹ کی نظر میں اپنی عزت اور وقار قایم رکھنے کے لیے باہمی اتفاق و اتحاد کی محتاج ہیں ۔

خصوصاً مسلمانوں کو بہ نسبت دیگر اقوام کے اتفاق کی زیادہ ضرورت ہے کیوں کہ ہندوستان میں ایرین نسل کی جتنی قومیں آباد ہیں ، سب غلطی سے مسلمانوں کو ایک اجنبی اور بیگانہ قوم تصور کرتی ہیں ، حالانکہ وہ خود بھی بہ مقابلہ اصلی باشندوں کے اس ملک میں ویسے ہی بیگانے ہیں جیسے کہ مسلمان ۔ پس تاوقتیکہ یہ غلطی رفع نہ ہو اور آریا قومیں مسلمانوں کو بھی دل سے اپنا وطنی بھائی نہ سمجھنے لگیں ، اُس وقت تک مسلمان اس ملک میں بغیر اسلامی اخوت کے اپنا وزن قایم و برقرار نہیں رکھ سکتے ۔

اور اس اخوت و اتحاد کا سب سے بڑا اور قوی مانع مذہبی مناظرہ یا مجادلہ ہے جو کتابوں ، رسالوں اور اخباروں کے ذریعے سے فریقین میں تعصب کی آگ بھڑکاتا رہتا ہے ۔

اگرچہ مسلمانوں میں اور بھی بہت سے فرقے ایسے ہیں جن میں بحث و مباحثہ ہمیشہ جاری رہتا ہے ، مگر سب سے زیادہ مضر اور خطرناک اور تمام قوم میں نا اتفاق کی جڑ مضبوط کرنے والے وہ مناظرے ہیں جو سنی اور شیعوں میں اب تک ہوتے رہے ہیں ۔

ان (مناظروں ، مباحثوں اور مجادلوں) کی بدولت بعض اصحاب کی یہ رائے ہو گئی ہے کہ ہندو مسلمانوں میں تو اتحاد ممکن ہے مگر سنی و شیعہ میں اتحاد کا ہونا امکان سے خارج ہے ۔

اگرچہ میں اس رائے کو صحیح نہیں سمجھتا کیوں کہ میرے نزدیک جس قدر مسلمان زمانے کی ضرورتوں سے واقف ہوتے جائیں گے ، اور جس قدر ہندستان میں مذہبی تعصبات قومی ، اور ملکی تعصبات سے بدلتے جائیں گے ، اور جس قدر مذہبی مناظرے فضول اور بے سود بلکہ مضر ثابت ہوتے جائیں گے ، اُسی قدر اسلامی فرقوں میں اتفاق اور اتحاد بڑھتا جائے گا ۔

اس مقام پر اس بحث سے قطع نظر کر کے فریقین سے التجا کرتا ہوں کہ وہ مناظرے کے متعارف طریقے کو یک قلم خیرباد کہہ دیں اور بجائے اس کے کہ ایک دوسرے کے مذہب پر رد و قدح کریں ، اسلام کی جڑ مضبوط کرنے میں کوشش کریں ، جس کو دہریوں اور ملحدوں کے شکوک و شبہات متزلزل کر رہے ہیں ۔

اس مقام پر ہم ایک شاعر کے چار مصرعے نقل کرنے مناسب سمجھتے ہیں جن میں لا مذہبوں کے خیالات کی تصویر کھینچی گئی ہے ، جو مسلمانوں کے باہمی جھگڑوں کی نسبت اُن کے دل میں گزر سکتے ہیں :

کہتا تھا کل ایک منکر قرآن و خبر
”کیا لیں گے یہ اہل قبلہ باہم لڑ کر ؟
کچھ دم ہے تو میدان میں آئیں ، ورنہ
کتّا بھی ہے شیر اپنی گلی کے اندر“[۱]

---

[۱] یہ ”شاعر“ خود مولانا حالی ہیں اور یہ ”چار مصرعے“ خود ان کی تصنیف ہیں ۔ در اصل اُن کی بڑھی ہوئی انکساری نے کبھی اس بات کی اجازت نہ دی کہ وہ کسی مقام پر بھی اپنے آپ کو نمایاں کریں ۔ (اسماعیل)

۱۵

ہماری معاشرت کی اصلاح کیوں کر ہو سکتی ہے ؟

آنریبل خواجہ غلام‌الثقلین مولانا حالی کے نواسے تھے ۔ انھوں نے جنوری ۱۹۰۳ع میں میرٹھ سے ایک اصلاحی ماہنامہ ’عصر جدید‘ کے نام سے جاری کیا ۔ یہ رسالہ جو آخر میں ہفتہ وار ہو گیا تھا ، کبھی میرٹھ سے ، کبھی مالیر کوٹلہ سے اور کبھی لکھنؤ سے مختلف اوقات میں شائع ہوتا رہا اور بالآخر جون سنہ ۱۹۱۵ع میں بند ہو گیا ۔ ۳ ستمبر سنہ ۱۹۱۵ع کو ایڈیٹر کا بھی انتقال ہوگیا مولانا حالی نے ذیل کا مضمون اسی رسالے میں لکھا تھا جو اُس کے ماہ اگست سنہ ۱۹۱۵ع کے پرچے میں از صفحہ ۲۹۶ تا صفحہ ۳۰۰ چھپا ۔

(محمد اسماعیل)

ہماری معاشرت کی اصلاح کے ضروری ہونے پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے جس کے بعد زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں معلوم ہوتی ۔ اب صرف یہ دیکھنا ہے کہ قوم کی موجودہ حالت میں یہ اصلاح کیوں کر ہو سکتی ہے ؟

بے شک آج کل کے خیالات کے موافق اس قسم کی اصلاح کے لیے قومی انجمنیں قائم کرنا ، عام جلسوں میں اسپیچیں دینا ،

رسالے جاری کرنا ، ناول یا ڈرامے لکھنا عموماً مفید خیال کیا جاتا ہے ، لیکن جب تک کچھ لوگ ان تدبیروں کے موافق عمل کرنے والے اور خود مثال بن کر اوروں کو ریس دلانے والے پیدا نہ ہوں ، یہ سب تدبیریں سردست بےکار معلوم ہوتی ہیں ۔ ان تدبیروں کا اثر جہاں تک دیکھا جاتا ہے ، زیادہ تر اُنھی لوگوں تک محدود رہتا ہے جو خود انجمنیں قائم کرتے ، اسپیچیں دیتے ، مضامین لکھتے اور ناول وغیرہ تصنیف کرتے ہیں ۔ ان کے سوا شاذ و نادر ہی کسی کے دل پر ان چیزوں کا اثر ہوتا ہے ۔ کیوں کہ انسان فطرتاً جیسا دوڑ کر مثال کی تقلید کرنے والا ہے ، ایسا خالی نصیحتوں اور ہدایتوں پر (اگر چہ وہ کیسی ہی مدلل اور موجّہ ہوں) عمل کرنے والا نہیں ہے ۔

کچھ کم سات سو برس کا زمانہ گزرا جب کہ ایک افریقہ کے سائل نے حلب کے بازار میں بزازوں سے مخاطب ہو کر کہا تھا :

> ”اے خداوندان نعمت ! اگر شما را نصاف بودے و ما را قناعت
> رسم سوال از جہان برخاستے ۔“

فی الواقعہ بھیک مانگنے کے انسداد کا کوئی طریقہ اس سے بہتر نہیں ہو سکتا جو سات سو برس پہلے اس افریقی سائل نے بتایا تھا ۔ مگر چوں کہ باوجود اس قدر طول طویل زمانہ گزرنے کے نہ دولت مندوں میں انصاف پیدا ہوا اور نہ سوال کرنے والوں میں قناعت ، اس لیے سوال کی وہی مذموم رسم آج تک دنیا میں برابر چلی جاتی ہے ۔ پس کیسی ہی سچی اور معقول بات کیوں نہ ہو ، جب تک اس پر عمل کرنے والے پیدا نہ ہوں ، کچھ اثر نہیں رکھتی ۔

آریہ سماج کے ممبروں کی تعداد جو روز بروز بڑھتی جاتی ہے ، اس کا سبب اس کے سوا اور کچھ نہیں معلوم ہوتا کہ وہ اتنا

کہتے نہیں ، جتنا کرتے ہیں ۔ چناں چہ اسی وجہ سے وہ بہت سی ایسی قدیم رسموں کے ترک کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں جن پر مذہب کا گہرا رنگ چڑھا ہوا تھا اور جن کا موقوف ہونا بہ ظاہر محال معلوم ہوتا تھا ۔

مگر حق یہ ہے کہ آریہ سماج کو اپنی اصلاحات میں چند سہولتیں ایسی میسر ہیں جو مسلمان مصلحوں کو میسر نہیں ہیں ۔ اور جن کی بدولت آریہ فرقے کے لوگ جس اصلاح کا ارادہ کرتے ہیں اس میں آسانی سے کامیاب ہو جاتے ہیں ۔

آریہ سماج درحقیقت ایک مذہبی سوسائٹی کا نام ہے جس کے تمام ممبر اپنے تئیں ایک جدید اصلاح شدہ قدیم مذہب کا پابند خیال کرتے ہیں ، اور آریہ سماج کی ہر ایک تجویز یا اصلاح کو مذہبی احکام میں شمار کرتے ہیں ۔ اور چوں کہ ایک جدید مذہبی فرقہ بہ نسبت قدیم فرقوں کے زیادہ جوشیلا اور زیادہ جذبیلا ہوتا ہے ، اس لیے وہ نہایت جوش و خروش کے ساتھ ہر وقت سماج کے حکم کی تعمیل پر آمادہ اور کمربستہ رہتے ہیں ۔

برخلاف مسلمان مصلحوں کے جو زیادہ تر نئے تعلیم یافتہ ہوتے ہیں ۔ پرانے خیالات کے مسلمانوں میں تو اُن کی وقعت اس لیے نہیں ہوتی کہ وہ تعلیم یافتہ یا دوسرے لفظوں میں نیچری کہلاتے ہیں ، اور نئے خیالات والوں نے درحقیقت آج تک کوئی ایسی سوسائٹی قائم نہیں کی جس کو ایک مذہبی جماعت کہا جا سکے ، اور جس کے ممبروں میں اس قسم کا جوش پایا جائے جو مثل آریہ سماج کے ایک جدید مذہبی فرقے میں ہونا چاہیے ۔ یہی وجہ ہے کہ نہ تو مسلمان مصلحوں کا منتر پرانے خیالات والوں پر چلتا ہے اور نہ خود اُن میں اس قدر جوش پایا جاتا ہے کہ وہ کم سے کم اپنے محدود دائرے ہی میں اپنی اصلاحیں جاری کر سکیں ۔ اسی لیے ہمارے

نزدیک (خاص کر پرانے خیالات کے مسلمانوں سے) اصلاح معاشرت کی امید اسی وقت کی جا سکتی ہے جب کہ ہمارے علماء اور واعظین اس ضروری کام کی طرف متوجہ ہوں ۔

ہم ہمیشہ سنتے ہیں کہ فلاں گاؤں یا قصبے میں فلاں مولوی صاحب کا وعظ ہوا اور وہاں کے باشندوں نے یک قلم بہت سی پرانی اور بیہودہ رسمیں ترک کر دیں ۔ انھی دنوں میں کیتھل ضلع کرنال کا یہ واقعہ سنا گیا کہ مولوی صاحب کے وعظ سے وہاں کے جلاہوں اور تیلیوں نے تمام شادی و غمی کی رسمیں ہمیشہ کے لیے اپنی اپنی قوم میں سے موقوف کر دیں ۔

بات یہ ہے کہ مسلمانوں پر کوئی نصیحت یا ترغیب یا تحریص کارگر نہیں ہوتی جب تک کسی ثواب آخروی کی امید یا عذاب آخروی کا خوف اس میں شامل نہ ہو ۔ اس لیے وہ کسی رسم یا رواج کی اصلاح پر رضامند نہیں ہو سکتے جب تک کہ ہمارے علما اور واعظین اپنے وعظ و ترغیب و ترہیب کو قوم کی اصلاحِ حال پر وقف نہ کر دیں ، اور وعظ و تذکیر کا سب سے زیادہ اہم اور ضروری مقصد قوم کی طرز معاشرت کی اصلاح کو نہ قرار دیں ۔ آریہ سماج میں اکثر وہ قومیں داخل ہوتی ہیں جو تجارت پیشہ ہیں اور جن کی گھٹی میں کفایت شعاری اور جز رسی پڑی ہوئی ہے ۔ پس جس قدر رسمیں اصولِ کفایت شعاری کے برخلاف قوم میں جاری ہیں ، جس وقت سماج میں ان کی برائی بیان کی جاتی ہے ، تو فوراً ان کے دل میں تہ نشین ہو جاتی ہے ، اور مذہبی جوش کے ساتھ طبعی میلان شامل ہو کر تمام سماج کو ان رسموں کی بیخ کنی پر آمادہ کر دیتا ہے ۔

اسی لیے ہمارے نزدیک محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے اس سیکشن (صیغے) کو ، جو کہ اس نے اصلاح معاشرت کے لیے قایم کیا

ہے ، اپنے کام کا آغاز اول مسلمان تاجروں سے کرنا چاہیے ؛ مثلاً جو رسالہ یا اخبار اس مقصد کے لیے جاری کیا جائے اس کو جہاں تک ممکن ہو ، تاجروں میں زیادہ متداول کیا جائے ۔

جو دورے ملک میں اس غرض سے کیے جائیں ، ان میں ان لوگوں کو خصوصیت کے ساتھ مخاطب کیا جائے ۔

اسپیچوں میں زیادہ تر ان رسموں کی برائی پر زیادہ زور دیا جائے جن کے ترک کرنے سے فضول خرچی اور اسراف کا انسداد مقصود ہے ۔

ایک اور سہولت آریہ سماج کو ہندو عورتوں کی حالت کے سبب سے حاصل ہے جو مسلمان عورتوں کی حالت سے بالکل مختلف ہے ؛ ہندو عورتوں میں اور خاص کر ان عورتوں میں جو آریہ سماج کے ممبروں سے تعلق رکھتی ہیں ، زمانۂ حال کی تعلیم زیادہ رواج پاتی جاتی ہے ۔

برخلاف مسلمان عورتوں کے ، جن میں اگر کچھ تعلیم ہے بھی تو صرف قدیم طریقے کی مذہبی تعلیم ہے جس سے کسی قدر اردو نوشت و خواند کی لیاقت یا نماز روزہ وغیرہ کے مسائل سے فی الجملہ واقفیت پیدا ہو جاتی ہے ۔ باقی جو خیالات متعلق بہ اصلاح رسوم و عادات ان کے رشتہ دار مردوں کے دماغ میں گشت کرتے رہتے ہیں ، ان سے وہ ویسی ہی بے خبر اور اجنبی ہوتی ہیں جیسی محض جاہل عورتیں ۔ اس لیے آریہ فرقے کے لوگ جس رسم یا رواج کی اصلاح یا انسداد کرنا چاہتے ہیں ، بہت آسانی سے اس میں کامیاب ہو جاتے ہیں ، کیوں کہ پرانی رسموں کی محبت اور ان کی پابندی عموماً مردوں کی نسبت عورتوں میں زیادہ ہوتی ہے ۔ پس جس قدر عورتوں کی طرف سے مزاحمت کم ہوتی ہے ، اسی قدر مردوں کو اصلاح میں زیادہ آسانی ہوتی ہے ۔

اس کے سوا جن قوموں میں پردے کا رواج ہوتا ہے ، اُن میں عورتیں بیاہ شادی اور دیگر رسمیات پر زیادہ شیفتہ اور فریفتہ ہوتی ہیں ، کیوں کہ اُن کی تمام خوشیاں اور اُمنگیں اور چاؤ انھی باتوں پر منحصر ہوتے ہیں کہ کنبے یا برادری کی عورتوں کو کسی حیلے یا بہانے سے اپنے گھر بلا کر ایک دو روز اُن کے ساتھ ملنے جلنے ، ہنسنے بولنے اور اُن کی خاطر تواضع کرنے سے اپنا اور اُن کا دل خوش کریں ۔ اسی بنیاد پر وہ ہمیشہ ایسی تقریبیں ڈھونڈتی رہتی ہیں جن میں اُن کو زیادہ سے زیادہ اپنی ہم جنسوں سے ملنے کا موقع ملے ۔ اگر بیاہ شادی کا موقع نہیں ملتا تو چھٹی ، مونڈن ، ختنہ اور بسم اللہ وغیرہ ہی کے بہانے سے اپنے دل کا ارمان نکال لیتی ہیں ۔

جس قوم میں عورتوں کی تمام خوشیاں اور امنگیں ان ہی باتوں پر منحصر ہوں ، اُن کے مرد کیوں کر اصلاح معاشرت میں کامیاب ہو سکتے ہیں ؟ وہ بغیر اس کے کہ عورتوں پر جبر کریں اور اپنے گھر کو دوزخ کا نمونہ بنائیں ، نہایت مشکل ہے کہ کسی قسم کی اصلاح کر سکیں ۔

پس تاوقتیکہ عورتوں میں زمانۂ حال کی تعلیم رواج نہ پائے اور ہمارے واعظین اپنی مجسلوں میں قرآن و حدیث کی رو سے بیہودہ اور فضول رسموں کی برائیاں اُن کے ذہن نشین نہ کریں ، بہت ہی کم امید ہے کہ ہماری طرز معاشرت میں کوئی معتد بہ اصلاح ہو سکے ۔ باوجود ان تمام مشکلات کے جو ہماری طرز معاشرت کی اصلاح میں حائل ہیں ، ہمت اور استقلال سے ان سب پر غالب آنا ممکن ہے ۔

سرسید مرحوم کو جو مشکلات انگریزی کی تعلیم کے پھیلانے میں در پیش تھیں ، اصلاحِ معاشرت میں ویسی مشکلات در پیش نہیں ہیں ؛ باوجود اس کے وہ اپنے استقلال سے تمام مشکلات پر

غالب آئے اور ایسی نمایاں کامیابی اپنے مقاصد میں حاصل کی جس کی بالکل امید نہ تھی ۔

اسی طرح جو کوشش محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے شعبۂ اصلاحِ تمدن نے شروع کی ہے ، اگر وہ صبر اور استقلال کے ساتھ برابر جاری رہی تو ضرور کبھی نہ کبھی سرسبز و بارور ہوگی ۔

۳۔ تاریخی مضامین

۱

دیوان حافظ کی فالیں

(تقریباً ۱۸۷۶ع)

یہ بڑا ہی دل چسپ اور پُرلطف مضمون ہے جو پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس میں اول تو مولانا نے دیوان حافظ کی بعض بہت عجیب فالوں کا ذکر کیا ہے جو مختلف لوگوں نے، مختلف زمانوں میں دیوان سے دیکھیں۔ بعد میں مولانا نے یہ بتایا ہے کہ دیوان حافظ کتنی مقبول اور مشہور اور ہر دل عزیز کتاب ہے اور اس کی وجہ کیا ہے؟

پھر یہ بیان کیا ہے کہ دیوان حافظ سے لوگوں کو کیوں عقیدت پیدا ہوئی اور کس طرح انھوں نے دیوان کو فال دیکھنے کا ایک ذریعہ بنا لیا۔ باقی رہی یہ بات کہ اس میں سے نکلی ہوئی فالیں کیوں عموماً ٹھیک ہو جاتی ہیں، اس سوال کا عجیب جواب مولانا نے یہ دیا ہے کہ اس کے الفاظ ایسے حاوی اور لچک دار ہیں کہ ہر شعر میں متعدد پہلو نکل سکتے ہیں۔

افسوس مجھے یہ پتا نہیں لگ سکا کہ یہ مضمون مولانا نے کس پرچے میں اور کب شائع کرایا تھا۔ میں نے تو ان کے ہاتھ سے لکھے ہوئے مسودے سے نقل کیا ہے۔

(محمد اسماعیل)

خواجہ حافظ کے دیوان میں فال دیکھنے کا رواج اور اُس کی فالوں کے سچا ہونے کا اعتقاد جیسا کہ ہندستان یا ایران کے مسلمانوں میں پایا جاتا ہے ، ایسا ہی کم و بیش اُن تمام ممالک اسلامیہ میں سنا گیا ہے جہاں فارسی زبان بولی یا پڑھی پڑھائی جاتی ہے ۔

خواجہ حافظ کی عموماً یہ ایک کرامت سمجھی جاتی ہے کہ اُن کے دیوان کو بند کر کے جب ایک خاص طریقے سے کھولا جاتا ہے تو جو شعر صفحے کے سرے پر نکلتا ہے وہ صراحتاً یا کنایتاً اُس امر کے متعلق ، جس میں تردد ہے ، صاف خبر دیتا ہے کہ وہ امر واقع ہوگا یا نہیں ؛ یا اُس کا نتیجہ خواہش کے موافق ہوگا یا مخالف ؛ یا فال دیکھنے والے کا خیال اُس کی نسبت صحیح ہے یا غلط ؟ چناں‌چہ اسی بنا پر دیوان مذکور کو لسان‌الغیب کے لقب سے ملقب کیا گیا ہے ۔

دیوان حافظ کی بعض فالیں جو سچی نکلیں :

صدہا واقعات کی نسبت مشہور ہے کہ دیوان مذکور میں فال دیکھی گئی اور اُسی کے مطابق ظہور میں آیا ۔

شیخ ابوالفضل نے لکھا ہے کہ جلال‌الدین اکبر اور سکندرلودھی کی لڑائی سے پہلے دیوان حافظ میں فال دیکھی گئی کہ لڑائی کا انجام کیا ہوگا ؟ اُس میں یہ شعر نکلا :

سکندر را نمی بخشند آبے
بہ زور و زر میسر نیست ایں کار

چناں‌چہ سکندر کو شکست ہوئی اور اکبر فتح‌یاب ہوا ۔

ایک تعجب انگیز واقعہ مشہور ہے کہ کوئی قیمتی جواہر یا زیور گم ہوگیا تھا ، رات کے وقت اُس کو چراغ کی روشنی میں تلاش کر رہے تھے کہ دیوان حافظ میں فال دیکھی گئی تو سر صفحہ یہ بیت برآمد ہوئی :

بفروغ چہرہ زلفش رہ دیں زند ہمہ شب
چہ دلاورست دزدے کہ بکف چراغ دارد

چناں‌چہ جس خادم کے ہاتھ میں چراغ تھا اُسی کے پاس سے وہ گم‌شدہ جواہر برآمد ہوا ۔

اسی قسم کے بعض واقعات ہم نے ایسے معزز ذریعوں سے سنے ہیں جن میں بناوٹ کا مطلق احتمال نہیں ہو سکتا ۔

میرے بڑے بھائی[1] کو ، جب کہ وہ پولیس میں ملازم تھے ، اکثر بیمار رہنے کے سبب سروس (ملازمت) کے پورا ہونے سے پہلے پنشن لینے اور ڈاکٹر کا معائنہ کرانے پر مجبور کیا گیا تھا ، مگر وہ یہ چاہتے تھے کہ جب سروس پوری ہو جائے اُس وقت خود درخواست کر کے پنشن لی جائے ۔ چناں‌چہ ڈاکٹری معائنے کی تاریخِ معین سے ایک دن پہلے انھوں نے دیوانِ مذکور میں فال دیکھی تو صفحے کے سرے پر یہ بیت نکلی :

ہر چند پیر خستہ دل و ناتواں شدم
ہرگہ کہ روے خوب تو دیدم جواں شدم

انھوں نے اس سے یہ نتیجہ نکالا کہ ڈاکٹر میری خواہش کے موافق رائے دے گا ۔ چناں‌چہ ایسا ہی ہوا ۔

بعض فالیں ایسی بھی سنی گئی ہیں جن سے اگرچہ زمانۂ مستقبل کی نسبت کوئی پیشین گوئی مفہوم نہیں ہوتی مگر فال دیکھنے والے کی سرگزشت اور زمانۂ ماضی کے برتاؤ کی طرف ایک لطیف اشارہ

---

[1] ان کا نام خواجہ امداد حسین تھا اور ان ہی نے مولانا حالی کو پرورش کیا تھا ۔ وہ یوپی میں انسپکٹر پولیس تھے ۔ وہیں وہ شیعہ سے سنی ہو گئے تھے اور اُنھوں نے ہی مولانا حالی کو شروع سے اپنے رنگ پر ڈالا ، ورنہ مولانا حالی کا سارا خاندان شیعہ تھا اور اُن کے والدین بھی شیعہ تھے ۔ (محمد اسماعیل)

مستنبط ہوتا ہے ۔

ایک نہایت باخدا اور صاحب نسبت امیر نے اپنی سرگزشت خود مجھ سے بیان کی کہ عنفوان شباب کی غفلت و بدمستی کے زمانے میں کبھی کبھی اپنی حالت پر سخت افسوس اور انفعال ہوتا تھا اور پھر تھوڑی دیر کے بعد وہی غفلت کا پردہ پڑ جاتا تھا ۔ ایک روز ساری رات لہو و لعب میں گزری ، جب صبح ہوئی تو سخت ندامت و انفعال دامن گیر ہوا اور یہ خیال دل میں گزرا کہ آخر کبھی اس سے نجات بھی ہوگی یا نہیں ؟ اس بے چینی میں دیوان حافظ کو کھول کر دیکھا تو اس میں پہلا شعر یہ نکلا :

وظیفۂ شب دوشیں مگر زیادت رفت
کہ بامداد بطرز دگر برآمدۂ

سب سے زیادہ عجیب وہ فال ہے جو شیخ علی حزیں کی طرف منسوب کی جاتی ہے : شیخ غزل میں اپنے نزدیک خواجہ حافظ کا تتبع کرتا تھا ۔ مشہور ہے کہ ایک دن اس بات کے دریافت کرنے کو کہ مجھے اس تتبع میں کہاں تک کامیابی ہوئی ہے ؟ اُس نے دیوان حافظ میں فال دیکھی : اُس میں چھوٹتے ہی یہ بیت نکلی :

کے شعرِ تر انگیزد خاطر کہ حزیں باشد
یک نکتہ ازیں دفتر گفتیم و ہمیں باشد

یہ اور اسی قسم کی بےشمار فالیں مشہور ہیں جو خواجہ حافظ کی کرامت سے منسوب کی جاتی ہیں ۔ ہم اُن لوگوں کے اعتقاد پر جو خواجہ حافظ کی اس کرامت کے قائل ہیں ، اعتراض کرنا نہیں چاہتے اور نہ ہی اس موقع پر ہمارا یہ مقصد ہے کہ نفس کرامت کے امکان یا امتناع پر بحث کریں ، بلکہ صرف یہ دکھانا منظور ہے کہ جن اسباب سے خواجہ حافظ کے کلام کو یہ درجہ حاصل ہوا ہے ، اُن میں کوئی غیرمعمولی کرشمہ نہیں ہے ۔

خواجہ حافظ کی غزلیات میں اعلیٰ درجے کے حسن بیان کے علاوہ سب سے بڑی چیز جس نے اُن کو مقبولِ خاص و عام بنا دیا ہے ، وہ عشق حقیقی کو عشق مجازی کے پیرایے میں ادا کرنا ہے ۔ یہی وجہ تھی کہ جب وہ کتاب کی صورت میں مرتب ہو کر ملک میں شایع ہوئیں تو باوجودے کہ اشاعت کے ذریعے اُس وقت نہایت محدود تھے ، تاہم تمام ملک میں گھر گھر اُس کے نسخے پھیل گئے اور ہر طبقے نے اس کو اپنا حرز جان بنا لیا ۔ جس طرح آزاد طبع نوجوان قہوہ خانوں اور تفریح کے جلسوں میں اس سے صحبتیں گرم کرتے تھے ، اسی طرح مشائخ اور اہل اللہ حال و قال کی مجلسوں میں اس پر وجد کرتے تھے ۔ جس طرح وہ درویشوں کا مونس و ہم دم تھا اسی طرح بادشاہوں اور امیروں کا تعویذ بازو تھا ۔

ظاہر ہے کہ انسان کی طبیعت میں آیندہ کا حال قبل از وقت دریافت کرنے کی طرف قدرتی میلان ہے اور اس قدرتی میلان کا نتیجہ ہے کہ اُس نے نجوم و رمل و جفر اور فال اور شگون اور بعض دیگر وسائل مستقبل کا حال دریافت کرنے کے لیے بہم پہنچائے ہیں ۔

اسی کے ساتھ اُس کی فطرت میں دوسری خاصیت یہ ہے کہ جس چیز یا جس شخص کے ساتھ اس کو عقیدت ہوتی ہے اُس سے خود بخود دل میں غیر معمولی کرشمے ظاہر ہونے کی توقع ہو جاتی ہے ، یہاں تک کہ اُس سے جو کچھ عادت مستمرہ کے موافق ظہور میں آتا ہے ، اُس کو بھی وہ اکثر فوق العادت کرشموں پر محمول کر لیتا ہے ۔

خواجہ حافظ کا دیوان چوں کہ متصوفانہ کلام پر مشتمل ہے اس لیے اس میں مذہبی عقیدت کا ایک زبردست پہلو موجود تھا ، اور ہر طبقے کے لوگ اُس کو ایک عارف کا کلام سمجھ کر متبرک خیال کرتے تھے ، اس لیے ضرور کسی نہ کسی وقت دنیا داروں کے

گروہ میں جو ہر وقت اپنی گوناگوں خواہشوں کے پورا ہونے کی دھن میں رہتے ہیں ، خواجہ حافظ کے کلام سے تفاول کرنے کا خیال پیدا ہوا ہوگا اور حسن اتفاق سے ایک دو بار جو کچھ فال میں نکلا اُس کے مطابق ظہور میں آیا ہوگا۔ لیکن یہاں تک کوئی بات ایسی نہ تھی جس کو ایک غیرمعمولی کرشمہ ماننے کی ضرورت ہو ، مگر چوں کہ انسان بالطبع عجائب پسند ہے ، اس لیے وہ ہمیشہ ایسے اتفاقات کو غیرمعمولی کرشموں کی طرف کھینچ لے جاتا ہے۔

کچھ شک نہیں کہ دیوان مذکور میں فال دیکھنے کی بنیاد اسی طرح پڑی ہے مگر اس کے بعد خود اُس کی شاعری اور طرز بیان نے اس خیال کو بہت کچھ مدد پہنچائی۔ وہ عام شعرا کی طرح ان مستثنی حالتوں سے کبھی تعرض نہیں کرتا جو دنیا میں نادرالوقوع ہیں بلکہ ہمیشہ نیچرل جذبات اور معمولی خواہشوں اور امیدوں اور عام معاملات اور واقعات کی تصویر کھینچتا ہے ، اور اُس کے الفاظ ایسے حاوی اور لچک‌دار ہوتے ہیں کہ ہر ایک شعر میں متعدد پہلو نکل سکتے ہیں۔

۲

مدعیانِ تہذیب کی بداعمالیاں

(مجموعۂ نظم حالی ، مطبوعہ ۱۸۹۰ع ، صفحہ ۹۸)

جب انگریزوں کا تسلط تمام ہندوستان پر ہو گیا اور ہندوستان کی حکومت ایسٹ انڈیا کمپنی کے ہاتھوں سے نکل کر ملکۂ وکٹوریہ کے ہاتھ میں چلی گئی ، اور ۱۸۵۷ع کا قیامت خیز ہنگامہ بھی ختم ہو گیا اور انگریز ہندوستان کے مطلق العنان بادشاہ بن گئے ، تو ۱۸۷۷ع میں ملکۂ وکٹوریہ بادشاہ انگلستان نے ''ایمپرس آف انڈیا'' (شہنشاہ ہندوستان ، یعنی قیصرۂ ہند) کا خطاب اختیار کیا۔ اس موقع پر انگلستان اور ہندوستان میں نہایت زبردست خوشی کا اظہار کیا گیا اور لندن اور دہلی میں نہایت شان دار دربار منعقد کیے گئے۔ اُس وقت ہندوستان کا وائسرائے لارڈ لٹن (۱۸۷۶ع تا ۱۸۸۰ع) تھا۔ اُس نے یکم جنوری ۱۸۷۷ع کو دہلی میں دربار کیا جو تاریخ میں ''دربار قیصری'' کہلاتا ہے اور اس میں اس امر کا اعلان کیا کہ آج سے ملکۂ انگلستان نے قیصرۂ ہند کا لقب اختیار کر لیا ہے۔

اس موقع پر لندن کے ایک شخص مسٹر ایسٹوک نے ایک طول طویل نظم انگریزی میں لکھی جس میں

حسبِ عادت نہایت تعصب سے کام لے کر مسلمان بادشاہوں کے مظالم کے فرضی افسانے بڑی شدومد سے بیان کیے اور ہندوستان میں اُسے شائع کرانے کے لیے اُس کا اردو نظم میں ترجمہ کرانا چاہا ۔ اس مطلب کے لیے اُس نے اس نظم کو کرنل ڈیوس کمشنر دہلی کے پاس بھیج دیا کہ وہ اس کا اردو نظم میں کسی بہت بڑے شاعر سے ترجمہ کروادیں ۔ کمشنر کو سارے ہندوستان میں مولانا حالی سے زیادہ موزوں آدمی اس کام کے لیے دوسرا نہ ملا ۔ پس اُس نے انگریزی نظم اس درخواست کے ساتھ مولانا کے پاس بھیج دی کہ کسی سے اس نظم کا اردو نثر میں ترجمہ کرا کے اُسے نظم کے سانچے میں ڈھال دیں ۔

اُن متعصبانہ خیالات کے باعث ، جو اُس نظم میں ظاہر کیے گئے تھے ، مولانا کا دل بالکل نہیں چاہتا تھا کہ وہ اس کا اردو نظم میں ترجمہ کریں ، مگر سرکاری ملازمت کی مجبوریاں ایسی تھیں کہ مولانا کو یہ تلخ گھونٹ پینا ہی پڑا ۔ مگر آفرین ہے اُن کی دلیری پر اور تعجب آتا ہے اُن کی شجاعت پر کہ ایسے پر آشوب زمانے میں جب کہ انگریز کا پورا پورا خوف اور رعب تمام ہندوستان پر چھایا ہوا تھا اور کسی بڑے سے بڑے بہادر کی بھی مجال نہ تھی کہ وہ انگریزوں کے خلاف ایک لفظ لکھ سکے ، اُنھوں نے اس نظم پر جو حاشیہ نثر میں لکھا ، وہ تاریخِ حریت میں ہمیشہ یادگار رہے گا ۔ آج وہی حاشیہ میں ناظرین کرام کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں ۔ واقعہ یہ ہے کہ حالی سے زیادہ حریت پسند شاید

> ہی کوئی شخص ہو جس نے جان پر کھیل کر انتہائی دلیری اور بے خوف کے ساتھ علی الاعلان اپنے آزادانہ خیالات کا اظہار کیا اور نتائج کی قطعاً پروا نہ کی ۔
>
> (محمد اسماعیل)

انگریزی مورخوں اور شاعروں کو جب یہ منظور ہوتا ہے کہ لوگوں کو اپنی رحم دلی اور انسانی ہمدردی پر فریفتہ اور مسلمانوں پر غضب ناک اور برافروختہ کریں تو وہ محمود غزنوی اور تیمور وغیرہ کی سختی اور تشدد کو خوب چھڑک چھڑک کر جلوہ گر کرتے ہیں ۔

مسٹر ایسٹوک ایک انگریز مصنف نے دربار قیصری منعقدہ ۱۸۷۷ع کے موقع پر ایک انگریزی نظم لکھی تھی جس کے تین حصے تھے :

پہلے حصے میں ہندوستان اور مسلمان بادشاہوں اور انگریزی سلطنت کی ابتدا اور ترقی کا ذکر ہے ۔

دوسرے اور تیسرے حصے میں اُن ہندوستانی رؤسا اور والیان ریاست کا تذکرہ ہے جو دربار قیصری میں شریک ہونے تھے ۔

پہلے حصے میں انگریز مصنف نے بعض مسلمان بادشاہوں پر نکتہ چینی کی ہے جس کے ایک بند کا ترجمہ مثالاً پیش کیا جاتا ہے جو سلطان محمود غزنوی کے متعلق ہے :

پھر ہوا اسلام کے اقبال کا نعرہ بلند
جانبِ ہندوستاں محمود نے بانکا سمند
وہ مسلمانوں کے حق میں ابر رحمت تھا ، مگر
ہندوؤں کے دل رہے اُس کے ستم سے دردمند
وہ پہنچتا تھا جہاں ہوتی تھی واں آفت بپا
اور چلتا تھا جلو میں اُس کے آسیب و گزند

غش پہ غش آتے تھے ہر ذی روح کو پیہم وہاں
سانس لیتا تھا جہاں وہ اژدہائے زور مند
روندتا تھا جس کو ، وہ کھیتی نہ ہوتی تھی ہری
صلح سے بجھتا نہ تھا ، ہوتا تھا جو شعلہ بلند
خوف تھا دل میں خدا کا اور نہ کچھ بندوں پہ رحم
قتل اور تاراج تھا اک بازیِ سلطاں پسند
جب وہ آیا تھا تو سر تا پا گلستاں تھا یہ ملک
جب گیا یاں سے تو مثل دشت ویراں تھا یہ ملک

اسی طرح ایک اور انگریز نے محمود کے متعلق کچھ اشعار نظم کیے ہیں جن کا ترجمہ یہ ہے :

اے ملکِ زرنگار[1] قدم ہے وہ کون سا
حملے سے جس کے ہے ترے ارکاں میں زلزلا
وہ تیرے قصر اور ستوں دار سائباں
معبد وہ جو پہاڑوں کے غاروں میں ہیں نہاں
ٹھاکر اور اُن کے مندر ، راجا اور اُن کے تخت
حملے سے اُس کے آکے پڑا سب پہ وقت سخت
پُتلا غضب کا کون سا وہ ہول ناک ہے
اے ملک زرنگار ! وہ غزنیں کی خاک ہے
آتا ہے لوٹتا ہوا اس بزم گاہ میں
پھرتے ہیں بکھرے تاج بہت اُس کی راہ میں
کتے جو اُس کے ساتھ شکاری ہیں بے شمار
اُن کے گلوں میں ہیں وہ جواہر نگار ہار
بے رحم فوج لائی ہے جو لوٹ مار کر
مقتول رانیوں کے گلے سے اُتار کر

---

[1] یعنی ہندوستان ۱۲ -

کرتا ہے قتل لڑکیوں کو وہ گھروں کے بیچ
اور بے گنہ پجاریوں کو مندروں کے بیچ

اگرچہ ان دونوں شاعروں نے محمود کے تشدد کو بہت مبالغے کے ساتھ بیان کیا ہے مگر حق یہ ہے کہ مسلمانوں کے لیے ان کے بعض بادشاہوں کی ظالمانہ کارروائیاں ، گو وہ کیسی ہی تاریکی اور وحشت کے زمانے میں کی گئی ہوں ، ہمیشہ باعث شرم و ندامت رہیں گی ۔

لیکن ہم پوچھتے ہیں کہ آیا دنیا میں کوئی ایسی قوم ہے جو اس دھبے سے پاک ہو ؟ یورپ کی تاریخ سے ظاہر ہے کہ وہاں کی شایستہ قومیں ، جو آج اپنے سوا تمام دنیا کی قوموں کو وحشی یا نیم وحشی کا خطاب دیتی ہیں ، محمود کے زمانے میں بلکہ اُس کے بعد کئی صدیوں تک ایشیا سے بہ مراتب زیادہ وحشت و خوں‌ریزی و بے رحمی میں مبتلا تھیں ۔

اگر انصاف سے دیکھا جائے تو بنی‌نوع انسان کی دو خصلتیں نہ کبھی بدلی ہیں نہ آیندہ بدلنے کی امید ہے :

(۱) طمع اور خود غرضی ۔
(۲) زبردستوں کا زیردستوں کو دلنا اور پیسنا ۔

جس طرح مگر مچھ ، مچھلیوں اور مینڈکوں کو ، یا شیر اور چیتا ہرن اور نیل گائے کو نوش جان کرتا ہے ، اسی طرح جو انسان قوی اور زبردست ہیں ، وہ ضعیف اور کمزور انسانوں کے شکار کرنے سے کبھی درگزر نہیں کرتے ۔

سولھویں صدی کو (جس میں اہل یورپ ، امریکہ میں جا کر آباد ہوئے) کچھ بہت زمانہ نہیں گزرا ۔ اس صدی میں یورپ کی بعض قوموں کے ہاتھ سے امریکہ کے اصلی باشندوں پر کون سا ظلم اور کون سی بے رحمی ہے جو روا نہیں رکھی گئی ۔ میکسیکو اور

پیرو جو کہ امریکہ کے دو شایستہ ملک تھے ، وہاں کے مفتوحین پر جو وحشیانہ ظلم ہسپانیہ والوں نے کیے اُن کی نظیر دنیا کی تاریخ میں مشکل سے ملے گی ۔ کورٹیز جو کہ ہسپانیہ کا رہنے والا اور میکسیکو کا فاتح تھا ، اُس نے اور اُس کے بعد نئے آنے والے جرنیلوں نے یہ ٹھان لی تھی کہ میکسیکو کو قاطبۃً ویران کر دیجیے اور وہاں ہسپانیہ کی ایک کولونی[1] آباد کیجیے ۔ چناں چہ جہاں تک اُن سے ہو سکا ، وہاں کے قدیم باشندوں کے نیست و نابود کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا ۔ کورٹیز نے میکسیکو کے شہنشاہ مونٹی زوما کو گرفتار کرکے اُلٹا لٹکا دیا اور اُس کی رعایا کو اُس کی آنکھ کے سامنے جلایا اور قتل کرایا ۔ بڑے بڑے الاؤ لگے ہوئے تھے جن میں ہزار ہا بنی آدم عام طور پر بے تکلف جلائے جاتے تھے ۔ معصوم بچوں کے روبرو اُن کی مائیں اور باپ بہ ہزار عقوبت و سختی آگ میں جھونک دیے جاتے تھے ۔ دیہات اور جنگلوں میں ہزاروں آدمی شکاری کتوں سے پھڑوا دیے جاتے تھے ۔ یہ ہسپانیہ کے وہی مقدس اور بے عیب عیسائی تھے جنھوں نے کافروں (یعنی مسلمانوں) کو غرناطہ سے ایک ناپاک اور گنہگار قوم ہونے کا الزام لگا کر نکالا تھا اور جن کا قول تھا کہ ”ظالم اور بد دین مسلمان اس لایق نہیں ہیں کہ فرشتہ صفت عیسائیوں کے ہمسائے اور ہم وطن ہو کر رہیں ۔“ اندازہ کیا گیا ہے کہ تقریباً ایک ملین (دس لاکھ) بنی آدم ان مقدس عیسائیوں کے ہاتھ سے طرح طرح کی عقوبت اور سختی کے ساتھ مارے اور جلائے گئے ۔

یہی حال کچھ دنوں بعد پیرو کا ہوا ؛ یہ ملک جنوبی امریکہ میں بحرالکاہل کے کنارے پر واقع ہے ۔ فرینسسلو پزیرو کہ غالباً

---

[1] ۔ کولونی : آبادی ، بستی ، شہر ۔

اٹلی کا رہنے والا ایک مجہول‌النسب آدمی تھا ، اس کو جنوبی امریکہ میں فتوحات کرنے اور وہاں سے سونا چاندی رولنے کا مدت سے خیال تھا ۔ اُس نے پناما یا اُس کے قریب کسی مقام میں ایک جماعت کو اس بات پر آمادہ کیا کہ وہ ایک بیڑا جہازوں کا اور کچھ سپاہ اُس کے ماتحت ملک پیرو کو ، جس کے تموّل کی بہت شہرت تھی ، روانہ کریں ۔ چناں چہ اس سامان کے ساتھ وہ وہاں پہنچا اور ایک دو پھیرے کے بعد اُس ملک پر قابض ہوگیا ۔ پھر تو کوئی ظلم اور تعدی ایسی نہ تھی جو پیرو کے اصلی باشندوں پر جائز نہ رکھی گئی ہو ۔ اُن سے سونا اور چاندی چھین چھین کر اپنے ملک کو بھیجتا تھا ۔ ہزاروں بندگانِ خدا اُس کے ظلم و ستم کے باعث ملک چھوڑ چھوڑ کر پہاڑوں پر چڑھ گئے تھے جہاں وہ آخر کار فاقے کر کر کے مر جاتے تھے ، اور ہزاروں قتل کرائے جاتے تھے ۔ تمام مورخوں کا اتفاق ہے کہ ایسی بے‌رحمی کبھی دنیا میں نہیں ہوئی ۔

انگریزوں کا بیان ہے کہ آسٹریلیا کے قدیم باشندوں پر بہت سختی نہیں کی گئی ۔ اگر یہ بیان صحیح ہے تو وہاں سختی کی کچھ ضرورت بھی نہ تھی ۔ وہ بے چارے اس درجہ ناہموار ، بے ڈول اور ناشایستہ تھے کہ انگریز فاتحوں کی صورتیں ، ٹیپ ٹاپ اور چمک دمک دیکھ کر شرم کے مارے زمین میں گڑے جاتے تھے اور کسی طرح ممکن نہ تھا کہ اُن کے پڑوس میں رہ سکیں ۔ جس قدر انگریز مہاجروں کی تعداد آسٹریلیا میں بڑھتی گئی ، وہ لوگ ملک کے اندرونی حصے میں غائب ہوتے گئے اور رفتہ رفتہ وہیں معدوم ہو گئے ۔ اب شاذ و نادر کہیں کہیں اندرونی پہاڑوں کے سلسلے میں پائے جاتے ہیں ۔

تسمانیہ[1] کے قدیم باشندے جو ایک خوش بشرہ مگر اَن سویلائزڈ

---

[1] ۔ تسمانیہ : براعظم آسٹریلیا کے ایک صوبے کا نام ہے ۔

قوم (ناتربیت یافتہ) تھی، یورپ والوں کی ہمسایگی کے باعث بالکل فنا ہوگئی۔ یہاں تک کہ اب ایک متنفس بھی اُن کی نسل کا باقی نہیں۔

پس آسٹریلیا کے قدیم باشندے، جو انڈیمن والوں سے بھی زیادہ بدقوارہ اور ناشائستہ تھے، انگریز جیسی اعلیٰ درجے کی شائستہ قوم کے پڑوس میں کیوں کر ٹھہر سکتے تھے۔

تو بجلوہ چوں در آئی، اجل از سرِ ترحم
ہمہ جا کند منادی پیٔ احتراز کردن

اگر فی‌الواقعہ انگریزوں نے آسٹریلیا والوں پر سختی نہیں کی تو یہ اُن کی عین دانائی تھی کہ انھوں نے مفت کی بدنامی نہیں لی اور تمام براعظم اُن کے لیے خود بخود خس و خاشاک سے پاک ہو گیا۔

بات یہ ہے کہ دنیا کے ایک بہت بڑے حصے نے علم و ہنر میں اس قدر ترقی کی ہے اور وہ دوسرے حصے کے ابنائے جنس سے اس قدر آگے بڑھ گیا ہے کہ اگلے زمانے کے فاتح اور کشورکشا جن ناجائز ذریعوں سے مفتوحین کی دولت و ثروت اور سلطنت کے مالک ہوتے تھے، اُن ذریعوں کے کام میں لانے کی اب مطلق ضرورت نہیں رہی۔ جس قدر مال و دولت پہلے قتل و غارت اور لوٹ کھسوٹ سے حاصل کیا جاتا تھا اُس سے اضعاف مضاعفہ اب صنعت و تجارت کے ذریعے سے خود بخود کھنچا چلا جاتا ہے۔ یہاں تک کہ جب دو ایسی گورنمنٹوں کے درمیان، جن میں سے ایک شائستہ اور دوسری ناشائستہ ہو، تجارتی عہدنامہ تحریر ہو جاتا ہے تو یقیناً یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ شائستہ گورنمنٹ بغیر اس کے کہ ہلدی لگے نہ پھٹکڑی، دوسری گورنمنٹ کے تمام ملک و دولت و منافع و محاصل کی بالکل مالک ہوگئی۔ کسی شاعر نے خوب کہا ہے:

نہیں خالی ضرر سے وحشیوں کی لوٹ بھی لیکن
حذر اُس لوٹ سے جو لوٹ ہے علمی و اخلاق
نہ گل چھوڑے نہ برگ و بار چھوڑے تو نے گلشن میں
یہ گل چینی ہے یا لٹس ہے گلچیں! یا ہے قزّاق

شاید ان شعروں میں کچھ مبالغہ ہو، لیکن اس میں شک نہیں کہ جو نتیجہ اگلے زمانے کے غارت‌گروں کی لوٹ کھسوٹ سے مرتب ہوتا تھا، اسی نتیجے کے قریب قریب یہ شائستہ لوٹ بھی پہنچا دیتی ہے۔

کروڑوں اہلِ صنعت و حرفت جن کی دست کاری، مکینکس (کلوں، مشینوں) کا کسی طرح مقابلہ نہیں کر سکتی، نانِ شبینہ کو محتاج ہو جاتے ہیں۔ فلاحت پیشہ لوگوں پر یہ بپتا پڑتی ہے کہ زمین کی پیداوار جس قدر کثرت کے ساتھ غیر ملکوں کو جاتی ہے اُسی قدر ملک میں زیادہ کاشت کا تردد کیا جاتا ہے اور اس سبب سے روز بروز زیادہ لاگت لگانی پڑتی ہے اور محنت کا کافی معاوضہ نہیں ملتا۔

پولیٹیکل اکانومی (علمِ سیاستِ مدن) کا یہ مسلم مسئلہ ہے کہ قدرتی پیداوار کی جس قدر زیادہ مانگ ہوتی جاتی ہے، اسی قدر اس کے بہم پہنچانے میں زیادہ لاگت اور زیادہ محنت صرف ہوتی ہے، اور مصنوعی چیزوں کی جس قدر زیادہ طلب ہوتی ہے، اُسی قدر اُن پر کم لاگت آتی ہے اور کم محنت صرف ہوتی ہے۔

ملکی تاجروں کے لیے، جو کہ شائستہ ملکوں کی مصنوعی چیزوں کی تجارت کرتے ہیں، اول تو اوپر والے منافع کی کچھ گنجایش ہی نہیں چھوڑتے اور اگر قدرِ قلیل (جیسے آٹے میں نمک) کچھ فائدہ ہوتا بھی ہے تو اپنے ملک کی نہایت ضروری اور ناگزیر اشیا کا نرخ گراں ہونے کے سبب اُن کی کمائی میں سے بہت کم پس‌انداز ہوتا ہے، اور جس قدر ہوتا ہے وہ غیر ملکوں کی آرایشی اور

غیر ضروری چیزوں کے خریدنے میں ، جو باوجود کمال نفاست اور لطافت کے نہایت ارزاں دستیاب ہوتی ہیں ، صرف ہو جاتا ہے ۔ پس ان کو بھی فارغ البالی اور آسودگی کبھی نصیب نہیں ہوتی ۔ اور اگر سو دو سو میں سے دو چار ایسے نکل بھی آتے ہیں جو اپنے ملک میں مرفہ الحال سمجھے جاتے ہیں ، ان کا معاملہ اور لین دین ان کروڑ پتیوں سے ہوتا ہے ، جن کے مقابلے میں وہ اپنے تئیں محض مفلس اور قلاش تصور کرتے ہیں اور جن کی مانگ کے خوف سے ہمیشہ دوالہ نکل جانے کا اندیشہ رہتا ہے ۔

خلاصہ یہ ہے کہ طمع ، خود غرضی اور زبردستوں کا زیر دستوں کو دلنا اور پیسنا ، جو تاریکی اور وحشت کے زمانے میں تھا ، اسی کے قریب قریب اب بھی ہے ۔ فرق صرف اتنا ہے کہ دولت کھسیٹنے کے لیے پہلے جبر و تعدی کی ضرورت تھی ، اب اس کی کچھ ضرورت نہیں رہی ۔ ان سویلائزڈ (وحشی) دنیا کی دولت سویلائزڈ (مہذب) دنیا کی طرف خود بخود کھچی چلی جاتی ہے ۔

ایک اژدہا شیر کو بہت بُرا بھلا کہہ رہا تھا کہ "تو کیسا بے رحم ہے کہ ہمیشہ جانداروں کا خون پینے کی فکر میں رہتا ہے اور شکار کی دھن میں دور دور کے دھاوے کرتا ہے ۔ تمام جنگلوں میں تیری دھاک ہے ۔ آج اس ہرن کو پھاڑ ڈالا ، کل اس پاڑھے کے ٹکڑے اڑائے ۔ ایسی خون خواری پر کمر باندھنی اچھی نہیں ہے ۔" شیر نے کہا "قبلہ ! اگر میرے سانس میں بھی ایسی کشش ہوتی کہ دور دور سے جانور خود گھسٹے ہوئے منہ میں چلے آتے اور میری حرص و آز کی آگ کو بجھا دیتے تو میں بھی ہرگز کسی بے گناہ کے خون سے اپنے ہاتھ رنگین نہ کرتا ۔"

مع ذالک اگر کہیں آزادیِ تجارت میں کوئی مزاحمت پیش آتی ہے اور بغیر جبر و تعدی کے کام نہیں چلتا تو اعلیٰ سے اعلیٰ درجے

کی شائستہ قوم بھی سب کچھ کرنے کو موجود ہو جاتی ہے ، اور کہا جاتا ہے کہ آزادیِ تجارت کی مزاحمت رفع کرنی عین انصاف ہے ؛ حالانکہ آج تک پولیٹیکل اکانومی نے اس بات کا تصفیہ نہیں کیا کہ فری ٹریڈ (Free Trade) کا قاعدہ مطلقاً قرین انصاف ہے یا خاص خاص صورتوں میں خلاف انصاف بھی ہو سکتا ہے ۔ انگلینڈ کا فائدہ فری ٹریڈ میں ہے ، اس لیے وہ اسی کو عین انصاف سمجھتا ہے ۔ فرانس اور یونائیٹڈ اسٹیٹس (اضلاع متحدہ امریکہ) اس کو اپنے حق میں بالفعل مضر سمجھتے ہیں اس لیے وہ اس کو جائز نہیں رکھتے ۔

لیکن انصاف شرط ہے ؛ جن حکمتوں اور تدبیروں سے آج کل دنیا کی دولت گھسیٹی جاتی ہے ، ان پر بر خلاف اگلے زمانے کی جابرانہ لوٹ کھسوٹ کے کچھ اعتراض نہیں آ سکتا ۔ مشہور ہے کہ حکیم علوی خان[1] جو محمد شاہ بادشاہ کا معالج اور نہایت حاذق طبیب تھا ، اس کے زمانے میں ایک عطار بھی اس کے نسخے دیکھتے دیکھتے

---

[1] ۱۔ حکیم علوی خان دراصل خطاب ہے ، اصلی نام محمد ہاشم تھا ۔ ۱۰۸۰ھ مطابق ۱۶۶۹ع میں بہ مقام شیراز پیدا ہوا ۔ بڑا ہوا تو ۱۱۱۱ھ میں ہندوستان آ کر حضرت عالم گیر رحمۃ اللہ علیہ کے فرزند شہزادہ محمد اعظم کے ہاں ملازم ہوا ۔ پھر محمد شاہ کے دربار میں منصب شش ہزاری پر فائز ہو کر معتمد الملک کا خطاب پایا ۔ محمد شاہ کے دل میں اس حکیم کی اس قدر عزت تھی کہ ایک مرتبہ اس نے اس کو چاندی میں تلوایا اور وہ سب چاندی اس کو عطا کر دی ۔ جب سلطنت کی ابتری اور بدحالی کے باعث محمد شاہ کے عہد میں افغانستان سے نادر شاہ نے آ کر ہندوستان پر حملہ کیا تو کروڑوں روپے کی لوٹ کے ساتھ حکیم علوی خاں کو بھی اپنے ساتھ لے گیا ۔ مگر اس سے اس حکیم نے جلدی پیچھا چھڑا لیا اور حج کرنے کے بعد دوبارہ ۱۷۴۳ع میں واپس دہلی آ گیا اور اس کے چار برس بعد ۱۷۴۷ع میں یہیں انتقال کر گیا ۔ نامی طبیب اور نہایت حاذق معالج تھا ۔ جامع الجوامع اس کی مشہور طبی کتاب ہے ۔ (محمد اسماعیل)

علاج کرنے لگا تھا ۔ **لوگوں** نے اُس کا ذکر علوی خاں کے سامنے بھی کیا اور کہا کہ ''جس قدر مریض آپ کے علاج سے اچھے ہوتے یا مرتے ہیں ، اُسی کے قریب اُس کے علاج سے اچھے بھی ہوتے ہیں اور مرتے بھی ہیں''۔

اس پر علوی خاں نے جواب دیا '' بلے ! لا کن من بقاعدہ می کشم و آن قرمساق بے قاعدہ مے کشد ۔''

۳

قرون اولیٰ کی حق گوئی و حق پسندی

(رسالہ 'معارف' پانی پت ، جلد ۴ ، نمبر ۹ ، بابت ستمبر ۱۹۰۱ع
صفحہ ۲۶۵ تا ۲۷۲)

مولانا کا یہ تاریخی مضمون اُس زمانے سے تعلق رکھتا ہے ، جب صدرِ اول کے دو گروہوں میں افسوس ناک تصادم ہوا : ایک طرف حضرت علیؓ کی فوجیں آمادۂ حرب و ضرب تھیں ، دوسری طرف حضرت معاویہؓ آمادۂ پیکار تھے - جس کے نتیجے میں صفین کے مقام پر وہ منحوس لڑائی ہوئی جس کی تلخ یاد آج تک باقی ہے - اس جنگ میں حضرت علیؓ کی طرف سے جن پُرجوش ، مخلص اور بہادر عورتوں نے حصہ لیا ، یہ مضمون اُن ہی کے متعلق مولانا نے ایک عربی کتاب ''عقدالفرید'' سے ترجمہ کرکے اپنے دوست مولوی سید وحیدالدین سلیم کے لیے لکھا تھا جو اُس وقت پانی پت سے ایک اعلیٰ پاے کا ماہنامہ ''معارف'' کے نام سے نکالا کرتے تھے - ان عورتوں نے ، جن کا تذکرہ اس مضمون میں کیا گیا ہے ، نہ صرف یہ کہ بڑی بہادری کے ساتھ لڑائی میں حضرت علیؓ کا ساتھ دیا بلکہ اُن کی وفاداری اور محبت اور عقیدت ان عورتوں کے دلوں میں مرتے دم تک قائم رہی اور لڑائی کے بعد حضرت معاویہؓ کے

> دربار میں بھی ، جب کہ حضرت علیؓ کی وفات ہو چکی تھی اور حضرت معاویہؓ بلا شرکت غیرے تمام ممالک اسلامیہ کے مالک بن چکے تھے ، وہ محترم خواتین دلیری کے ساتھ حق گوئی اور حضرت علیؓ کی طرف داری سے باز نہ رہیں ۔ دوسری طرف آفرین ہے حضرت معاویہؓ کے تحمل پر کہ انھوں نے بھرے دربار میں حضرت علیؓ کے حق میں اور اپنے خلاف ان عورتوں سے نہایت سخت الفاظ سنے اور کسی غصے اور ناراضگی کا اظہار نہیں کیا بلکہ ان عورتوں کو انعام و اکرام سے مالامال کرکے واپس کیا ۔ (محمد اسماعیل)

اگرچہ وحشیانہ آزادی و بےباکی عرب عربا کی طبیعتوں میں قدیم سے متوارث چلی آتی تھی مگر اسلام کی تعلیم سے (جب تک کہ خود مختار سلطنتوں کے سیلاب نے اس کو گدلا اور مکدر نہیں کیا) ان کی یہ جبلی خصلات تہذیب و شایستگی کے زیور سے آراستہ ہو گئی تھی اور آزادی کا جوہر حق گوئی و حق پسندی کے قالب میں ڈھل گیا تھا ۔ یہی وجہ تھی کہ خلفا کی غلطیوں پر گرفت کی جاتی تھی اور وہ معقول اعتراض سن کر خاموش ہو جاتے تھے ۔

عمر فاروقؓ پر جب کوئی اعتراض کرتا تھا اور کہتا تھا کہ ”اے عمر ! خدا سے ڈر“، تو وہ اس کا شکریہ ادا کرتے تھے اور کہتے تھے ”خدا اس کا بھلا کرے جس نے ہمارے عیب سے ہم کو آگاہ کیا ۔“ ایک دفعہ انھوں نے ایک معمر آدمی کو ، جب کہ وہ اپنے گھر کے اندر شراب و نغمہ میں مشغول تھا ، جا پکڑا اور اس کو سخت نفرین کی ۔ اس نے کہا ”اے امیرالمومنین ! تیری حرکت اس سے بھی زیادہ قابل نفرین ہے ۔ تو نے تجسّس کیا ، حالاں کہ خدا تجسس کرنے سے منع کرتا ہے ۔ پھر تو گھر میں بغیر اذن کے چلا آیا ، حالاں کہ خدا نے اس کی ممانعت کی ہے ۔“ عمر فاروقؓ نے کہا ”بے شک تو سچ کہتا ہے“ اور وہاں سے نہایت ندامت اور افسوس کے ساتھ یہ کہتے ہوئے نکلے ”ثکلت عمر امہ ان لم یغفر لہ ربہ ۔“ یعنی عمر کی ماں اس کو روبو! اگر خدا اس کا قصور معاف نہ کرے ۔

مسلمان عورتوں کی بہادری و حق گوئی کی چند مثالیں

قرون اولیٰ کی تاریخ میں اس قسم کی مثالیں شمار و احصا سے خارج ہیں ، اور جس طرح مردوں کی آزادی و حق گوئی کی مثالیں جابجا ہیں ، اسی طرح عورتوں کی بھی ایسی مثالوں کی کچھ کمی نہیں ہے ۔ یہاں ہم کتاب ’عقدالفرید‘ سے چند حکایتیں ان عورتوں کی نقل کرتے ہیں جو جنگ صفین میں بنی ہاشم کی طرف دار تھیں اور عین جنگ کے موقع پر اہل شام کے برخلاف نہایت جوش و خروش کے ساتھ خطبے پڑھتی تھیں ، اور جنگ کے خاتمے کے بعد جب حضرت امیرمعاویہؓ سے ان کی گفتگو ہوئی تو انھوں نے نہایت آزادی کے ساتھ اپنے دلی خیالات ظاہر کیے اور جس بات کو وہ اپنے نزدیک حق جانتی تھیں اس کے ظاہر کرنے سے امیر شام کا رعب و داب ان کو مانع نہیں آیا ۔

۱۔ ازاں جملہ شعبی سے روایت ہے کہ بنی ہلال کی ایک عورت بکارہ نامی نے حضرت امیر معاویہؓ کے روبرو (جب کہ وہ مدینے میں تھے) حاضر ہونے کی اجازت چاہی ۔ چناں چہ اس کو اجازت دی گئی ۔ بکارہ اس وقت معمر ہو گئی تھی ، اس کی بینائی میں فرق آ گیا تھا ، قویٰ ضعیف ہو گئے تھے اور بدن میں رعشہ تھا ۔ دو خادم اس کو تھام کر امیر کے سامنے لائے ۔ بکارہ نے سلام کیا اور بیٹھ گئی ۔ امیر نے سلام کا جواب دیا اور مزاج پوچھا اور کہا ”افسوس ہے کہ زمانے نے تمھارا حال دگرگوں کر دیا ۔“ بکارہ نے کہا

”بےشک اس کی گردشیں ایسی ہی ہیں ۔“

مروان نے بطور سعایت کے کہا ”اے امیرالمومنین ! تم نے اس کا کلام بھی سنا ہے ؟ یہ کہتی ہے :

أنرى ابن هند لخلافة مالكاً
هيهات ذاك و ان اراد بعيد
منّتك نفسك فى الخلاء ضلالةً
اغواك عمرو للشقا و سعيد

یعنی کیا ہم ابن ہند (یعنی معاویہؓ) کو خلافت کا مالک سمجھیں ؟ یہ دور از قیاس ہے ، اور اگر وہ ایسا چاہے تو اُس کے مرتبے سے بالاتر ہے ۔ (اے معاویہ) تیرے نفس نے گمراہی سے یہ آرزو تیرے دل میں ڈالی ہے اورعمرو بن العاص اور سعید بن العاص نے تجھ کو بدبختی کے لیے ورغلایا ہے ۔

جب مروان یہ اشعار پڑھ چکا تو سعید بن العاصؓ نے کہا کہ اس نے یہ اشعار بھی کہے ہیں :

قد كنت اطمع ان اموت ولا أرى
فوق المنابر من امية خاطبا
فالله اخّر مدّتى فتطاولت
حتى رأيت من الزمان عجائبا
فى كل يوم للزمان خطيبهم
بين الجميع لآل احمد عائبا

یعنی ”میری آرزو تھی کہ میں مر جاؤں اور بنی امیہ میں سے کسی کو منبر پر خطبہ پڑھتا ہوا نہ دیکھوں ، مگر خدا نے میری رسی دراز کر دی یہاں تک کہ زمانے کے عجیب عجیب کرشمے میری نظر سے گزرے ، اور میں برابر ان خطبوں سے علی الاعلان آل احمد کی برائیاں سنتی رہی ۔“

مروان وغیرہ جب یہ چھیڑ کرنے کے بعد خاموش ہو رہے تو بکارہ بولی ”اے معاویہ ! بےشک یہ میرا کلام ہے جو انھوں نے اس وقت پڑھا ۔ اور جو کلام ابھی تجھ پر ظاہر نہیں کیا گیا وہ اس سے بہت زیادہ ہے ۔“ امیر کو یہ سن کر ہنسی آ گئی اور کہا ”یہ امر تمھاری حاجت براری کرنے سے مجھ کو مانع نہیں آ سکتا ۔ تم اپنی حاجت بیان کرو ۔“ اُس غیرت مند عورت نے کہا ”بس ! اب اس بےلطفی کے بعد ایسا نہیں ہو سکتا“ اور وہاں سے اٹھ کر چلی گئی ۔

۲۔ شعبی نے بنی امیہ کی ایک جماعت سے روایت کی ہے کہ ایک دن رات کو ، جب کہ امیر معاویہؓ کے پاس عمرو ، سعید ، عتبہ اور ولید موجود تھے ، عدی بن قیس ہمدانی کی بیٹی زرقا کا ذکر چلا جو اپنی قوم کے ساتھ جنگ صفین میں شریک تھی ۔ امیر نے کہا ”تم میں سے کسی کو اُس کا کلام یاد ہے ؟“ اُن میں سے بعض نے کہا ”ہاں اے امیرالمومنین ! ہم کو یاد ہے ۔“ امیر نے کہا ”مجھ کو مشورہ دو کہ اُس کے ساتھ کیا سلوک کیا جائے ؟“ بعضوں نے کہا کہ اس کو قتل کر دیا جائے ۔ امیر نے کہا ”تم نے بہت برا مشورہ دیا ۔ کیا مجھ کو زیبا ہے کہ میں اپنی نسبت لوگوں سے یہ کہلواؤں کہ ایک عورت کو ، جب کہ وہ قابو میں آ گئی ، قتل کروا ڈالا ؟“

اس کے بعد امیر نے کوفے کے عامل کو (جہاں زرقا رہتی تھی) لکھا کہ زرقا کو اس کے چند معتمد محرموں اور قبیلے کے سرداروں کے ہمراہ عمدہ ساز و سامان کے ساتھ اور معقول سفر خرچ دے کر ہمارے پاس روانہ کردو ۔ عامل نے زرقا کو طلب کیا اور امیر کا خط پڑھوا دیا ۔ زرقا نے کہا ”اگر امیر نے میرا وہاں جانا میری مرضی پر منحصر رکھا ہے تو میں جانا نہیں چاہتی اور اگر

حتمی حکم ہے تو بہرحال جانا پڑے گا ، فرماں برداری ضروری ہے ۔‘‘ آخر عامل نے ، جیسا کہ اُس کو حکم تھا ، بہت تزک و احتشام کے ساتھ اس کو روانہ کیا ۔

جب وہ معاویہ کے پاس پہنچی تو امیر نے اُس کو بہت خاطرداری اور اعزاز کے ساتھ لیا اور پوچھا کہ سفر کس طرح طے ہوا ؟ کہا ’’جس طرح لڑکی ماں کی گود میں پرورش پاتی ہے یا بچہ گہوارے میں سوتا ہے ۔‘‘ امیر نے کہا ’’ہم نے اسی طرح عامل کو ہدایت کی تھی ۔‘‘ پھر زرقا سے پوچھا ’’تم کو معلوم ہے کہ تم کیوں بلائی گئی ہو ؟‘‘ اُس نے کہا ’’جو راز مجھ پر ظاہر نہیں کیا گیا اُس کو میں کیوں کر جان سکتی ہوں ؟‘‘

امیر نے کہا ’’اے زرقا ! کیا تو سرخ اونٹ پر سوار جنگِ صفین کے منجھ میں موجود نہ تھی؟ اور کیا تو اپنے خطبوں سے آتشِ حرب کو نہیں بھڑکا رہی تھی اور لوگوں کو مقابلے پر برانگیختہ نہیں کر رہی تھی ؟ آخرکار اس جوش کا کیا سبب تھا ؟‘‘ زرقا نے کہا ’’اے امیرالمومنین ! سر مر چکا اور دم کٹ[1] چکی اور جو کچھ جانا تھا ، جا چکا ۔ زمانہ پلٹیاں کھانے والا ہے اور حوادث و واقعات کا سلسلہ برابر جاری ہے ۔‘‘

امیر نے کہا ’’اے زرقا ! تجھ کو اپنا اُس دن کا خطبہ یاد ہے ؟‘‘ اُس نے کہا ’’لاواللہ ! مجھ کو بالکل یاد نہیں رہا ۔‘‘ امیر نے کہا ’’تجھ کو نہیں تو مجھ کو یاد ہے ۔ تیری اُس تقریر کا کیا کہنا ہے ۔ تو اُس وقت کہہ رہی تھی کہ ’’اے لوگو ! باز آؤ اور پلٹ جاؤ ۔ تم اُس فتنے میں پڑ گئے ہو جس نے تم پر ظلمت کے پردے

ڈال دیے ہیں اور تم کو راہ راست سے برگشتہ کر دیا ہے ۔ یہ کیسا اندھا اور بہرا اور گونگا فتنہ ہے کہ نہ ہانکنے والے کی آواز سنتا ہے ، نہ کھینچنے والے کی مرضی پر چلتا ہے ۔ دیکھو ! چراغ آفتاب کے سامنے روشن نہیں ہوتا اور ستارے چاند کے سامنے ماند رہتے ہیں اور لوہے کو لوہا ہی کاٹ سکتا ہے ۔ دیکھو ! جو ہم سے راہ پوچھے گا ہم اُس کو راہ بتائیں گے ، اور جو ہم سے سوال کرے گا ہم اس کو جواب دیں گے ۔ لوگو ! حق اپنی کھوئی ہوئی چیز کو ڈھونڈ رہا تھا ، سو وہ اُس کو مل گئی ۔ پس اے مہاجرین ! غم و غصہ پر صبر کرو ۔ تفرقے کا رخنہ بند ہوگیا ہے اور کلمۂ حق پر سب متفق ہو گئے ہیں اور سچائی نے ظالموں کا سر توڑ دیا ہے ۔ یاد رکھو ! عورتوں کی آرایش مہندی سے ہے اور مردوں کی زیبایش خون سے ۔‘‘ غرض کہ جس قدر امیر کو اُس کے فقرے یاد تھے ، پڑھ کر کہا ’’اے زرقا ! جو خون علیؓ نے بہائے اُن میں تُو بھی شریک تھی ۔‘‘ زرقا نے کہا ’’خدا تیرا بھلا کرے اور تجھے سلامت رکھے ۔ تو نے ایک مژدہ سنا کر اپنی جلیس کو (یعنی مجھ کو) خوش کر دیا ۔‘‘ امیر نے کہا ’’کیا اس بات سے کہ سفکِ دما میں تو علیؓ کے ساتھ شریک تھی ، تجھ کو خوشی ہوئی ؟‘‘ کہا ’’بے شک ! اور اب تجھ کو میرے خیالات کا بخوبی اندازہ ہو گیا ہو گا ۔‘‘ امیر یہ سن کر ہنسا اور کہا ’’واللہ ! علی کے ساتھ تمھاری وفاداری اُس کی وفات کے بعد زیادہ عجیب ہے بہ نسبت اُس محبت و ولا کے جو اُس کی زندگی میں تم اُس کے ساتھ رکھتی تھیں ۔ اے زرقا ! اب تو اپنی حاجت بیان کر ، میں اس کو پورا کروں گا ۔‘‘ زرقا نے کہا ’’میں نے قسم کھائی ہے کہ جن کے برخلاف میں نے کوشش کی ہے ، اُن سے کبھی کچھ سوال نہ کروں گی ۔ ہاں اگر تُو بغیر طلب اور خواہش کے کچھ دے تو تجھ کو اختیار ہے ۔‘‘ امیر

---

[1] عربی کی یہ مثل کہ ’’مات الراس و بترالذنب‘‘ ایسے موقع پر بولی جاتی ہے جیسے ہم کہتے ہیں ’’گزشتہ را صلواۃ‘‘ یا ’’الماضی لا یذکر ۔‘‘
(حالی)

نے کہا ۔ ”ٹھیک ہے“ اور اُس کو اور اُس کے ہمراہیوں کو انعام و اکرام اور خلعت دے کر رخصت کیا ۔

۳۔ سعید ابن حذافہ سے منقول ہے کہ مروان نے (جب کہ مدینے کی ولایت اُس کے لیے نامزد تھی) ایک لڑکے کو کسی قصور پر قید کر دیا ۔ جب اُس کے گھر خبر پہنچی تو اُس کی دادی ام سنان بنت جشمہ مروان کے پاس گئی اور اپنے پوتے کے باب میں کچھ گفتگو کی ۔ مروان نے نہایت سخت جواب دیا ۔ وہ اس پر سیدھی امیر معاویہ کے دربار میں پہنچی اور اپنا حسب و نسب بیان کیا ۔ امیر نے اس کو پہچان لیا اور کہا ”اے بنت جشمہ ! بہت اچھا ہوا کہ تو آئی ، مگر یہاں قدم رنجہ کرنے کا کیا باعث ہوا ؟ مجھ کو خوب معلوم ہے کہ تو ہم پر تبرا کرتی تھی اور ہمارے دشمنوں کو ہمارے مقابلے میں برانگیختہ کرتی تھی ۔“ ام سنان نے کہا ”سن اے معاویہ ! عبد مناف کی اولاد کو اخلاق پاکیزہ اور حلمِ وسیع دیا گیا ہے ۔ وہ واقف ہو کر انجان نہیں بنتے اور حلم اختیار کر کے سفاہت اختیار نہیں کرتے اور عفو کے بعد انتقام نہیں لیتے ۔ اور اپنے اسلاف کے قدم بہ قدم چلنا سب سے زیادہ تجھ کو سزاوار ہے ۔“ امیر نے کہا ”ہاں بے شک ہم ایسے ہی ہیں ۔“ اس کے بعد امیر نے ام سنان کے چند اشعار پڑھے جن میں علی مرتضٰی کی مدح و ثنا اور اُن کے مخالفین پر تعریض کی گئی تھی ۔ ام سنان نے اقرار کیا کہ بے شک یہ اشعار میرے ہیں مگر میں امید کرتی ہوں کہ تو ہمارے لیے (علی مرتضٰی کے بعد) اچھا جانشین ہوگا ۔“

امیر کے ایک جلیس نے ام سنان کے کچھ اور اشعار پڑھے جن سے امیر کی طبیعت پر اس کی نسبت برا اثر ہوا ۔ ام سنان نے کہا ”اے امیر المومنین ! مسلمانوں کے دل میں تیری دشمنی پیدا ہونے کے یہی لوگ باعث ہیں ۔ ان کی باتوں کو حقیر جان اور ان کو اپنا مقرب نہ بنا ۔ اگر تو ایسا کرے گا تو خدا کا قرب اور مومنوں کی محبت تیرے ساتھ زیادہ ہوگی ۔ تو ہماری رائے اور ہمارے دلی خیالات سے واقف ہے ۔ واللہ ! علی کو ہم تجھ سے زیادہ محبوب رکھتے تھے لیکن تجھ کو بھی اور لوگوں سے زیادہ محبوب رکھتے ہیں ۔“ امیر نے پوچھا ”کن سے ؟“ کہا ”مروان بن الحکم اور سعد بن العاص سے ۔“ امیر نے پوچھا ”میں اس محبت کا مستحق تیرے نزدیک کیوں کر ہوا ؟“ کہا ”اپنے وسعت حلم اور عفو و درگزر کے سبب سے ۔“

امیر نے پوچھا ” یہاں کیوں کر آنا ہوا ؟“ کہا ”مروان نے مدینے میں ایسے قدم جمائے ہیں کہ گویا کبھی وہاں سے نہ ٹلے گا ۔ نہ وہ انصاف کے ساتھ حکومت کرتا ہے اور نہ شریعت کے موافق فیصلہ کرتا ہے ۔ مسلمانوں کی لغزشیں ڈھونڈھتا رہتا ہے اور اُن کے پردے فاش کرتا رہتا ہے ۔ چناں چہ ابھی اُس نے میرے پوتے کو قید کیا ہے ۔ میں اُس کے پاس گئی تھی ۔ اُس نے کہا ’تو نے ایسا کیا اور تو نے ویسا کیا‘ (یعنی بنی امیہ کے خلاف کارروائیاں کیں) میں نے بھی اس کو پتھر سے زیادہ کرخت اور حنظل سے زیادہ کڑوے جواب دیے اور اپنے تئیں ملامت کی اور دل میں کہا کہ میں کیوں نہ اپنا معاملہ اُس شخص کے پاس لے جاؤں جس سے بہ نسبت مروان کے زیادہ عفو اور درگزر کی امید ہے ۔ پس میں تیرے پاس آئی ہوں تاکہ تو میرے معاملے میں غور کرے ۔“ امیر نے کہا ”تو سچ کہتی ہے ۔ میں تجھ سے تیرے پوتے کی صفائی کے متعلق کچھ نہیں پوچھنا چاہتا“ اور کاتب کو اشارہ کیا کہ رہائی کا حکم لکھ کر اس عورت کو دے دو اور پانچ ہزار درہم زادِ راہ کے لیے اور اونٹ سواری کے لیے اُس کو دے کر رخصت کیا ۔

۴۔ ابوبکر ہذلی نے عکرمہ[1] سے روایت کی ہے کہ اطرش ابن رواحہ کی بیٹی اپنے عصا کے سہارے سے امیر معاویہ کے دربار میں آئی اور یہ کہہ کر کہ ”السلام علیک یا امیر المومنین !“ بیٹھ گئی ۔ امیر نے کہا ”اے عکرشہ ! کیا اب میں تیرے نزدیک امیر المومنین ہو گیا ؟“ عکرشہ نے کہا ”ہاں ، کیوں کہ اب علی زندہ نہیں رہے ۔“ اس کے بعد امیر نے کہا ”کیا تو تلوار حائل کیے صفین میں یہ خطبہ نہیں پڑھ رہی تھی ؟“ اور چند فقرے جو اس خطبے میں سے یاد رہ گئے تھے پڑھے ، جن میں یہ الفاظ بھی شامل تھے کہ ”اے مہاجرین و انصار ! معاویہ نا سمجھ عربوں کو ، جو نہ ایمان کو جانتے ہیں اور نہ شریعت کو سمجھتے ہیں ، ساتھ لے کر تم سے لڑنے کو آیا ہے ۔ اُن کو دنیا کا لالچ دیا ہے ، سو وہ لالچ میں آ گئے ہیں ؛ اور ان کو باطل کی طرف پکارا ہے ، سو وہ اُس کی طرف دوڑ پڑے ہیں ۔“ پھر امیر نے کہا ”میں اُس وقت تجھے دیکھ رہا تھا کہ تو گویا اسی عصا کے سہارے سے کھڑی تھی اور دونوں لشکر بالاتفاق کہہ رہے تھے کہ یہ اطرش بن رواحہ کی بیٹی عکرشہ ہے ۔ اگر اُس وقت تیرے اختیار میں ہوتا تو تُو اہل شام کا قتل و قمع کر ڈالتی ۔ مگر جو خدا کو منظور ہوتا ہے وہی ظہور میں آتا ہے ۔ آخر اس جوش کا کیا سبب تھا ؟“ عکرشہ نے کہا ”اے امیر المومنین ! صدقات میں ہمارا حق تھا جو کہ ہمارے مقدور والوں سے لیے جاتے تھے اور ہمارے بےمقدوروں میں تقسیم کیے جاتے تھے ۔ سو یہ حق ہمارے ہاتھ سے جاتا رہا تھا ۔ نہ ہمارے شکستہ حالوں کی خبر لی جاتی تھی ، نہ ہمارے محتاجوں

کی دست گیری کی جاتی تھی ۔ پس اگر یہ تیری رائے سے ہوا تھا تو تجھ کو غفلت سے ہوشیار ہونا اور اپنی رائے سے رجوع کرنا چاہیے تھا ، اور اگر تیری رائے کے خلاف تھا تو تجھ کو زیبا نہیں تھا کہ خائنوں سے مدد لے اور ظالموں کو کام سپرد کرے ۔“ امیر نے کہا ”اے عکرشہ ! ہم کو رعیت کے معاملات میں ایسے امور پیش آ جاتے ہیں جن کی روک تھام کرنا اور سمیٹنا مشکل ہو جاتا ہے ۔“ عکرشہ نے کہا ”خدا نے ہمارے لیے کوئی حق ایسا مقرر نہیں کیا جس میں دوسرے کا ضرر ہو ۔“ آخر امیر نے اُس کی خواہش کے موافق حکم دے دیا ۔

۵۔ ابو سہیل تمیمی سے روایت ہے کہ معاویہ ابن ابی سفیان نے موسم حج میں بنی کنانہ کی ایک عورت کا حال پوچھا جو حجونیہ میں آ کر اترا کرتی تھی اور جس کو دارمیہ حجونیہ کہتے تھے ، اور جو نہایت سیہ فام اور فربہ تھی ۔ لوگوں نے کہا ”وہ موجود ہے ۔“ امیر نے اُس کو بلا بھیجا ۔ جب وہ آئی تو اُس سے پوچھا ”اے دارمیہ ! تو جانتی ہے کہ تجھ کو کیوں بلایا گیا ہے ؟“ اُس نے کہا ”غیب کا علم تو خدا ہی کو ہے ۔“ امیر نے کہا ”میں نے تجھ کو یہ پوچھنے کو بلایا ہے کہ تو کس لیے علیؓ سے محبت اور مجھ سے بغض رکھتی تھی ؟“ اُس نے کہا ”تُو مجھ کو معاف کرے گا ؟“ امیر نے کہا ”نہیں ۔“ اُس نے کہا ”اگر تو نے معافی سے انکار کیا ہے تو سن ! میں علیؓ کو اس لیے دوست رکھتی تھی کہ وہ رعیت کے ساتھ انصاف کرتا تھا ، سب کو استحقاق کے موافق حقوق دیتا تھا ، مسکینوں سے محبت رکھتا تھا اور دین داروں کی تعظیم کرتا تھا ۔ اور تجھ سے اس لیے بغض رکھتی تھی کہ تُو اپنے سے افضل سے لڑا اور جس کا تو مستحق نہ تھا اُس حق کا طالب ہوا ۔ تو نے خوں ریزی کرائی ، فیصلوں میں ناانصافی کی ، ہوائے نفس کے موافق حکومت کی ۔“ امیر نے کہا ”نیک بخت !

---

[1] یہ عکرمہؓ ابوجہل کے بیٹے نہیں بلکہ عبداللہ بربری کے لڑکے ، حضرت ابن عباسؓ کے غلام اور بڑے عالم ، فقیہ ، محدث اور مفسر تھے ۔ ۱۰۷ھ مطابق ۷۲۵ع میں وفات پائی ۔ (محمد اسماعیل)

تو نے علیؓ کو دیکھا بھی ہے ؟“ کہا ”کیوں نہیں !“ امیر نے کہا ”تو نے اُس کو کیسا پایا ؟“ کہا ”واللہ ! اُس کو حکومت نے تیری طرح فتنے میں نہیں ڈالا اور دولت نے تیری طرح اُس کو غافل نہیں کیا ۔“ امیر نے پوچھا ”تو نے اُس کا کلام بھی سنا ہے ؟“ کہا ”کیوں نہیں ! اُس کا کلام تاریکی سے دلوں کو اس طرح جلا کرتا تھا جیسے تیل برتن کا زنگ چھڑا دیتا ہے ۔“ امیر نے کہا ”بے شک ! تو سچ کہتی ہے ۔ اگر تجھ کو کوئی حاجت ہو تو بیان کر ۔“ اُس نے کہا ”کیا تو اُسے پورا کرے گا ؟“ امیر نے کہا ”ضرور ۔“ اس نے کہا ”مجھ کو سو اونٹنیاں سُرخ رنگ کی دے جن کے ساتھ اُن کا ساربان بھی ہو ۔“ امیر نے کہا ”اگر میں یہ اونٹنیاں تجھ کو دوں تو بھی میری جگہ تیرے دل میں علیؓ کے برابر ہوگی یا نہیں ؟“ دارمیہ نے کہا ”سبحان اللہ ! کیا اُس کے سوا دوسرے شخص کی جگہ ؟“ امیر نے اس کے جواب میں یہ دو شعر پڑھے :

اذا لم اعد بالحلم منّی علیکم
فمن ذالذی بعدی یؤمّل بالحلمِ
خذیھا ھنیئًا واذکری فعل ماجد
جزاک علٰی حرب العداوۃ بالسّلمِ

یعنی ”اگر میں تیرے ساتھ فراخ حوصلگی سے پیش نہ آؤں تو پھر میرے بعد کون ہے جس سے امید کی جائے ؟ لے یہ اونٹنیاں تجھ کو مبارک ہوں ، اور یاد رکھ اُس شخص کو جس نے تیرے ساتھ عداوت کی لڑائی کا معاوضہ صلح کے ساتھ کیا ہے “۔ اس کے بعد امیر نے کہا ”واللہ اگر علیؓ زندہ ہوتا تو ان میں سے ایک اونٹنی بھی تجھ کو نہ دیتا “۔ وہ بولی ”واللہ ! اونٹنی تو اونٹنی ! وہ تو ایک بلی کا بچہ بھی مسلمانوں کے مال میں سے دینے والا نہ تھا ۔“

٦۔ شعبی سے روایت ہے کہ معاویہؓ نے کوفے کے والی کو لکھا کہ ام الخیر بنت حریش بن سراقہ کو سوار کرا کر عزت و احترام کے ساتھ ہمارے پاس بھیج دے ۔ والی نے فوراً حکم کی تعمیل کی اور ام الخیر بہت آرام کے ساتھ معاویہؓ کے پاس پہنچی ۔ معاویہؓ نے اُس کو اپنے محل میں اُتارا اور چوتھے روز ، جب کہ جلیس و مصاحب جمع تھے ، اُس کو بات چیت کے لیے بلایا ۔ ام الخیر نے آتے ہی کہا ”السلام علیک یا امیرالمومنین و رحمۃ اللہ و برکاتہ “۔ امیر نے سلام کا جواب دیا اور تعریضاً اس بات کا شکریہ ادا کیا کہ تو نے مجھے امیرالمومنین کے لفظ سے یاد کیا ۔ ام الخیر نے کہا اے امیرالمومنین ! ”لکل اجل کتاب“ یعنی ہر چیز کی مدت معین ہے ۔ امیر نے کہا ”سچ ہے “۔ پھر ادھر اُدھر کی باتیں کر کے پوچھا کہ ”عمار یاسرؓ کے قتل کے وقت تو نے کیا خطبہ پڑھا تھا ؟“ ام الخیر نے جواب دیا ”نہ میں نے اُس کو پہلے سے بنایا تھا اور نہ اُس موقع کے بعد کسی کو سنایا ۔ یہی چند جملے تھے جو صدمے کے سبب ٹپک پڑے تھے ۔ لیکن اگر اس کے سوا کوئی اور کلام تُو سننا چاہے تو میں سناؤں “۔ امیر یہ سن کر مصاحبوں کی طرف ملتفت ہوا اور پوچھا ”تم میں سے کسی کو اس کا وہ کلام یاد ہے ؟“ ایک نے اُن میں سے کہا ”اے امیرالمومنین ! مجھ کو کچھ کچھ اس میں سے یاد ہے“ اور اُس نے اُس بلیغ خطبے کے چند فقرے امیر کے سامنے پڑھے ، جن میں لوگوں کو علی مرتضٰی کے فضائل و مناقب کا ذکر کر کے اُن کا ساتھ دینے اور اہل شام سے لڑنے کی ترغیب نہایت پُر زور الفاظ میں دی گئی تھی ۔ امیر نے ان فقروں کو سن کر ام الخیر سے کہا ”ظاہر ہے کہ اس کلام سے تیرا مطلب میرے قتل کے سوا اور کچھ نہ تھا ۔ پس اگر میں تجھ کو قتل کرا دوں تو اس میں کوئی حرج نہیں معلوم ہوتا ۔“ ام الخیر

نے کہا ” واللہ مجھ کو ہرگز شاق نہیں کہ میرا قتل اُس شخص کے ہاتھ سے ظہور میں آئے جس کی شقاوت سے میری سعادت متصور ہے “۔ امیر نے کہا ” اے فضول گو! عثمان بن عفانؓ کے باب میں تو کیا کہتی ہے؟“ ام‌الخیر نے کہا ” لوگوں نے جب اس کو خلیفہ کیا تو اس سے راضی تھے اور جب اس کو قتل کیا تو اُس سے ناراض تھے “۔ امیر نے کہا ” اے ام‌الخیر! مدح ایسی ہی ہوتی ہے؟“ وہ بولی ”خدا گواہ ہے، اور اس کی گواہی کافی ہے، میرا مطلب اس سے عثمانؓ کی تنقیص نہیں ہے، بلکہ وہ سابقین اولین میں سے تھا اور بے شک آخرت میں اُس کا درجہ بلند ہوگا۔“ امیر نے کہا ” اچھا زبیرؓ کے باب میں تو کیا کہتی ہے؟“ کہا ” بھلا میں رسول‌اللہ صلعم کی پھوپھی کے بیٹے اور اُن کے حواری کے حق میں کیا کہہ سکتی ہوں، جن کی نسبت خود رسول مقبولؐ نے جنتی ہونے کی شہادت دی ہے “۔ اس کے بعد ام‌الخیر نے کہا ”اے معاویہؓ! تُو قریش میں احلم‌الناس مشہور ہے۔ میں تجھ کو خدا کی قسم دیتی ہوں کہ مجھے ان سوالات سے معذور رکھ اور ان کے سوا جو تیرا جی چاہے سو پوچھ۔“ امیر نے سوالات موقوف کیے اور اس کو معقول رخصتانہ دے کر عزت و احترام کے ساتھ رخصت کیا۔

مذکورۂ بالا حکایتوں سے قطع نظر اس کے کہ قرون اولیٰ کی عورتوں کی راست بازی اور حق گوئی کماحقہ ثابت ہوتی ہے، یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ:

(الف) وہ جنگ کے معرکوں میں شریک ہوتی تھیں۔

(ب) اپنے جتھوں کا ساتھ دیتی تھیں۔

(ج) فریق مخالف کے برخلاف لوگوں کو اُکسانے کے لیے نہایت فصیح و بلیغ اور پُر زور خطبے خود انشاء کر کے پڑھتی تھیں۔

(د) خلیفہ کے دربار میں بے حجابانہ حاضر ہوتی تھیں۔

(ہ) بھرے مجمع میں آزادانہ اور بیباکانہ گفتگو کرتی تھیں۔

(و) سب سے بڑھ کر ان حکایتوں سے امیر معاویہؓ کے تحمل اور فراخ حوصلگی کا ثبوت ملتا ہے کہ باوجود ہر طرح کے اقتدار و اختیار کے رعیت کے ضعیف ترین فرقے کی ایسی تلخ اور ناگوار باتیں برداشت کی جاتی تھیں اور اعیان دربار کے سامنے اُن کو اپنے اوپر اعتراض اور خردہ‌گیری کرنے کا موقع دیا جاتا تھا۔ امیر کا یہ قول مشہور ہے کہ ”النساء یغلبن الکرام و یغلبہن اللئام“ یعنی عورتیں شریفوں پر غالب اور کمینوں سے مغلوب رہتی ہیں۔ اور اس سے یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ امیر کا اغماض اور تحمل شاید عورتوں کے ساتھ مخصوص ہو، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ امیر کا یہ برتاؤ عورتوں اور مردوں کے ساتھ برابر تھا۔

چنانچہ ابوعمر نے ہمدان کے ایک شخص سے روایت کی ہے کہ معاویہؓ نے ضرارالصدئی (ضرار بن ضمرہ کنانی) سے کہا کہ ”میرے سامنے علیؓ کے کچھ اوصاف بیان کر۔“ اُس نے جناب مرتضوی کے عدل و انصاف، علم و حکمت، دنیا سے نفرت، شب بیداری، اشک‌باری، ذکر و فکر، قناعت، مسکینوں پر شفقت، اہل دین کی تعظیم، قوی اور کمزور کے ساتھ یکساں برتاؤ اور اسی قسم کی بہت سی خصلتیں بیان کیں۔ معاویہؓ پر اس ذکر سے رقت طاری ہو گئی اور کہا ”ابوالحسن پر خدا کی رحمت ہو، واللہ وہ ایسا ہی تھا۔“ پھر ضرار سے پوچھا کہ ”تجھ پر اُس کے غم میں کیا گزرتی ہے؟“ ضرار نے کہا ”جو اُس عورت پر گزرتی ہے جس کا اکلوتا بیٹا اس کی گود میں ذبح کیا گیا ہو۔“

ظاہر ہے کہ امیر معاویہؓ کا جو معاملہ جناب مرتضویؓ کے ساتھ رہا تھا، اُس کو ہر شخص خوب جانتا تھا۔ باوجود اس کے

لوگ آپ کے فضائل و مناقب بے دھڑک امیر کے سامنے بیان کرتے تھے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اُس وقت تک اسلام کی تعلیم کا اثر جو اُس نے عرب عربا کی آزاد طبیعتوں پر کیا تھا، زائل نہیں ہوا تھا اور وہ باوجود ہر طرح کی قدرت اور مکنت کے حق کی تلخ اور ناگوار باتیں، جو اُن کی طبیعت اور مرضی کے خلاف کہی جاتی تھیں، گوارا کرتے تھے۔ اگرچہ خلافت راشدہ کے تیس برس (جن کی رسول مقبولؐ نے پیشین گوئی فرمائی تھی) گزر چکے تھے اور ملک عضوض کا دور دورہ شروع ہو گیا تھا مگر آزادی، جو عرب کی خاک کا اصلی جوہر تھا اور اسلام کی تعلیم نے اُس کو جِلا دی تھی، اُس میں ابھی تک کچھ فرق نہیں آیا تھا۔

مذکورۂ بالا حکایتوں کا مضمون ہم نے بطور خلاصے کے بیان کیا ہے۔ خصوصاً اُن خطبوں میں سے جو صفین میں امیر معاویہؓ کے برخلاف پڑھے گئے، صرف معدودے چند جملوں کا ترجمہ کیا گیا ہے۔ اور بعض حکایتیں جو صاحبِ 'عقدالفرید' نے اس باب میں عورتوں کے متعلق نقل کی ہیں، بالکل چھوڑ دی گئی ہیں، ورنہ نتائج مذکورالصدر کے سوا اور بھی بہت سے نتیجے اُن حکایتوں سے استخراج ہو سکتے تھے، مگر بخوف تطویل صرف اسی خلاصے پر اکتفا کیا گیا۔

۴۔ سوانحی مضامین

۱

شیخ الاسلام علامہ ابن تیمیہ حرانی

(قریباً ۱۸۷۵ع)

اس عالمِ بے بدل اور فاضلِ یگانہ کی سوانح حیات حضرت مولانا حالی نے لکھنی شروع کی تھی مگر صد ہزار افسوس کہ پوری نہ ہو سکی۔ اگر یہ تصنیف مکمل ہو جاتی تو یقیناً اردو لٹریچر میں ایک بے نظیر چیز ہوتی۔ لیکن نہ معلوم کیا وجوہ و اسباب ہوئے کہ حضرت مولانا اس مقدس کام کی تکمیل نہ کر سکے اور ابھی صرف چند صفحات ہی لکھنے پائے تھے کہ توجہ دوسرے کاموں کی طرف مبذول ہو گئی اور یہ ضروری کام بیچ میں رہ گیا اور ایسا رہا کہ پھر مولانا اپنی وفات تک اسے مکمل نہ کر سکے۔

مجھے مولانا مرحوم کے مسودات میں سے علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ کے حالات کے متعلق صرف یہی چار ورق ہی مل سکے ہیں۔ مسودہ مولانا کے اپنے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا اور صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ مولانا نے لکھتے لکھتے مسودہ فرش پر رکھ دیا ہے (مولانا میز کرسی پر بیٹھ کر نہیں لکھتے تھے) کہ ذرا دم لے کر پھر لکھوں گا۔ پھر اُن کو اُس کے مکمل کرنے کی مہلت نہ ملی اور اس طرح یہ مسودہ نا تمام رہا۔

اس نامکمل مسودے کو مکمل کرنے کے لیے میں مولانا کا تبحرِ علمی، اُن جیسی لیاقت، اُن جیسی قابلیت، اُن جیسا حسن بیان، اُن جیسی سلاست اور اُن جیسی روانی کہاں سے لاتا؟ مگر میں نے حتی المقدور کوشش کی ہے کہ جہاں تک ہو سکے، اس ناتمام مسودے کو ایک حد تک مکمل کر دوں۔ میں نے اس مضمون کو مکمل کرنے میں اختصار کا بے حد خیال رکھا ہے اور بہت ہی ضروری باتیں نہایت مختصر طور پر بیان کر دی ہیں تاکہ دل چسپی کے ساتھ پڑھی جا سکیں۔

قارئین کرام پہلے حضرت مولانا حالی کا مضمون ملاحظہ فرمائیں، ازاں بعد خاکسار راقم‌الحروف کا لاحقہ۔ آپ کو ان شاء اللہ حضرت امام ابن تیمیہ کے سوانحی حالات سے ایک حد تک واقفیت ہو جائے گی۔ اردو میں ابن تیمیہ پر ایک تحقیقی اور تنقیدی کتاب ڈاکٹر غلام جیلانی برق ایم۔ اے، پی ایچ۔ ڈی نے ۲۷۲ صفحات کی مئی ۱۹۳۸ع میں لکھی تھی۔ ممکن ہے بڑی لائبریریوں میں مل جائے یا کسی قدیم کتب فروش کی پرانی کتابوں میں پڑی ہو۔ عام طور پر بازار میں نہیں ملتی۔ حضرت امام ابن تیمیہ کے حالات و واقعات اور خصوصاً اُن کے فلسفۂ علمِ کلام کے جویا اُس کتاب کی طرف توجہ فرمائیں۔ (محمد اسماعیل)

خاندان:

حرّان جو بلاد شام میں ایک شہر ہے، وہاں چھٹی اور ساتویں صدی ہجری میں ایک نامور خاندان اہل علم کا گزرا ہے جس میں

چھ جلیل القدر اور متبحر عالم ''ابن تیمیہ'' کے نام سے مشہور ہوئے ہیں ۔ ان میں سب سے پہلے شیخ فخرالدین ابو عبداللہ بن ابی القاسم کا نام ابن تیمیہ رکھا گیا ہے جن کی اولاد میں سے ایک تقی الدین ابن تیمیہ ہیں جن کا ہم کو یہاں حال لکھنا منظور ہے اور جن پر اسلامی دنیا میں سب سے زیادہ ابن تیمیہ کا اطلاق کیا جاتا ہے ۔

ولادت :

شیخ الاسلام احمد بن عبدالحلیم بن عبدالسلام تقی الدین ابن تیمیہ ربیع الاول ۱۶۶ھ کی دسویں یا بارھویں کو حران میں پیدا ہوئے جہاں اُس وقت تاتاریوں کا زور تھا ۔

والدین کی ھجرت اور ابن تیمیہ کا دمشق آنا :

اُن کی عمر چھ سات برس سے زیادہ نہ تھی جب کہ اُن کے والد مع اہل و عیال کے تاتاریوں کے پڑوس سے تنگ آ کر دمشق میں چلے آئے تھے ۔

بچپن میں تحصیل علوم :

دمشق جو اُس وقت بلاد اسلام میں علوم دینیہ کا مرکز تھا ، وہاں شیخ زین الدین مقدسی کے حلقۂ درس میں شریک ہو کر ابن تیمیہ حدیث کی سماعت کرنے لگے ۔ لکھا ہے کہ ابن تیمیہ کے شیوخ جن سے انھوں نے حدیث کی سماعت کی ہے ، تعداد میں سو سے زیادہ ہیں ۔ سب سے پہلے انھوں نے حدیث ہی کی طرف توجہ کی اور سالہا سال حدیث کے سماع میں بسر کیے ۔ پھر خوش نویسی ، حساب اور حفظ قرآن کے بعد فقہ کی طرف متوجہ ہوئے اور ایک مدت تک عربیت کی کتابیں پڑھیں ۔ خصوصاً سیبویہ کی ''کتاب النحو'' (جس کی نسبت کہا گیا ہے کہ کسی علم میں ایسی عمدہ کتاب نہیں لکھی گئی) خصوصیت کے ساتھ دیکھی ۔ پھر تفسیر اور اصول فقہ کی طرف خاص توجہ کی اور ان سب فنون میں معاصرین سے سبقت لے گئے ، حالاں کہ ابھی اُن کی عمر بیس برس سے بھی کم تھی ۔

ذہانت ، پرہیزگاری اور شوق علم :

اُس زمانے کے فضلا ابن تیمیہ کی ذہانت اور جودت اور قوتِ حافظہ اور سرعت انتقال دیکھ کر حیران تھے ، اور اسی کے ساتھ اخلاق فطرۃً نہایت اعلیٰ درجے کے پائے تھے ۔ پارسائی ، تقویٰ ، خداپرستی ، کھانے پہننے میں میانہ روی ، والدین کی اطاعت ، عبادت الٰہی کا شوق ، ہر وقت خدا کی طرف لو لگائے رکھنا ، حدود الٰہی سے کبھی تجاوز نہ کرنا ، نیک باتوں کی ترغیب دینا اور بری باتوں سے روکنا ، یہ سب خوبیاں پوری ان کی ذات میں پائی جاتی تھیں ۔ علم سے اُن کی کبھی سیری نہیں ہوتی تھی اور مطالعے کی پیاس کبھی نہ بجھتی تھی ۔ ایسا بہت کم ہوتا تھا کہ اُنھوں نے کسی مضمون کی طرف توجہ کی ہو اور غیب سے فتح بابی نہ ہوئی ہو ۔

قوتِ مناظرہ :

وہ بچپن سے علمی مجلسوں میں شریک ہو کر اہل علم سے بحث اور مناظرہ کرتے تھے اور بڑے بڑے علما کو ساکت کر دیتے تھے اور اکثر ایسی باتیں اُن کے منہ سے نکل جاتی تھیں جن کو سن کر حاضرین حیران رہ جاتے تھے ۔

بچپن میں فتویٰ نویسی :

وہ سترہ برس کی عمر میں فتویٰ لکھنے لگے تھے اور اُسی وقت سے اُن کو جمع اور مرتب کرنے لگے تھے ۔

باپ کا انتقال اور ابن تیمیہ کا حلقۂ درس :

جب آن کے باپ شیخ عبدالسلام نے ، جو حنبلیوں میں امام کا درجہ رکھتے تھے ، انتقال کیا تو ابن تیمیہ نے باپ کی جگہ طلبہ کو درس دینا اور باپ کے فرائض ادا کرنے شروع کیے ۔ اس وقت آن کی عمر اکیس سال کی تھی ۔ چند روز میں آن کی شہرت دور دور پہنچ گئی ۔ انھی دنوں میں آنھوں نے قرآن مجید کا درس ہر جمعے کو بغیر مدد کتاب کے کہنا شروع کیا ۔ آواز بہت بلند تھی ۔ درس کی حالت میں کہیں نہیں رکتے تھے ۔

حج :

۶۹۱ھ میں انھوں نے حج کیا ، جب کہ آن کی عمر تیس برس کی تھی ۔

شہرت اور مقبولیت :

اب وہ بہ لحاظ اپنے کمالاتِ علمی و عملی اور اعلی درجے کے اخلاق و خصائل کے ، زہد و ورع اور نفع رسانی خلایق کے نواح شام میں مرجع خلایق اور امام وقت سمجھے جانے لگے ۔ وہ دین مبین کی نصرت اور اعلان کلمۂ حق میں بہ مقابل اہل بدعت کے ننگی تلوار تھے ۔

فضل و کمال :

ابوالحجاج کا قول ہے کہ ”میں نے کسی کو ان کا مثل نہیں پایا اور انھوں نے بھی کسی کو اپنا نظیر نہ دیکھا ہوگا ۔ کوئی شخص کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ کا آن سے زیادہ جاننے والا اور آن سے بڑھ کر آن کی پیروی کرنے والا میری نظر سے نہیں گزرا ۔“

علامۂ کمال الدین زملکانی نے کہا ہے کہ جس علم کے

متعلق آن سے کوئی سوال کیا جاتا تھا تو سننے والے اس علم میں آن کا تبحر دیکھ کر یہ خیال کرتے تھے کہ شاید یہ اس علم کے سوا کوئی دوسرا علم نہ جانتے ہوں گے ۔ ہر مذہب کے فقہا جب تک کہ آن کے مذہب سے واقف نہ ہوتے تھے ، اپنے اپنے مذہب کے متعلق آن سے استفادہ کرتے تھے ۔ تصنیف کا سلیقہ ، حسن بیان اور حسن ترتیب گویا آن کا حصہ تھا ۔ ایک بار تقسیم میراث کے متعلق اور دوسری بار حدود کے متعلق دو مسئلوں میں آس زمانے کے مفتیوں میں اختلاف واقع ہوا ۔ آنھوں نے دونوں مسئلوں پر ایک ایک ضخیم کتاب لکھی مگر کہیں اصل سوال کی حد سے قدم باہر نہیں رکھا ۔ ہر ایک مسئلے کے متعلق جو کچھ لکھا وہ ایسا ضروری معلوم ہوتا تھا کہ گویا بغیر آس کے بیان نا تمام تھا ۔ لیکن ہر ایک پر جو کچھ لکھا آس کا غالب حصہ ایسا تھا کہ کسی کے وہم و گمان میں بھی آس موقع کے متعلق وہ باتیں نہ گزری تھیں ۔ آن میں اجتہاد کی تمام شرطیں ، جیسی کہ چاہئیں ، خدا نے جمع کر دی تھیں ۔“

ابوالحجاج کہتے ہیں کہ میں نے علامۂ موصوف کے قلم کا لکھا ہوا ، جو انھوں نے تقی‌الدین ابن تیمیہ کی کتاب ”رفع الاعلام عن ائمۃ الاسلام“ پر لکھا تھا پڑھا ۔ ابوالحجاج نے علامۂ زملکانی کی وہ عبارت نقل کی ہے جو انھوں نے شیخ کی اس مشہور کتاب پر اپنے قلم سے لکھی تھی ۔ آس میں شیخ کے بے شمار محامد بیان کرنے کے بعد وہ یہ اشعار لکھتے ہیں :

[1]ما ذا یقول الواصفون لہ
و صفاتہ قلت عن الحصر

---

[1] یعنی تعریف کرنے والے آس کی تعریف کیا بیان کریں گے ، جب

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

ہو حجة لله قاهرة
ہو بیننا اعجوبة الدهر
ہو آیة فی الخلق ظاهرة
انوارها اربت علی الفجر

ابوالحجاج کہتے ہیں کہ وہ اس تعریف کے اس وقت مستحق ہو گئے تھے جب کہ اُن کی عمر تیس برس سے زیادہ نہ تھی ۔

اُن کے شیوخ اور ہم عصر علماء کی جماعتِ کثیر نے بھی اُن کی بے انتہا مدح وثنا کی ہے ۔ جیسے شمس الدین ابن ابی عمرو ، شیخ تاج الدین فزاری ، ابن منجا ، ابن عبدالقوی قاضی جونی ، ابن دقیق العید اور ابن النحاس وغیرہم ۔ اور یہ سب علماء شافعی المذہب ہیں ۔ شیخ عماد الدین وسطی نے ان کو اتباع سنت اور ترک بدعت کے لحاظ سے خلفائے راشدین اور ائمہ مہدیین کا نمونہ قرار دیا ہے اور اُن کی بے انتہا تعریف کے بعد لکھتے ہیں کہ ”کسی فن میں کوئی اُن کی گرد تک کو نہیں پہنچ سکتا تھا ۔ جس وقت وہ قرآن کی تفسیر بیان کرتے تھے تو لوگ اُن کی یادداشت دیکھ کر مبہوت ہو جاتے تھے ۔ وہ مفسرین کے ہر قول پر جب ترجیح یا تضعیف کا حکم لگاتے تھے تو حاضرین حیران رہ جاتے تھے ۔ حالاں کہ وہ ایک زاہد و عابد اور ذاکر و شاغل بزرگ تھے ، اور اُن کا بہت سا وقت لوگوں کو خدا کی طرف بلانے ، یعنی وعظ وتذکیر میں گزرتا تھا ۔“

حضرت مولانا حالی کا مسودہ یہیں تک ختم ہو گیا ۔ آگے بے حد اختصار کے ساتھ میں علامہ ابن تیمیہ کے کچھ حالات لکھ کر مضمون کو ختم کرتا ہوں ۔

(محمد اسماعیل)

غضب کا حافظہ :

ابن تیمیہ نے حافظہ غضب کا پایا تھا ۔ جو چیز ایک مرتبہ نظر سے گزر جاتی تھی ، پھر نہ بھولتی تھی ۔ جو کتاب ایک مرتبہ دیکھ لیتے تھے وہ ساری حفظ ہو جاتی تھی ۔ آپ کی بیشتر علمی کتابیں جیل خانے میں لکھی گئیں اور محض اپنے حیرت انگیز حافظے سے ۔ ایک مرتبہ جب کہ وہ اسکندریہ کے جیل میں محبوس تھے ، جیلر نے جو علمی ذوق رکھتا تھا ، آپ سے کچھ حدیثیں لکھنے کی فرمائش کی ۔ آپ نے محض اپنے حافظے سے کام لے کر بیس بڑے صفحات پر اُس کے لیے احادیث نبوی کا ایک دفتر لکھ دیا ۔ ایک مرتبہ بچپن میں اُن کے عجیب حافظے کو دیکھ کر ایک فاضل شخص نے کہا تھا کہ ”اگر یہ بچہ زندہ رہا تو بڑا ہو کر دنیا کا عظیم الشان انسان بنے گا ۔“ اور اُس کی یہ پیش گوئی حرف بحرف پوری ہوئی ۔

دورِ ابتلا اور آزمائش :

جتنے بڑے بڑے علماے کرام اور مجددین امت مسلمانوں میں گزرے ہیں ، سب کو کم و بیش کفر و الحاد کے فتووں کے سمندر میں سے گزرنا پڑا ہے ۔ ابن تیمیہ اس کلیے سے کس طرح مستثنیٰ رہتے ۔ ان پر بھی اُس وقت کے علما نے کفر کے فتوے لگائے اور اُن کو قید و بند کی صعوبتوں میں مبتلا کیا ۔ مولویوں

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ)

کہ اُس کی صفات غیر محصور ہیں ۔ وہ اللہ تعالیٰ کی ایک حجتِ قاہرہ اور ہم میں ایک نادرِ روزگار انسان ہے ۔ وہ اس دنیا میں خدا کا ایک کھلا ہوا نشان ہے اور اُس کی برکات طلوعِ فجر کی طرح نمایاں ہیں ۔

کے فتووں پر ایک مرتبہ آپ کو دمشق سے نکل جانے کا حکم دیا گیا ۔ دمشق سے نکل کر جب قاہرہ میں پہنچے تو وہاں بھی مولویوں کے فتوے ساتھ ساتھ ، جن کے نتیجے میں آپ کو جیل جانا پڑا ، اور شہر میں اعلان کر دیا گیا کہ جو کوئی ابن تیمیہ کی حمایت اعمال و عقائد میں کرے گا ، جان سے مارا جائے گا اور اس کی جائداد ضبط کر لی جائے گی ۔ یہاں سے ڈیڑھ سال کے بعد رہائی ملی اور دمشق میں قیام کی اجازت ہوگئی ۔ مگر یہاں بھی کچھ عرصے کے بعد اعلان کر دیا گیا کہ ابن تیمیہ کسی جلسے میں تقریر نہیں کر سکتے : نہ زبانی ، نہ لکھ کر ۔ پھر آپ کو مصر بھیج دیا گیا اور جیل خانہ آپ کا مسکن قرار پایا ۔ جیل پہنچتے ہی آپ نے قیدیوں کو تبلیغ کرنی شروع کی اور سب کو نماز روزے کا پابند بنایا ۔ پھر آپ کو شاہی حکم سے رہا کر دیا گیا ۔ ایک روز جامع مسجد میں درس دے رہے تھے کہ مخالفین کا ایک ہجوم مسجد میں گھس آیا اور آپ کو مار مار کر ادھ مؤا کر دیا ۔ معتقدین کو خبر ہوئی تو وہ سخت اشتعال میں بھرے ہوئے تلواریں لے کر آئے مگر آپ نے انہیں انتقام لینے سے منع کر دیا ۔

پھر آپ شام ، عسقلان اور بیت المقدس ہوتے ہوئے دمشق آئے ۔ یہاں پہلے زبان بندی کے احکام جاری ہوئے اور پھر آپ قید کر دیے گئے ۔ ساڑھے پانچ ماہ قید رہے ، پھر چھوڑ دیے گئے ۔ مگر کچھ دنوں بعد پھر جیل خانے بھیج دیے گئے ۔ لوگ وہاں بھی فتوے لینے کے لیے جاتے تھے ۔ آخر اس کی بھی مخالفت شروع ہوگئی ۔ اس پر آپ نے جیل کی کوٹھڑی میں خاموشی کے ساتھ تصنیف و تالیف کا کام شروع کیا اور بیسیوں کتابیں اپنے بے نظیر حافظے کے بل پر جیل میں بیٹھے بیٹھے لکھ ڈالیں ۔ مخالفین اور معاندین کو خبر ہوئی تو اس تمام عرصے میں جو کتابیں آپ نے لکھ کر تیار کی تھیں اور جو چودہ موٹے موٹے بستوں میں بند تھیں ، سب بحق سرکار ضبط کر لی گئیں اور قلم آپ کے ہاتھ سے چھین لیا گیا ۔ اس پر آپ نے کوئلے سے کام لینا شروع کیا مگر وہ بات کہاں تھی ۔ اس سانحے کا آپ کو اپنی قید سے بھی زیادہ صدمہ ہوا اور بیمار پڑ گئے ۔ قلم دوات سے محروم ہونے کے ساڑھے چار ماہ بعد اور بیمار ہونے کے بیس دن بعد ۲۰ ذی قعدہ ۷۲۸ھ مطابق ۲۶ ستمبر ۱۳۲۸ء کو علم کا یہ آفتاب جیل خانے کی ایک تنگ و تاریک کوٹھڑی میں ہمیشہ کے لیے غروب ہوگیا اور دنیائے اسلام پر اندھیرا چھا گیا ۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ آپ کے جنازے کی نماز میں قریباً تین لاکھ آدمی شریک ہوئے ۔

شاگرد :

تاریخوں میں لکھا ہے اور بڑے بڑے علماء نے کہا ہے کہ ابن تیمیہ کے شاگردوں اور تلامذہ کی تعداد سینکڑوں سے گزر کر ہزاروں تک پہنچتی تھی ۔ اگر غالب کو فخر ہے کہ حالی جیسا شخص اس کا شاگرد تھا ، اگر مولوی نوازش علی اپنے شاگرد سرسید پر فخر کر سکتے ہیں ، اگر مولوی فیض الحسن سہارن پوری علامہ شبلی کی شاگردی پر ناز کر سکتے ہیں ، اگر داغ

کو فخر ہے کہ اقبال اس کا شاگرد ہے ، تو بلاشبہ ابن تیمیہ بھی اس امر پر بجا طور سے ناز کر سکتے ہیں کہ امام ابن قیم ، علامہ ذہبی اور محدث ابن کثیر جیسے فضلاے عصر اُن کے شاگردانِ خصوصی میں داخل تھے ۔

تصانیف :

جن جن لوگوں نے حضرت ابن تیمیہ کے حالات پر قلم اٹھایا ہے ، اُن سب کے درمیان اس باب میں سخت اختلاف پایا جاتا ہے کہ آپ کی تصنیفات اور تالیفات کی مقدار کس قدر ہے ۔ حضرت ابن تیمیہ تصنیف و تالیف کے لحاظ سے شاید اپنے سے پہلے اور اپنے سے بعد کے سب مصنفین پر غالب ہیں ۔ نہ ایسی سرعت اور تیزی کے ساتھ کوئی مصنف کتابیں لکھ سکتا تھا ، جیسی سرعت کے ساتھ ابن تیمیہ کتابیں لکھتے تھے (آپ ایک ایک دن میں چالیس چالیس جز لکھ لیا کرتے تھے) اور نہ اس کثرت کے ساتھ کسی شخص نے کتابیں تصنیف کی ہیں جیسی ابن تیمیہ نے کیں ۔ بعضے اُن کی تصنیفات ڈیڑھ سو بتاتے ہیں ۔ بعضے تین سو اور بعضے پانچ سو ۔ کئی آدمیوں نے ایک ہزار کی تعداد بھی لکھی ہے اور آخر میں یہ بھی لکھ دیا کہ بہت اغلب ہے کو ان کے علاوہ بعض اور کتابیں بھی رہ گئی ہوں ۔ ڈاکٹر غلام جیلانی برق نے اُن کی سوانح عمری میں اُن کی جو تصانیف لکھی ہیں وہ تین سو کے قریب ہیں ۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ اُن کتابوں میں بعض ایسی ہیں جو بیس بیس ، تیس تیس ، چالیس چالیس جلدوں میں ہیں ۔

ایک کتاب ابن تیمیہ نے پچاس جلدوں میں لکھی ہے ۔ سخت تعجب ہوتا ہے کہ ایسی بے اطمینانی اور قیدوبند کی صعوبتوں میں آخر وہ کس طرح سے اُن عظیم الشان کتابوں کو لکھ گئے ۔ یہ معمہ کم از کم میری عقل و سمجھ سے بالا ہے کہ دنیا میں ایسے محیر العقول اصحاب بھی موجود ہیں جو ایک ایک دن میں چالیس چالیس صفحے تصنیف کر دیں ۔ اللہ ہی کو پتا ہے کہ یہ مبالغہ ہے یا واقعہ! (محمد اسماعیل)

۲

مومن کے سوانحی حالات

(قریباً سنہ ۱۸۸۲ع)

’’آب حیات‘‘ اردو شعرا کا مشہور تذکرہ ہے جسے مولانا محمد حسین آزاد نے پہلی مرتبہ ۱۸۸۰ع میں شائع کیا ۔ مگر اس میں حکیم مومن خاں مومن کے حالات نہیں تھے کیوں کہ ترتیبِ تذکرہ کے وقت ہر چند آزاد نے اہلِ وطن کو مومن کے حالات کے لیے خطوط لکھے اور لکھوائے مگر بہ قول آزاد ’’ہر طرف سے صاف جواب ملا ۔‘‘ ناچار پہلا ایڈیشن مومن کے حالات کے بغیر شائع ہوا ۔ مگر کتاب شائع ہوتے ہی ہر طرف سے اعتراضات ہونے شروع ہوئے کہ ’’مومن کے حالات اس میں کیوں نہیں ہیں ؟‘‘ اس پر آزاد نے بعض خاص خاص اہلِ علم کو دوبارہ اس طرف توجہ دلائی ۔ اس مرتبہ ایک مشہور بزرگ نے مومن کے حالات لکھ کر آزاد کو بھیج دیے اور آزاد نے وہ حالات آبِ حیات کے دوسرے ایڈیشن میں (جو ۱۸۸۲ع میں شائع ہوا) شامل کر دیے ۔ مگر اُن صاحب کا نام نہ لکھا جنھوں نے محنت اور تلاش کے بعد یہ حالات قلم بند کرکے بھیجے تھے ۔ صرف اشارے کے طور پر اتنا لکھ دیا کہ ’’میں ایک صاحب کے الطاف و کرم کا شکر گزار ہوں جنھوں نے (مومن کے) یہ حالات فراہم کرکے مرتب کیے اور مع ایک مراسلے کے (مجھے) عنایت فرمائے[1] ۔‘‘

اس پر خواص تو اسی وقت سمجھ گئے تھے کہ ’الطاف و کرم‘ کا اشارہ کس کی طرف ہے ؟ مگر عوام کے لیے یہ عقدہ لاینحل رہا ۔

عرصۂ دراز کے بعد آخر یہ راز اُس وقت کھلا جب سنہ ۱۹۳۵ع میں مولانا حالی کے شاگرد جناب پنڈت برج موہن کیفی سے میں نے اس کے متعلق دریافت کیا جس کے جواب میں اُنھوں نے مجھے ماڈل ٹاؤن لاہور سے ۲۷ جولائی ۱۹۳۵ع کو ایک طول طویل خط لکھا جس میں بالکل صاف طور پر تحریر فرمایا کہ ’’مومن کے حالات حالی نے ہی لکھ کر آزاد کو بھیجے جو آب حیات کے دوسرے ایڈیشن میں شامل کتاب کیے گئے ۔‘‘

اس کے بعد ۱۹۳۷ع میں اردو کے نامور ادیب مالک رام صاحب نے مجھے خود اس مسئلے کے متعلق ایک خط لکھا جو ذیل میں درج کیا جاتا ہے :

پولیٹیکل ڈپارٹمنٹ گورنمنٹ آف انڈیا ، شملہ ۔

مکرمی جناب شیخ صاحب قبلہ ! آداب عرض ہے ۔

میں آپ کا تصنیف کردہ ’تذکرۂ حالی‘ دیکھ رہا تھا ۔ جہاں آپ نے حضرت مولانائے مرحوم کی تصنیفات کا ذکر کیا ہے ، اس میں ایک چیز کی کمی ہے اور چاہیے کہ اس کا اضافہ کر لیا جائے ۔

آپ کو معلوم ہوگا کہ مولانا محمد حسین آزاد مرحوم نے ’آب حیات‘ کے طبع اول میں حکیم مومن مرحوم کا

---

[1] ملاحظہ ہو : ’آب حیات‘ تمہیدِ حالاتِ مومن ۔

تذکرہ نہیں لکھا تھا ۔ جب ہر طرف سے اعتراض ہوئے تو آنھوں نے (آن کے اپنے قول کے مطابق) مختلف حضرات سے حکیم صاحب مرحوم کے حالات جمع کرنے کی درخواست کی ۔ آخر آنھوں نے جو حال درجِ کتاب کیا اور جو اب بھی ملتا ہے ، وہ انھیں مولانا حالی مرحوم نے لکھ کر دیا تھا ۔ مولانا آزاد لکھتے ہیں کہ میں نے وہی الفاظ رکھے ہیں جو اصل لکھنے والے نے لکھے تھے اور کوئی چیز بدلی نہیں ۔ البتہ بعض مقامات سے آنھوں نے مضمون حذف کر دیا اور ایسے مقامات پر آنھوں نے اشارہ کر دیا ہے ، مولانا حالی مرحوم کا نام نہیں لکھا ۔ لیکن یہ روایت مجھے حکیم آزاد انصاری مدظلہ نے سنائی جو حضرت مولانا حالی مرحوم کے ارشد تلامذہ میں سے ہیں ۔ آپ چاہیں تو آن سے تصدیق فرما سکتے ہیں ۔

میں نے یہ خط لکھنے کی اس لیے جرأت کی ہے کہ آپ مولانا حالی مرحوم کے تذکرہ نگار ہیں اور آپ سے یہ واقعہ مخفی نہیں رہنا چاہیے اور جب خود مولانا آزاد مرحوم نے 'آب حیات' میں لکھ دیا کہ مومن مرحوم کے حالات آن کے اپنے لکھے ہوئے نہیں تو کیا وجہ ہے کہ ہم آنھیں آن کے اصلی لکھنے والے کی طرف منسوب نہ کریں اور اس امر کا اعلان نہ کریں ؟

والسلام بالاکرام ، خاکسار مالک رام[1]

۱۰ مئی سنہ ۱۹۳۷ء’’

۱۔ پنڈت برج موہن صاحب کیفی اور مالک رام صاحب دونوں کے اپنے ہاتھ کے لکھے ہوئے یہ خطوط میرے پاس محفوظ ہیں ۔ جو صاحب چاہیں ملاحظہ فرما سکتے ہیں ۔ (محمد اسماعیل)

> اب جب کہ یہ معاملہ دو مستند اور معزز گواہوں کے بیانات سے بالکل واضح طور پر ثابت ہو گیا کہ مومن کے جو حالات 'آب حیات' میں ہیں وہ تمام تر مولانا حالی مرحوم کے لکھے ہوئے تھے ، تو میں آن کو 'کلیات نثر حالی' میں شامل کرتا ہوا ذیل میں درج کرتا ہوں :
>
> (محمد اسماعیل)

ان کے والد حکیم غلام نبی خاں ولد حکیم نام دار خاں شہر کے شرفا میں سے تھے (جن کی اصل نجباے کشمیر سے تھی) اول حکیم نام دار خاں اور حکیم کام دار خاں دو بھائی سلطنت مغلیہ کے آخری دور میں (دہلی) آ کر بادشاہی طبیبوں میں داخل ہوئے ۔ شاہ عالم کے زمانے میں موضع بلامہ وغیرہ پرگنہ نارنول میں جاگیر پائی ۔ جب سرکار انگریزی نے جھجر کی ریاست نواب فیض طلب خاں کو عطا فرمائی تو پرگنہ نارنول بھی اس میں شامل تھا ۔ رئیس مذکور نے آن کی جاگیر ضبط کر کے ہزار روپیہ سالانہ پنشن وراثتاً حکیم نام دار خاں کے نام مقرر کر دی ۔ پنشن مذکور میں سے حکیم غلام نبی خاں صاحب نے اپنا حصہ لیا اور اس میں سے حکیم مومن خاں صاحب نے اپنا حق پایا ۔ اس کے علاوہ ان کے خاندان کے چار طبیبوں کے نام پر سو روپیہ ماہوار پنشن سرکار انگریزی سے بھی ملتی تھی ۔ اس میں سے ایک چوتھائی آن کے والد کو اور آن کے بعد اس میں سے ان کا حصہ ان کو ملتا رہا ۔

ان کی ولادت ۱۲۱۵ ہجری میں واقع ہوئی ۔ بزرگ جب دلی میں آئے تو چیلوں کے کوچے میں رہے تھے ۔ وہیں خاندان کی سکونت رہی ۔ شاہ عبدالعزیز صاحب کا مدرسہ وہاں سے بہت قریب تھا ۔ ان کے والد کو شاہ صاحب سے کمال عقیدت تھی ۔ جب یہ پیدا ہوئے تو حضرت ہی نے آ کر کان میں اذان دی اور

مومن خاں نام رکھا ۔ گھر والوں نے اس نام کو پسند نہ کیا اور حبیب اللہ نام رکھنا چاہا ۔ لیکن شاہ صاحب ہی کے نام سے نام پایا ۔

بچپن کی معمولی تعلیم کے بعد جب ذرا ہوش سنبھالا تو والد نے شاہ عبدالقادر صاحب کی خدمت میں پہنچایا ۔ ان سے عربی کی ابتدائی کتابیں پڑھتے رہے ۔ حافظے کا یہ حال تھا کہ جو بات شاہ صاحب سے سنتے تھے ، فوراً یاد کر لیتے تھے ۔ اکثر شاہ عبدالعزیز صاحب کا وعظ ایک دفعہ سن کر بعینہ اسی طرح ادا کر دیتے تھے ۔ جب عربی میں کسی قدر استعداد ہوگئی تو والد اور چچا حکیم غلام حیدر خاں اور غلام حسن خاں سے طب کی کتابیں پڑھیں اور انھی کے مطب میں نسخہ نویسی کرتے رہے ۔

نیز طبیعت کا خاصہ ہے کہ ایک فن پر دل نہیں جمتا ۔ اس نے بزرگوں کے علم یعنی طبابت پر تھمنے نہ دیا ۔ دل میں طرح طرح کے شوق پیدا کیے ۔ شاعری کے علاوہ نجوم کا خیال آیا ۔ اس کو اہل کمال سے حاصل کیا اور مہارت بہم پہنچائی ۔ ان کو نجوم سے قدرتی مناسبت تھی ۔ ایسا ملکہ بہم پہنچایا تھا کہ احکام سن سن کر بڑے بڑے منجم حیران رہ جاتے تھے ۔ سال بھر میں ایک بار تقویم دیکھتے تھے ، پھر برس دن تک تمام ستاروں کے مقام اور ان کی حرکات کی کیفیت ذہن میں رہتی تھی ۔ جب کوئی سوال پیش کرتا ، نہ زائچہ کھینچتے ، نہ تقویم دیکھتے ؛ پوچھنے والے سے کہتے کہ تم خاموش رہو ، جو میں کہتا جاؤں ، اس کا جواب دیتے جاؤ ۔ پھر مختلف باتیں پوچھتے تھے اور سائل اکثر کو تسلیم کرتا جاتا تھا ۔

ایک دن ایک غریب ہندو نہایت بے قرار اور پریشان آیا ۔ ان کے بیس برس کے رفیق قدیم شیخ عبدالکریم اس وقت موجود تھے ۔ خاں صاحب نے اسے دیکھ کر کہا کہ تمھارا کچھ مال جاتا

رہا ہے ؟ اس نے کہا ’’صاحب میں لٹ گیا‘‘ کہا ’’خاموش رہو ۔ جو میں کہوں ، اسے سنتے جاؤ ۔ جو غلط بات ہو اس کا انکار کر دینا‘‘ پھر پوچھا ’’کیا زیور کی قسم سے تھا ؟‘‘ ۔ ’’صاحب ہاں وہی عمر بھر کی کمائی تھی‘‘ کہا ’’تم نے لیا ہے یا تمھاری بیوی نے ، کوئی غیر چرانے نہیں آیا ۔‘‘ اس نے کہا ’’میرا مال تھا اور بیوی کے پہننے کا زیور تھا ، ہم کیوں چراتے ۔‘‘ ہنس کر فرمایا ’’کہیں رکھ کر بھول گئے ہو گے ۔ مال کہیں باہر نہیں گیا ۔‘‘ اس نے کہا ’’صاحب ! سارا گھر ڈھونڈ مارا ، کوئی جگہ باقی نہیں رہی ۔‘‘ فرمایا ’’پھر دیکھو ۔‘‘ گیا اور سارے گھر میں اچھی طرح دیکھا ۔ پھر آ کر کہا ’’صاحب میرا چھوٹا سا گھر ہے ۔ ایک ایک کونا دیکھ لیا ، کہیں پتا نہیں لگتا ۔‘‘ خاں صاحب نے کہا ’’اسی گھر میں ہے ، تم غلط کہتے ہو ۔‘‘ کہا ’’آپ چل کر تلاشی لے لیجیے ۔ میں تو ڈھونڈ چکا ۔‘‘ فرمایا ’’میں یہیں سے بتاتا ہوں ۔‘‘ یہ کہہ کر اس کے سارے گھر کا نقشہ بیان کرنا شروع کیا ۔ وہ سب باتوں کو تسلیم کرتا جاتا تھا ۔ پھر کہا ’’اس گھر میں جنوب کے رخ ایک کوٹھڑی ہے اور اس میں شمال کی جانب ایک لکڑی کا مچان ہے ۔ اس کے اوپر مال موجود ہے ، جا کر لے لو ۔‘‘ اس نے کہا ’’مچان کو تین دفعہ چھان مارا ، وہاں نہیں ملا ۔‘‘ فرمایا ’’اسی کے ایک کونے میں پڑا ہے ۔‘‘ غرض وہ گیا اور جب روشنی کرکے دیکھا تو ڈبا اور اس میں سارا زیور جوں کا توں وہیں سے مل گیا ۔

ایک صاحب کا مراسلہ اسی تحریر کے ساتھ مسلسل پہنچا ہے جس میں یہ اور اس قسم کے کئی اسرار نجومی ، ستاروں کی طرح چمک رہے ہیں اور ان کے شاگردوں کی تفصیل بھی لکھی ہے ۔ آزاد ان کے درج کرنے سے قاصر ہے ۔ معاف فرمائیں ، زمانہ ایک طرح کا نہیں ہے ، لوگ کہیں گے کہ تذکرۂ شعرا لکھنے بیٹھا اور نجومیوں کا تذکرہ

لکھنے لگا ۔

خاں صاحب نے اپنی نجوم دانی کو ایک غزل کے شعر میں نہایت خوبی سے ظاہر کیا ہے :

ان نصیبوں پر کیا اختر شناس
آسماں بھی ہے ستم ایجاد کیا

شطرنج سے بھی ان کو کمال مناسبت تھی ۔ جب کھیلنے بیٹھتے تھے تو دنیا و مافیہا کی خبر نہ رہتی تھی اور گھر کے نہایت ضروری کام بھی بھول جاتے تھے ۔ دلی کے مشہور شاطر کرامت علی خاں سے قرابت قریبہ رکھتے تھے اور شہر کے ایک دو مشہور شاطروں کے سوا کسی سے کم نہ تھے ۔

شعر و سخن سے انھیں طبعی مناسبت تھی اور عاشق مزاجی نے اسے اور بھی چمکا دیا تھا ۔ انھوں نے ابتدا میں شاہ نصیر مرحوم کو اپنا کلام دکھایا ، مگر چند روز کے بعد اُن سے اصلاح لینی چھوڑ دی اور پھر کسی کو استاد نہیں بنایا ۔

ان کے نامی شاگرد :

نواب مصطفٰی خاں شیفتہ صاحبِ تذکرۂ ”گلشن بے خار“ خلف نواب اعظم الدولہ سرفراز الملک مرتضٰی خاں مظفر جنگ بہادر رئیس پلول اور ان کے چھوٹے بھائی نواب اکبر خاں کہ ۴ برس ہوئے راولپنڈی میں دنیا سے انتقال کیا ۔ میر حسین تسکین کہ نہایت ذکی الطبع شاعر تھے ۔ سید غلام علی خاں وحشت ۔ غلام ضامن کرم ۔ نواب اصغر علی خاں کہ پہلے اصغر تخلص کرتے تھے ، پھر نسیم تخلص اختیار کیا اور مرزا خدا بخش قیصر شہزادے وغیرہ اشخاص تھے ۔

رنگین طبع ، رنگین مزاج ، خوش وضع ، خوش لباس ، کشیدہ قامت ، سبزہ رنگ ، سر پر لمبے لمبے گھونگر والے بال اور ہر وقت

انگلیوں سے ان میں کنگھی کرتے رہتے تھے : ململ کا انگرکھا ، ڈھیلے ڈھیلے پائنچے ، اس میں لال نیفہ بھی ہوتا تھا ۔ میں نے انھیں نواب اصغر علی خاں اور مرزا خدا بخش قیصر کے مشاعروں میں غزل پڑھتے ہوئے سنا تھا ۔ ایسی دردناک آواز سے ، دل پزیر ترنم کے ساتھ پڑھتے تھے کہ مشاعرہ وجد کرتا تھا ۔ اللہ اللہ اب تک وہ عالم آنکھوں کے سامنے ہے ۔ باتیں کہانیاں ہو گئیں ۔ باوجود اس کے نیک خیالوں سے بھی ان کا دل خالی نہ تھا ۔ نوجوانی ہی میں مولانا سید احمد صاحب بریلوی کے مرید ہوئے کہ مولوی اسماعیل صاحب کے پیر تھے ۔ خاں صاحب انھی کے عقائد کے قائل رہے ۔

انھوں نے کسی کی تعریف میں قصیدہ نہیں کہا ۔ ہاں راجا اجیت سنگھ برادر راجا کرم سنگھ رئیس پٹیالہ ، جو دہلی میں رہتے تھے اور ان کی سخاوتیں شہر میں مشہور تھیں ، وہ ایک دن مصاحبوں کے ساتھ سر راہ اپنے کوٹھے پر بیٹھے تھے ، خاں صاحب کا آدھر سے گزر ہوا ۔ لوگوں نے کہا ”مومن خاں شاعر یہی ہیں ۔“ راجا صاحب نے آدمی بھیج کر بلوایا ، عزت و تعظیم سے بٹھایا (کچھ نجوم ، کچھ شعر و سخن کی باتیں کیں) اور حکم دیا کہ ہتھنی کس کر لاؤ ۔ ہتھنی حاضر ہوئی ، وہ خاں صاحب کو عنایت کی ۔ انھوں نے کہا کہ مہاراج ! میں غریب آدمی ہوں ، اسے کہاں سے کھلاؤں گا اور کیوں کر رکھوں گا ۔ کہا کہ سو روپیہ اور دو ۔ خاں صاحب اسی پر سوار ہو کر گھر آئے اور پہلے اس سے کہ ہتھنی روپے کھائے ، اُسے بیچ کر فیصلہ کیا (اسی موقع پر اوج نے کہا تھا ۔ دیکھو صفحہ ۵۱۶) پھر خاں صاحب نے ایک قصیدہ مدحیہ شکریے میں کہہ کر راجا صاحب کو دیا جس کا مطلع ہے :

صبح ہوئی تو کیا ہوا ، ہے وہی تیرہ اختری
کثرت دود سے سیاہ شعلۂ شمع خاوری

سوا اس قصیدے کے اور کوئی مدح کسی دنیا دار کے صلہ و انعام کی توقع پر نہیں لکھی ۔ وہ اس قدر غیور تھے کہ کسی عزیز یا دوست کا ادنیٰ احسان بھی گوارا نہ کرتے تھے ۔

راجا کپور تھلہ نے انھیں ساڑھے تین سو روپیہ مہینا کر کے بلایا اور ہزار روپیہ خرچ سفر بھیجا ۔ وہ بھی تیار ہوئے مگر معلوم ہوا کہ وہاں ایک گوئیے کی بھی یہی تنخواہ ہے ۔ کہا کہ جہاں میری اور ایک گوئیے کی برابر تنخواہ ہو ، میں نہیں جاتا ۔

جس طرح شاعری کے ذریعے سے آنھوں نے روپیہ نہیں پیدا کیا ، اسی طرح نجوم ، رمل اور طبابت کو بھی معاش کا ذریعہ نہیں کیا ۔ جس طرح شطرنج ان کی ایک دل لگی کی چیز تھی ، اسی طرح نجوم ، رمل اور شاعری کو بھی ایک بہلاوا دل کا سمجھتے تھے ۔

خاں صاحب پانچ چار دفعہ دلی سے باہر گئے : اول رام پور اور وہاں جا کر کہا :

دلی سے رام پور میں ہے لایا جنوں کا شوق
ویرانہ چھوڑ آئے ہیں ، ویرانہ تر میں ہم

دوسری دفعہ سہسوان گئے ، وہاں فرماتے ہیں :

چھوڑ دلی کو سہسوان آیا
ہرزہ گردی میں مبتلا ہوں میں

جہانگیر آباد میں نواب مصطفیٰ خاں کے ساتھ کئی دفعہ گئے ۔

ایک دفعہ نواب شائستہ خاں کے ساتھ سہارن پور گئے ۔

اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ دلی میں جو میسر تھا ، اسی پر قانع تھے ، درست ہے ۔ تصدیق اس کی دیکھو ، غالب مرحوم کے حال میں ۔

آن کی تیزیِ ذہن اور ذکاوتِ طبع کی تعریف نہیں ہوسکتی ۔ وہ خود بھی ذہانت میں دو شخصوں کے سوا کسی ہم عصر کو

تسلیم نہ کرتے تھے ۔ ایک مولوی اسماعیل صاحب ، دوسرے خواجہ محمد نصیر صاحب کہ ان کے پیرو اور خواجہ میر درد صاحب کے نواسے تھے ۔

اسی سلسلے میں نواب مصطفیٰ خاں کی ایک وسیع تقریر ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایسا ذکی الطبع آج تک نہیں دیکھا ۔ ان کے ذہن میں بجلی کی سی سرعت تھی وغیرہ وغیرہ ۔ ساتھ اس کے مراسلت میں بعض اور معاملے منقول ہیں مگر ان میں بھی واردات کی بنیاد نہیں لکھی ۔ مثلاً یہ کہ مولا بخش قلق ، مولوی امام بخش صاحب صہبائی کے شاگرد رشید دیوان نظیری پڑھتے تھے ۔ ایک دن خاں صاحب کے پاس آئے اور ایک شعر کے معنے پوچھے ۔ انھوں نے ایسے نازک معنی اور نادر مطلب بیان فرمائے کہ قلق معتقد ہو گئے اور کہا کہ ”مولوی صاحب نے جو معنے بتائے ہیں ، وہ اس سے کچھ بھی نسبت نہیں رکھتے“ ۔ لیکن نہ وہ شعر لکھا ہے نہ کسی صاحب کے معنے لکھے ہیں ۔ ایسی باتوں کو آزاد نے افسوس کے ساتھ ترک کر دیا ہے ، شفیق مکرم معاف فرماویں ۔

لطیفہ :

ان کی عالی دماغی اور بلند خیالی شعرائے متقدمین و متاخرین میں سے کسی کی فصاحت یا بلاغت کو خاطر میں نہ لاتی تھی ۔ یہ قول آن کا مشہور تھا کہ گلستان سعدی کی تعریف میں لوگوں کے دم چڑھے جاتے ہیں ، اس میں ہے کیا ؟ ”گفت گفت ، گفتہ اند گفتہ اند“ کہتا چلا جاتا ہے ۔ اگر ان لفظوں کو کاٹ دو تو کچھ بھی نہیں رہتا ۔ ایک دن مفتی صدرالدین خاں مرحوم کے مکان پر یہی تقریر کی ۔ مولوی احمدالدین کرسانوالہ ، مولوی فضل حق صاحب کے شاگرد بیٹھے تھے ۔ انھوں نے کہا کہ قرآن شریف میں کیا فصاحت ہے ۔ جابجا ”قال قال قالوا قالوا“ ہے ۔

ان کے کسی شاگرد نے غزل میں یہ شعر لکھا تھا :

ہجر میں کیوں کر پھروں ہر سو نہ گھبرایا ہوا
وصل کی شب کا سماں آنکھوں میں ہے چھایا ہوا

خان صاحب نے پہلے مصرع کو یوں بدل دیا : ع

اس طرف کو دیکھتا بھی ہے تو شرمایا ہوا

اہل مذاق جانتے ہیں کہ اب شعر کہاں سے کہاں پہنچ گیا ہے ۔

ایک اور شخص نے الٰہی بخش کا سجع لکھا تھا : ع

مجھ گنہ گار کو الٰہی بخش

خان صاحب نے فرمایا :

میں گنہ گار ہوں الٰہی بخش

تاریخیں[1] :

تاریخ میں ہمیشہ تعمیہ اور تخرجہ معیوب سمجھا گیا جاتا ہے مگر ان کی طبع رسا نے اسے محسنات تاریخ میں داخل کر دیا ۔ چناں چہ اپنے والد کی تاریخ وفات کہی :

بہ من الہام گشت سال وفات
کہ غلام نبی بہ حق پیوست

'غلام' کے اعداد کے ساتھ 'حق' ملائیں تو پورے سنہِ فوت نکل آتے ہیں ۔ اپنی صغیر سن بیٹی کی تاریخِ فوت کہی :

خاک بر فرق دولتِ دنیا
من فشاندم خزانہ بر سر خاک

---

[1] ۱۔ ان تاریخوں کے لطف و نزاکت میں کلام نہیں ، لیکن اصول فن کے بہ موجب ۹ سے زیادہ کمی و بیشی جائز نہیں ۔ اس انداز کے ایجاد داخل معمہ ہیں ۔

'خزانہ' کے اعداد 'سر خاک' یعنی 'خ' کے ساتھ ملانے سے ۱۲۶۳ھ ہوتے ہیں ۔

تاریخ چاہ :

آب لذت فزا بہ جام بگیر

'آب لذت فزا' کے اعداد 'جام' کے اعداد میں ڈالو تو ۱۲۶۵ھ حاصل ہوئے ۔

ایک شخص زین خاں نام حج کو گیا ، رستے میں سے پھر آیا ۔ خان صاحب نے کہا : ع

چوں بیاید ہنوز خر باشد
۱۲۵۶ھ

شاہ محمد اسحاق صاحب نے دلی سے ہجرت کی ۔ خان صاحب نے کہا :

گفتیم وحید عصر اسحاق
بر حکم شہنشہِ دو عالم
بگذاشتہ دار حرب اسسال
جا کردہ بہ مکہ' معظّم

'وحید عصر اسحاق' کے اعداد 'مکہ' معظم' کے اعداد کے ساتھ ملاؤ اور دار حرب کے اعداد اس میں سے تفریق کرو تو ۱۲۶۰ھ تاریخ ہجرت نکلتی ہے ۔

ایک شخص قلعہ' دہلی سے نکالا گیا ۔ انھوں نے تاریخ کہی : ع

از باغ خلد بیروں شیطانِ بے حیا شد

'باغ خلد' کے اعداد میں سے 'شیطان بے حیا' کے عدد نکال ڈالیں تو ۱۲۲۶ ہجری رہتے ہیں ۔

سادی تاریخیں بھی عمدہ ہیں ۔ چناں چہ خلیل خاں کے ختنے کی تاریخ کہی :

"سنت خلیل اللہ"

اپنی عمہ کے مرنے کی تاریخ کہی : ع

لَہَا اَجْرٌ عَظِیْم

اپنے والد کی وفات کی تاریخ کہی : ع

قَد فَازَ فَوزاً عظیماً

اپنی بیٹی کی ولادت کی تاریخ کہی :

نال کٹنے کے ساتھ ہاتف نے
کہی تاریخ دختر مومن

'دختر مومن' کے اعداد میں سے 'نال' کے اعداد کو اخراج کیا ہے ۔

شاہ عبدالعزیز صاحب کی وفات کی تاریخ :

دستِ بے دادِ اجل سے بے سروپا ہوگئے
فقر و دیں ، فضل و ہنر ، لطف و کرم ، علم و عمل

الفاظِ مصرعِ آخر کے اول و آخر کے حرفوں کو گرا دو ۔ بیچ کے حرفوں کے عدد لے لو تو ۱۲۳۹ھ رہتے ہیں ۔

ان کے معمے بھی متعدد ہیں مگر ایک لاجواب ہے ۔ ایسا نہیں سنا گیا :

بنے کیوں کر کہ ہے سب کار اُلٹا
ہم اُلٹے ، بات اُلٹی ، یار اُلٹا

(یعنی 'مہتاب رائے')

پہیلیاں بھی کہیں : ایک یہاں لکھی جاتی ہے کہ گھڑیال پر ہے :

نہ بولے وہ جب تک کہ کوئی بلائے
نہ لفظ اور معنی سمجھ میں کچھ آئے
نہیں چور پھر ، وہ لٹکتا رہے
زمانے کا احوال بکتا رہے
شب و روز غوغا مچایا کرے
اسی طرح سے مار کھایا کرے

کوٹھے سے گرنے کے بعد انھوں نے حکم لگایا تھا کہ ۵ دن یا ۵ مہینے یا ۵ برس میں مر جاؤں گا ۔ چناں چہ ۵ مہینے کے بعد مر گئے ۔ گرنے کی تاریخ خود ہی کہی تھی :

"دست و بازو شکست"

مرنے کی تاریخ ایک شاگرد نے کہی :

"ماتم مومن"

دلی دروازے کے باہر میدھیوں کے جانب غرب زیر دیوار احاطے میں مدفون ہوئے ۔ شاہ عبدالعزیز صاحب کا خاندان بھی یہیں مدفون ہے ۔

روایت :

مرنے کے بعد لوگوں نے عجیب عجیب طرح سے خواب میں دیکھا ۔ ایک خواب نہایت سچا اور حیرت انگیز ہے ۔ نواب مصطفیٰ خاں نے دو برس بعد خواب میں دیکھا کہ ایک قاصد نے آ کر خط دیا کہ مومن مرحوم کا خط ہے ۔ انھوں نے لفافہ کھولا تو اس کے خاتمے پر ایک مہر ثبت تھی ، جس میں 'مومن جنتی' لکھا تھا اور خط کا مضمون یہ تھا کہ آج کل میرے عیال پر مکان کی

طرف سے بہت تکلیف ہے ، تم اُن کی خبر لو ۔ صبح کو نواب صاحب نے دو سو روپے ان کے گھر بھیجے اور خواب کا مضمون بھی کہلا بھیجا ۔ ان کے صاحب زادے احمد نصیر خاں سلمہ اللہ کا بیان ہے کہ فی الواقعہ ان دنوں میں ہم پر مکان کی نہایت تکلیف تھی ۔ برسات کا موسم تھا اور سارا مکان ٹپکتا تھا ۔[1]

---

[1] مولانا حالی نے مومن کے صرف حالات زندگی لکھ کر آزاد کو بھیجے تھے ، مومن کے کلام پر تنقید نہیں کی تھی ۔ مولانا آزاد نے ریویو کے لیے بے حد اصرار بھی کیا مگر مولانا حالی نے اپنے روایتی انکسار کی وجہ سے ریویو لکھنے سے انکار کر دیا ، جس پر آزاد نے ان حالات سے آگے مومن کے کلام پر رائے خود لکھی جو آب حیات میں موجود ہے ۔
(محمد اسماعیل)

۳

بیان حالی

(قلمی مسودے سے نقل کیا گیا)

یہ بہت اہم تاریخی اور سوانحی مقالہ ہے جسے مولانا حالی نے ۱۹۰۱ع میں نواب عمادالملک مولوی سید حسین بلگرامی کی فرمائش پر لکھ کر حیدر آباد دکن بھیجا تھا ۔ واقعہ یہ ہوا تھا کہ ایک انگریز مصنف نے لندن سے نواب عمادالملک کو لکھا کہ مولانا حالی کے حالات زندگی اور اُن کی تصنیفات کا کچھ تذکرہ مجھے لکھ کر بھیج دیجیے ۔ اس پر نواب صاحب مرحوم نے مولانا کو پانی پت لکھا کہ اپنے قلم سے اپنے کچھ حالات لکھ کر ارسال فرماویں تو میں اُن کو لندن بھیج دوں گا ۔ مولانا نے جو حالات نواب صاحب کو بھیجے اُن کی ایک نقل اپنے اُس دیوان کے ابتدائی خالی اوراق پر کر لی جو اُن کے استعمال میں رہتا تھا ، اور جس میں وہ وفات تک برابر ترمیم و تنسیخ اور کاٹ چھانٹ کرتے رہے ۔ میں جس زمانے میں مولانا حالی کی لائبریری کا انچارج تھا تو میں نے خواجہ سجاد حسین صاحب مرحوم (فرزند اصغر حضرت مولانا حالی) سے اُن کے والد محترم کا یہ مستعملہ دیوان لے کر اُن حالات کی علیحدہ نقل کر لی تھی

جسے ۱۹۳۹ء میں میں نے کتابی شکل میں مولانا کے فوٹو اور اُن کے خط کے عکس کے ساتھ شائع کیا۔

جب مولانا نے یہ خود نوشت حالات ۱۹۰۱ء میں لکھے اُسی وقت مولانا کے نواسے خواجہ غلام السبطین (جوائنٹ سیکرٹری طبیہ کالج دہلی) نے مولانا کے دیوان کے اوراق میں سے وہ نقل کرکے مولوی محبوب عالم ایڈیٹر 'پیسہ اخبار' لاہور کو اشاعت کے لیے بھیج دیے۔ مولوی محبوب عالم اُن ایام میں 'پیسہ اخبار' کے علاوہ 'انتخاب لاجواب'، 'بچوں کا اخبار' اور عورتوں کے لیے 'شریف بی بی' بھی نکالا کرتے تھے۔ مولوی صاحب نے اس مضمون کو 'بچوں کا اخبار' میں شائع کر دیا۔ جب ۳۱ دسمبر ۱۹۱۴ء کو مولانا حالی کا انتقال ہوا تو مولوی سید وحیدالدین سلیم نے ان ہی حالات کو 'پیسہ اخبار' لاہور میں اشاعت کے لیے بھیج دیا۔ بعد میں یہ حالات ایک مرتبہ رسالہ معارف اعظم گڑھ میں بھی چھپے تھے اور اب میں ان کو مولانا کے مضامین کے مجموعے کے ساتھ شامل کر رہا ہوں۔ بہت ہی مختصر طور پر میں نے اس مضمون پر کہیں کہیں ضروری حواشی اور نوٹ بھی لکھے ہیں جو مولانا کی عبارت کو سمجھنے میں ممدومعاون ہوں گے۔

۱۹۰۱ء سے پہلے بھی ایک مرتبہ مولانا کے حالات چھپے تھے؛ جب ۱۸۷۴ء میں مولانا لاہور کے محکمۂ تعلیم میں ناظرِ ادبی تھے، اُس وقت مولوی سیف الحق ادیب دہلوی ایڈیٹر رسالہ انجمن مفید عام قصور نے ستمبر ۱۸۷۴ء کے پرچے میں مولانا کے خاصے تفصیلی حالات لکھے تھے اور آپ کے کلام کا انتخاب بھی دیا تھا لیکن یہ پرچہ اب قطعاً ناپید ہے۔

۱۹۰۱ء سے اب تک جن جن مصنفین نے حالی پر قلم اُٹھایا ہے، اُن میں سے ایک بھی ایسا نہیں جس نے ان حالات سے فائدہ نہ اُٹھایا ہو اور ان حالات کو بعینہ یا پھیلا کر بیان نہ کیا ہو، مگر اس نقل میں بھی مصنفین نے سینکڑوں غلطیاں کی ہیں۔ مولانا کے سوانحی حالات کی کوئی ایک بھی تحریر میں نے آج تک ایسی نہیں دیکھی جس میں ایک دو یا پانچ دس غلطیاں نہ ہوں۔ آخر میں یہ ضروری بات بیان کرکے میں اس تمہید کو ختم کرتا ہوں کہ مولانا نے اپنے دیوان میں ان حالات کو لکھتے ہوئے عنوان 'ترجمہ حالی' لکھا تھا جسے میں نے یہاں 'بیان حالی' سے بدل دیا ہے۔ 'ترجمہ' کے معنی سوانحی حالات کے ہیں۔ مضمون پر سرخیاں بھی میری لگائی ہوئی ہیں۔ مولانا کے مضمون میں نہیں تھیں۔ (محمد اسماعیل)

ولادت :

میری ولادت تقریباً ۱۲۵۳ھ مطابق ۱۸۳۷ء میں بہ مقام قصبہ پانی پت، جو شاہجہان آباد (دہلی) سے جانب شمال ۵۳ میل کے فاصلے پر ایک قدیم بستی ہے، واقع ہوئی۔

سلسلۂ نسب :

اس قصبے میں کچھ کم سات سو برس سے قوم انصار کی ایک شاخ، جس سے راقم کو تعلق ہے، آباد چلی آتی ہے۔ ساتویں صدی

ہجری اور تیرھویں صدی عیسوی میں ، جب کہ غیاث‌الدین بلبن[1] تختِ دہلی پر متمکن تھا ، شیخ الاسلام خواجہ عبداللہ انصاری[2] معروف بہ پیرِ ہرات کی اولاد میں سے ایک بزرگ خواجہ ملک علی[3] نام ، جو علومِ متعارفہ میں اپنے عام معاصرین سے ممتاز تھے ، ہرات سے ہندوستان میں وارد ہوئے تھے ، جن کا سلسلۂ نسب ۲۶ واسطے سے حضرت ابو ایوب[4] انصاریرض تک اور ۱۸ واسطے سے شیخ الاسلام تک اور ۱۰ واسطے سے ملک محمود شاہ انجو ملقب بہ آق خواجہ تک ، جو غزنوی دور میں فارس و کرمان و عراقِ عجم کا فرماں روا تھا ، پہنچتا ہے -

---

[1] غیاث‌الدین بلبن : خاندانِ غلاماں کا نواں بادشاہ اور بڑا منتظم ، لائق ، منصف ، متقی اور پرہیزگار انسان تھا - شمس‌الدین التتمش نے بطور ایک غلام کے خریدا تھا ، پھر اپنی بیٹی اُس سے بیاہ دی - تقدیر نے ۶۶۴ھ (۱۲۶۶ع) میں اسے دہلی کے تخت پر بٹھا دیا - نہایت کامیابی اور امن و امان کے ساتھ ۲۰ سال ہندوستان پر حکومت کرنے کے بعد ۸۰ برس کی عمر میں ۶۸۶ھ (۱۲۸۷ع) میں انتقال کیا - (محمد اسماعیل)

[2] خواجہ عبداللہ انصاری : ہرات کے نہایت مقدس اور صاحبِ علم و فضل بزرگ تھے - یہ بہت سی کتابوں کے مصنف اور بڑے صوفی منش انسان تھے - آلِ سلجوق کے زمانے میں ۹ شعبان ۳۹۶ھ (۱۰۰۶ع) کو پیدا ہوئے اور ۸۵ برس کی عمر پا کر ۴۸۱ھ (۱۰۸۸ع) میں اس دارِ فانی سے رحلت فرمائی - (محمد اسماعیل)

[3] خواجہ ملک علی : یہی بزرگ تھے جو انصاریوں میں سب سے پہلے پانی پت میں وارد ہوئے - ۷۱۸ھ ان کا سالِ وفات ہے - (محمد اسماعیل)

[4] حضرت ابو ایوب انصاریرض : آنحضرتؐ کے جلیل‌القدر صحابی ہیں - ۴۷ھ (۶۸۸ع) میں قسطنطنیہ کی دیواروں کے نیچے انتقال فرمایا جہاں آپ جہاد کے لیے تشریف لے گئے تھے - آپ کا مزار آج بھی زیارت گاہِ عوام ہے - (محمد اسماعیل)

آباو اجداد کا ہندوستان آنا :

چوں کہ غیاث‌الدین اس بات میں نہایت مشہور تھا کہ وہ قدیم اشراف خاندانوں کی بہت عزت کرتا تھا اور اس کا بیٹا سلطان محمد[1] علما و شعرا و دیگر اہلِ کمال کا حد سے زیادہ قدردان تھا اس لیے اکثر اہلِ علم اور عالی خاندان لوگ ایران و ترکستان سے ہندوستان کا قصد کرتے تھے - اسی شہرت نے خواجہ ملک علی کو سفرِ ہندوستان پر آمادہ کیا تھا - چناں چہ سلطان غیاث‌الدین نے چند عمدہ اور سیر حاصل دیہات پرگنۂ پانی پت میں ، اور معتدبہ اراضی سوادِ قصبۂ پانی پت میں بطور مددِ معاش کے ، اور بہت سی زمین اندرون آبادیِ قصبۂ پانی پت میں واسطے سکونت کے اُن کو عنایت کی اور منصبِ قضا و صدارت و تشخیص نرخ بازار اور تولیتِ مزاراتِ ائمہ ، جو سواد پانی پت میں واقع ہیں ، اور خطابتِ عیدین اُن کے متعلق کر دی -

پانی پت میں جو اب تک ایک محلہ انصاریوں کا مشہور ہے ، وہ انھی بزرگ کی اولاد سے منسوب ہے -[2]

---

[1] سلطان محمد : غیاث‌الدین کا بیٹا اور ملتان اور سندھ کا صوبے‌دار تھا - نہایت علم دوست اور فاضل شخص تھا - اس کا دربار ہمیشہ علما و فضلا سے بھرا رہتا تھا - شیخ سعدیؒ کو ایران سے طلب کیا مگر وہ نہ آ سکے - البتہ انھوں نے اپنے ہاتھ کی لکھی ہوئی گلستان و بوستان کا ایک ایک نسخہ ہدیۃً بھیجا - افسوس کہ یہ شاہزادہ مغلوں سے ایک لڑائی کے دوران میں ۶۸۳ھ میں مارا گیا - (محمد اسماعیل)

[2] افسوس صد افسوس کہ اب اس محلے میں ایک شخص بھی قوم انصار کا موجود نہیں اور سب کے سب وطن چھوڑ کر پاکستان آ چکے ہیں - پانی پت مسلمانوں سے ، اُن کے علوم و فنون سے ، اُن کی تہذیب و

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

میں باپ کی طرف سے اسی شاخ سے علاقہ رکھتا ہوں اور میری والدہ سادات کے ایک معزز گھرانے کی، جو یہاں "سادات شہدا پور" کے نام سے مشہور ہیں، بیٹی تھیں۔

خاندان کا ذریعۂ معاش :

اگرچہ خواجہ ملک علی کی اولاد میں بہت سے لوگوں نے اول سلطنتِ مغلیہ کے عہد میں اور پھر شاہانِ اودھ کی سرکار میں نہایت درجے کا امتیاز حاصل کیا تھا مگر زیادہ تر یہ لوگ اسی ملک و مددِ معاش پر قانع رہے جو سلاطینِ اسلام کی طرف سے وقتاً فوقتاً اُن کو عطا ہوتی رہی۔

میرے آبا و اجداد نے، جہاں تک معلوم ہے، ظاہرا کوئی خدمت دلی یا لکھنؤ میں اختیار نہیں کی۔ سب سے پہلے میرے باپ نے سرکار انگریزی کی نوکری سررشتۂ پرمٹ میں اختیار کی تھی۔

والد کا انتقال اور بھائی کی سرپرستی :

میری ولادت کے بعد میری والدہ کا دماغ مختل ہو گیا تھا اور میرے والد نے (۴۰ برس کی عمر میں) سن کہولت میں انتقال کیا جب کہ میں نو برس کا تھا، اس لیے میں نے ہوش سنبھال کر اپنا سرپرست بھائی بہنوں[۱] کے سوا کسی کو نہیں پایا۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

شائستگی سے اور اُن کے علم تجوید و قرأت سے (جس کے لیے وہ تمام اسلامی دنیا میں مشہور تھا) بالکل محروم ہو چکا ہے۔ اور اُس شہر کی بعینہ وہی حالت ہوگئی ہے جو اندلس مرحوم کی مسلمانوں کے نکل جانے سے ہوگئی تھی۔ خاکسار راقم الحروف کا مکان بھی اسی محلۂ انصار میں مولانا حالی کے آبائی مکان سے بالکل ملا ہوا تھا۔ افسوس سب کچھ تباہ ہو گیا۔ انا للہ و انا الیہ راجعون۔ (محمد اسماعیل)

[۱] مولانا کے بھائی کا نام خواجہ امداد حسین تھا اور وہ یوپی میں انسپکٹر پولیس تھے۔ ۱۸۸۶ع میں انتقال کیا۔ بہنیں دو تھیں؛ ایک کا نام امۃ الحسین تھا اور دوسری کا وجیہ النساء۔ (محمد اسماعیل)

تعلیم :

اُنھوں نے اول مجھ کو قرآن حفظ کرایا۔ اس کے بعد اگرچہ تعلیم کا شوق خود بخود میرے دل میں حد سے زیادہ تھا مگر باقاعدہ اور مسلسل تعلیم کا کبھی موقع نہیں ملا۔ ایک بزرگ سید جعفر علی مرحوم، جو میر ممنون دہلوی کے بھتیجے اور نیز داماد بھی تھے اور بہ وجہ تعلق زنا شوئی کے پانی پت میں مقیم تھے، اور فارسی لٹریچر، تاریخ اور طب میں یدِ طولیٰ رکھتے تھے، اُن سے دو چار فارسی کی ابتدائی کتابیں پڑھیں اور اُن کی صحبت میں فارسی لٹریچر سے ایک نوع کی مناسبت پیدا ہو گئی۔ پھر عربی کا شوق ہوا۔ انھی دنوں میں مولوی حاجی ابراہیم حسین انصاری مرحوم لکھنؤ سے امامت کی سند لے کر آئے تھے، اُن سے صرف و نحو پڑھی۔

شادی :

چند روز بعد بھائی اور بہن نے، جن کو میں بہ منزلہ والدین کے سمجھتا تھا، تأہل پر مجبور کیا۔ اُس وقت میری عمر ۱۷ برس کی تھی اور زیادہ تر بھائی کی نوکری پر سارے گھر کا گزارا تھا کہ یہ جؤا میرے کندھے پر رکھا گیا۔

تعلیم کا شوق دھلی لے گیا :

اب بظاہر تعلیم کے دروازے چاروں طرف سے مسدود ہو گئے۔ سب کی یہ خواہش تھی کہ میں نوکری تلاش کروں مگر تعلیم کا شوق غالب تھا اور بیوی کا میکا آسودہ حال۔ میں گھر والوں سے روپوش ہو کر دلی چلا گیا اور قریب ڈیڑھ برس کے وہاں رہ کر کچھ صرف و نحو اور کچھ ابتدائی کتابیں منطق کی مولوی نوازش علی مرحوم سے، جو وہاں ایک مشہور واعظ اور مدرس تھے، پڑھیں۔

انگریزی نہ پڑھنے کے وجوہات :

اگرچہ اُس وقت قدیم دہلی کالج خوب رونق پر تھا مگر جس سوسائٹی میں میں نے نشو و نما پائی تھی ، وہاں علم صرف عربی اور فارسی زبان میں منحصر سمجھا جاتا تھا ۔ انگریزی تعلیم کا خاص کر پانی پت میں اول تو کبھی ذکر ہی سننے میں نہیں آتا تھا اور اگر اُس کی نسبت لوگوں کا کچھ خیال تھا تو صرف اس قدر کہ وہ سرکاری نوکری کا ایک ذریعہ ہے ، نہ یہ کہ اُس سے کوئی علم حاصل ہوتا ہے ۔ بلکہ برخلاف اس کے انگریزی مدرسوں کو ہمارے علما مجہلے[1] کہتے تھے ۔ دلی پہنچ کر جس مدرسے میں مجھ کو شب و روز رہنا پڑا ، وہاں سب مدرس اور طلبہ کالج کے تعلیم یافتہ لوگوں کو محض جاہل سمجھتے تھے ۔ غرض کبھی بھول کر بھی انگریزی تعلیم کا خیال دل میں نہ گزرتا تھا ۔ ڈیڑھ برس تک دہلی میں رہنا ہوا ، اس عرصے میں کبھی کالج کو جا کر آنکھ سے دیکھا تک نہیں اور نہ اُن لوگوں سے (اُس زمانے میں) کبھی ملنے کا اتفاق ہوا جو اُس وقت کالج میں تعلیم پاتے تھے ۔ جیسے مولوی ذکاء اللہ ، مولوی نذیر احمد ، مولوی محمد حسین آزاد وغیرہ وغیرہ ۔

دلی سے جبری واپسی :

میں نے دلی میں شرح مسلم ، ملا حسن اور میبذی پڑھنی شروع کی تھی کہ سب عزیزوں اور بزرگوں کے جبر سے چار و ناچار مجھ کو دلی چھوڑنا اور پانی پت واپس آنا پڑا ۔ یہ ذکر ۱۸۵۵ع کا ہے ۔ دلی سے آ کر برس ڈیڑھ برس تک پانی پت سے کہیں جانے کا اتفاق نہیں ہوا ۔ یہاں بطورِ خود اکثر بے پڑھی کتابوں کا مطالعہ کرتا رہا ۔

---

[1] ۱۔ یعنی جہالت کی جگہ ۔

ملازمت :

۱۸۵۶ع میں مجھے ضلع حصار میں ایک قلیل تنخواہ کی اسامی صاحب کلکٹر کے دفتر میں مل گئی ۔

۱۸۵۷ع کا غدر اور ملازمت کا چھوٹ جانا :

۵۷ع میں جب کہ سپاہ باغی کا فتنہ ہندوستان میں برپا ہوا اور حصار میں بھی اکثر سخت واقعات ظہور میں آئے اور سرکاری عمل داری اٹھ گئی ، تو میں وہاں سے پانی پت چلا آیا اور قریب چار برس کے پانی پت میں بےکاری کی حالت میں گزرے ۔

دوبارہ تعلیم کا آغاز :

اس عرصے میں پانی پت کے مشہور فضلا مولوی عبدالرحمان[1] ، مولوی محب اللہ[2] اور مولوی قلندر علی[3] مرحومان سے بغیر کسی ترتیب اور نظام کے کبھی منطق یا فلسفہ ، کبھی حدیث ، کبھی تفسیر پڑھتا رہا اور جب ان صاحبوں میں سے کوئی پانی پت میں نہ ہوتا تھا تو خود بغیر پڑھی کتابوں کا مطالعہ کرتا تھا ، اور خاص کر علمِ ادب کی کتابیں شروح اور لغات کی مدد سے اکثر دیکھا کرتا تھا ، اور کبھی کبھی عربی نظم و نثر بھی بغیر کسی کی اصلاح یا مشورے کے لکھتا تھا مگر اس پر اطمینان نہ ہوتا تھا ۔ میری عربی اور فارسی تحصیل کا منتہا صرف اسی قدر ہے جس قدر اوپر ذکر کیا گیا ۔

---

[1] ۱۔ مولوی عبدالرحمان : حضرت شاہ عبدالغنی کے شاگرد اور بہت بڑے فاضل انسان تھے ، ۱۸۹۶ع میں انتقال کیا ۔ (محمد اسماعیل)

[2] ۲۔ مولوی محب اللہ : پانی پت کے مشہور ترین فضلا میں سے تھے ۔ ۱۸۶۷ع میں وفات پائی ۔ (محمد اسماعیل)

[3] ۳۔ مولوی قلندر علی زبیری : ادبیات کے ماہر اور معقول و منقول کے فاضل تھے ۔ ۱۸۷۶ع میں انتقال کیا ۔ (محمد اسماعیل)

مرزا غالب کی خدمت میں باریابی :

جس زمانے میں میرا دلی جانا ہوا تھا ، مرزا اسداللہ خاں غالب مرحوم کی خدمت میں اکثر جانے کا اتفاق ہوتا تھا اور اکثر ان کے اُردو اور فارسی دیوان کے اشعار ، جو سمجھ میں نہ آتے تھے ، اُن کے معنی اُن سے پوچھا کرتا تھا ، اور چند فارسی قصیدے انھوں نے اپنے دیوان میں سے مجھے پڑھائے بھی تھے ۔ اُن کی عادت تھی کہ وہ اپنے ملنے والوں کو اکثر فکرِ شعر کرنے سے منع کیا کرتے تھے ۔ مگر میں نے جو ایک آدھ غزل اُردو یا فارسی کی لکھ کر اُن کو دکھائی تو اُنھوں نے مجھ سے یہ کہا کہ ''اگرچہ میں کسی کو فکرِ شعر کی صلاح نہیں دیا کرتا لیکن تمھاری نسبت میرا یہ خیال ہے کہ اگر تم شعر نہ کہو گے تو اپنی طبیعت پر سخت ظلم کرو گے ۔'' مگر اُس زمانے میں ایک دو غزل سے زیادہ دلی میں شعر لکھنے کا اتفاق نہیں ہوا ۔

نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ سے تعلق :

غدر کے بعد جب کئی برس پانی پت میں بے کاری کی حالت میں گزر گئے تو فکرِ معاش نے گھر سے نکلنے پر مجبور کیا ۔ حسنِ اتفاق سے نواب مصطفیٰ خاں مرحوم[1] رئیس دہلی و تعلقہ دار جہانگیر آباد ضلع بلند شہر سے ، جو فارسی میں حسرتی اور اردو میں شیفتہ تخلص کرتے تھے اور شاعری کا اعلیٰ درجے کا مذاق رکھتے تھے ، شناسائی ہو گئی اور آٹھ سات برس تک بطور مصاحبت کے اُن کے ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا ۔

نواب صاحب جس درجے کے فارسی اور اُردو زبان کے شاعر تھے ، اُس کی بہ نسبت اُن کا مذاقِ شاعری بہ مراتب بلندتر اور اعلیٰ تر واقع ہوا تھا ۔ انھوں نے ابتدا میں اپنا فارسی اور اُردو کلام مومن خاں[1] کو دکھایا تھا مگر اُن کے مرنے کے بعد وہ مرزا غالب سے مشورۂ سخن کرنے لگے تھے ۔ میرے وہاں جانے سے اُن کا پرانا شعر و سخن کا شوق ، جو مدت سے افسردہ ہو رہا تھا ، تازہ ہو گیا اور اُن کی صحبت میں میرا طبعی میلان بھی ، جو اب تک مکروہات کے سبب اچھی طرح ظاہر نہ ہونے پایا تھا ، چمک اٹھا ۔ اُسی زمانے میں اُردو اور فارسی کی اکثر غزلیں نواب صاحب مرحوم کے ساتھ لکھنے کا اتفاق ہوا ۔ انھی کے ساتھ میں جہانگیر آباد سے اپنا کلام مرزا غالب کے پاس بھیجتا تھا مگر در حقیقت مرزا کے مشورہ و اصلاح سے مجھے چنداں فائدہ نہیں ہوا جو نواب صاحب مرحوم کی صحبت سے ہوا ۔ وہ مبالغے کو ناپسند کرتے تھے اور حقایق و واقعات کے بیان میں لطف پیدا کرنا اور سیدھی سادی اور سچی باتوں کو محض حسنِ بیان سے دل فریب بنانا ، اسی کو منتہائے کمالِ شاعری سمجھتے تھے ۔ چھچھورے اور بازاری الفاظ و محاورات اور عامیانہ خیالات سے شیفتہ اور غالب دونوں متنفر تھے ۔

نواب شیفتہ کے مذاق کا اندازہ اس ایک واقعے سے بخوبی ہو سکتا ہے کہ ایک روز انیس کے مرثیے کا ذکر ہو رہا تھا ۔

---

[1] ۱۔ شیفتہ : بہت متین ، سنجیدہ اور مہذب بزرگ تھے ۔ ۱۸۰۶ع میں بہ مقام دہلی پیدا ہوئے ۔ عربی و فارسی کے عالم اور متعدد کتابوں کے مصنف تھے ۔ حکیم مومن خاں مومن کے فنِ شعر میں شاگرد تھے ۔ اُن کا تذکرۂ شعرائے اُردو ''گلشنِ بے خار'' بہت مشہور ہے ۔ ۱۸۶۹ع میں انتقال کیا ۔ (محمد اسماعیل)

[1] ۱۔ حکیم مومن خاں مومن : کشمیری الاصل اور خاندانی طبیب تھے ۔ دہلی میں مستقل سکونت اختیار کر لی تھی ۔ پچھلے دور کے نہایت مشہور شاعروں میں شمار ہوتے ہیں ۔ ۱۲۳۳ھ (۱۸۱۷ع) میں پیدا ہوئے اور ۱۲۶۹ھ (۱۸۵۲ع) میں اتفاقیہ کوٹھے سے گر کر مر گئے ۔ صرف ۳۵ سال کی عمر پائی ۔ (محمد اسماعیل)

انھوں نے انیس کے مرثیے کا یہ پہلا مصرع پڑھا :

آج شبیر پہ کیا عالم تنہائی ہے

اور کہا کہ انیس[۱] نے ناحق مرثیہ لکھا ، یہی ایک مصرع بجائے خود ایک مرثیے کے برابر تھا ۔ اُن کے خیالات کا اثر مجھ پر بھی پڑنے لگا اور رفتہ رفتہ ایک خاص قسم کا مذاق پیدا ہو گیا ۔

گورنمنٹ بک ڈپو کی ملازمت :

نواب شیفتہ کی وفات کے بعد پنجاب گورنمنٹ بک ڈپو (لاہور) میں ایک اسامی مجھ کو مل گئی ، جس میں مجھے یہ کام کرنا پڑتا تھا کہ جو ترجمے انگریزی سے اُردو میں ہوتے تھے اُن کی اُردو عبارت درست کرنے کو مجھے ملتی تھی ۔ تقریباً چار برس میں نے یہ کام لاہور میں رہ کر کیا ۔ اس سے انگریزی لٹریچر کے ساتھ فی الجملہ مناسبت پیدا ہو گئی اور نامعلوم طور پر آہستہ آہستہ مشرق اور خاص کر عام فارسی لٹریچر کی وقعت دل سے کم ہونے لگی ۔

لاہور میں ایک نئی قسم کے مشاعرے کا انعقاد :

لاہور ہی میں کرنیل ہالرائڈ ڈائرکٹر پبلک انسٹرکشن پنجاب کے ایما سے مولوی محمد حسین[۲] آزاد نے اپنے پرانے ارادے کو پورا

---

[۱] انیس : میر حسن دہلوی کے پوتے ، زبردست شاعر اور اُردو میں مرثیہ گوئی کی ایک خاص طرز کے موجد ہیں ۔ صفائی کلام ، خوبیِ بیان ، لطفِ محاورہ اور سوز و گداز اُن کے کلام کی خاص خصوصیات ہیں ۔ ۲۹ شوال ۱۲۹۱ھ کو ۷۱ سال کی عمر پا کر لکھنؤ میں انتقال کیا ۔ (محمد اسماعیل)

[۲] شمس العلما مولانا محمد حسین آزاد دہلوی : مولوی محمد باقر کے فرزند ، ذوق کے شاگرد اور گورنمنٹ کالج لاہور کے پروفیسر اور ادب اُردو کے بے مثل انشا پرداز تھے ۔ آب حیات ، دربار اکبری اور سخندان پارس ان

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

کیا : یعنی ۱۸۷۴ع میں ایک مشاعرے کی بنیاد ڈالی جو ہندوستان میں اپنی نوعیت کے لحاظ سے بالکل نیا تھا اور جس میں بجائے مصرعِ طرح کے کسی مضمون کا عنوان شاعروں کو دیا جاتا تھا کہ اس مضمون پر اپنے خیالات جس طرح چاہیں نظم میں ظاہر کریں ۔

میں نے بھی اسی زمانے میں چار مثنویاں ، ایک برسات پر ، دوسری امید پر ، تیسری انصاف پر اور چوتھی حبِ وطن پر لکھیں ۔

اینگلو عربک اسکول دہلی کی مدرسی ، مسدس اور بعض دیگر نظموں کی تصنیف :

اس کے بعد لاہور سے دہلی میں اینگلو عربک اسکول کی مدرسی پر بدل آیا ۔ یہاں آ کر اول میں نے ایک آدھ نظم بطورِ خود اسی طرز کی ، جس کی تحریک لاہور میں ہوئی تھی ، لکھی ، پھر سر سید احمد خاں مرحوم نے ترغیب دلائی کہ مسلمانوں کی موجودہ پستی و تنزل کی حالت اگر نظم میں بیان کی جائے تو مفید ہوگی ۔ چناں چہ میں نے اول مسدس 'مد و جزرِ اسلام' اور اس کے بعد اور نظمیں ، جو چھپ کر بار بار شائع ہو چکی ہیں ، لکھیں ۔

تریاق مسموم :

نظم کے سوا میں نے نثرِ اُردو میں بھی چند کتابیں لکھی ہیں ۔ سب سے پہلے غالباً ۱۸۶۷ع میں ایک کتاب 'تریاقِ مسموم' ایک نیٹو کرسچن کی کتاب کے جواب میں ، جو میرا ہم وطن تھا

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

کی مشہور کتابیں ہیں ۔ ادبی مضامین کا مجموعہ 'نیرنگِ خیال' کے نام سے شائع ہو چکا ہے ۔ ۲۱ سال تک مرض جنون میں مبتلا رہنے کے بعد لاہور میں ۲۲ جنوری ۱۹۱۰ع کو انتقال کیا ۔ مولانا حالی نے تاریخ کہی :

ہوا خاتمہ اُردو کے ادب کا (محمد اسماعیل)

اور مسلمان سے عیسائی ہو گیا تھا ، لکھی تھی جس کو اسی زمانے میں لوگوں نے مذہبی میگزینوں میں شائع کر دیا تھا ۔

علم طبقات الارض پر ایک کتاب کا ترجمہ :

اس کے بعد لاہور میں ایک عربی کتاب کا ، جو جیولوجی میں تھی اور جو فرنچ سے عربی میں کسی مصری فاضل نے ترجمہ کی تھی ، اردو میں ترجمہ کیا اور اس کا کاپی رائٹ (حق تصنیف) بغیر کسی معاوضے کے پنجاب یونیورسٹی کو دے دیا ۔ چناں چہ ڈاکٹر لائٹنر کے زمانے میں اس کو یونیورسٹی نے چھاپ کر شایع کر دیا تھا ۔ مگر اول تو وہ اصل کتاب پچاس ساٹھ برس پہلے کی لکھی ہوئی تھی جب کہ جیولوجی (علم طبقات الارض) کا علم ابتدائی حالت میں تھا ، دوسرے مجھ کو اس فن سے محض اجنبیت تھی ، اس لیے اصل اور ترجمہ دونوں غلطیوں سے خالی نہ تھے ۔

مجالس النساء :

لاہور ہی میں ایک کتاب عورتوں کی تعلیم کے لیے قصے کے پیرائے میں موسوم بہ مجالس النساء لکھی تھی جس پر کرنیل ہالرائڈ نے ایک ایجوکیشنل دربار میں بمقام دہلی مجھے لارڈ نارتھ بروک[1] کے ہاتھ سے چار سو روپے کا انعام دلوایا تھا اور جو اودھ اور پنجاب کے مدارسِ نسواں میں مدت تک جاری رہی اور شاید اب بھی کہیں جاری ہو ۔

حیاتِ سعدی :

پھر دلی میں سعدی شیرازی کی لائف اور اُن کی نظم و نثر پر ریویو لکھ کر شایع کیا جس کا نام 'حیاتِ سعدی' ہے اور جس کے

---

[1] لارڈ نارتھ بروک : ہندوستان کا وایسرائے تھا جس نے ۱۸۷۲ء سے ۱۸۷۶ء تک حکومت کی ہے ۔ (محمد اسماعیل)

دس بارہ ایڈیشن اب سے پہلے شایع ہو چکے ہیں ۔

مقدمہٴ شعر و شاعری اور دیوان :

پھر شاعری پر ایک مبسوط اسّے (مضمون) لکھ کر بطور مقدمے کے اپنے دیوان کے ساتھ شائع کیا ۔

یادگار غالب :

اس کے بعد مرزا غالب مرحوم کی لائف جس میں اُن کی فارسی اور اُردو نظم و نثر کا انتخاب بھی شامل ہے اور نیز اُن کی شاعری پر ریویو بھی کیا گیا ہے ، 'یادگارِ غالب' کے نام سے لکھ کر شائع کی ۔

حیات جاوید :

اب سر سید احمد خان مرحوم کی لائف موسوم بہ حیات جاوید[1] ، جو تقریباً ہزار صفحے کی کتاب ہے لکھی ، جو امید ہے کہ مارچ یا اپریل میں شائع ہو جائے گی ۔

فارسی صرف و نحو کے متعلق چند کتابیں :

ان کے سوا اور بھی بعض کتابیں فارسی گریمر[2] وغیرہ میں لکھی ہیں جو چنداں ذکر کے قابل نہیں ہیں ۔

مختلف مضامین :

اس کے علاوہ تیس بتیس مضمون بھی مختلف عنوانوں پر مختلف

---

[1] حیات جاوید : ۱۹۰۱ء میں چھپی ۔ اُس وقت سے اب تک اس کے پانچ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں ۔ (محمد اسماعیل)

[2] فارسی گریمر میں مولانا نے ایک کتاب ''اصولِ فارسی'' کے نام سے لکھی تھی مگر اُس کے چھپنے کی نوبت نہیں آئی ۔ (محمد اسماعیل)

اوقات میں لکھے جو ’تہذیب الاخلاق‘ ’علی گڑھ گزٹ‘ اور دیگر اخبارات و رسائل میں شایع ہوئے ہیں ۔

فارسی نظم و نثر :

نیز اردو کے علاوہ فارسی میں کسی قدر زیادہ اور عربی میں کم میری نظم و نثر موجود ہے جو ہنوز شایع نہیں ہوئی[1] ۔ جب سے ان دونوں زبانوں کا رواج ہندوستان میں کم ہونے لگا ہے ، اُس وقت سے ان کی طرف توجہ نہیں رہی ۔

فارسی و اُردو نظم :

میری سب سے اخیر فارسی نظم وہ ترکیب بند ہے جو سر سید کی وفات پر میں نے ۱۸۹۸ع میں لکھا تھا[2] اور اردو میں سب سے اخیر وہ نظم ہے جو حال میں ایمپرس وکٹوریہ کی وفات پر لکھی ہے اور علی گڑھ گزٹ میں شایع ہو چکی ہے[3] ۔

حیدر آباد سے وظیفے کا اجرا اور ملازمت سے علیحدگی :

۱۳۰۵ھ میں جب میں اینگلو عربک اسکول دہلی میں مدرس تھا ، نواب سر آسمان جاہ بہادر مرحوم مدار المہام سرکارِ عالی نظام اثنائے سفرِ شملہ میں علی گڑھ محمڈن کالج کے ملاحظے کے لیے سرسید احمد خاں مرحوم کی کوٹھی واقع علی گڑھ میں فروکش ہوئے تھے اور میں بھی اُس وقت علی گڑھ گیا ہوا تھا ۔ نواب صاحب

---

[1] عربی و فارسی نظم و نثر کا مجموعہ مولانا کی وفات سے چند ماہ پیشتر اگست ۱۹۱۴ع میں شائع ہو چکا تھا ۔ (محمد اسماعیل)

[2] سرسید کا یہ فارسی مرثیہ مولانا کے شائع کردہ مجموعہ‘ کلیات نظم حالی میں موجود ہے ۔ (محمد اسماعیل)

[3] یہ پُر زور نظم ”کلیاتِ نظمِ حالی“ میں موجود ہے ، جو میں نے ۱۹۲۴ع میں شائع کی تھی ۔ (محمد اسماعیل)

ممدوح نے بہ‌صیغہ‘ امداد مصنفین ایک وظیفہ تعدادی پچھتر روپے ماہوار کا میرے لیے مقرر فرمایا اور ۱۳۰۹ھ میں جب کہ میں سرسید مرحوم کے ہمراہ بشمول دیگر ممبران ڈیپوٹیشن ٹرسٹیان محمڈن کالج علی گڑھ ، حیدر آباد گیا تھا ، اس وظیفے میں پچیس روپے ماہوار کا اضافہ کرکے سو روپے سکہ حالی کا وظیفہ میرے لیے مقرر کر دیا جو اب تک مجھ کو ماہ بہ ماہ سرکار عالی سے ملتا ہے اور اُسی وقت سے میں نے اینگلو عربک ہائی سکول دہلی کا تعلق قطع کر دیا ہے ۔

اضافۂ مرتب :

مولانا نے یہ سوانح عمری جنوری ۱۹۰۱ع میں لکھی تھی ۔ اسی سال میں آپ نے سر سید کی جامع اور مبسوط سوانح حیات شائع کی (جس کا ذکر مولانا خود کر چکے ہیں) اس کے بعد مولانا نے چند متفرق قومی اور اصلاحی نظمیں لکھیں جو نہایت مقبول ہوئیں اور بکثرت شائع ہوئیں ۔

جون ۱۹۰۴ع میں گورنمنٹ کی طرف سے آپ کو ’شمس العلما‘ کا خطاب ملا ۔ ۱۹۰۷ع میں آپ نے آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرس کے سالانہ جلسے کی صدارت فرمائی جو کراچی میں منعقد ہوا تھا ۔

اسی اثنا میں آپ کی آنکھوں میں پانی اُتر آیا جس کا دو مرتبہ آپریشن ہوا ۔ مگر کچھ فائدہ نہ ہوا ۔

مولانا کی سب سے آخری تصنیف ”ضمیمہ‘ کلیات نظم اُردو“ ہے جس میں آپ نے اپنا فارسی اور عربی کلامِ نظم و نثر جمع کر دیا ہے ۔ یہ مجموعہ اگست ۱۹۱۴ع

میں شائع ہوا ، جس کے چند ماہ بعد ۳۱ دسمبر ۱۹۱۴ع کو رات کے دو بجے مولانا نے اس سرائے فانی سے عالم جاودانی کی طرف کوچ کیا اور دنیا ایک بہترین معلم اخلاق اور مجدد نظم اُردو کے وجود سے خالی ہو گئی ۔ یکم جنوری ۱۹۱۵ع کو دن کے دو بجے آپ کا وجود خاکی حضرت بو علی شاہ قلندر کی درگار کے صحن میں حوض کے کنارے ایک چبوترے پر سپرد خاک کر دیا گیا اور اُس پر نشانی کے لیے آہنی کٹہرا لگا دیا گیا جو آج تک ، ۱۹۴۷ع کے زبردست انقلاب کے بعد بھی موجود ہے ۔ انا للہ و انا الیہ راجعون ۔

یہاں ایک غلطی کا ازالہ ضروری معلوم ہوتا ہے اور وہ یہ کہ صالحہ عابد حسین نے اپنی کتاب 'یادگار حالی' میں لکھا ہے کہ "سنگ مرمر کی ایک خوب صورت قبر میں حالی آسودۂ خواب ہیں" اور اسی کی نقل ڈاکٹر شجاعت سندیلوی ایم۔اے ، پی ایچ ۔ ڈی نے 'حالی بحیثیت شاعر' نامی کتاب میں کر دی ہے : حالاں کہ واقعہ یہ ہے کہ حالی کی قبر سنگ مرمر کی ہے ، نہ اینٹوں کی ، نہ پختہ ہے نہ خام : ایک وسیع و عریض چبوترے پر ، جس پر اور بھی قبریں بنی ہوئی ہیں ، لوہے کا ایک کٹہرا لگا دیا گیا ہے اور یہی حالی کی آخری آرام گاہ ہے ۔ کتبہ بھی کوئی لگا ہوا نہیں ۔ صرف واقف آدمیوں کو پتا ہے کہ یہ حالی کا مرقد ہے ۔ (محمد اسماعیل)

۵۔ مضامین متعلق سرسید

۱

سید احمد خاں اور اُن کے کام

(علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ ۱۸۷۱ع صفحہ ۱۱۸)

> یہ وہ سب سے پہلا مضمون ہے جو سر سید کے کاموں کی تائید اور حمایت میں مولانا حالی نے لکھا ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مولانا حالی سرسید کے اُس وقت سے ساتھ تھے جب کہ اُنھوں نے ولایت سے واپسی کے بعد ابھی اپنی تعلیمی اور اصلاحی تحریک شروع نہیں کی تھی ۔ صرف قومی خدمت کا خیال ظاہر کیا تھا اور قوم کی اصلاح کے لیے ’تہذیب الاخلاق‘ کی شکل میں پہلا قدم اُٹھایا تھا ۔ (محمد اسماعیل)

ان دنوں میں جناب مولوی سید احمد خاں بہادر تمام ہندوستان کی تربیت میں عموماً اور ہماری قوم کی تہذیب اور اصلاح میں خصوصاً جواں مردانہ سعی اور کوشش کر رہے ہیں ، اور اپنے اُس احسان کی بنیاد ڈال رہے ہیں جس کے بوجھ سے ہم اور ہمارے اخلاف کبھی سبکدوش نہ ہوں گے ۔

اہل ملک میں سے جو لوگ سید صاحب کی سرگرمی اور جان فشانی کو شائبۂ اغراضِ نفسانی سے پاک اور منزہ نہیں جانتے ، یا اُن کی رائے کو قرین صواب نہیں سمجھتے ، یا اُن کو مسلکِ ہدیٰ سے متجاوز رکھتے ہیں ، اگر چہ میں نہ کبھی پہلے اُن کا ہم زبان

ہوا ، نہ اب ہوں ، اور امید ہے کہ آگے کو بھی نہ ہوں گا ، مگر اس میں شک نہیں کہ اس تحریر سے پہلے اُن کے باب میں میری رائے کبھی تذبذب اور تردد سے خالی نہیں رہی ۔ لیکن الحمد للہ کہ میرے تذبذب کا منشا کوئی داعیۂ نفسانی نہ تھا ، لہذا میرے خلوص نے مجھے اس مرض سے نجات دی اور جو رائے میری اب ہے غالباً یہی قرین صواب بھی ہے ۔

میرے نزدیک سید صاحب کی نسبت لوگوں کا سوء ظن بہ حسبِ اختلافِ طبائع ان چار وجہوں میں سے کسی نہ کسی وجہ پر مبنی ہے :

۱- یا تو یہ بات ہے کہ ہم جنسوں کی خیرخواہی اور اُن کی بہبودگی کے لیے تہ دل سے کوشش کرنی اور اپنے عزیز وقت کا ایک معتد بہ حصہ خاص ایسے کام میں صرف کرنا اور بہ حسب مقتضائے مقام ، عقلی اور مالی تدبیروں میں مضائقہ نہ کرنا اس زمانے میں ایسا نادرالوجود ہے کہ اگر مردان خدا میں سے کوئی جواں مرد اس راہ میں قدم رکھتا ہے تو وہ شوائبِ غرض سے پاک نہیں سمجھا جاتا ، اور اُس کا خلوص ریا کاری کے سوا اور کسی بات پر محمول نہیں ہوتا ۔

۲- یا جیسا کہ ہر قوم ، ہر ملک اور ہر زمانے میں جن لوگوں نے گزشتہ زمانے کی رسوم وعادات پر اعتراض کیا ہے ، یا سلف کے قانون معاشرت میں کوئی نیا انقلاب پیدا کرنا چاہا ہے ، وہ ضرور ہدف طعن و ملامت ہوئے ہیں ، اسی طرح سید صاحب کے حسنِ قبول میں خلل واقع ہوا ۔

۳- یا یہ کہ سید صاحب اپنی صاف باطنی اور کھرے پن سے بعض کلمات ایسے کہہ اُٹھتے ہیں جن کو سن کر بعض سامعین کا حوصلہ تنگی کرتا ہے اور وہ کلمات بجائے محبت کے اُن کے دلوں میں

مخالفت کی بنیاد ڈالتے ہیں ۔

۴۔ کیا عجب ہے کہ سید صاحب کا تقربِ سلطانی بھی کسی تنگ ظرف اور تنگ چشم کی نظروں میں کھٹکتا ہو [1]۔

ان چاروں وجوہات میں سے کوئی وجہ ایسی نہیں معلوم ہوئی جس کی طرف کچھ التفات کیا جائے اور جس سے اُن کی حقیقی اور نفس الامری خوبیوں کو کچھ ضرر پہنچے ۔

اور بعض لوگ سید صاحب پر جو اعتراض کرتے ہیں کہ اولاد کی دنیوی تعلیم میں اس قدر کوشش کرنی اور آدابِ دین سے بالکل کورا رکھنا کہاں تک قرین صواب ہے ؟ سید صاحب پر یہ بھی اعتراض ہوتا ہے کہ لباس و طعام وغیرہ میں ابنائے جنس کی مخالفت پر اس قدر مبالغہ کرنا جیسے کوئی فرض و واجبات پر کرتا ہے اور جو نتائج قوم کی تالیف اور موافقت پر مترتب ہوتے ہیں اُن پر لحاظ نہ فرمانا ، کون سی مصلحت کا مقتضا ہے ؟

پہلی بات کا جواب دینا ہمارے ذمے نہیں کیوں کہ جو امور سید صاحب کی ذاتِ خاص سے متعلق ہیں وہ ہماری بحث سے خارج ہیں ۔

دوسرا امر بے شک ایسا ہے کہ جب تک اُس کا جواب نہ دیا جائے گا ، اُس وقت تک سید صاحب اور اُن کے خاص مددگار اپنے ذمے سے فارغ نہ ہوں گے ۔ اور میں صرف اس جواب پر اکتفا کرتا ہوں کہ میں نے سید صاحب کے معصوم ہونے کا دعویٰ نہیں کیا ، مگر اس قدر ضرور جانتا ہوں کہ آج سید صاحب اپنی کوششوں کے اعتبار سے اس حدیث کے صحیح مصداق ہیں کہ ”سید القوم خادمہم ۔“

سید صاحب کے کارنامے :

۱۔ کتاب ’خطبات احمدیہ‘ جو اُنھوں نے لندن میں جا کر تالیف

---

[1] ۱۔ سید صاحب سرکاری ملازم اور جج عدالتِ خفیفہ تھے ۔ (اسماعیل)

کی [1] ہے ، ظاہر ہے کہ اپنے لیے ایک عمدہ ذخیرہ آخرت کا مہیا کیا ہے ۔ اور کیا عجب ہے کہ فریضۂ حج جو باوجود استطاعت اور قربِ مسافت کے اُن سے ادا نہ ہو سکا ، اُس کی تلافی اس تالیف سے ہو جائے ، مگر قوم کو بھی اس احسان کی شکرگزاری سے چارہ نہیں ۔ اگرچہ اس کتاب میں اکثر مضامین اور خیالات ایسے ہیں جن میں ہم جناب مؤلف کو منفرد نہیں کہہ سکتے لیکن اور بہت سی حیثیتیں ایسی ہیں جن کے اعتبار سے اس کتاب کو اثباتِ نبوت کی پہلی کتاب کہنا چاہیے اور جن کے لحاظ سے یہ کہنا غیر موزوں نہیں کہ آج مولوی سید احمد خاں صاحب کے سوا دوسرے سے اس کام کا سرانجام ہونا محال تھا ۔

۲۔ رعیت کی آزادی ، جو اس سلطنت کی بےبہا اور برگزیدہ خاصیتوں میں سے ایک خاصیت ہے اور جس کی حقیقت نہ جاننے سے سلطنت کی بڑی خوبی ہماری آنکھوں سے چھپی ہوئی تھی ، اگر سچ پوچھیے تو اُس کی معرفت کا دروازہ جو ہم پر کھلا ، اس کی کنجی سید صاحب کی آزاد تحریریں ہیں ۔ ہم کو وہ زمانہ یاد ہے کہ ایام غدر کے بعد ہنوز بغاوت کی آگ مدھم نہیں ہوئی تھی اور گورنمنٹ کی نگاہ تمام ہندوستانیوں پر عموماً اور مسلمانوں پر خصوصاً غضب آلود پڑتی تھی اور چند نا اہلوں اور خیرہ سروں کے الزام نے برٹش انڈیا کی کل قوموں کو خوف و رجا اور امید و بیم کے بھنور میں ڈال رکھا تھا ، اور کیا دوست اور کیا دشمن اور کیا مخالف اور کیا موافق سب کے دلوں پر رعبِ سلطنت چھایا ہوا تھا ، اُس وقت اس

---

[1] ۱۔ ’خطبات احمدیہ‘ ابھی تک اُردو میں نہ چھپی تھی ، صرف اُس کا خلاصہ انگریزی میں سید صاحب نے لندن سے ۱۸۷۰ع میں شائع کیا تھا ۔ (محمد اسماعیل)

اولوالعزم جوان مرد نے وہ کام کیا جس سے گورنمنٹ کی حق پسندی اور حق شناسی رعایا پر ، اور رعایا کی بے گناہی اور بے جرمی گورنمنٹ پر ''کالشمس فی رابعۃ النہار'' آشکارا ہو گئی ۔ رسالہ 'اسباب بغاوت ہند'[1] کا لکھنا اگرچہ سید صاحب کی آزاد اور بے باک طبیعت کی بے شمار موجوں میں سے ایک موج تھی لیکن ہمارے گراں بار کرنے کو یہ احسان کچھ کم نہ تھا ۔

۳- انگلستان سے جو وہ ہر فن اور علم کی منتخب کتابیں اپنے ساتھ لائے ہیں اور یہاں اُن کے اردو میں ترجمے کرانے کی سبیلیں نکالنے میں سرگرم ہیں ، اگر غور سے دیکھیے تو یہ ہمارے اُن مقاصدِ جلیلہ میں سے ہے جن کے حاصل ہونے کی توقع ہم کو اس سے پہلے گورنمنٹ کے سوا اور کسی سے نہ تھی اور جن پر ہمارے وہ کام اٹکے ہوئے ہیں جن کے نہ ہونے سے ہم پر 'انسان بالفعل' کا اطلاق اب تک صحیح نہیں ہوا ۔

۴- پرچہ 'تہذیب الاخلاق جو سید صاحب کی حسنِ توجہ سے ابھی جاری ہوا ہے[2] ، یہ بھی ہماری حدتِ بصر اور تیزیِ نظر کے لیے ایک بہت عمدہ وسیلہ ہے ۔ بعض لوگ اس پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ ''امرِ معاش میں اس قدر منہمک ہونے کی ترغیب دینی گویا امرِ معاد کی طرف سے بالکل ذہول اور غفلت کا پردہ ڈالنا ہے ، کیوں کہ چین ، مصر اور یونان کی تواریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں کی عقلِ معاش کو جس قدر ترقی ہوتی گئی ، اسی قدر عقلِ معاد میں تنزل ہوتا گیا ، اور رفتہ رفتہ امرِ دین میں ایسے کوتاہ ہیں اور

---

[1] ۱- یہ رسالہ سید صاحب نے ۱۸۵۸ع میں لکھا تھا ۔ (محمد اسماعیل)

[2] ۲- رسالہ 'تہذیب الاخلاق' کا پہلا پرچہ ۲۴ دسمبر ۱۸۷۰ع کو شائع ہوا تھا ۔ (محمد اسماعیل)

ناعاقبت اندیش ہو گئے کہ اُن کی حماقت کی مثالیں شمار اور بیان کی حد سے باہر ہیں ۔ اور اب یورپ کی اعلیٰ درجے کی ترقی سے جو نتائج دین اور مذہب پر مترتب ہوئے ہیں وہ ایسے روشن اور ظاہر ہیں کہ اُن کے بیان کرنے کی حاجت نہیں ۔'' اگرچہ یہ اعتراض ایسا نہیں ہے جس سے 'تہذیب الاخلاق' کی خوبی کو دھبہ لگے لیکن اس سے بچنے کے لیے میانہ روی اختیار کرنی اور اعتدال کی حد سے تجاوز نہ کرنا قرین صواب ہی نہیں بلکہ واجب ہے ۔ اور اس پرچے کا مقبولِ خاص و عام ہونا زیادہ تر اسی بات پر موقوف ہے ۔

۴- 'علی گڑھ سوسائٹی'[1] جو اپنے بانی کے حسنِ سلیقہ اور نیک نیتی پر گواہی دیتی ہے اور جس کی دیکھا دیکھی اور بہت سی علمی مجلسیں ہندوستان میں منعقد ہوئیں ، اگرچہ آج تک اُس کی خوبی کو نہیں پہنچیں ، اُس کی مثال ہمارے نزدیک ایسی ہے جیسے ایک خشک پودے میں پانی دیا جائے ۔ جس طرح پانی دینے سے خشک پودا اُسی وقت سرسبز اور بارور نہیں ہو جاتا ، اسی طرح اس سوسائٹی کے فوائد اور منافعے اگرچہ بالفعل محسوس نہیں ہوتے ، لیکن ہم لوگ اُن سے برابر متمتع ہوتے چلے جاتے ہیں ۔ اور اب جو اس کے بانی اور سرگروہ اور میرمجلس یعنی مولوی سید احمد خاں بہادر عنقریب علی گڑھ میں رونق افروز ہونے والے ہیں ، اُمید ہے کہ اُن کی موجودگی میں اُن کی کوششیں اور زیادہ بآور ہوں گی ۔

---

[1] ۱- اس کا نام 'سائنٹیفک سوسائٹی' تھا اور یہ سید صاحب نے بہ مقام غازی پور ۱۸۶۳ع میں قائم کی تھی ۔ جب سید صاحب کی تبدیلی علی گڑھ میں ہو گئی تو وہ سوسائٹی کو اپنے ساتھ علی گڑھ لے آئے اور پھر یہی اس کا مستقل مستقر قرار پایا ۔ (محمد اسماعیل)

۵۔ کمیٹی خواستگار ترقیِ تعلیم[1] اہل اسلام ، جس کے سرمنشا اور سہتمم سید صاحب ممدوح ہیں ، اس کا قایم ہونا اُس مرض کا علاج ہے جس نے ہماری قوم میں آس باقی نہیں رکھا اور جو اس کمیٹی کے قایم ہونے سے پہلے لاعلاج معلوم ہوتا تھا ۔

کاش ہمارے ملک کے دولت مند مسلمان اس کمیٹی کے مطالب اور مقاصد کو غور سے دیکھیں اور سمجھیں کہ سید صاحب نے اُن کے اور اُن کی قوم کے لیے کیسا اعلیٰ طریقہ نکالا ہے ۔ اور وہ بارگراں جو سید صاحب نے محض بمقتضاے رقّتِ جنسیت اپنے سر پر رکھا ہے ، اس کے اٹھانے میں آپ بھی شریک ہوں ۔ اور صرف روپے پیسے ہی سے نہیں بلکہ جان و دل سے اُن کی امداد کریں ۔

یہاں کے مسلمانوں میں جو روز بروز جہل پھیلتا جاتا ہے اور جس بات میں وہ ہندوستان کی عام قوموں میں ممتاز گنے جاتے تھے ، اب اُسی بات میں سب سے زیادہ مبتذل ہوتے جاتے ہیں ۔ اس کا بڑا سبب دولت مند مسلمانوں کی بےاعتنائی ، تن آسانی اور نفس پروری ہے ۔ کیا وہ اس بات کو گوارا کرتے ہیں کہ دلی اور لکھنؤ سے شہر ، جو ہندوستان کے بڑے دارالعلم گنے جاتے ہیں ، اُن میں کوئی اتنا نہ رہے جس سے یہ پوچھا جائے کہ نماز میں کتنے فرض ہیں اور وضو کن کن چیزوں سے ٹوٹتا ہے ؟ کیا وہ اس بات کو جائز رکھتے ہیں کہ جو شائستہ قوم آج ہندوستان میں فرماں روا ہے اور جس کے زن و مرد اور پیر و جوان سب علم و دانش کے پُتلے اور جہل و ناشائستگی کے دشمن ہیں ، اُن کے عہد میں مسلمانوں سے زیادہ کوئی ذلیل و خوار نہ رہے ؟

---

[1] اس کمیٹی کا پہلا جلسہ ۲۶ دسمبر ۱۸۷۰ع کو سرسید نے بنارس میں منعقد کیا جہاں سے یہ کمیٹی بعد میں علی گڑھ منتقل ہو گئی ۔
(محمد اسماعیل)

سید صاحب کی جو یہ تمنا ہے کہ مسلمانوں کے حسنِ اتفاق سے ہر ضلع میں کم سے کم ایک مدرسہ ایسا قایم ہو جس میں علوم قدیمہ اور فنون جدیدہ کی تعلیم بوجہِ شائستہ ممکن ہو ، سو خدا تعالیٰ اُن کی یہ آرزو پوری کرے ۔

ظاہرا اس کوشش کے بارور ہونے میں ابھی بہت دن باقی ہیں ، ہاں اگر دولت مند اور ذی مقدور مسلمانوں نے اس مہمِ عظیم کا بوجھ صرف سید صاحب ہی پر نہ ڈالا اور اُن کے درد میں آپ بھی شریک ہوئے اور اپنے عیش و عشرت کے اوقات و مصارف کا ایک معتد بہ حصہ اُن کی غم خواری میں صرف کیا ، تو البتہ خدا تعالیٰ کی ذات سے اُمید ہے کہ ہندوستان کے پانچ سات بڑے بڑے شہروں میں ایسے مدرسوں کی بنیاد پڑ جائے اور جو تاریکی ساری قوم پر چھا رہی ہے اُس کے دور ہونے کی کچھ کچھ امید بندھے ۔

اگر مسلمانوں نے اب بھی بےپروائی کو کام فرمایا اور سید صاحب کا ساتھ دینے میں کوتاہی کی اور اپنی آیندہ نسلوں کے لیے کچھ پود نہ لگائی تو اُن کی وہی مثل ہو گی جیسا کہ شمالی امریکہ کے وحشیوں کے حال میں لکھا ہے کہ جس وقت لین گسٹو کا وہ عہدنامہ لکھا گیا جو ۱۷۴۴ع میں سلطنت ورجینا اور چھ قوموں میں بمقام پنسلوینیا قرار پایا تھا ، تو اُس کے لکھے جانے کے بعد سلطنت ورجینا کے ایلچیوں نے امریکہ والوں سے کہا کہ ”وائمیزبرگ“ میں ایک کالج ہے ، اس میں اس ملک کے لڑکوں کی تربیت کے لیے کچھ روپیہ جمع ہے ، اگر تم میں سے چھ قوموں کے سردار اپنے لڑکے کالج میں بھیج دیں تو ہماری سرکار سے ہر شے کا سرانجام ہوسکتا ہے اور یورپ کے کل علوم اُن کو سکھائے جائیں گے ۔“

اُن وحشیوں نے کہا ”پہلے ایک بار ہمارے لڑکوں نے اضلاع شمالی کے کالجوں میں تعلیم پائی تھی اور اُن کو تمہارے

علوم سکھائے گئے تھے مگر وہ پڑھ لکھ کر آئے تو ہمارے کام کے نہ تھے۔ بھاگنا، جنگل میں رہنا، کوٹھا بنانا، ہرن پکڑنا، کچھ نہ جانتے تھے۔ ہم کو منظور نہیں کہ اپنی اولاد کو علم پڑھا کر اپنے کاموں سے بالکل کھو دیں۔"

میں نے یہ جو کچھ لکھا ہے، اس سے مجھ کو مولوی سید احمد خاں کا خوش کرنا منظور نہیں، نہ اُن کے مخالفوں سے بحث کرنی مقصود ہے؛ بلکہ اس کا منشا وہ ضرورت اور وہ مصلحت ہے جس کے سبب سے بھولے کو راہ بتائی جاتی اور مریض کو دوائے تلخ کی ترغیب دی جاتی ہے۔

وما علینا الاالبلاغ

۲

سرسید کی اسلامی اور مذہبی خدمات

(محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میگزین، علی گڑھ، جلد ۶، نمبر ۵، بابت مئی ۱۸۹۸ع، صفحہ ۱۱۵ تا ۱۲۶)

سرسید کا انتقال علی گڑھ میں ۲۷ مارچ ۱۸۹۸ع کو ہوا۔ اُن کی وفات پر نہایت کثرت کے ساتھ اُن کے متعلق مضامین مختلف جرائد و رسائل میں شائع کیے گئے جن میں مرحوم کی مختلف حیثیتوں پر موافق اور مخالف خیالات کا اظہار کیا گیا۔ مدرسۃالعلوم مسلمانان علی گڑھ سے جو علمی اور ادبی رسالہ اُس وقت شائع ہوتا تھا اور جس کا نام محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میگزین تھا، اُس کے ایڈیٹر نے مولانا حالی سے درخواست کی کہ سرسید پر ایک مضمون اُن کے رسالے کے لیے لکھ دیں۔ مولانا اُس وقت سرسید کی لائف (حیات جاوید) لکھنے میں نہایت انہاک کے ساتھ مشغول تھے اور اُن کو فرصت قطعاً نہ تھی، مگر سخت عدیم الفرصتی کے باوجود مولانا نے محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میگزین کے لیے یہ مضمون لکھا جس میں سرسید کی اُن تمام خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے جو اسلامی اور مذہبی لحاظ سے اُنھوں نے انجام دیں۔

(محمد اسماعیل)

سرسید کی لائف میں منجملہ اُن مختلف حیثیتوں کے جو اُن کی ذات میں جمع تھیں ، سب سے زیادہ مہتم بالشان اور سب سے زیادہ لحاظ کے قابل بلکہ اُن کی تمام لائف کی جان مذہبی حیثیت ہے ، جس پر اُن کی لائف میں ، جو عنقریب شائع ہونے والی ہے ، ہر ایک پہلو سے نظر ڈالی گئی ہے اور متعدد ابواب میں اس کا ذکر کیا گیا ہے ۔ یہاں نہایت اختصار کے ساتھ ہمیں صرف تین امور پر بحث کرنی منظور ہے ۔

(۱) جو کچھ گزشتہ چالیس برس میں سر سید نے مذہب کے متعلق لکھا ، اس کے لکھنے کا منشا کیا تھا ؟ (۲) یہ لٹریچر مسلمانوں کی مذہبی تصنیفات میں کیا درجہ رکھتا ہے ؟ اور (۳) ان تصنیفات سے اسلام یا مسلمانوں کے حق میں کیا نتیجے مترتب ہوئے ؟

سرسید کا خمیر اُس شہر کی خاک سے ہوا تھا جو کبھی ہندوستان میں اسلام کا مرکز اور مسلمانوں کا ملجا و ماویٰ تھا اور وہ جس زمانے میں پیدا ہوئے ، یہ وہ زمانہ تھا کہ دہلی کے مسلمانوں کے پاس کوئی چیز ، جس پر وہ فخر کر سکیں ، دین اسلام کے سوا باقی نہ رہی تھی ، اور اس لیے وہاں کے شریف مسلمان خاندان مذہب کو زیادہ مضبوط پکڑتے جاتے تھے ۔ خصوصاً سرسید کا خاندان اس بات میں کسی قدر امتیاز رکھتا تھا ۔ اُس کو ایسے تین مقدس گھرانوں سے قوی تعلق تھا جو نہ صرف دلی میں بلکہ ہندوستان کے دور دراز حصوں میں مذہبی مقتدا و پیشوا سمجھے جاتے تھے ۔ اُن کے باپ کی ننھیال خواجہ میر درد[1] کے خاندان سے علاقہ رکھتی تھی ۔

۱- خواجہ میر درد : خواجہ میر ناصر کے بیٹے اور شاہ گلشن کے مریدوں میں سے تھے ۔ سلوک و تصوف میں آپ کی بہت سی تصانیف

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

خود سرسید کی ننھیال کے تمام زن و مرد شاہ عبدالعزیز کے خاندان سے تعلق رکھتے تھے ۔ اور اُن کے باپ سید متقی ، شاہ غلام علیؒ صاحب کے نہایت مقرب اور مخصوص ارادت مندوں میں سے تھے ۔ شاہ صاحب اُن کو اپنا فرزند اور اُن کی اولاد کو اپنے پوتا پوتی سمجھتے تھے ۔ سر سید کی والدہ ، جن کی آغوش تربیت میں انھوں نے نشو و نما پائی تھی ، نہایت دین دار اور شاہ غلام علی صاحبؒ کی مرید تھیں ، اور اُن کے خاندان کے چھوٹے بڑے عموماً فرائضِ مذہبی کے پابند تھے ۔ پس سر سید نے آنکھ کھول کر اپنے دائیں بائیں مذہب ہی کا جلوہ دیکھا تھا ۔ اور چوں کہ اُن کے خاندان کو ایسے گھرانوں سے ، جو جامع شریعت و طریقت سمجھے جاتے تھے ، ارادت مندانہ تعلق تھا اور اُن کے گھر میں ہر ایک کام ان بزرگوں کی ہدایت و ارشاد کے موافق ہوتا تھا ، اس لیے اُن کا گھر بہت سی ایسی جاہلانہ رسموں اور بیہودہ اوہام اور لغو عقائد سے پاک تھا جن میں اکثر جاہل مسلمانوں کے خاندان گرفتار ہوتے ہیں ۔ گویا سر سید کو ہوش سنبھالتے ہی اسلام کا وہ نقشہ نظر پڑا تھا جو عامیانہ خیالات اور جاہلانہ رسوم اور بدعات کے میل کچیل سے بالکل صاف تھا ۔ پھر حسن اتفاق سے چند ایسے اسباب جمع ہو گئے کہ اُن کو مولانا اسماعیل شہید[1] کی تصنیفات سے ، جن میں آزادی کی روح موجود تھی ،

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ)

قابلِ دید ہیں ۔ تصوفانہ رنگ کے اُردو فارسی اشعار بھی خوب کہتے تھے ۔ اُردو شعرا میں بہت بڑا پایہ رکھتے تھے ۔ تمام عمر دہلی سے قدم باہر نہیں نکالا ۔ نہایت متوکل ، قانع اور بے پروا بزرگ تھے ۔ ۱۱۳۰ھ میں پیدا ہوئے اور ۶۶ سال کی عمر پا کر ۱۱۹۹ھ میں وفات پائی ۔ (محمد اسماعیل)

۱- مولانا اسماعیل شہیدؒ : حضرت شاہ عبدالغنی کے فرزند اور حضرت شاہ ولی اللہ کے پوتے تھے ۔ نہایت ذہین و طباع ، عالم و فاضل

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

زیادہ دل چسپی ہوگئی اور اس طرح وہ تقلید کی بندشوں سے رفتہ رفتہ آزاد ہوتے گئے ۔ مگر غدر کے زمانے تک اُن کے مذہبی خیالات میں کوئی بڑا انقلاب واقع نہیں ہوا ۔ وہ اُسی شرک و بدعت اور تقلید و عدم تقلید وغیرہ کے جھگڑوں میں اُلجھے رہے اور اسی لیے اُن کی وہ مذہبی تصنیفات ، جو غدر سے پہلے کی ہیں ، چنداں امتیاز نہیں رکھتیں ۔

ایک ہندی دوہے میں علمی بحث و مباحثے کو گڑیوں کے کھیل سے اور خدا کی معرفت کو بیاہ سے تشبیہ دی گئی ہے : یعنی جب انسان کو خدا کی معرفت حاصل ہو جاتی ہے تو جس طرح لڑکیاں بیاہ کا لطف اُٹھانے کے بعد گڑیوں کے کھیل کو محض فضول سمجھنے لگتی ہیں ، اسی طرح آدمی خدا کی معرفت کا مزہ پا کر علمی قیل و قال اور مذہبی بحث و جدال کو بالائے طاق رکھ دیتا ہے ۔ غدر کے بعد سر سید کا بھی یہی حال ہوا ۔ مسلمانوں کی ہمدردی نے مذہبی تحقیقات کا جو مفید پہلو اُن کو سمجھایا تھا اور جو لذت اس کاوش اور خلش میں اُن کو حاصل ہوئی تھی ، اُس کے آگے اُن کو اپنے پہلے مذہبی خیالات بچوں کا کھیل معلوم ہونے لگے ۔

مسلمان مذہبی تعصبات میں سخت بدنام تھے اور ان ہی تعصبات کی بدولت غدر کے بعد اُن کی پولٹیکل حالت کو سخت صدمہ پہنچا

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ)

بزرگ ، اور خاندان کا فخر تھے ۔ تبلیغِ اسلام کا خاص جوش رکھتے تھے ۔ آپ نے فقہ اور ردِ شرک و بدعت میں بہت سی کتابیں تحریر فرمائی ہیں ۔ ١٢ ربیع الثانی ١١٩٣ھ (١٧٧٩ع) کو پیدا ہوئے اور مولانا سید احمد بریلوی اپنے پیر کی زیرِ قیادت سکھوں سے جہاد کرتے ہوئے بالا کوٹ کے قریب ذی قعدہ ١٢٤٦ھ مطابق مئی ١٨٣١ع میں شہید ہوئے ۔

(محمد اسماعیل)

تھا اور آیندہ اس سے بھی سخت‌تر آفتوں کا سامنا نظر آتا تھا ۔ سر سید کو جس طرح اسلام کے دین برحق ہونے کا یقین تھا اسی طرح اس بات کا بھی یقین تھا کہ سچا دین انسان کے حق میں خدا کی رحمت ہونا چاہیے ، اس لیے انھوں نے سمجھا کہ اسلام ہرگز ایسے تعصبات کی تعلیم نہیں دے سکتا جن کی بدولت ہندوستان کی چھ کروڑ مخلوق طرح طرح کی آفات و حوادث کا نشانہ بن رہی ہے ، ورنہ بجائے اس کے کہ اسلام کو خدا کی رحمت سمجھا جائے ، وہ انسان کے حق میں سخت ترین عذاب الٰہی ہوگا ۔

١- مسلمانوں کی پولٹیکل مشکلات :

اگرچہ گزشتہ زمانوں میں اسلام کو جس قسم کی مشکلات پیش آئیں ، علمائے اسلام نے اُن کو بخوبی حل کیا اور اپنے فرائض کا حق پورے طور پر ادا کر گئے مگر جو مشکل اس وقت ہندوستان کے مسلمانوں کو درپیش تھی ، چوں کہ وہ کبھی اُن کے زمانے میں پیش نہیں آئی تھی ، اس لیے اُن کو اُس کے حل کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی ۔ ایک ہزار برس سے زیادہ عرصے تک مسلمانوں کو کسی غیر قوم کی رعایا ہونے کا بہت ہی کم اتفاق ہوا تھا ۔ وہ ایک آدھ مستثنیٰ صورت[1] کے سوا ہمیشہ جہاں کہیں رہے، حکم ران رہے ،

---

[1] اس سے مراد تاتاریوں کی سلطنت ہے جو ایک مدت تک ایران و ترکستان اور دیگر ممالک میں مسلمانوں پر حکمران رہے ۔ لیکن آغاز تسلط میں جب کہ چنگیز خاں نے خروج کیا ، تاتاریوں اور مسلمانوں کے تعلقات ہرگز ایسے نہ تھے جیسے بادشاہ اور رعیت میں ہونے چاہئیں ۔ چنگیز خاں کہتا تھا کہ خدا نے مجھ کو مسلمانوں کے غارت کرنے کے لیے پیدا کیا ہے اور مسلمان اس کو فی‌الواقعہ اپنے حق میں غضبِ الٰہی جانتے تھے ۔ مگر آخر کو تاتاریوں کی سلطنت کی باگ مسلمانوں کے ہاتھ آ گئی جس کو وہ

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

اور غیر قومیں اُن کی محکوم رہیں ، اس لیے جو برتاؤ مسلمانوں کو اصول اسلام کے موافق کسی غیر قوم کے محکوم ہونے کی حالت میں اُس قوم کے ساتھ رکھنا چاہیے ، اُس کی طرف کبھی کسی کی توجہ مبذول نہیں ہوئی ۔

حالاں کہ اسلام نے بادشاہ کے فرائض اُس کی حالت کے موافق اور رعیت کے فرائض اُس کی حالت کے موافق اور اسی طرح ہر طبقے کے مصالح معاش جدا جدا بیان کر دیے تھے ، مگر چوں کہ مسلمان کبھی (الا ماشاء اللہ) کسی کی رعیت بن کر نہیں رہے تھے اس لیے رعیت ہونے کی حالت میں بھی وہ رعیت کے فرائض سے بے خبر رہے ۔ انھوں نے اقبال کے دور دورے میں ہمیشہ زمانے کو اپنے ساتھ موافق دیکھا تھا ، اس لیے ادبار کی حالت میں بھی وہ اسی بات کے متوقع رہے کہ زمانہ اب بھی ہمارا ساتھ دے گا ، ہم کو زمانے کا ساتھ دینے کی ضرورت نہیں ہے ۔

۲۔ مسلمانوں کی مذہبی مشکلات :

یہ مشکلات تو مسلمانوں کی پولٹیکل حالت سے علاقہ رکھتی تھیں مگر ان کے سوا دو نہایت سخت اور خطرناک مشکلیں خاص کر مذہب اسلام کو اس وقت اور در پیش تھیں ۔

(بقیہ حاشیہ گزشتہ صفحہ)

ایک اسلامی سلطنت سمجھنے لگے تھے ، یہاں تک کہ تین چار پشت کے بعد خود بادشاہ مسلمان ہوگیا اور اخیر تک وہ ایک اسلامی سلطنت رہی ۔ پس اول میں بسبب غایت عداوت کے اور آخر میں بسبب کمال رسوخ کے وہ تعلقات پیدا ہی نہیں ہوئے جو بادشاہ اور رعیت میں ہونے چاہئیں اور اس لیے مسلمان ایک غیر قوم کی حکومت میں بھی فرائض رعیت سے بے خبر رہے ۔
(محمد اسماعیل)

اولاً عیسائی مشنری (مبلغ) جو تمام دنیا میں دین مسیحی کی اشاعت میں سرگرم ہیں اور برٹش انڈیا میں اُس کے پھیلانے کو اپنا قدرتی حق سمجھتے ہیں ، ان کا دانت ہندوستان کی قوموں میں سب سے زیادہ مسلمانوں پر تھا ۔ اگرچہ غدر سے پہلے اکثر مسلمان عالموں نے اُن کے مقابلے میں اپنے قدیم طریقۂ مناظرہ کے موافق عمدہ عمدہ کتابیں لکھی تھیں اور بعض نے اُن سے زبانی مناظرے بھی کیے تھے ، جن سے بلاشبہ مسلمانوں کو بہت بڑا فائدہ ہوا اور وہ عیسائیوں کا شکار ہونے سے بچ گئے ، لیکن غدر کے بعد مشنریوں نے مناظرے کا قدیم طریقہ بالکل بدل دیا تھا ، اور جس قسم کے اعتراض انھوں نے اب اسلام اور داعیِ اسلامؐ پر کرنے شروع کیے تھے ، اُن کی تردید کے لیے مسلمانوں کو بھی مناظرے کا نیا طریقہ اختیار کرنا ضرور تھا ۔ کیوں کہ جس طرح آج کل کی نو ایجاد بندوقوں کے سامنے پرانی توڑے دار بندوقیں کچھ کام نہیں دے سکتیں اسی طرح مشنریوں کے نئے طریقۂ مناظرہ سے ہمارے قدیم طرز کے مناظرے کا عہدہ برآ ہونا دشوار تھا ۔ چناں چہ سر ولیم میور[1] کی 'لائف آف محمد' جو چار جلدوں میں لکھی گئی تھی ، اس کی نسبت

---

[1] سر ولیم میور : صوبۂ متحدہ آگرہ و اودھ کا لفٹیننٹ گورنر تھا ۔ اس نے ایک پادری کی فرمائش پر آنحضرت صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی سوانح عمری انگریزی میں اس غرض سے لکھی کہ آگے بڑھ کر ہندوستان کے مسلمان اسلام سے بیزار اور ذاتِ نبوی سے متنفر ہو جائیں ۔ سر سید نے کتاب منگوا کر سنی تو مصنف کا تعصب دیکھ کر اُن کا دل جل کر کوئلہ ہو گیا ، اور انھوں نے مصمم ارادہ کر لیا کہ میں اس کتاب کا جواب لکھوں گا ۔ چناں چہ اسی غرض کے لیے انھوں نے لندن کا سفر کیا اور وہاں بیٹھ کر اس کتاب کا جواب لکھا اور پھر اُس کا انگریزی میں ترجمہ کرا کے وہیں نہایت شان سے شائع کیا ۔ بلا شبہ یہ سر سید کی بہت بڑی اسلامی خدمت ہے ۔ (محمد اسماعیل)

عیسائیوں میں مشہور تھا کہ کوئی کتاب اسلام کی جڑ کاٹنے والی عیسائی دنیا میں ایسی نہیں لکھی گئی جیسی یہ ہے ۔ انگریزی تعلیم یافتہ نوجوان مسلمانوں کے حق میں مشنریوں کا نیا طریقۂ نکتہ چینی حد سے زیادہ خطرناک تھا اور اس لیے ضرور تھا کہ مسلمان بھی اسلام کی طرف سے مدافعت کا نیا طریقہ اختیار کریں ۔

دوسری مشکل جو اسلام کے حق میں پہلی مشکل سے بہت زیادہ خطرناک تھی ، وہ یہ تھی کہ انگریزی تعلیم ، جس سے ہندوستانیوں کو کسی طرح مفر نہ تھا ، روز بروز ہندوستان میں پھیلتی جاتی تھی اور غدر کے بعد اُس کی ترقی کی رفتار بہت تیز ہو گئی تھی ۔ اگرچہ غدر سے پہلے مسلمانوں میں انگریزی تعلیم کی کچھ اشاعت نہیں ہوئی تھی لیکن غدر کے بعد اس کے بغیر مسلمانوں کا اُبھرنا اور ہندوستان میں عزت سے رہنا محال ہو گیا تھا ۔ یہاں تک کہ سرسید کو خود اُن میں تعلیم پھیلانی پڑی ، حالاں کہ انگریزی تعلیم کے نتائج اسلام کے حق میں مشنریوں کی پریچنگ (تبلیغ مذہب) سے زیادہ اندیشہ ناک تھے ۔ یورپ میں جو سخت صدمہ علوم جدیدہ کی تعلیم سے دین عیسوی کو پہنچا تھا ، وہی صدمہ اُن کی اشاعت سے ہندوستان میں اسلام کو پہنچنے کا اندیشہ تھا ۔ اور اس مشکل کا اس طرح مقابلہ کرنا کہ مغربی تعلیم مسلمانوں میں جاری نہ ہونے دی جائے ، اول تو مسلمانوں کی طاقت سے باہر تھا ، کیوں کہ وہ جس طرح ہندوستان میں روز بروز پھیلتی جاتی تھی ، اسی طرح تمام دنیا میں ؛ یہاں تک کہ ممالک اسلامیہ یعنی ٹرکی ، مصر اور ایران وغیرہ میں بھی عام ہوتی جاتی تھی ۔ دوسرے مغربی علوم کی تعلیم کو اس خوف سے کہ مبادا مذہب اسلام کو اُن سے صدمہ پہنچے ، روکنا اور اُن کے انسداد میں کوشش کرنا گویا اس بات کو تسلیم کر لینا تھا کہ اسلام علومِ جدیدہ کی روشنی کے آگے نہیں ٹھیر سکتا اور مثل

دیگر مذاہب کے اسلام بھی سائنس کے حملے کی تاب نہیں لا سکتا ۔

یہ تمام مشکلات ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کو در پیش تھیں اور چھ کروڑ مسلمانوں میں صرف ایک سرسید احمد خاں ان تمام مشکلوں کا سمجھنے والا ، اُن کے انجام کا سوچنے والا اور اُن کا مقابلہ کرنے والا تھا ۔

ہمارے مسلم‌الثبوت علما کو اول تو ان مشکلات کا احساس ہونا ہی دشوار تھا ، اور اگر بالفرض اُن کو احساس بھی ہوتا تو ان مشکلات کا تدارک اُن کے احاطۂ قدرت سے خارج تھا ۔ کیوں کہ تقلید کی بدولت اُن میں اس بات کی قابلیت باقی نہیں رہی تھی کہ اگر مذہب کے متعلق کوئی ایسی نئی مشکل پیش آئے جو اگلے علما کو پیش نہیں آئی اور جس کا حل اُن کی کتابوں میں صراحتہً موجود نہ ہو ، تو اُس کے حل کرنے میں اپنی سمجھ بوجھ سے کام لے سکیں ، اور اس کا علاج خود قرآن و حدیث میں ، جو دینیات کے اصلی مخرج ہیں ، تلاش کر سکیں ۔ وہ سمجھتے تھے کہ مذہبی مشکلات کی حل کرنے والی صرف فقہ اور تفسیر اور علماے سلف کی کتابیں ہیں ۔ قرآن محض تلاوت کے لیے ، حدیث محض سننے کے لیے ، عقلِ انسانی امورات مذہبی میں محض معطل اور بے کار رہنے کے لیے ہے اور بس ۔

جو مشکلات اسلام اور مسلمانوں کو اُس وقت درپیش تھیں ، اُن کے مقابلے کے لیے کسی عالمِ متبحر کی ضرورت نہ تھی بلکہ ایک ایسے معمولی استعداد کے آدمی کی ضرورت تھی جو صاحبِ عقلِ سلیم ہو ، قدیم طریقۂ تعلیم کا منتر اُس پر کارگر نہ ہوا ہو ، دنیا کے حالات سے باخبر ہو ، علومِ جدیدہ کی طاقت سے واقف ہو ، تقلید کی بندش سے آزاد ہو ، لومۃِ لائم سے خائف نہ ہو ، اسلام اور مسلمانوں کا حقیقی خیر خواہ اور جاں نثار ہو ۔

سرسید نے غدر کے زمانے سے لے کر اخیر دم تک ان تمام

مشکلات کا مقابلہ کیا ۔

۱۔ انھوں نے دلائلِ عقلیہ سے ، قرآن و حدیث کے حوالوں سے ، ممالک اسلامیہ کے موجودہ عمل درآمد سے بےشمار ثبوت اس بات کے دیے کہ عیسائیوں کے ساتھ سچے دل سے دوستی کا برتاؤ کرنا ، اُن کے ساتھ دوستانہ میل جول رکھنا ، اُن کے کھانوں اور دعوتوں میں شریک ہونا ، مصالحِ دنیوی میں اُن کی پیروی کرنا ، اُن کے علوم سیکھنا ، اُن کے آڑے وقت میں کام آنا ، اُن کے مصائب میں اُن کے ساتھ ہمدردی کرنا عین اسلام کی تعلیم کا مقتضا ہے ۔ اور جس طرح قرآن کی رو سے کوئی قوم عیسائیوں سے بڑھ کر مسلمانوں کی دوست نہیں ہے ، اسی طرح مسلمانوں کو بھی اُن کا خالص و مخلص دوست ہونا ضرور ہے ۔

۲۔ اُنھوں نے پُر زور مذہبی دلائل سے ثابت کیا کہ انگریزی حکومت میں رہ کر مسلمانوں کا مذہبی فرض ہے کہ سلطنت کی اطاعت ، خیر خواہی اور وفاداری میں ثابت قدم رہیں اور جب کبھی سلطنت کو کوئی مشکل پیش آئے تو جان و مال سے اُس کا ساتھ دیں ۔ غرض اُن کو طرح طرح سے عقلی اور نقلی دلائل کے ساتھ یقین دلایا کہ ہندوستان میں مسلمانوں کا عزت و آبرو سے رہنا اُسی حالت میں ممکن ہے جب کہ وہ برٹش گورنمنٹ کی وفادار اور خیرخواہ رعایا بن کر رہیں ۔

سرسید کی تعلیم کا اثر :

(قومی نفرت اور مذہبی تعصب دور ہو گیا)

اس باب میں جو کچھ سرسید نے لکھا ، اگرچہ وہ ایک آدھ بات کے سوا بالکل اصول اسلام کے مطابق تھا ، لیکن چوں کہ اس میں بہت سی ایسی باتیں شامل تھیں جو ہندوستان کے مسلمانوں نے پہلے کبھی دیکھی یا سنی نہ تھیں ، اور مذہبی تعصبات کے ساتھ قومی تعصب

بھی شامل تھا ، اور جس شخص کی زبان یا قلم سے وہ باتیں نکلتی تھیں وہ ایک دنیادار آدمی ، سرکار انگریزی کا ملازم اور مذہبی تقدس کے لباس سے معرا تھا ، اس لیے ایک مدت تک مخالفتیں ہوتی رہیں ، مگر آخرکار ہندوستان کے تمام سمجھ دار مسلمانوں کو سرسید کی نصیحتیں تسلیم کرنی پڑیں اور اُن پر عمل کرنا پڑا ۔

۱۔ جو مسلمان مذہبی خیالات کے سبب انگریزی تعلیم سے نفرت کرتے تھے ، اُن کے خیالات بدل گئے ، یہاں تک کہ جن مولویوں نے مدرسۃ العلوم کے قائم کرنے پر سرسید کے اوپر کفر کے فتوے لکھے تھے ، اُن میں سے بعض کی اولاد کو خود انگریزی تعلیم پاتے ہوئے دیکھا گیا ۔

۲۔ ترکی لباس جو انگریزی لباس سے بہت مشابہ تھا اور اس لیے مسلمان اُس کے سایے سے بھڑکتے تھے ، وہ مسلمان نوجوانوں میں عموماً پھیل گیا ۔

۳۔ ہزاروں آدمی میز کرسی پر چھری کانٹے سے کھانے لگے اور لاکھوں اس کو جائز اور مباح سمجھنے لگے ۔[۱]

۴۔ جو لوگ انگریزوں کے ساتھ کھانا کھانے پر سخت معترض تھے ، وہ فخریہ اُن کی دعوتیں کرنے لگے ، اور اُن کے ہاں

۱۔ چھری کانٹے سے کھانا اُس زمانے میں بڑے عیب کی بات اور کرسٹان ہونے کی علامت سمجھی جاتی تھی ۔ اور جو مسلمان ایسا کرتا تھا ، نہایت شدت کے ساتھ اُس کا بائیکاٹ کر دیا جاتا تھا ۔ مگر آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ چھری کانٹے سے کھانے کا رواج سب سے پہلے اندلس کے مسلمانوں نے ایجاد کیا جہاں سے بعد میں تمام یورپ میں پھیل گیا ، اور نوبت یہاں تک پہنچی کہ اب یہ یورپین لوگوں کی خصوصیت بن گیا ہے ، حالانکہ ایسا نہیں ؛ یورپین صرف مقلد ہیں ۔ مسلمانانِ اندلس کے تفصیلی حالات کے لیے دیکھیے موسیو سدیو فرانسیسی کی کتاب 'تاریخ عرب' ۔ (محمد اسماعیل)

دعوتوں میں جانے لگے اور اُن کے ساتھ انھی کے ہاں کا ذبیحہ اور انھی کے باورچی خانے کا پکا ہوا ایک میز پر بیٹھ کر کھانے لگے۔

۵- تعلیم کے لیے اولاد کو ولایت بھیجنے لگے جو وہاں جاکر انگریزوں کے ساتھ شیرو شکر ہو جاتے ہیں۔

۶- علی گڑھ محمڈن کالج ، جہاں مسلمان طلبہ اپنے یورپین اُستادوں کے ساتھ بالکل اُسی طریقے سے معاشرت رکھتے ہیں جیسے مسلمان آپس میں ایک دوسرے سے رکھتے ہیں ، وہاں کوئی مسلمان اپنی اولاد کے بھیجنے میں پس و پیش نہیں کرتا ، الا ماشاء اللہ۔

اس قسم کی اور بہت سی سوشل تبدیلیاں ، جو مسلمانوں کی سوسائٹی میں سرسید کی مذہبی تحریروں سے ظہور میں آئی ہیں ، ایسی صاف اور صریح ہیں کہ کوئی شخص اُن کا انکار نہیں کر سکتا۔

۱- سرسید کے پولٹیکل کارنامے :

اب دیکھنا یہ ہے کہ پولٹیکل خیالات پر سرسید کی تحریروں نے کیا اثر کیا ہے ؟

۱- اگرچہ اکثر مذہبی مسائل میں لاکھوں مسلمان اب تک سرسید کے سخت مخالف رہے ہیں مگر جو کچھ انھوں نے گورنمنٹ اور رعیت کے تعلقات کی نسبت مذہب اسلام کی رو سے لکھا ہے ، اُس کو ہندوستان کے تمام مسلمانوں نے بالاتفاق تسلیم کیا ہے۔ اور گو سرسید کو مسلمانوں نے اپنا مذہبی پیشوا نہیں مانا ، لیکن شاید ہندوستان میں ایک بھی ایسا مسلمان نہ ہوگا جس کو اُن کے قومی پولٹیکل لیڈر ہونے میں کچھ تامل ہو۔ اس کا ایک ادنیٰ ثبوت یہ ہے کہ انڈین نیشنل کانگرس ، جو در حقیقت کوئی باغیانہ یا خلاف قانون مجمع نہ تھا مگر مسلمانوں کی پولٹیکل حالت کے لحاظ سے اُن کا اُس میں شریک ہونا سرسید کے نزدیک خلاف مصلحت تھا ، جس وقت سرسید نے اُس کی مخالفت کی اور مسلمانوں کو

اس میں شریک ہونے سے روکا ، تو بہ استثنائے معدودے چند ، تمام ہندوستان کے مسلمان ، کیا سنی اور کیا شیعہ ، کیا وہابی اور کیا غیر وہابی ، کیا پڑھے لکھے اور کیا ان پڑھ ، کیا وہ لوگ جو سرسید کی پارٹی میں گنے جاتے تھے اور کیا وہ جماعتِ کثیر جو ہر بات میں اُن کی مخالفت کرتی تھی ، سب نے بالاتفاق نیشنل کانگرس سے ہمیشہ کے لیے صرف اس بنا پر علیحدگی اختیار کی کہ سید احمد خاں کے نزدیک ان کا شریک ہونا مناسب نہ تھا۔ اور لاکھوں مسلمانوں نے اُن کاغذوں پر آنکھیں بند کرکے دستخط کر دیے جو پیٹریاٹک ایسوسی ایشن نے اس بات کے ظاہر کرنے کو ولایت بھیجے تھے کہ ہندوستان کے مسلمان کانگرس میں شریک نہیں ہیں۔

۲- سب سے زیادہ وفاداری اور لائلٹی (وفاداری) کی مستحکم بنیاد جو سر سید کی مذہبی تحریروں نے مسلمانوں میں قائم کی ہے ، وہ انگریزی تعلیم کی مزاحمتوں کو دور کرکے اُن کو عام طور پر اُس کی طرف متوجہ کرنا اور خاص کر اُن کی تعلیم کے لیے محمڈن کالج کا قائم کرنا ہے ؛ جس کی رو سے نہایت وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ جس قدر اعلیٰ تعلیم مسلمانوں میں زیادہ پھیلتی جائے گی اُسی قدر وہ تاج برطانیہ کے زیادہ وفادار اور گورنمنٹ کے زیادہ معتمد علیہ بنتے جائیں گے۔

۳- یہاں تک ہم نے ایک نہایت مختصر بیان اُن نتائج کا کیا ہے جو سرسید کی اُن تحریروں سے پیدا ہوئے ہیں جو انھوں نے مسلمانوں کی مذہبی غلط فہمیوں کی اصلاح کے لیے وقتاً فوقتاً شائع کیں۔ مگر اُن کے سوا جو کچھ کہ انھوں نے حکمران قوم کے اُن شکوک و شبہات کے رفع کرنے کے لیے ، جو غدر کے بعد اسلام کے بعض مذہبی مسائل کی نسبت اُن میں عموماً پھیل گئے تھے اور جن سے مسلمانوں کی پولٹیکل حالت نہایت نازک ہو گئی تھی ، گزشتہ

چالیس برس میں لکھا ، وہ بھی ایک دفتر طویل الذیل ہے ، جس میں متعدد کتابیں اور رسالے اور بےشمار آرٹیکل شامل ہیں ۔ اگرچہ ان تمام تحریروں میں کوئی بات ایسی نہیں ہے جس کا شریعتِ اسلامیہ میں کافی ثبوت موجود نہ ہو ، مگر جس بسط اور تفصیل کے ساتھ اور جس خوبی و صفائی سے سرسید نے ان مضامین کو بیان کیا ہے ، نہ اس صدی میں اور نہ گزشتہ اسلامی صدیوں میں (شاید اس وجہ سے کہ پہلے کبھی اُن کی ضرورت پیش نہیں آئی) کسی مسلمان عالم نے نہیں لکھا ۔

ان تحریروں کا مفصل حال اور جو اثر اُنھوں نے حکمران قوم کے دل پر کیا ، اس کو سرسید کی لائف میں ، جو عنقریب چھپنے والی ہے ، دیکھنا چاہیے ۔ یہاں صرف اس قدر لکھنا کافی ہے کہ سرسید کی ان تحریروں سے جہاں تک کہ ہم کو معلوم ہے ، انگریزوں کی بہت کچھ غلط فہمیاں ، جو اُن کو مسئلۂ جہاد ، وہابیوں کے اصول اور بعض دیگر مسائل کی نسبت تھیں ، رفع ہو گئی ہیں ۔

۴۔ سرسید ہی کی تحریر کا یہ اثر تھا کہ جس وقت ڈاکٹر ہنٹر کی اُس کتاب پر ، جو انھوں نے غدر سے دس بارہ برس بعد مسلمانوں اور خاص کر وہابیوں کے برخلاف لکھی تھی ، سرسید کا ریویو ہندوستان اور انگلستان میں شائع ہوا تھا ، تو تمام انگریز ، جن کو ڈاکٹر موصوف کی کتاب نے مسلمانوں پر نہایت برافروختہ کر رکھا تھا ، سب کے خیالات بالکل بدل گئے اور ڈاکٹر ہنٹر جیسے مشہور اور نامور مصنف پر اعتراضوں کی بوچھاڑ پڑنے لگی ؛ یہاں تک کہ ہندوستان کے ایک اینگلو انڈین اخبار نے ان کی نسبت صاف لکھ دیا کہ ”اصلی واقعات کے محقق ہونے کی ناموری اُن کے (یعنی ڈاکٹر ہنٹر کے) ہاتھ سے ایسی گئی ہے کہ پھر کبھی اُن کو میسر

ہونے والی نہیں ہے ۔“ اور ایک جلیل القدر حاکم نے ، جو غالباً سر ولیم میور تھے ، وہابیوں کی نسبت ، جن کی صفائی کے لیے سرسید نے ریویو لکھا تھا ، یہ ریمارک کیا کہ ”وہابی وہ ہے جو خالصاً خدا کی عبادت کرتا ہو ، موحد ہو اور اس کا اسلام ہوائے نفسانی اور بدعت کی آمیزش سے پاک ہو ۔ اس کو یہ کہنا کہ وہ ہمیشہ درپردہ تخریبِ سلطنت کی فکر میں رہتا ہے اور چپکے چپکے منصوبے باندھا کرتا ہے اور بغاوت کی تحریک کرتا ہے ، محض تہمت ہے ۔“

سرایلفرڈ لائل اپنے ایک اسّے (مضمون) میں ، جو سر سید کے ریویو کے بعد تھیالوجیکل ریویو میں شائع ہوا تھا ، ڈاکٹر ہنٹر کی کتاب پر ریمارک کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ”اس مصنف کو مبالغے کا جِن بسا اوقات نہایت پریشان کرتا ہے ، اور بہتر ہوتا اگر اس جِن کو وہ آتار دیتا ۔“ ہم نے سنا ہے کہ کئی برس پہلے سے جو بنگال میں وہابیوں کی گرفتاری برابر جاری تھی ، سر سید کا ریویو نکلنے کے بعد پھر کوئی وہابی گرفتار نہیں کیا گیا ۔

۵۔ انھی دنوں میں ‘تہذیب الاخلاق’ کے مذہبی مضامین دیکھ کر سرسید کے ایک انگریز دوست نے اُن کو لکھا تھا کہ ‘تہذیب الاخلاق’ نے ثابت کر دیا ہے کہ اسلام ایسا تنگ و تاریک رستہ نہیں ہے جیسا کہ خیال کیا جاتا تھا ۔“

سب سے پہلے ، جب کہ غدر کو دو ہی تین برس گزرے تھے ، سرسید کو اس مقصد کے پورا کرنے کے لیے کہ مسلمانوں اور عیسائیوں میں مصالحت کرائی جائے اور دونوں قوموں کے مذہبی تعصبات اور مذہبی غلط فہمیوں کو دور کیا جائے ، ایک ایسے عظیم الشان کام کا خیال آیا تھا جس کا اُن سے پہلے تیرہ سو برس میں کسی مسلمان کو خیال نہیں آیا ۔

۶۔ انھوں نے نہایت مستعدی اور سرگرمی کے ساتھ بائبل کی

تفسیر اہل اسلام کے اصول کے موافق لکھنی شروع کی تھی جس کی صرف دو جلدیں چھپنے پائی تھیں کہ مالی مشکلات کے سبب اس ارادے سے دست بردار ہونا پڑا ۔

اس تفسیر کی نسبت فرانس کا مشہور اورینٹلسٹ (مستشرق) مسٹر گارسن ڈی ٹاسی[1] پروفیسر اردو لٹریچر اپنے ایک لکچر میں لکھتا ہے کہ :

> ''میں اپنے آپ کو مبارک باد دیتا ہوں کہ یہ کتاب ایسی زبان میں لکھی گئی ہے جس کا سکھانا میرا فرض ہے ، کیوں کہ مجھ کو یقین ہے کہ یہ پہلا ہی موقع ہے کہ کسی مسلمان نے نہ صرف اردو میں بلکہ ایشیا کی کسی زبان میں اس قسم کے مضمون پر ایسی بسیط اور مکمل بحث کی ہو ۔''

یہ کتاب اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں لکھی گئی تھی تاکہ ہندوستان کے مسلمان اور یورپ کے عیسائی دونوں اس کے مضامین سے مطلع ہوں اور اس کے نسخے بہ نسبت ہندوستان کے یورپ میں زیادہ شائع ہوئے تھے ۔

غالباً اسی کتاب کا یہ نتیجہ ہے کہ ٹرکی اور مصر وغیرہ کے کئی عیسائی عالموں نے ، جیسا کہ سرسید کی لائف میں مفصل بیان

کیا گیا ہے ، اسلام اور کرسچینٹی (عیسائیت) میں اتحاد اور مصالحت پیدا کرنے کا ارادہ کیا ہے ۔ یہاں تک کہ جس طرح سرسید نے اپنی تفسیر میں دعویٰ کیا ہے کہ تثلیث کا مسئلہ انجیل کی کسی آیت سے ثابت نہیں ہوتا ، اسی طرح مصر کے ایک عیسائی عالم نے جو اخبار 'شہادۃ الحق' کا ایڈیٹر ہے ، اپنی کتاب ''وحدۃالادیان و وحدۃالایمان فی التوراۃ والانجیل والقرآن'' میں لکھا ہے کہ تثلیث کا مسئلہ بائبل میں کہیں نہیں ہے ، اس لیے عیسائیوں کی ہٹ دھرمی ہے کہ قرآن کے عمدہ عقیدۂ توحید کو نہ مانیں ۔

۲ ۔ سرسید کی مذہبی خدمات :

اب ہم نہایت مختصر ذکر سرسید کی اس غیرمعمولی سرگرمی اور عجیب و غریب لیاقت کا کرتے ہیں جو دین اسلام کی حمایت میں بہ حیثیت اس کے دینِ برحق ہونے کے اخیر دم تک اُن سے ظاہر ہوتی رہی ہے ، اور جس کی رو سے ٹھیک طور پر اُن کو اسلام کے جدید علم کلام کا موجد اور سائنس اور مذہب میں دائمی صلح کی بنیاد ڈالنے والا کہا جا سکتا ہے ۔

جو کچھ سرسید نے اسلام کی حمایت میں بہ مقابلہ عیسائیوں کے لکھا ہے ، اس میں سب سے زیادہ لحاظ کے قابل وہ بارہ اسےّ یا خطبے ہیں جو انھوں نے سرولیم میور کی کتاب 'لائف آف محمدؐ' کی پہلی جلد کے جواب میں لکھے ہیں اور جو اردو انگریزی دونوں زبانوں میں چھپ گئے ہیں ۔ لیکن جو شخص اس کتاب کی اصل خوبی اور مصنّف کی لیاقت سے پوری واقفیت حاصل کرنی چاہے ، اُس کو چاہیے کہ اردو ایڈیشن کا مطالعہ کرے ، کیوں کہ انگریزی ایڈیشن درحقیقت اردو ایڈیشن کا خلاصہ ہے جس میں بہت سی باتیں بہ نسبت اردو ایڈیشن کے نہایت اختصار کے ساتھ بیان ہوئی ہیں ۔ چوں کہ اس کتاب کا لکھنا سرسیّد کی مذہبی خدمات میں ایک جلیل القدر

۱- ڈی ٹاسی : ۱۸۲۱ء میں فرانس میں پیدا ہوا اور وہیں ۱۸۷۷ء میں وفات پائی ۔ اکثر یورپین زبانوں کے علاوہ عبرانی ، سریانی ، کلدانی ، سامری ، عربی اور فارسی زبانوں کا ماہر تھا ۔ اردو زبان کا پروفیسر تھا ۔ اُس نے اُردو مصنفین اور شعرا کا بہت بڑا تذکرہ تین جلدوں میں لکھا ہے ۔ اس کے علاوہ اور بہت سی کتابیں اُردو زبان اور اس کے قواعد پر تصنیف کی ہیں ۔ یہ اردو کے بڑے محسنوں میں شمار ہوتا ہے ۔ اردو کے متعلق اس کے فرانسیسی لکچروں کا ترجمہ 'مقالات گارسن ڈی ٹاسی' کے نام سے انجمن ترقی اُردو نے شائع کیا ہے (محمد اسماعیل)

خدمت ہے اور اس کا بیان بہت طولانی ہے جس کی اس مضمون میں گنجایش نہیں ہے ، اس لیے ہم اس موقع پر اس کی نسبت زیادہ لکھنا نہیں چاہتے کیوں کہ سرسیّد کی لائف میں اس کا مفصل بیان کیا گیا ہے ۔ یہاں صرف اس قدر سمجھ لینا چاہیے کہ سرسیّد سے پہلے جہاں تک ہم کو معلوم ہوا ہے ، کبھی کسی مسلمان نے مثل ‘خطبات احمدیہ’ کے کوئی ایسی کتاب ، جس میں اسلام کی خوبیاں ظاہر کی گئی ہوں یا اُس کے مخالفوں کے اعتراضات کے جوابات دیے گئے ہوں ، اُن قوموں کے ملک میں جا کر جن کو مسلمان گمراہ سمجھتے ہیں اور جن پر اسلام کا عرض کرنا اپنا فرض جانتے ہیں ، انھی قوموں کی زبان میں لکھ کر شائع نہیں کی ۔ ایک بہت بڑے عیسائی عالم ریورنڈر ہوپر نے ، جو ایک زمانے میں لاہور ڈیونٹی کالج کے پرنسپل تھے ، میرے ایک مسلمان دوست سے کہا تھا :

’’خطبات احمدیہ لکھنے سے سید احمد خاں نے اسلام کی ایک ایسی خدمت کی ہے جو تیرہ سو برس میں کسی مسلمان سے بن نہیں آئی ۔‘‘

اگرچہ ہندوستان کے مسلمانوں نے اب تک اس کتاب کی کچھ قدر نہیں کی بلکہ معدودے چند کے سوا اس کو کسی مسلمان نے دیکھا بھی نہیں ، مگر امید ہے کہ جب وہ ان ضرورتوں کو سمجھیں گے جو مسلمان اور اسلام کو فی زماننا درپیش ہیں اور جن کو سید احمد خاں کے سوا بہت ہی کم آدمیوں نے اب تک سمجھا ہے ، تو اُس کی صرف قدر ہی نہیں کریں گے بلکہ فخر کریں گے کہ اُس کا لکھنے والا ایک ہندوستان کا مسلمان تھا ۔ جس زمانے میں سر سید لندن میں یہ کتاب لکھ رہے تھے ، اس وقت ٹرکی کے ایک مسلمان عالم سے وہاں اُن کی ملاقات ہوئی تھی ۔ سر سید نے اپنی کتاب کے چند مقالات اس کو سنائے تو اس کا یہ حال تھا کہ وہ

بار بار سرسید کے ہاتھ چومتا تھا اور بچھا جاتا تھا ۔

کرنل گریہم سرسید کی لائف میں اسی ‘خطبات احمدیہ’ کی نسبت لکھتے ہیں :

’’جو لوگ (یعنی انگریز) مذہبی باتوں سے دل چسپی رکھتے ہیں اُن کو چاہیے کہ اس کتاب کو غور سے پڑھیں ۔ دین محمدی فی زماننا انگریزوں کے نزدیک بالکل ایک غیر معقول اور سخت متہم دین ہے اور وہ اس کو ایک روحانی آفت خیال کرتے ہیں ، جیسے کہ ہمارے بزرگ اس صدی کے شروع میں بونا پارٹ کو ایک جسمانی آفت خیال کرتے تھے ۔ وہ (یعنی اسلام) عموماً ایک تلوار کا مذہب خیال کیا جاتا ہے اور ہر ایک چیز تعصب ، مغایرت اور تنگ دلی کی اُس میں خیال کی جاتی ہے ۔ لیکن ہمارے ناظرین کتاب جو اس غلطی میں مبتلا ہیں ، جب سید احمد خاں کی اس کتاب کو غور سے پڑھیں گے تو میں کہہ سکتا ہوں کہ وہ بالکل دوسرے خیالات لے کر اٹھیں گے ۔ ہمارے مصنف (یعنی سید احمد خاں) نے اپنے دلی دوست سرولیم میور کی کتاب ‘لائف آف محمد’ کی تحریروں کی مخالفت کی ہے اور خوب برچھیاں توڑی ہیں ، اور میں خیال کرتا ہوں کہ بے تعصب اور دقیقہ سنج ناظرینِ کتاب بہت سی باتوں میں سرولیم میور کے خلاف فیصلہ دینے میں اتفاق کریں گے ۔‘‘

انگلستان کے اخبار ‘انکوائرر’ میں جبکہ ‘خطبات احمدیہ’ وہاں شائع ہوئی ، ایک مبسوط ریویو (جس کا خلاصہ سرسید کی لائف میں درج کیا گیا ہے) کسی آزاد خیال انگریز نے اس کتاب پر لکھا تھا ، جس میں توقع سے بہت زیادہ اُس کی تعریف کی تھی اور بڑے بڑے اہم مسائل میں سرسید کے جوابوں کو تسلیم ہی نہیں کیا تھا بلکہ اُن کی حد سے زیادہ داد دی تھی ۔ اور سرولیم میور نے ڈاکٹر اسپرنگر

کے مقابلے میں سرسید کی کامیابی کا اعتراف کیا تھا ۔ اس سے بہتر ایک کتاب کے حق میں ، جو عیسائیوں کے مقابلے میں لکھی گئی ہو ، اور کیا شہادت ہو سکتی ہے کہ خود عیسائی قوم کے متعدد ممبروں نے اُس کی نسبت ایسی عمدہ رائے ظاہر کی ہے ۔

اس کتاب میں چند جزوی اختلافات کے سوا ، جن کا ایک محقق مصنف کی کتاب میں ہونا لابدی ہے ، کوئی ایسی بات نہیں ہے جو جمہور اسلام کے خلاف ہو ۔ اور امید ہے کہ جس قدر تعصبات کا طوفان فروتر ہوتا جائے گا (اور اس کے فرو ہونے کا وقت اب آ گیا ہے) اُسی قدر اس کتاب کی وقعت روز بروز مسلمانوں میں زیادہ ہوتی جائے گی ۔

سب سے زیادہ اہم اور قابل غور سرسید کی وہ مذہبی خدمت ہے جو اُن کے اخیر دم تک برابر جاری رہی : یعنی تفسیر القرآن کا لکھنا جس کا اصل مقصد تعلیم یافتہ نوجوان مسلمانوں کے خیالات کی اصلاح کرنا اور اسلام کو سائنس کے حملوں سے بچانا تھا ۔ جس نیت سے سر سید نے یہ تفسیر لکھنی شروع کی اور جن ضرورتوں نے اُن کو اُس کے لکھنے پر مجبور کیا تھا ، اُس کا مفصل بیان انہوں نے اپنے ایک لکچر میں کیا ہے جو لاہور میں اسلام پر دیا گیا تھا اور جو ‘سفر نامۂ پنجاب’ میں اور اُن کی اسپیچوں اور لکچروں کے مجموعے میں چھپ گیا ہے ۔ اس لکچر میں انہوں نے اس تفسیر کے لکھنے کا اصل منشا ایسی سچائی اور خلوص اور جوشِ اسلامی کے ساتھ بیان کیا تھا کہ اُن کے ایک سخت مخالف مولوی نے ، جو اُن کے برخلاف رسالے شائع کرتے تھے اور اُن کو نفرین اور ملامت کے گم نام خط لکھتے تھے ، لکچر ختم ہونے کے بعد علیٰ رؤس الاشہاد اپنی غلط فہمی کا اقرار کیا اور سرسید سے اپنے قصوروں کی معافی چاہی ، اور خود اپنے اوپر یہ جرمانہ کیا کہ اپنی ایک پوری تنخواہ

کالج کے چندے میں دی ۔

اس تفسیر پر بھی سر سید کی لائف میں مفصل ریویو کیا گیا ہے جو کسی قدر طویل ہے ۔ یہاں صرف اس مختصر بیان پر اکتفا کرنا چاہیے کہ جس وقت سر سید کو مسلمانوں میں انگریزی تعلیم پھیلانے کا خیال پیدا ہوا ، اُسی وقت سے اُن کو اس بات کی فکر تھی کہ جس قدر دنیوی ترقی کے لیے مسلمانوں کو انگریزی تعلیم کی طرف مائل کرنا ضرور ہے ، اُس سے بہت زیادہ اس بات کی ضرورت ہے کہ اُن کو تعلیم کے اُن مضر نتائج سے ، جو مذہب کے حق میں اُس سے پیدا ہوتے نظر آتے ہیں ، جہاں تک ممکن ہو بچایا جائے ۔

سرسید دیکھتے تھے کہ جو لوگ انگریزی تعلیم پاتے ہیں ، خواہ ہندو ہوں ، خواہ مسلمان اور خواہ عیسائی ، اُن کے دل میں ، مستثنیٰ صورتوں کے سوا ، عموماً مذہب کی وقعت باقی نہیں رہتی ۔ وہ جانتے تھے کہ اسی تعلیم کی بدولت روز بروز الحاد اور دہریت پھیلتی جاتی ہے اور عیسائی مذہب میں ضعف آتا جاتا ہے ، اس لیے ان کو خوف تھا کہ جو تعلیم وہ مسلمانوں میں پھیلانی چاہتے ہیں اور جو ضرور اُن میں پھیلنے والی ہے ، مبادا اس سے ویسے ہی مضر نتائج اسلام کے حق میں پیدا ہوں ۔ چناں چہ ۱۸۷۶ع میں کہ یہی زمانہ مسلمانوں میں تعلیم کی بنیاد پڑنے اور کالج کے کھلنے کا ہے اور تقریباً یہی زمانہ سرسید کی تفسیر شروع ہونے کا معلوم ہوتا ہے ، انہوں نے ایک اسپیچ میں (خاص کر مدرسۃالعلوم کے طلبہ سے مخاطب ہو کر) کہا تھا کہ ”یاد رکھو سب سے سچا کلمہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ ہے ۔ اسی پر یقین کرنے سے ہماری قوم ہماری قوم ہے ۔ اگر تم نے سب کچھ کیا اور اس پر یقین نہ کیا تو تم ہماری قوم نہ رہے ، پھر اگر تم آسمان کے تارے ہوگئے تو کیا ۔ پس اُمید ہے کہ تم ان دونوں باتوں (یعنی علم اور اسلام) کے نمونے ہوگے اور جب ہی ہماری قوم

کی عزت ہوگی ۔‘‘

باوجود اُس اندیشے کے ، جو اُن کو انگریزی تعلیم سے اسلام کے حق میں تھا ، اُن کو اس بات کا بھی یقین تھا کہ خاص اسلام جس کو وہ ٹھیٹ اسلام کہتے تھے اور جو اُن کے نزدیک حالتِ موجودہ میں صرف قرآن مجید میں منحصر تھا ، اس کو انگریزی تعلیم سے وہ صدمہ ہرگز نہیں پہنچ سکتا جو یورپ اور امریکہ میں عیسائی مذہب کو پہنچا ہے ۔ اُن کو معلوم تھا کہ مغربی تعلیم سے جو ایک عام یقین ایجوکیٹڈ (تعلیم یافتہ) نوجوانوں کے دل پر نقش ہو جاتا ہے ، وہ یہ ہے کہ دنیا میں کوئی امر لا آف نیچر ، یعنی قانونِ فطرت کے خلاف وقوع میں نہیں آتا ، اور اس لیے جو چیز وہ مذہب میں ایسی پاتے ہیں جو قانونِ فطرت کے خلاف معلوم ہوتی ہے ، اس پر یقین نہیں کرتے ۔ سرسید کو بھی اس اصول پر ایسا ہی یقین تھا ؛ اور اسی کے ساتھ یہ بھی یقین تھا کہ قرآن میں کوئی بات ایسی نہیں ہے جو حقیقتاً قانونِ فطرت کے خلاف ہو ۔ مگر اُن کا قول تھا کہ قرآن چوں کہ کافۂ انام کی ہدایت کے لیے نازل ہوا ہے اس لیے اس کا طرزِ بیان ایسا واقع ہوا ہے کہ ادنیٰ سے ادنیٰ آمی اور جاہل سے لے کر اعلیٰ سے اعلیٰ درجے کے عالم اور حکیم تک سب اپنی اپنی سمجھ کے موافق اس سے ہدایت پاتے ہیں ۔ پس گو اس کی ظواہر آیات سے اکثر موقعوں پر عام ذہنوں میں فوق العادة امور کا واقع ہونا سمجھا جاتا ہے مگر جب آیتوں پر تعمقِ نظر کے ساتھ غور کیا جاتا ہے تو اُن میں کوئی بات عادتِ الٰہی یا قانونِ فطرت کے خلاف نہیں معلوم ہوتی ۔

اسی اصول پر انھوں نے تفسیرالقرآن لکھنی شروع کی جو قریب نصف قرآن کے چھ جلدوں میں چھپ چکی ہے اور بہ قدر ایک جلد کے اُس کا قلمی مسودہ موجود ہے ۔

جس طرح سرسید کے اور اکثر کام سب سے نرالے اور اچھوتے تھے ، اسی طرح اس تفسیر کا بھی سب سے نرالا کام تھا ۔ تیرہ سو برس میں کسی مسلمان نے قرآن کی تفسیر اس اصول پر نہیں لکھی کہ قرآن میں کوئی بات قانونِ فطرت کے خلاف نہیں ہے ۔ اگرچہ اس میں شک نہیں کہ جس کتاب کی نسبت یہ یقین کیا جائے کہ وہ سرتا سر خدا کا کلام ہے ، اس کی سچائی کا اس سے بہتر کوئی معیار نہیں ہو سکتا کہ اُس میں کوئی بیان در حقیقت قانونِ فطرت کے خلاف نہ ہو ۔ مگر جس طرح یہ کہنا آسان ہے کہ ’’خدا کا کوئی کام مصلحت سے خالی نہیں‘‘ لیکن اُس کے ہر ایک کام کی مصلحت بیان کرنی سخت مشکل ہے ، اسی طرح یہ کہنا تو بہت آسان ہے کہ ’’قرآن میں کوئی بات قانونِ فطرت کے خلاف نہیں‘‘ مگر قرآن کے ہر ایک بیان کو قانونِ فطرت پر منطبق کرنا نہایت دشوار ہے ، کیوں کہ جو کتاب خدا کی طرف سے تمام دنیا کی ہدایت کے لیے آئی ہو ، اُس کی شان یہی ہے کہ اُس میں کوئی بات عام لوگوں کی سمجھ سے بالاتر نہ ہو ، اور اس لیے ضرور ہے کہ اس میں بہت سی باتیں ایسے پیرایوں میں کی جائیں کہ اگر اُن کو ظاہری معنوں میں محدود رکھا جائے تو وہ کسی طرح علمی تحقیقات کی میزان میں پوری نہ اُتر سکیں ۔

بہرحال سرسید نے یہ ایک مشکل کام اختیار کیا تھا کہ اگر کوئی اور شخص ایسا ارادہ کرتا تو مشکلات کا ہجوم دیکھ کر اس ارادے سے کبھی کا دست بردار ہو گیا ہوتا ۔ مگر انھوں نے باوجود ایسی مشکلات کے اور باوجود اپنے ہم مذہبوں کی سخت مخالفت کے اس ارادے کو اخیر دم تک ترک نہیں کیا بلکہ اس کو اپنی زندگی کا اعلیٰ ترین مقصد اور اسلام کی خیرخواہی کا سب سے بڑا کام سمجھا ۔

اگرچہ اُن کو اس تفسیر کے اکثر مقامات میں توقع سے زیادہ

کامیابی ہوئی ہے جس سے ایک عجیب و غریب تھیالوجیکل (مذہبی) قابلیت اُن کے دماغ کی ثابت ہوتی ہے ، مگر اسی کے ساتھ بہت سے مقامات ان کی تفسیر میں ایسے بھی موجود ہیں جن کو دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ ایسے عالی دماغ شخص کو کیوں کر ایسی تاویلاتِ باردہ پر اطمینان ہو گیا اور کیوں کر ایسی فاحش غلطیاں اُن کے قلم سے سرزد ہوئی ہیں ؟ لیکن درحقیقت یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے ؛ جن لوگوں نے تقلید کی بندشوں کو توڑ کر تحقیق کے میدان میں قدم رکھا ہے اور زید و عمرو کا سہارا چھوڑ کر اپنی خدا داد عقل سے کام لینا اور قدما کے علم میں کچھ اضافہ کرنا چاہا ہے ، ان سب کی رایوں میں اس قسم کی شترگربگی پائی گئی ہے کہ اُن کی بعضی باتوں پر الہامی ہونے کا گمان ہوتا ہے اور بعضی انتہا درجے کی رکیک اور سخیف معلوم ہوتی ہیں ، یہاں تک کہ ایک کو دوسری کے ساتھ کچھ نسبت نہیں معلوم ہوتی ۔ مگر یہی وہ لوگ ہیں جو علومِ دینیہ میں اپنے اپنے فن کے امام مانے گئے ہیں ۔ ان کی غلطیوں سے دین کو کچھ نقصان نہیں پہنچا ، کیوں کہ وہ لغو سمجھ کر آخرکار مردود ٹھیر گئیں ۔ مگر اُن کی فتوحاتِ جدیدہ سے اسلام کو بے انتہا تقویت پہنچی ہے ۔ سرسید کو اپنی اس نئی طرز کی تفسیر کے جن جن مقامات میں پوری کامیابی ہوئی ہے (اور ایسے مقامات کی تعداد کچھ کم نہیں ہے) اُن سے فی الواقعہ بہ مقابلہ علومِ جدیدہ کے اسلام میں ایک نئے علم کلام کی بنیاد پڑ گئی ہے ؛ اور اس بات کی امید بندھ گئی ہے کہ جب اس قدر مشکلات صرف ایک شخص کی کوشش سے حل ہو گئی ہیں تو باقی مشکلات بھی ضرور کبھی نہ کبھی حل ہو جائیں گی ۔ دنیا میں ہمیشہ بڑے بڑے کام اسی طرح پورے ہوئے ہیں کہ ایک شخص کسی کام کی بنیاد ڈالتا ہے اور آیندہ نسلیں اس کام کو پورا کرتی ہیں اور اُس کی غلطیوں کی اصلاح کرتی

ہیں ۔ سرسید نے خود اپنے ایک لکچر میں ، جو اُنھوں نے بہ مقام لاہور اسلام پر دیا تھا ، اس بات کا اقرار کیا ہے کہ :

> ”میں معصوم نہیں ہوں اور نہ معصوم ہونے کا دعویٰ کرتا ہوں ۔ میں ایک جاہل آدمی ہوں ۔ اسلام کی محبت سے میں نے یہ کام کیا ہے جس کے میں لائق نہیں ہوں ۔ ممکن ہے کہ اس میں غلطی ہو مگر آیندہ علما اس کی صحت کر دیں گے اور اسلام کو مدد دیں گے ۔ میرے خیال میں مخالفین اور مشککین فی الاسلام کے مقابلے میں اسلام کی تائید اسی طریقے پر ہو سکتی ہے ، اور کسی طریقے پر نہیں ہو سکتی ۔“

اگرچہ اس نئی طرز کے علم کلام کو ، جس کی بنیاد بہ مقابلہ علوم جدیدہ کے سرسید نے اپنی تفسیر میں ڈالی ہے ، اب تک ہمارے علما نے اُسی نفرت اور کراہیت سے دیکھا ہے جیسے عباسیہ کے عہد میں محدثین و فقہا نے قدیم طرز کے علم کلام کو اُس کے آغاز کے زمانے میں دیکھا تھا ، مگر جس طرح قدیم علم کلام آخرکار علوم دینیہ کا ایک نہایت ضروری حصہ سمجھا جانے لگا تھا ، اسی طرح امید ہے کہ اگر ہمارے علما نے تعصب اور تقلید کی بندشوں سے آزاد ہوکر ٹھنڈے دل سے اس تفسیر پر غور کی ، اور سرسید کے عمدہ خیالات کو اخذ کیا ، اور اُن کی غلطیوں کی اصلاح کی ، اور جس عمارت کی انھوں نے بنیاد ڈالی ہے اُس کو پورا کرنا چاہا ، تو تعلیم یافتہ نوجوان مسلمانوں کے مذہبی خیالات کی اصلاح کے لیے یہ جدید علم کلام نہایت مفید بلکہ علوم دینیہ کا ایک نہایت ضروری حصہ سمجھا جائے گا ۔ اور اس کا بڑا ثبوت یہ ہے کہ جو کچھ سرسید نے اس مضمون پر تفسیر القرآن یا تہذیب الاخلاق میں یا چھوٹے چھوٹے متعدد رسالوں میں لکھا ہے ، اس کا ایجوکیٹڈ (تعلیم یافتہ) طبقے کے مسلمانوں پر عجیب و غریب اثر ہوا ہے ؛ میں ایسے متعدد مسلمان نوجوانوں سے واقف ہوں جنھوں

نے انگریزی تعلیم پانے کے زمانے میں مذہب کو بالکل خیرباد کہہ دی تھی اور بعضوں نے عیسائی ہونے کا ارادہ ٹھان لیا تھا۔ اور ایسے تو بےشمار تھے جن کا ایک قدم لامذہبی کی طرف اٹھتا تھا تو دوسرا قدم مذہب کی طرف سے پیچھے ہٹ جاتا تھا ، مگر جب سے سرسید مرحوم کی مذکورہ بالا تحریریں شائع ہونا شروع ہوئیں اس وقت سے ، جہاں تک کہ ہم کو معلوم ہے ، یہ رخنہ تقریباً بالکل بند ہو گیا ہے۔ بعض مسلمان نوجوانوں نے اخباروں میں بذریعہ تحریر کے اور بعضوں نے پبلک لکچروں میں اور بعض نے اپنے دوستوں سے زبانی بیان کیا ہے کہ ”اگر سید صاحب کی تحریریں ہماری نظر سے نہ گزرتیں تو ہم اسلام سے منحرف ہو جاتے ۔“ اور جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ، یہی مقصد سرسید کا تفسیرالقرآن لکھنے سے تھا ۔

ایک بار ایک مولوی صاحب ، سر سید سے ملنے کو آئے اور ان کی تفسیر دیکھنے کو مانگی ۔ سرسید نے ان سے کہا کہ ”آپ کو خدا کی وحدانیت اور رسول خدا صلعم کی رسالت پر تو ضرور یقین ہوگا ؟ انہوں نے کہا ”الحمد للہ ۔“ پھر کہا کہ ”آپ حشر و نشر اور عذاب و ثواب اور بہشت و دوزخ پر بھی یقین رکھتے ہوں گے ؟“ انہوں نے کہا ”الحمد للہ ۔“ اس پر سرسید نے کہا ”بس تو آپ کو میری تفسیر دیکھنے کی کچھ ضرورت نہیں ہے ۔ اس کی ضرورت ان لوگوں کو ہے جو مذکورہ بالا عقائد پر یقین نہیں رکھتے یا ان میں متردد و مذبذب ہیں ۔“

سرسید کا خیال تھا کہ اس تفسیر سے ، کچھ عجب نہیں بلکہ نہایت قرین قیاس ہے کہ مسلمانوں میں ایجوکیٹڈ (تعلیم یافتہ) لوگوں کا ایک نیا فرقہ پیدا ہو جائے جو مذہبی خیالات میں مسلمانوں کے موجودہ فرقوں سے کسی قدر مختلف ہو ۔ لیکن وہ کہا کرتے تھے کہ ”ایسا نیا اسلامی فرقہ بہ نسبت اس کے کہ وہ اسلام کو چھوڑ کر دوسرا مذہب اختیار کر لیں یا کسی مذہب کے پابند نہ رہیں ، ہزار درجہ بہتر ہے ۔“

یہاں ایک لطیفہ ذکر کرنے کے قابل ہے : علی گڑھ کے ایک مشنری (پادری) صاحب نے سر سید کے ایک دوست سے کہا کہ ”سید صاحب یہ تو خوب جانتے ہوں گے کہ محمڈن کالج کے طالب علم مسلمانوں کے طریقے پر قائم نہیں رہ سکتے ، پھر وہ تفسیر لکھ کر ان کو ہمارے ہاتھ سے بھی کیوں کھوتے ہیں ؟“

٦- مضامین متعلق علی گڑھ کالج

۱

مدرسۃ العلوم مسلمانان علی گڑھ

(علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ ، بابت ۱۸۷۹ء ، صفحہ ۱۲۳۶)

سرسید کو مسلمانوں کی تعلیم کے لیے ایک انگریزی علوم کا مدرسہ قائم کرنے کا خیال تو اُسی وقت سے پیدا ہو گیا تھا جب وہ ۱۸۶۹ء میں لندن گئے تھے - مگر وہاں سے ۱۸۷۰ء میں واپسی کے بعد تو وہ ہمہ تن اس کوشش میں مصروف ہو گئے - چناں چہ ایسے مدرسے کے قیام کے لیے سارے ہندوستان میں پراپیگنڈہ کیا ، اُس کے لیے چندہ جمع کیا ، اُس کے لیے علی گڑھ میں زمین خریدی اور بالآخر نہایت آرزوؤں اور امنگوں اور بڑے بڑے ارادوں کے ساتھ ۲۴ مئی ۱۸۷۵ء کو "مدرسۃ العلوم مسلمانان" کے نام سے اُس کا افتتاح کر دیا - یہی مدرسہ جس کا افتتاح چند خس پوش جھونپڑوں میں کیا گیا تھا ، آج مسلم یونیورسٹی کی شکل میں ہمارے سامنے ہے -

مولانا حالی ابتدا ہی سے اس مدرسے کے زبردست اور پُرجوش حامیوں میں سے تھے مگر خود وہ کبھی علی گڑھ نہیں گئے تھے - ۱۸۷۹ء میں سرسید نے اُنھیں علی گڑھ آنے کی دعوت دی تاکہ وہ مدرسے کا معائنہ فرمائیں - چناں چہ مولانا تشریف لے گئے اور اُس وقت جو کیفیت اُنھوں نے وہاں دیکھی ، اُسے ایک دل چسپ مضمون کی شکل میں اخبار میں چھپوایا - یہ

وہی مضمون ہے جو علی گڑھ کالج کی ابتدائی حالت پر بہت عمدہ روشنی ڈالتا ہے۔ (محمد اسماعیل)

ان دنوں حسن اتفاق سے ہم کو علی گڑھ جانے کا موقع ملا۔ ہم خوش قسمتی سے وہاں ایسی جگہ ٹھیرے تھے جہاں سے مدرسۃ العلوم کا احاطہ بہت قریب تھا اور یہ پہلا ہی موقع مدرسۃ العلوم کو دیکھنے کا ملا تھا۔

اگرچہ تعطیل کے سبب مدرسہ بند تھا اور بیماری کی وجہ سے طلبہ کی حاضری میں کمی تھی، مگر جس قدر مدرسے کی حالت ہماری آنکھوں کے سامنے تھی، اُس سے بھی جو اثر ہمارے دل پر پیدا ہوا ہے، اس کو ہم کبھی فراموش نہیں کر سکتے: ہم بڑے بڑے مقدس واعظوں کی مجالسِ وعظ میں حاضر ہوئے ہیں، ہم نے اونچے اونچے منبروں پر نہایت فصیح و بلیغ خطبے بھی سنے ہیں، ہم حال و قال کی مجلسوں میں بھی شریک ہوئے ہیں، ہم نے پیرانِ طریقت کے گرد مریدوں اور طالبوں کے حلقے بھی دیکھے ہیں اور اُن کے دل ہلا دینے والے نعرے بھی سنے ہیں، مگر ہم سچ کہتے ہیں کہ جو قومی مسرت اور اسلامی حمیت اس مدرسے کو دیکھ کر خود بخود جوش میں آتی ہے، وہ کسی دوسری جگہ اب تک نہیں دیکھی گئی۔ بلا تشبیہ جو شعر نظیری نیشاپوری[1] نے بیت اللہ کی زیارت کے وقت پڑھا تھا، وہ اس مدرسے کو دیکھ کر ہمیں یاد آیا اور بہت دیر تک ہم اُس کو اپنے دل ہی دل میں پڑھ کر گنگناتے رہے:

---

[1] نظیری کا نام محمد حسین تھا۔ فارسی کا مسلم الثبوت شاعر گزرا ہے۔ اکبر کے زمانے میں نیشاپور سے ہندوستان آیا اور عبدالرحیم خان خاناں کے ہاں ملازم ہو گیا۔ بمقام احمد آباد ۱۰۲۲ھ (۱۶۱۳ع) کو انتقال کیا۔ (محمد اسماعیل)

ایں کعبہ را بنا نہ بباطل نہادہ اند
صد معنی و جہاں دریں گل نہادہ اند

اس کالج کی ادھوری نیویں، اس کے اسکول کے نامرتب کمرے، اُس کے بورڈنگ ہاؤس کی ناتمام لین، اس کے احاطے کی چند سنگین جالیاں، جو قوم کی بے پروائی کی وجہ سے اب تک نامکمل نظر آتی ہیں، ہمارے دل میں تاج گنج کے روضے اور اکبر[1] کے مقبرے سے زیادہ عظمت و شوکت رکھتی ہیں، کیوں کہ اُن سے قوم کو نہ کچھ اُس وقت فائدہ پہنچنے کی امید تھی اور نہ اب ہے، اور نہ اُن سب کی بنیاد محض قوم کی بہبودی اور عزت کی امید پر رکھی گئی تھی۔

اُس کے چمن اور کیاریوں کے خاکے اور اُن کی روشوں کی حدبندی، اُس کی سڑکوں کی داغ بیل، اُس کے گرد چھوٹے چھوٹے پودوں کی باڑ، اُس کی اونچی نیچی زمین اور گھانس اور اُس کی مٹی ہم کو لاہور کے شالامار باغ[2] اور لکھنؤ کے قیصر باغ[3] سے زیادہ دل کش

---

[1] مقبرۂ اکبر: یہ مقبرہ آگرے سے چار پانچ میل موضع سکندرہ میں بنا ہوا ہے۔ مقبرے کی دو منزلہ عمارت سنگ سرخ کی بنی ہوئی ہے جس میں جا بجا سنگ مرمر اور سنگ موسیٰ بھی استعمال کیا گیا ہے۔ (محمد اسماعیل)

[2] شالامار باغ: لاہور سے مشرق کی طرف تین میل پر موضع باغبانپورہ کے قریب ہے۔ دور دور سے لوگ اسے دیکھنے آتے ہیں اور لطف اٹھاتے ہیں۔ باغ میں نہر کی موجودگی نے اس کی خوبصورتی اور دل فریبی کو دوبالا کر دیا ہے۔ ۸۰ ایکڑ زمین پر شاہجہاں بادشاہ نے ۱۰۴۷ھ (۱۶۳۷ع) میں تعمیر کرایا تھا۔ خوبصورتی، نفاست اور دل کشی کے لحاظ سے قابل دید ہے۔ (محمد اسماعیل)

[3] قیصر باغ: لکھنؤ کا قدیم عالی شان اور خوب صورت باغ ہے۔ اگرچہ شاہی زمانے میں نہایت عروج پر تھا مگر اب بھی خاصا پُر رونق ہے۔ وسط میں عالی شان سفید بارہ دری ہے اور فصیل کے ساتھ ساتھ تین طرف بڑی بڑی دو منزلہ عمارتیں بنی ہوئی ہیں۔ (محمد اسماعیل)

اور دل کشا معلوم ہوتی ہے ، کیوں کہ وہ باغات صرف ایک ایک شخص کے دل کا ارمان نکالنے کے لیے بنائے گئے تھے اور یہ مدرسہ اس لیے بنایا جا رہا ہے کہ تمام قوم کے ارمان اُس سے نکلیں - اگرچہ اُس کے مکانات کی تعمیر میں ابھی بہت کچھ باقی ہے لیکن جس قدر کام ہو چکا ہے اور ہو رہا ہے ، اُس سے ہم کو کامیابی کا نہایت پختہ یقین ہوتا ہے -

جس طرح خدائے ذوالجلال نے بنی نوع انسان پر نئی دنیا ظاہر کرنے کے لیے اور اپنی قدرت کے بےانتہا خزانے کھولنے کے لیے جینوا[1] میں کلمبس[2] کو پیدا کیا تھا اور وہ اپنی پر زور دلیلوں اور زبردست حجتوں سے ملکۂ ہسپانیہ کے تمام دربار پر غالب آیا تھا ، اسی طرح اُس نے ہماری بہبودی کے لیے ہندوستان میں ایک اولوالعزم اور عالی ہمت آدمی پیدا کیا ہے جو باوجود قوم کی سخت مخالفتوں اور مزاحمتوں کے آج تک اپنے ارادے پر ثابت قدم ہے -

ہم مدرسة العلوم کے اس وسیع میدان میں عین دھوپ کے وقت ایک پیر مرد ، سفید ریش ، نورانی صورت اور عالی دماغ آدمی کو باوجود کبرسن اور فربہی مفرط کے نہایت ذوق و شوق اور امنگ کے ساتھ دو دو گھنٹے پیادہ پا پھرتے دیکھ آئے ہیں - اور اس کے سوا ہم نے رات اور دن اُس کو اُسی دھن میں سرگرم پایا ہے - اور اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ خدا کو اس شخص سے یہ عظیم الشان کام لینا ہے - نہ رئیسوں اور تعلقداروں کی بے پروائی اس کے ارادوں

---

[1] جنیوا (Genoa) : اٹلی کی مشہور و معروف بندرگاہ ہے -
(محمد اسماعیل)

[2] کولمبس (Columbus) : امریکہ کا دریافت کنندہ اور یورپ کا مشہور سیاح ہے - ١٤٣٦ء میں پیدا ہوا اور ١٥٠٦ء میں انتقال کیا -
(محمد اسماعیل)

کو روک سکتی ہے اور نہ زید و عمرو کی مخالفت اُس کی ہمت کو توڑ سکتی ہے -

خدا نے اپنا کام لینے کے لیے اس کو کچھ یار و مددگار بھی دیے ہیں جن میں سے بعض نے اپنا گھر بار چھوڑ کر علی گڑھ ہی میں بود و باش اختیار کر لی[1] ہے ، اور اکثر اپنے اپنے مقام پر دل و جان سے اعانت و امداد میں سرگرم ہیں -

اگرچہ قوم کی پست ہمتی کے سبب ابھی تک کوئی مسجد اصل نقشے کے مطابق تیار نہیں ہوئی لیکن عارضی طور پر چند روز کے لیے ایک خوب صورت پختہ چبوترہ نماز پڑھنے کے لیے بنا لیا گیا ہے - ہم نے بھی طالب علموں اور مدرّسوں کے ساتھ ایک وقت کی نماز وہاں پڑھی - اتفاق اور ہمدردی اور قومی محبت کے انوار و برکات جو کہ جمعہ و جماعت کے خاص مقاصد ہیں ، اگر سچ پوچھیے تو ہم نے اسی چبوترے اور اسی نماز میں دیکھے ہیں - اور اسلام کی آیندہ شوکت کا اگر پتا لگتا ہے تو ایسے ہی اجتماع سے لگتا ہے -

ہم نے حیدر آباد اور مدراس تک کے صغیر سن لڑکے بھی یہاں پائے ، اور اُن کو اس قدر خوش و خرم ، مطمئن اور فارغ البال دیکھا کہ شاید اپنے گھر پر اپنے پیارے ماں باپ کے پہلو میں بھی اس قدر خوش حال نہ ہوں گے -

وہی اولوالعزم پیر مرد جس وقت اُن کے سر پر ماں باپ سے بھی زیادہ شفقت بھرا ہاتھ پھیرتا ہے اور ان کو چمکارتا ہے تو اُن کے دل باغ باغ ہو جاتے ہیں ، اور وہ اپنے کنبے اور اپنے دیس کو بالکل بھول جاتے ہیں -

---

[1] یہ اشارہ نواب وقار الملک مولوی مشتاق حسین کی طرف ہے جو اُس زمانے میں محض طلبا کی نگرانی کے لیے بورڈنگ ہاؤس میں سکونت رکھتے تھے - (حالی)

ہم نے جس نفاست اور صفائی اور تمیز کے ساتھ یہاں کے طالب علموں کو بورڈنگ ہاؤس میں رہتے دیکھا ، اور جس لطافت کے ساتھ اُن کا دسترخوان چنا ہوا پایا اور جس خاموشی ، وقار اور متانت کے ساتھ اُن کے کھانا کھانے کا طریقہ دیکھا ہے ، ہم کو امید نہیں ہے کہ ہندوستانی امرا اور رؤسا اور علما کی اولاد کو اس طرح رہنا اور کھانا پینا نصیب ہو سکے ۔

یہاں کے طالب علموں نے کرکٹ میں بھی نہایت ترقی کی ہے ۔ علی گڑھ کے تمام جلیل القدر انگریز اور اُن کی معزز لیڈیاں کرکٹ میں اُن کے ساتھ شریک ہوتی ہیں اور سب اُن کے ساتھ مُربیانہ اور دوستانہ برتاؤ برتتے ہیں ۔

طالب علموں کے چال چلن اور ضبطِ اوقات اور لباس و طعام اور نماز پنجگانہ و دیگر امور کی نگرانیَ کے لیے نہایت دین دار ، مدبر اور ذی علم لوگ مقرر ہیں اور تعلیم سے زیادہ اُن کی تربیت میں کوشش اور اہتمام کیا جاتا ہے ۔

الغرض ہندوستان میں ، جہاں تک ہم کو معلوم ہے ، کوئی عام تدبیر مسلمانوں کی دینی اور دنیوی بہبودی کی اُس وقت سے ، جب کہ مہلّب[1] اور محمد ابن[2] قاسم نے اس ملک میں قدم رکھا ، آج تک نہیں کی گئی ۔

۱- مہلّب : حضرت معاویہؓ کے زمانے میں عبدالرحمن بن سمرہ والیِ سیستان کی فوج کے ایک نام ور سردار تھے ۔ یہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے ۴۴ھ میں افغانستان کے مہیب پہاڑوں اور دشوار گزار اور سخت پیچیدہ گھاٹیوں کو عبور کرکے ہندوستان پر حملہ کیا اور ایک ہی تاخت میں کابل سے ملتان تک کے علاقے کو آن کی آن میں فتح کر لیا ۔ بعد ازاں لاہور پر فوج کشی کرکے جملہ حملہ آوروں کو شکست دی ۔ (محمد اسماعیل)

۲- محمد بن قاسم ثقفی : اموی خلیفہ عبدالملک بن مروان کے زمانے

(بقیہ حاشیہ اگلے صفحے پر)

افسوس ہے کہ اس اندھی اور بے تمیز دنیا میں ایسے عجیب و غریب کاموں کی قدر کبھی وقت پر نہیں ہوئی ، بلکہ ہمیشہ اُس وقت ہوئی ہے جب جواں مرد لوگ زمانے کی سختیاں جھیلتے جھیلتے اور یگانوں اور بیگانوں کے طعنے سنتے سنتے آخر ہو گئے ہیں ۔ سچ یہ ہے کہ باغِ دنیا کی ہود کبھی سرسبز نہ ہوتی ، اگر شہیدوں کے خون سے اُس میں آب پاشی نہ کی جاتی ۔ اور اگر ہر شخص اپنی نت کا ثمرہ اور اپنی کوشش کی قدردانی اپنی زندگی میں چاہتا تو یہ کھیتی کبھی پروان نہ چڑھتی ۔

اے خدا ! تو نے جن لوگوں کو بنی نوعِ انسان کی بھلائی کے لیے پیدا کیا ہے ، اُن کی عمر میں برکت دے اور اُن کی سعی کو مشکور کر اور اُن کی ہمت اور استقلال کو آخر دم تک قائم رکھ !! آمین ۔

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

میں ولایتِ فارس کے گورنر اور حجاج بن یوسف ثقفی گورنر عراق کے ابنِ عم، نیز داماد تھے ۔ بہت بڑے شجاع اور اعلیٰ درجے کے سپہ سالار تھے ۔ خلیفہ کی اجازت اور حجاج کے حکم سے ۹۳ھ میں ، جب کہ ان کی عمر پندرہ سال کی تھی ، سندھ پر حملہ کیا اور اپنی عدیم النظیر شجاعت سے تھوڑے ہی عرصے میں تمام سندھ کو فتح کرکے مسلمانوں کی حکومت کی بنیاد ڈال دی ۔ ابھی ان کی فتوحات کا سلسلہ جاری تھا کہ خلیفہ نے وفات پائی اور اُس کا بیٹا سلیمان مسند آرائے خلافت ہوا ، جس کو حجاج اور اس کے خاندان سے سخت دشمنی تھی ۔ اُس نے عنانِ سلطنت ہاتھ میں لیتے ہی سب سے پہلے محمد بن قاسم پر ، جو حجاج کے داماد تھے ، ہاتھ صاف کیا اور محض بلا قصور ایک سپہ سالار بھیج کر سندھ سے انھیں گرفتار کرا منگایا ، اور شہر واسط میں قید کر دیا ، جہاں سخت تکالیف سہتے سہتے ۹۶ھ میں اس بے نظیر بہادر نے عین عالم شباب میں نہایت حسرت کے ساتھ جان دے دی ۔ (محمد اسماعیل)

۲

خیالات دربارۂ مسودۂ قانون ٹرسٹیانِ مدرسۃالعلوم علی گڑھ

(سرمور گزٹ ناہن ، جلد ۲ ، نمبر ۲۹ ، بابت ۸ اگست ۱۸۸۹ع)

۱۸۸۹ع میں سرسید نے علی گڑھ کالج کے استحکام اور اُس کی جائدادوں کے انتظام کے لیے ٹرسٹی مقرر کرنے چاہے اور اس کے لیے قوانین کا ایک مسودہ مرتب کیا جس میں اپنے بعد اپنے لڑکے سید محمود کو کالج کا لائف سیکرٹری تجویز کیا ۔ جب وہ مسودۂ قانون ممبرانِ کالج کمیٹی کے ملاحظے کے لیے چھاپ کر تقسیم کیا گیا تو اُس پر مخالفت کا ایسا زبردست طوفان کھڑا ہوا جس نے کالج کی بنیادوں کو ہلا کر رکھ دیا ۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ کالج کے سب سے بڑے معین و مددگار مولوی سمیع اللہ خاں کالج سے ہمیشہ کے لیے علیحدہ ہوگئے ، جس سے کالج کو سخت نقصان پہنچا ۔ مگر سرسید اپنی بات پر اڑے رہے اور مسودے کو پاس کرا کے رہے ۔

اس مسودۂ قانون پر مولانا حالی نے بھی اپنے خیالات کا اظہار ایک مضمون کی صورت میں کیا تھا ، اور یہ مضمون مولوی سراج الدین کے اخبار 'سرمور گزٹ' میں

اُسی وقت چھپ گیا تھا ۔ 'سرمور گزٹ' کا وہ فائل جس میں یہ مضمون ہے ، خوش قسمتی سے محمد احمد پبلک لائبریری رام گلی لاہور میں محفوظ ہے ۔ بعد میں اس مضمون کو قاسم علی سجن لعل نے 'نوائے ادب' بمبئی کے پرچوں (جولائی ، اکتوبر ۱۹۵۸ع اور جنوری ۱۹۵۹ع) میں شائع کرایا ۔

یہ نایاب مضمون ، جو علی گڑھ کالج کی تاریخ سے متعلق ایک اہم دستاویز ہے ، میں آج ہدیۂ ناظرین کر رہا ہوں ۔ جن لوگوں کو علی گڑھ کالج کے معاملاتِ نظم و نسق سے دل چسپی ہے ، وہ اس مضمون میں بہت سی نئی اور عجیب باتیں پائیں گے ۔ (محمد اسماعیل)

مسودۂ قوانین و قواعدِ تقرر و طریقۂ کارروائیِ ٹرسٹیانِ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج علی گڑھ پر ، اور اُن اعتراضات و شبہات پر جو مسودۂ مذکورہ کی اکثر دفعات پر وارد کیے گئے ہیں ، ریمارک :

یہ مسودہ آنریبل ڈاکٹر سرسید احمد خاں بہادر لائف آنریری سکریٹری محمڈن اینگلو اورینٹل کالج فنڈ کمیٹی نے کالج کے استحکام اور دوام کی غرض سے ، اور اس غرض سے کہ اس کی جائداد کی کامل حفاظت کی جائے اور مطابق قوانینِ سرکاری مجریۂ وقت کے اس کے لیے ٹرسٹی (یعنی امانت دار) مقرر کیے جائیں ، کالج فنڈ کمیٹی کی باضابطہ اجازت سے تیار کرکے مئی ۱۸۸۹ع میں واسطے ملاحظۂ ممبران کالج فنڈ کمیٹی چھاپ کر شایع کیا ہے ، اور اس کے شایع ہونے کے بعد جناب مولوی محمد سمیع اللہ خاں بہادر سی - ایم - جی نے بہ حیثیت ممبر کالج فنڈ کمیٹی کے اس کی دفعات پر اعتراضات اور شبہات لکھ کر تمام ممبروں کے پاس اس غرض سے بھیجے ہیں

کہ وہ ان پر کامل غور کرنے کے بعد مسودۂ مذکور کی منظوری یا عدم منظوری کی نسبت رائے تحریر کریں ۔

اگرچہ میں ٹرسٹی یا کالج فنڈ کمیٹی کا ممبر نہیں ہوں لیکن چوں کہ مدرسۃالعلوم مسلمانوں کی بھلائی کے لیے قائم کیا گیا ہے ، اس لیے ہر مسلمان اس بات کا حق رکھتا ہے کہ جو امر اس کے نزدیک مدرسۃالعلوم کے حق میں مضر ، مسلمانوں کے لیے باعث شرم ہو ، اس کو صاف صاف لوگوں پر ظاہر کرے ۔

جس روز سے مدرسۃالعلوم کی بنیاد پڑی ہے ، خود مدرسہ اور اس کے بانی ہمیشہ مخالفت اور طعن و تشنیع کے آماج گاہ رہے ہیں ، لیکن اب تک جتنے حملے اس پر ہوتے تھے ، وہ سب بیرونی تھے ۔ جن لوگوں کو مدرسے سے کچھ تعلق نہ تھا ، ان میں سے بعضے تعصب سے ، بعضے نادانی و حماقت سے اور بعضے خبثِ طینت سے مدرسے اور اس کے بانیوں کو متہم اور بدنام کرتے تھے ، لیکن بہ عنایت الٰہی ان تمام مخالفتوں اور مزاحمتوں سے مدرسے کو بجائے اس کے کہ کچھ صدمہ پہنچے ، زیادہ قوت و استحکام ہوتا گیا اور رفتہ رفتہ وہ اس آیت کا مصداق ہو گیا :

> ”کزرع اخرج شطاءہ فازرہ فاستغلظ فاستویٰ علی سوقہ یعجب الزراع ۔“

لیکن جو اختلاف یا مخالفت مسودۂ قانون مذکور کے ساتھ کی گئی ہے ، یہ ایک اندرونی مخالفت ہے جو خود مدرسے کے بانی اور اس کے بعض اعوان و انصار میں پیدا ہوئی ہے ، اور اس لیے وہ مدرسے کے حق میں نہایت خطرناک ہے ۔ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ جناب مولوی محمد سمیع اللہ خاں صاحب اور تمام ممبرانِ کالج فنڈ کمیٹی کو بلاشبہ یہ استحقاق حاصل تھا اور حاصل ہے کہ مسودۂ مذکور کی کُل یا بعض دفعات سے اختلاف یا ان پر اعتراض کریں ، اور اس مسودے کو من حیث المجموع منظور کریں یا نہ کریں ۔ لیکن جس طریقے سے مولوی صاحب نے اس پر نکتہ چینی کی ہے ، اگر میری رائے غلط نہیں تو ایسی نکتہ چینی کا استحقاق ان کو یا کسی اور ممبر کو ہرگز حاصل نہیں ہو سکتا ۔ انھوں نے اختلاف نہیں کیا بلکہ مخالفت کی ہے اور بیان کا ایسا عنوان اختیار کیا ہے ، جس سے ذاتی رنجش کا اظہار ہوتا ہے ۔ وہ اکثر دفعات کو سید صاحب کی خود غرضی پر محمول کرتے ہیں ۔ انھوں نے سید صاحب اور سید محمود کے مذہب پر بھی تعریض کی ہے ، جو کسی طرح ان کو زیبا نہ تھی ۔ الغرض انھوں نے اس تحریر میں ایسا انداز اختیار کیا ہے جو بلاشبہ سید صاحب کا اور ان تمام مسلمانوں کا ، جن کے دل سید صاحب کی عظمت اور احسان مندی سے لبریز ہیں ، دل دکھانے والا اور مدرسے کے مخالفوں کو خوش کرنے والا ہے ۔

انسان کی ان تمام کمزوریوں میں سے ، جو قابل تعریف ہیں ، سب سے زیادہ افسوس کے قابل یہ بات ہے کہ وہ اپنے ہم جنسوں کی ہزاروں خوبیوں کو ، جن کا اس کو یقین ہے ، ایک ادنیٰ برائی کے شبہ سے ، جس کا کوئی ثبوت اس کے پاس نہیں ، بالکل نسیاً منسیاً کر دیتا ہے اور اس کے تمام حقوق و احسانات پر پانی پھیر دیتا ہے ۔ اور اس سے بھی زیادہ افسوس ناک بات یہ ہے کہ جس طرح ادنیٰ اور اوسط درجے کے لوگ اس مرض میں مبتلا ہیں ، اسی طرح اعلیٰ طبقے کے لوگ بھی اس علت سے مستثنیٰ نہیں ہیں ۔

مولوی صاحب ممدوح نے مسودۂ قانون ٹرسٹیاں پر اعتراضات و شبہات لکھنے اور ان کے شایع کرنے ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ مشہور یہ ہے کہ ایڈووکیٹ اور ہندوستانی اخبار میں جو کچھ سید صاحب کے برخلاف لکھا جاتا ہے ، وہ خود مولوی صاحب یا ان کے ایماء سے ان کے بعض دوست لکھتے ہیں ۔ شاید مولوی صاحب کی

سنجیدگی اور متانت سے یہ بات کسی کو مستبعد معلوم ہوتی ہو لیکن ہم کو یقین واثق ہے کہ ضرور انھی کے ایما سے یہ سب کچھ لکھا جاتا ہوگا ، کیوں کہ مسلمانوں کی بدبختی اور بداقبالی جو انتہا کے درجے کو پہنچ گئی ہے ، اس میں کوئی حالت منتظرہ اس کے سوا باقی نہ تھی کہ جن لوگوں سے یہ امید ہو کہ قوم میں اتفاق و یک جہتی پیدا کریں گے ، خود انھی میں نااتفاق و مخاصمت پیدا ہو جائے ، اور پورا ہو مسلمانوں کے حق میں خدا تعالیٰ کا وہ حکم جو نازل ہوا تھا یہود کے حق میں کہ :

> ''ضربت علیھم الذلة و المسکنة و باؤا بغضبٍ من اللہ ۔''

جناب مولوی محمد سمیع اللہ خاں صاحب نے جو مسودۂ قانون مذکور پر اپنی رائے تحریر فرمائی ہے ، اس میں انھوں نے اپنے بہت سے حقوق مدرسے پر جتائے ہیں اور گویا یہ ظاہر کیا ہے کہ وہ اور سید صاحب مدرسے کے قائم کرنے اور اس کے قائم رکھنے میں مساوی الاقدام ہیں ۔ بلاشبہ مولوی صاحب ممدوح کے بہت سے حقوق تسلیم کرنے کے قابل تھے لیکن افسوس ہے کہ ''قومی خدمات'' جتلانے اور اظہار کرنے سے ، گو وہ جتلانا اور اظہار کرنا کسی پیرایے میں ہو ، بالکل بے قدر سمجھی جاتی ہیں بلکہ 'کان لم یکن' ہو جاتی ہیں ۔ کیا اچھا ہوتا اگر وہی حقوق مولوی صاحب ممدوح اپنی زبان سے ظاہر نہ کرتے بلکہ کوئی دوسرا شخص ان کو ظاہر کرتا ۔ اور اس سے بھی اچھا ہوتا اگر جناب ممدوح بھی ، جیسا کہ سید مہدی علی خاں نے امادہ کے اڈریس کے جواب میں اقرار کیا ہے ، اس بات کا اقرار کرتے کہ :

> ''اگر کوئی شخص اس عزت کا مستحق ہے تو وہ تمام ہندوستان میں صرف ایک شخص ، یعنی سر سید احمد ہے جس نے دنیا کو دکھا دیا کہ ابھی مسلمانوں کی قوم زندہ ہے ۔''

> ''اور ابھی اس نیم جاں قالب میں تازہ روح پھونکنے والا موجود ہے ۔''

پہلے اس سے کہ مولوی صاحب کے اعتراضات اور ان کی رائے پر کچھ لکھا جائے ، دو باتوں کی تنقیح کرنی ضروری ہے : ایک یہ کہ مدرسة العلوم کا قیام اور چودہ برس میں جو ترقیات غیر مترقبہ اس کو ہوئیں ، یہ کوئی جمہوری کام تھا یا شخصی ؟ دوسرے یہ کہ اگر یہ شخصی کام تھا تو دوسری صورت میں یعنی اگر یہی کام جمہوری ہوتا تو ایسے قلیل زمانے میں اس کا اس قدر ترقی کرنا ممکن تھا یا نہیں ؟ امر اول کی نسبت مجھ کو ہرگز امید نہیں کہ کوئی منصف مزاج آدمی جو مدرسة العلوم کے اول سے آخر تک تمام حالات سے واقف ہے ، وہ اس کے قیام اور اس کی ترقیات کو سرسید احمد خاں کی ذات کے سوا کسی دوسرے شخص کی طرف منسوب کر سکے ؛ اول ایک ایسے انسٹیٹیوشن کا ، جس کو مسلمانوں نے کبھی خواب میں بھی نہ دیکھا تھا ، منصوبے میں باندھنا ، پھر اس کی ضرورت ایسی دھوم دھام کے ساتھ کہ تمام زمانے کو اس کا اقرار کرنا پڑے ، ثابت کرنا ، پھر اس کے چندے کے لیے ہزاروں تدبیریں سوچنی ، اور ہر تدبیر میں کامیاب ہونا اور چودہ برس میں چندے کی مقدار کو اس حد تک پہنچانا کہ سو برس میں بھی وہاں تک پہنچنا دشوار بلکہ ناممکن معلوم ہوتا تھا ، کالج کے واسطے ایک نہایت وسیع قطعۂ زمین کی گورنمنٹ سے درخواست کرنی اور باوجودیکہ اکثر گورنمنٹ آفیسر اور خود ضلع علی گڑھ کا کلکٹر اس کے مخالف تھے ، اس زمین کے لینے میں کامیاب ہونا ، دس برس میں کالج کے لیے ایک ایسی عظیم الشان عمارت کھڑی کر دینی جو کسی طرح رعایا کا کام نہیں بلکہ ایک جلیل القدر سلطنت کا کام معلوم ہوتا ہے ؛ جو لوگ قومی مدرسے اور قومی کام کے مفہوم سے بھی واقف نہ تھے ،

ان میں سے سیکڑوں بلکہ ہزاروں اپنے مددگار بہم پہنچانے ، جس قوم میں انگریزی تعلیم کفر سمجھی جاتی تھی ، ان میں بہت جلد انگریزی تعلیم کا ایک عام ولولہ اور شوق پیدا کر دینا ، گورنمنٹ اور ہندوستانی رئیسوں کو مدرسے کا معاون اور مددگار بنانا ، انگریزوں کے دل میں عموماً اس کی عظمت کا نقش بٹھانا ، کالج کے بورڈروں کی خوراک ، آسائش ، صحت ، ریاضت ، معاشرت ، اخلاق اور دیگر حالات کی نگرانی کا ایسا انتظام کرنا جس کی نظیر ہندوستان کے کسی کالج یا بورڈنگ ہاؤس میں نہیں پائی جاتی ، کالج کے لیے ایک بے بہا لائبریری مہیا کرنی اور ہمیشہ اس کی ترقی میں مصروف رہنا ، کالج کی زمین میں ایک نفیس باغ لگانا اور اس کے لیے میوہ‌دار درختوں کی پود دور دست مقامات سے منگوانی ، کالج کے لیے انگلینڈ سے ایسا اسٹاف بہم پہنچانا جو لیاقت اور فضیلت کے علاوہ کالج کی خیرخواہی اور طلبہ کی ہمدردی میں ضرب المثل اور انگلش نیشن کی شرافت اور انسانیت کا عمدہ نمونہ ہے ، ذی مقدور طالب علموں کو ولایت بھیجنے میں توقع سے زیادہ کامیابی حاصل کرنی ، غریب طلبہ کے لیے اسکالرشپوں کا بندوبست کرنا اور اس غرض کے لیے نمایشوں میں خود دوکان لگانی ، کتابیں فروخت کرنی ، تھیٹر قائم کرنا اور اور طرح کی تدبیریں کرنی ، یہ اور اسی طرح کے بے شمار کام کون کہہ سکتا ہے کہ اس ایک اولوالعزم آدمی کے سوا جس کے احسان سے کسی طرح مسلمان سبکدوش نہیں ہو سکتے ، یعنی سر سید احمد خاں کے سوا ، کسی دوسرے شخص کی قوت بازو سے سرانجام ہوئے ہیں ۔ یہ سچ ہے کہ انسان مدنی الطبع ہے ۔ وہ اپنے ادنٰی ادنٰی کاموں میں دوسروں کی اعانت کا محتاج ہے ۔ کولمبس کی امداد اگر ملکہٗ ازبلا نہ کرتی اور ایک جہاز کا بیڑا اس کے ساتھ نہ کر دیتی تو امریکہ کا دریافت کرنا کولمبس کی طاقت سے باہر

تھا ۔ ملکہٗ ازبلا ہی پر موقوف نہیں ہے ، اس کے سوا ہزاروں آدمی ایسے ہوں گے جن سے کولمبس کو اس عزیمت کے سرانجام کرنے میں بہت کچھ مدد پہنچی ہو گی ، لیکن نئی دنیا کے فاتح ہونے کی عزت جو کولمبس کو دی گئی ہے ، اس میں اسپین کی ملکہ یا اور کوئی شخص کسی طرح شریک نہیں ہو سکتا ۔ اس کی وجہ ظاہر ہے : کولمبس کو اور لوگوں سے بھی وہی مدد پہنچنی ممکن تھی جو ملکہ یا اور لوگوں سے اس کو پہنچی ، لیکن کولمبس کا کام اسی کی ذات کے ساتھ مخصوص تھا جو اس کے سوا کسی دوسرے شخص سے سرانجام نہ ہو سکتا تھا ۔

پس اگرچہ اس بات کا انکار نہیں ہو سکتا کہ سرسید احمد خاں نے جو کام شروع کیا تھا ، اس میں اکثر بزرگانِ قوم سے اُن کو بے انتہا مدد پہنچی ہے ، اور قوم کا فرض ہے کہ ان کی دل سے شکر گزار ہو ، لیکن کسی شخص کو یہ استحقاق نہیں ہے کہ مدرسے کے کسی کام میں سرسید کی مساوات کا دعوٰی کر سکے ۔ گو سید احمد خاں اپنی زبان سے کچھ نہ کہیں لیکن ان کا نام سنہرے حرفوں میں زمانے کی پیشانی پر لکھا ہوا ہے ، جو کبھی مٹنے والا نہیں ۔

جناب مولوی صاحب ممدوح اپنی رائے میں لکھتے ہیں کہ :

”جس وقت مدرسے کا وجود خیالی تھا اور اخبارات میں اس کی خیالی تصویر کھینچی جاتی تھی اور فریق مخالف کی جانب سے اعتراضات کی بوچھاڑ تھی ، ہمارے آنریبل سکریٹری سید احمد خاں بہادر بنارس میں جج اسمال کز کورٹ اور سب ججی کے عہدے پر تھے اور میں علی گڑھ میں سب جج تھا ۔ اس وقت اکیلا میں ہی تھا جس کی مستحکم رائے یہ تھی کہ خیالی تصویر دکھانے سے فریق مخالف کا جواب نہیں ہو سکتا ، عملی

> طریقے سے مخالفت کو توڑنا چاہیے ۔ جب ہمارے آنریبل سکریٹری اور ان ممبرانِ مقامیِ بنارس نے ، جن سے ایک مختصر کمیٹی بنارس میں مرکب تھی ، میری رائے سے اختلاف کیا تو میں نے اپنی رائے پر استقلال اور بھروسے کے ساتھ عمل کرنا چاہا اور مستحکم ارادہ کر لیا کہ سلسلۂ تعلیم کو شروع کردوں ۔ میں نے علی گڑھ میں ایک جلسہ کیا جس میں تمام میرے دوست رئیسانِ اعظم گڑھ و بلندشہر جمع ہوئے اور اول ہی جلسے میں کثیرالتعداد چندہ جمع ہو گیا ۔ میں سکریٹری قائم ہوا ۔ اس کے بعد میں نے سرسید صاحب کو اپنے ارادے اور عمل پر متوجہ کرنے پر اصرار کیا ۔ ان کی ذاتی رائے اس وقت بھی میری رائے سے مختلف تھی لیکن دیگر ممبران کمیٹی نے غلبۂ رائے سے میرے ساتھ اتفاق کیا ۔’’

اس میں شک نہیں کہ سید صاحب کی رائے ہرگز یہ نہ تھی کہ مدرسہ کھولنے میں ایسی عجلت اور جلدی کی جائے ، بلکہ ان کی یہ رائے تھی کہ جب تک چندے کی معتد بہ مقدار جمع نہ ہو جائے اس وقت تک مدرسے کا کھولنا ملتوی رکھا جائے ۔ اور بلا شبہ اگر مولوی سمیع اللہ خاں صاحب کی طرف سے اصرار نہ ہوتا اور کثرت رائے ممبران ان کی مؤید نہ ہوتی تو مدرسے کے قیام میں شاید کسی قدر تاخیر ہوتی ، لیکن جو تامل سید صاحب کو اس بات میں تھا وہ اس احتیاط کا مقتضی تھا جو ان کی شان کے مناسب تھی ۔ ان کی احتیاط سے اور مولوی صاحب ممدوح اور ان کے مؤیدین کی جلدی سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ سید صاحب بنائے مدرسہ کے ذمہ دار تھے ، اور سب لوگ بہ منزلہ تماشائی کے ۔ ظاہر ہے کہ جس شخص کو سالہا سال سے مدرسہ قائم کرنے کی لو لگی ہوئی تھی اور جس نے انگلستان کا سفر زیادہ تر اسی غرض سے اختیار کیا تھا اور

کیمبرج یونیورسٹی کو خاص اسی ارادے سے بہ نظر تفصیلی جا کر ملاحظہ کیا ، جس نے ولایت سے آتے ہی انجمن ترقی خواہِ تعلیمِ مسلمانان قائم کی اور ہندوستان کے لائق ترین اشخاص سے قریب پچاس مضمون کے اس سوال پر لکھوائے کہ گورنمنٹ کالجوں اور اسکولوں کی تعلیم مسلمانوں کے مناسب حال ہے یا نہیں اور تمام ابتدائی مرحلے طے کیے ، اس شخص سے زیادہ کون اس بات کا خواہش‌مند ہو سکتا ہے کہ مدرسہ کل کا کھلتا آج ہی کھل جائے ۔ لیکن انھوں نے ایک ایسا عظیم‌الشان انسٹیٹیوشن قائم کرنے کا ارادہ ظاہر کیا تھا جو کسی طرح مسلمانوں کی پست حالت کے ساتھ مناسبت نہ رکھتا تھا ، اور جس کے لیے اس قدر زر خطیر درکار تھا کہ ہندوستان جیسے ملک میں ایک قومی کام کے لیے اس قدر روپیہ فراہم کرنا محال معلوم ہوتا تھا ۔

سرسید نے نہ کسی تاریخ میں پڑھا تھا اور نہ ان کو اپنے ذاتی تجربے سے معلوم تھا کہ ہندوستان میں لکھوکھا روپیہ قوم کی ایک ایسی بھلائی کے لیے ، جس کو تمام قوم اپنے حق میں سخت مضر سمجھتی ہو ، لوگوں سے چندے کے طور پر جمع ہو سکتا ہے ۔ ان کو بخوبی معلوم تھا کہ اگر ایک ایسا جلیل‌القدر کالج ، جیسا کہ دعویٰ کیا گیا ہے اور جس کے منصوبے پر بڑے بڑے دانش مند لوگ ہنستے ہیں ، قائم نہ ہو سکا تو نہ مولوی سمیع اللہ خاں کو اور نہ کسی اور ممبر کو ، بلکہ صرف سید احمد کو عالم کی نظر میں خفیف ہونا پڑے گا ۔ یہ اسباب تھے جن کی وجہ سے سر سید کو مدرسہ کھولنے میں اس قدر احتیاط تھی ، اور ایسی ہی احتیاط ہونی بھی چاہیے تھی ۔ کیوں کہ جن لوگوں نے دنیا میں بڑے بڑے کام کیے ہیں ، انھوں نے کبھی کسی کام میں ہاتھ نہیں ڈالا جب تک اس کی تمام مشکلات اور دشواریوں پر غالب آنے کی طاقت اپنے میں نہیں دیکھی ۔

بلاشبہ ہم کو مولوی سمیع‌اللہ خاں صاحب کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ ان کی ایک یگانہ وار اور اتفاق مگر صائب رائے سے مسلمانوں کی تعلیم کا سامان وقت سے پہلے ہو گیا ، لیکن مولوی صاحب ممدوح سے ہزار درجہ بڑھ کر شکر و سپاس کے مستحق سر سید احمد خاں ہیں جن کی فوق‌العادت کوششوں سے مدرسے کو یوماً فیوماً ترقی ہوتی گئی اور وہ رفتہ رفتہ ایک عظیم‌الشان کالج بن گیا ۔ اور جس کا سالانہ خرچ ابتدا میں تقریباً دس بارہ ہزار سے زیادہ نہ تھا ، اب اس کے بجٹ کی تعداد بڑھتے بڑھتے چونسٹھ ہزار سالانہ تک پہنچ گئی ۔ اگر سر سید اپنی جان اور مال اور اپنا تمام عزیز وقت اور اپنی تمام جسمانی اور دماغی طاقتیں اس مدرسے کی ترقی اور افزائش میں صرف نہ کرتے اور اپنے خلوص ، استقلال ، تدیّن اور راست بازی سے لکھوکھا مسلمانوں کو اپنی طرف گرویدہ نہ کرتے ، اور اپنی پُر زور تحریروں سے قوم کے متعصبانہ خیالات میں ایک انقلاب عظیم پیدا نہ کرتے ، اور وہ تمام کام نہ کرتے جن کی نظیر ہندوستان کی تاریخ میں نہیں مل سکتی ، تو ممکن نہ تھا کہ مولوی محمد سمیع‌اللہ خاں صاحب کی صائب رائے پر کوئی نتیجہ معتدبہ مرتب ہوتا ۔ جس طرح اور ہندوستانی ہزاروں کام شروع کرتے ہیں اور چند روز کے بعد ان کی مشکلات کو دیکھ کر جی چھوڑ دیتے ہیں یا جیسا دعویٰ کرتے ہیں ایسا انجام تک نہیں پہنچا سکتے ، ویسا ہی حال اس مدرسے کا ہوتا ۔ پس حق یہ ہے کہ مدرسۃ‌العلوم کا قیام ، اس کی ترقی ، اس کی رونق اور عظمت جو کچھ نظر آتی ہے یہ صرف سرسید احمد خاں کی مساعیِ جمیلہ ، تدبر ، اولوالعزمی کا صدقہ ہے اور اسی لیے کسی کو یہ منصب نہیں ہے کہ ان کے ساتھ اس عزت میں برابری یا مشارکت کا دعویٰ کر سکے ۔

شاید کسی کو یہ خیال ہو کہ مدرسۃ‌العلوم کی محافظت اور اس کا انتظام ابتدا سے چند کمیٹیوں کے سپرد رہا ہے اور اس کے تمام کام ہمیشہ کسی نہ کسی جماعت کے استصواب اور مشورے سے انجام پاتے رہے ہیں ، پس ایسے کام کو شخصی کام کیوں کر کہا جا سکتا ہے ؛ لیکن جو لوگ مدرسے کے حالات سے واقف ہیں ان کو معلوم ہے کہ ابتدا سے آج تک صرف ایک انجمن سے یہ تمام کام چلتی رہی ہیں ، بہ استثنائے کمیٹی مدیران تعلیم مذہب ، جس نے اب تک محض اس وجہ سے کہ سید احمد خاں جیسے سکریٹری کی روح اس میں نہ تھی ، اپنا کوئی کارنامہ نہیں دکھایا ۔ تمام کمیٹیوں میں وہی ایک روح حلول کیے ہوئے تھی ۔ اس سے ہمارا یہ مطلب نہیں ہے کہ سکریٹری کے سوا تمام ممبروں کا عدم وجود برابر تھا یا ان کو مدرسے کی ترقی اور بہبودی کا کچھ خیال نہ تھا ؛ نہیں ، بلکہ وہ یہ جانتے تھے کہ ایک شخص نے وطن ، کنبہ ، عزیز ، رشتہ‌دار سب کچھ چھوڑ کر اپنے نفس کو مدرسے کے نام پر قربان کر دیا ہے ۔ رات دن مدرسے ہی کی دھن میں لگا رہتا ہے ۔ برابر قوم کی بھلائی کی تدبیریں سوچتا رہتا ہے ۔ مخالف اور موافق اس کی امانت اور دیانت کا اعتراف کرتے ہیں ۔ مدبر ہے ، دانش مند ہے ، تجربہ کار ہے ، مستقل مزاج ہے ، ذی لیاقت ہے ، صاحب وجاہت ہے ، اولوالعزم ہے ، دور اندیش ہے ؛ اور باوجود ان سب باتوں کے اپنے ارادوں میں برابر کامیاب ہوتا چلا آتا ہے ۔ ایسے شخص کی تجویزوں اور منصوبوں میں دخل دینا اور اس کی بہادرانہ امنگوں کو روکنا گویا چلتی گاڑی میں روڑا اٹکا دینا ہے ۔ اسی لیے جو تجویزیں سید احمد خاں کمیٹی میں پیش کرتے تھے وہ ہمیشہ (الا ماشاء اللہ) منظور ہوتی تھیں ۔ ان کی رائے سے بہت کم اختلاف کیا جاتا تھا اور اگر کیا جاتا تھا تو وہ بہت کم سرسبز ہوتا تھا ۔ پس مدرسۃ العلوم کا قیام اور اس کی ترقی اور عظمت وغیرہ خواہ کمیٹیوں کی طرف منسوب کی جائے اور خواہ بعض ممبروں کی

طرف ، لیکن ہے یوں کہ یہ تمام ظہورہ صرف سید احمد خاں کی ذات بابرکات کا ہے اور انھی کو اس کا حقیقی استحقاق ہے ۔

کار زلف تست مشک افشانی اما عاقلان
مصلحت را تہمتی بر آہوی چین بستہ اند

دوسرے سوال کی نسبت میری رائے یہ ہے کہ اگر مدرسۃ العلوم کی کمیٹیاں اپنے سکریٹری یعنی سرسید احمد خاں کی سرگرمی ، استقلال ، دانش مندی اور راست بازی کے بھروسے پر مدرسے کے کاموں میں دخل دینے سے بالکل مستغنی نہ ہو جاتیں ، اور اپنے اختیارات کو پورے طور پر عمل میں لاتیں ، تو ممکن نہ تھا کہ مدرسۃ العلوم کو چودہ برس میں یہ ترقیاتِ روز افزوں نصیب ہوتیں ۔ ٹامس کارلائل جہاں حکومت کا سب سے بہتر طریقہ بتاتا ہے ، وہاں یہ لکھتا ہے کہ :

> ”ملک میں لائق ترین شخص ، جس سے زیادہ کوئی لائق آدمی موجود نہ ہو ، تلاش کرو اور اس کو سلطنت کی باگ سونپ دو ۔ پھر وفاداری سے اس کی تعظیم کروگے تو تم ایک ایسی کامل گورنمنٹ ملک میں پاؤگے جس کو قرعہ ڈالنا یا ووٹ دینا یا قانونِ سلطنت بنانا یا پارلیمنٹ کے ممبروں کی جادو بیانی یا اسی طرح کی اور کلیں ایک بالشت بھر آگے نہیں بڑھا سکتیں ۔
>
> ”یہ ایک ایسی کامل حالت ملک کی ہے کہ اس سے پرے خیال نہیں پہنچ سکتا ۔ لائق ترین شخص کے صرف یہی معنی نہیں کہ سب سے زیادہ لائق ہو ، بلکہ اس کے ساتھ یہ بھی ضرور ہے کہ سب سے زیادہ نیک نیت ، سب سے زیادہ منصف مزاج اور سب سے زیادہ شریف ہو ۔ اگر ایسا شخص ہم کو دستیاب ہو جائے تو پھر جو کچھ کرنے کو وہ ہم سے

> کہے ، اس کو یہ سمجھو کہ یہی بات ہمارے لیے سب سے زیادہ قرین مصلحت اور قرین عقل ہے ، جس کو ہم کبھی یا کہیں سیکھ سکتے ہیں ۔“

اس دعوے پر کوئی دلیل کارلائل نے شاید اس لیے نہیں لکھی کہ سمجھ دار آدمی ادنٰی غور سے اس کو ترتیب دے سکتا ہے ۔ ظاہر ہے کہ جب ایسا آدمی خوش قسمتی سے کسی قوم کو دستیاب ہو جائے جس سے بڑھ کر کوئی اچھا اور لائق شخص بہ ظاہر اس قوم میں موجود نہ ہو ، تو ضرور ہے کہ اس کی رائیں ، اس کے منصوبے ، اس کی تجویزیں اکثر اوقات قوم کے عام افراد کی سمجھ بوجھ سے کسی قدر بلند اور بالاتر ہوں گی ، کیوں کہ یہی امر اس میں اور تمام قوم میں ما بہ الامتیاز مانا گیا ہے ۔ پس اگر اس کو ملکی ترقی اور ملکی انتظام کے کاموں میں مطلق العنان نہ کیا جائے گا اور اس کے اختیارات ، ضابطے اور قانون کی بندشوں سے جکڑبند کر دیے جائیں گے ، اور اس کی رائے کو معمولی ممبروں کی رائے سے زیادہ وقعت نہ دی جائے گی ، اور تمام امور کا مجارٹی سے تصیفہ ہوگا ، تو ممکن نہیں کہ اس کی رائے عام ممبروں کی رائے پر کبھی غالب آ سکے ، اور وہ سلطنت کے کسی کام میں اپنی اعلٰی درجے کی لیاقت ظاہر کر سکے ۔ اس کی مثال اس یکہ تاز سپہ سالار کی سی ہوگی جو اپنی ران اور باگ کے بھروسے پر وسیع اور عمیق خندق سے ، جو راہ میں حائل ہوتی ہے ، گھوڑا اڑانا چاہتا ہے ، مگر اس کے پست ہمت اور کم سواد ساتھی اس یقین پر کہ یہ کام انسان کی معمولی طاقت سے باہر ہے ، کبھی اس کو ایسی جرأت نہیں کرنے دیتے ، اور اس لیے اس کی یکہ‌تازی و شہ سواری کا جوہر کبھی ظاہر نہیں ہونے پاتا ۔

جو رائے کارلائل کی ، حکومت اور سلطنت کی بابت ہے ، وہی

رائے بلکہ اس سے زیادہ وثوق کے ساتھ ایک ایسے قومی کام میں ، جیسا کہ مدرسۃ العلوم اور اس کی ترقی و انتظام ہے ، قائم ہو سکتی ہے ۔ اگر ہندوستان کے مسلمانوں کو کوئی ایسا لائق اور نیک آدمی جیسے کہ سرسید احمد خاں ہیں ، خوش نصیبی سے مل جائے تو بلاشبہ اگر وہ فی الواقعہ دل سے مدرسے کی روز افزوں ترقی اور حسن انتظام کے خواہاں ہیں ، ان کو چاہیے کہ آنکھیں بند کرکے مدرسے کی باگ اس کے ہاتھ میں دے دیں ۔ الحمد للہ کہ ہمارے ہم وطن مسلمانوں نے اب تک ایسا ہی کیا ہے اور امید ہے کہ جب تک ان کو سرسید احمد خاں جیسا شخص ملے گا ، وہ ہمیشہ اسی طریقے پر کاربند رہیں گے ۔

فقرۂ بالا میں ہم نے 'بہت زیادہ وثوق' کا لفظ اس لیے استعمال کیا ہے کہ خاص کر ہندوستان کی موجودہ حالت میں کوئی ایسا کام ، جس کا مدار فی الواقعہ کسی جماعت کی رائے پر ہو ، ہرگز سرسبز نہیں ہو سکتا ۔ جماعتوں اور کمیٹیوں کے کام اور ایسے کام جن کا اختیار کسی خاص شخص کے ہاتھ میں نہ ہو ، ہمیشہ آن ملکوں میں سرسبز ہوتے ہیں جہاں ہائر کلاس اور مڈل کلاس کے آدمی قاطبۃً اصول اور کلیات میں متفق ہوتے ہیں ۔ اگر کچھ اختلاف ہوتا ہے تو صرف فروع اور جزئیات میں ہوتا ہے ۔ ہندوستان کی حالت اس کے بالکل برخلاف ہے ؛ یہاں مثلاً ایک شخص قومی ہمدردی کا اظہار کرکے ایک رفاہ عام کا کام شروع کرنا چاہتا ہے ، لیکن جن لوگوں سے وہ اس کام میں مدد چاہتا ہے ان میں بہت کم ایسے لوگ ہوتے ہیں ، جن کو اس بات کا یقین ہو کہ آدمی خلوص اور صدق دل سے محض قوم کی بھلائی کے لیے ، بے شائبۂ غرض ، کسی کام میں کوشش کر سکتا ہے ۔ ایک شخص کسی مدرسے کی ترقی اور افزائش اس بات پر موقوف سمجھتا ہے

کہ اس کی عظمت اور بڑائی گورنمنٹ اور پبلک کے دل میں بٹھائی جائے لیکن دیگر اکثر لوگوں کا یہ خیال ہوتا ہے کہ جس قدر روپیہ اس غرض سے صرف کیا جاتا ہے ، وہ محض رائگاں جاتا ہے ۔ ایک شخص کی یہ رائے ہے کہ جہاں تک ممکن ہو ، پروفیسروں اور معلموں کے لیے معقول تنخواہیں مقرر کی جائیں تاکہ لائق ، شریف اور ذی عزت استاد میسر آئیں ، لیکن اکثر لوگوں کی یہ مرضی ہوتی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو ، کفایت شعاری کے ساتھ خرچ کیا جائے ، اگرچہ عمدہ صفات کے استاد بہم نہ پہنچیں ۔

یورپ میں پبلک لائبریری قائم کرنی ، خیراتی ہسپتال کھولنا ، تعلیم نسواں کے لیے مدرسے جاری کرنے اور اسی طرح کے بیسیوں کام ایسے ہیں کہ اگر کوئی شخص ان میں سے کسی کام کے چھیڑنے کا ارادہ کرے تو ہزاروں آدمی نہایت ممنونیت کے ساتھ اس کی مدد کرنے کو فوراً کھڑے ہو جائیں گے ، بخلاف ہمارے ملک کے کہ اکثر لوگ بجائے امداد کے اس کی تضحیک کریں گے ۔ پس ایسے ملک میں صرف وہی کام سرسبز ہو سکتا ہے جس کو کوئی بڑا ذی وجاہت ، مستقل مزاج اور جفا کش آدمی شروع کرے ، اور لوگ اس کی وجاہت اور لیاقت کے سبب اس کی طرف گرویدہ ہوں : اس کی مدد اور اس پر اعتبار کریں ، اس کے اختیارات کو ، جن کا وہ مستحق ہے ، وسعت دے کر اس کا دل بڑھائیں اور اس کو تقویت دیں اور آپ اس کی صلاحوں اور تجویزوں پر کاربند رہیں ۔

اب میں اصل مطلب کی طرف متوجہ ہوتا ہوں : اگرچہ جناب مولوی محمد سمیع اللہ خاں بہادر نے مسودۂ مذکور کی اکثر دفعات پر اعتراضات لکھے ہیں ، لیکن انھوں نے زیادہ تر آن دفعات کے مضمون پر زور دیا ہے جس میں ٹرسٹیوں کو سکریٹری اور جائنٹ سکریٹری مقرر کرنے کا اختیار اس شرط کے ساتھ دیا گیا ہے کہ اول

آنریری سکریٹری آنریبل سرسید احمد خاں بہادر اور آنریری جائنٹ سکریٹری آنریبل جسٹس سید محمود ہوں گے ۔ اور سرسید احمد خاں کا عہدہ خالی ہونے پر سید محمود لائف آنریری سکریٹری ہو جائیں گے اور آئندہ اگر کوئی سکریٹری مقرر ہوگا تو تین برس کے لیے مقرر ہوگا ۔ وہ لکھتے ہیں کہ :

> ''آنریبل سرسید صاحب کا لائف آنریری سکریٹری ہونا بلحاظ ان کی خدمتوں کے ایک امر طے شدہ ہے ، اور ۲۳ اگست سنہ ۱۸۸۳ع کو ایک بڑے اجلاس میں تسلیم ہو چکا ہے ۔ اس پر میرے نزدیک کچھ بحث نہیں ہو سکتی ۔ لیکن جو وسعت اختیار کی ہمارے آنریبل سکریٹری (یعنی سرسید احمد خاں) کے واسطے تجویز ہوئی ہے اس قدر وسعت کو میں منظور نہیں کر سکتا ، اور اس کی نسبت میں مفصل رائے آگے لکھوں گا ۔ اسی طرح بہ طور ایک قاعدے کے آنریبل جسٹس محمود کو ، جو آنریری جائنٹ سکریٹری مادام الحیات ، اور بعد خالی ہونے عہدۂ آنریری سکریٹری کے ان کو لائف آنریری سکریٹری قرار دیا گیا ہے ، اس کی بھی میں تائید نہیں کر سکتا ہوں ۔ پچھلا امر مدرسے کے واقعات اور جسٹس محمود کے حالات کے لحاظ سے مدرسے کے لیے ناموزوں ہے ۔ میں خوب جانتا ہوں کہ ممبرانِ مدرسة العلوم سید محمود کے حالات سے بخوبی واقف ہیں اور اس سے بھی بخوبی واقف ہیں کہ یہ مدرسہ مسلمانوں کی ترقی کے لیے قائم ہوا ہے ، اور اس میں ایسے امور کی نہایت ضرورت ہے جن سے مسلمانوں کو اس کی طرف رغبت ہو ، اور وہ اپنی اولاد کو اس میں تعلیم دلانے کی طرف راغب ہوں ۔ اس کی انتظامی حالت ایک ایسے شخص کے ہاتھ میں ہونی چاہیے

> جس پر مسلمانوں کو ہر قسم کا بھروسا ہو اور بغیر کسی اندیشے کے وہ اپنی اولاد کو اس کے سپرد کریں ۔ اور جہاں تک کہ مجھ کو تجربہ ہے اور ان ممبروں کو جن کو زیادہ تر تعلق کالج کی انتظامی حالت سے رہا ہے ، وہ اس بات کی تصدیق کر سکتے ہیں کہ اگرچہ سید محمود کی لیاقت ایک عہدۂ جسٹس کے لیے کیسی ہی عمدہ اور موزوں ہو ، لیکن وہ جائنٹ سکریٹری یا مادام الحیات عہدۂ سکریٹری مدرسة العلوم کے لیے ناموزوں ہیں ۔ مدرسة العلوم حکومت شخصیہ نہیں ہے کہ باپ کے بعد بیٹا بطور ولی عہد کے تسلیم ہو ۔ سکریٹری وہ شخص مقرر ہونا چاہیے جس سے محمڈن کالج جیسے مدرسے کو ترقی و کامیابی کی امید ہو ۔ مجھ کو اس بات کی بھی کوئی وجہ معقول نہیں معلوم ہوتی کہ جب کہ ہمارے آنریبل سکریٹری ابھی تندرست و زندہ ہیں ، اور خدا ان کو بہت روز ایسا ہی سلامت رکھے ، تو کیا ان کو آنریبل سید محمود کے انتخاب میں بعد اپنی زندگی کے ایسا اندیشہ ہے جس کی بنا پر اپنی زندگی میں اپنی وجاہت کے بھروسے پر آنریبل سید محمود کے لیے اس قسم کی کوشش کرتے ہیں ۔ جب کہ اس کثرت سے ٹرسٹی مقرر ہوتے ہیں اور ان پر تمام کاموں کا بھروسا کیا جاتا ہے تو کیوں تقررِ سکریٹری شپ ان کی تجویز پر موقوف نہیں رہتا ۔ کیا ایک ایسے آزاد رائے اور لائق آدمی کے اس قسم کے خیالات معلوم ہونے سے کہ آنریبل جسٹس سید محمود کو اپنے بعد خواہ مخواہ اپنا قائم مقام بنانا چاہتے ہیں ، لوگوں کو کچھ کم تعجب ہوگا ؟''

مولوی صاحب کے اس بیان سے ٹرسٹیوں کے دل میں فی الواقعہ ایسے خدشے پیدا ہو سکتے ہیں جو صرف مسودۂ مذکور کے ملاحظے سے شاید رفع نہ ہو سکیں ۔ لیکن ہر مجموعہ قوانین و قواعد

میں ، خواہ وہ گورنمنٹ کی کونسل نے بنایا ہو اور خواہ کسی پبلک باڈی نے مرتب کیا ہو ، بعض دفعات ایسے دقیق اور ناگفتنی اسباب پر مبنی ہوتی ہیں جن کا ذکر اس مجموعے میں نہیں کیا جا سکتا ۔ لیکن در حقیقت وہ دفعات ایسی ضروری اور لازمی ہوتی ہیں کہ اگر ان کو اس مجموعے میں سے نکال دیا جائے تو قانون کا اصل مقصد فوت ہو جائے ۔ ایسی حالت میں سوا اس کے کہ مقنن کے تجربے اور قدیم دیانت اور خیرخواہی پر پورا اعتماد کیا جائے ، جو طریقہ اختیار کیا جائے گا ، وہ غلطی کے احتمال سے خالی نہیں ہو سکتا ۔ اگرچہ یہ ایک ضروری بات ہے کہ اس باب میں ہماری واقفیت بہ مقابلہ ان لوگوں کے ، جنھوں نے قانون بنایا ہے ، بہت مختصر اور محدود ہوگی ، لیکن امید ہے کہ جو کچھ اس باب میں اپنے ذاتی تفحص سے اور خود سید صاحب کی گفتگو سے ، جو مختلف اوقات میں ان سے سنی گئی ہے ، اور نیز اور واقف‌کار لوگوں کے بیانات سے اس پوائنٹ کے متعلق ہم کو معلوم ہے ، وہ بطور خلاصے کے اس مقام پر نقل کرنا کافی ہوگا ۔

جہاں تک معلوم ہے ، سید صاحب کو ہمیشہ اس بات کا یقین رہا ہے کہ مدرسۃ العلوم کا اعلیٰ درجے پر قائم رہنا صرف اس بات پر موقوف ہے کہ اس میں قابل اور عالم اور شریف یوروپین ، جو خاندان کے بھی معزز ہوں ، انگلستان کی نام آور یونیورسٹیوں سے ُبلا کر پرنسپل اور پروفیسر وغیرہ مقرر کیے جائیں ۔ اور میں خیال کرتا ہوں کہ جو لوگ مدرسۃ العلوم کے خیر خواہ ہیں ، وہ سب سید صاحب کی اس رائے کو تسلیم کریں گے ۔ کیوں کہ اگر ایسا نہ ہو تو نہ قوم کے لڑکوں کو اعلیٰ درجے کی تعلیم اور تربیت دی جا سکتی ہے ، نہ کالج کی وقعت ، عزت اور اعتبار لوگوں کی یا گورنمنٹ کی آنکھ میں قائم رہ سکتا ہے ۔ اور نہ گورنمنٹ اس قدر فیاضی سے گرینٹ ان ایڈ دے سکتی ہے جس قدر کہ اب دیتی ہے ۔

مدرسۃ العلوم کے لیے ایسے معزز اور لائق یوروپین کا میسر آنا کوئی آسان کام نہیں ہے ۔ نہ کمیٹی کو اس قدر استطاعت ہے کہ ان کو اس قدر تنخواہ دے سکے جس قدر کہ اسی حیثیت کے یوروپین افسروں کو گورنمنٹ سے اور موجودہ ایڈڈ کالجوں سے مل سکتی ہے ۔ نہ اس کالج کی ملازمت میں ان کو ترقی کی امید ہے ، نہ پنشن کی امید ہے اور نہ اور کسی قسم کی بہبودی کی امید ہے ۔ اس کے علاوہ وہ جانتے ہیں کہ یہ ایک ہندوستانیوں کا قائم کیا ہوا کالج ہے اور ہندوستانی ہی اس کے منتظم ہیں ۔ پس ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ یوروپین جنٹلمین اس کے قیام و استحکام پر اور اپنے حقوق کی حفاظت اور استقلال پر کس قدر اعتماد کر سکتے ہیں ۔ چند ہندوستانیوں کی جماعت ، خواہ اس کو کمیٹی کی حیثیت میں مانو اور خواہ ان کا نام ٹرسٹی رکھو ، ہر حالت میں کالج کے ملازمین کی نسبت اس کو کلی اختیارات ہیں ، جو چاہے سو کرے ۔ نہ اس کی تجویز کا کسی محکمے میں اپیل ہو سکتا ہے اور نہ وہ گورنمنٹ کے تابع ہے ۔ پس خیال کرنے کی جگہ ہے کہ کس بھروسے اور کس اعتماد پر یوروپین جنٹلمین ولایت سے سفر کرکے ہندوستان میں آئیں اور محمڈن کالج کی ملازمت اختیار کریں ۔

کمیٹی ان کو ولایت سے بلاتی ہے لیکن نہ ان سے کوئی خاص معاہدہ چاہتی ہے ، کیوں کہ اس میں کسی خاص معاہدہ کرنے کی استطاعت نہیں ، اور نہ ان کو کوئی خاص اگریمنٹ لکھ کر دینا چاہتی ہے ، کیوں کہ اس کو پورا کرنے کے لیے وہ کسی بینک کی ان کو ضمانت نہیں دے سکتی ۔ پس ظاہر ہے کہ ان کو بلانا صرف اس بات پر منحصر ہے کہ وہ مدرسے کے کار پردازوں پر بھروسا اور اعتماد کریں ۔

اس وقت جس قدر یوروپین ولایت سے آئے ہوئے کالج میں موجود ہیں ، وہ صرف سرسید احمد خاں اور سید محمود پر اعتماد کر کے آئے ہیں ، اور ان میں سے ایک شخص کو بھی کمیٹی نہیں بلا سکتی تھی ۔ کالج کمیٹی کے بعض ممبروں کو جو یہ خیال ہے کہ بیسیوں پڑے پھرتے ہیں اور جب ہم چاہیں بلا تامل ہم کو ہاتھ آ سکتے ہیں ، محض غلط ہے ۔ سید صاحب ہمیشہ اس رائے کے بر خلاف رہے ہیں اور ان کا قول ہے کہ یہ خیال کالج کو فائدہ پہنچانے والا نہیں بلکہ برباد کرنے والا ہے ۔ وہ کہتے ہیں کہ :

> ''اگر ہم یوروپین پروفیسروں اور پرنسپل کے ساتھ نہایت دوستی اور محبت سے راہ و رسم نہ رکھیں اور ان کی قدر و منزلت ایسی نہ کریں جیسی کہ ایک معزز دوست کی کرنی واجب ہے یا جیسی کہ اور کالجوں کے پرنسپلوں اور پروفیسروں کی قدر و منزلت ہے ، اور اگر ہم ان کے لیے وہ سب اختیار تسلیم نہ کریں جو اور کالجوں کے پرنسپلوں اور پروفیسروں کو حاصل ہوتے ہیں ، تو کوئی یوروپین جنٹلمین ہمارے کالج میں ملازمت قبول نہیں کر سکتا ۔ اور نہ کالج کا اور نہ طلبہ کی تعلیم کا ، خواہ وہ بورڈنگ ہاؤس میں رہتے ہوں اور خواہ ڈے سکولر (Day scholar) ہوں ، کام چل سکتا ہے ۔ لیکن افسوس ہے کہ مولوی سمیع اللہ خاں صاحب کالج کے پرنسپل اور پروفیسروں کو مثل کاٹ کی پُتلی کے رکھنا چاہتے ہیں کہ جس طرف چاہا پھیر دیا ۔ کوئی جنٹلمین ایسی حالت میں ایک منٹ بھر بھی کالج میں رہنا قبول نہیں کر سکتا ۔''

ہم نے متواتر سید صاحب سے سنا ہے کہ ''مولوی سمیع اللہ خاں صاحب کالج کے یوروپین ملازموں کو ایک نوکر سے زیادہ نہیں سمجھنا چاہتے ۔ ان کی طبیعت ہی ایسی واقع ہوئی ہے کہ وہ

ان کے ساتھ مثل ایک دوست کے ، نہ کہ مثل ایک نوکر کے برتاؤ نہیں کر سکتے ۔ ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں کوئی شریف یوروپین کالج میں نہیں رہ سکتا ۔ محمڈن کالج کا کیا ذکر ہے ، بڑی بڑی ہندوستانی ریاستوں میں جو یوروپین ملازم ہیں ، وہاں بھی ان کے ساتھ ایسا برتاؤ نہیں کیا جاتا جیسا کہ نوکروں کے ساتھ کرنا چاہیے ۔'' ہم کو خوب معلوم ہے کہ سنہ ۱۸۸۵ع یا ۱۸۸۶ع میں جب کہ سید صاحب دفعۃً شدید بیمار ہو گئے تو یوروپین اسٹاف کو یہ تردد پیدا ہوا کہ سرسید کے بعد ان سے کیسا سلوک کیا جائے گا اور کن لوگوں سے ان کو پالا پڑے گا اور وہ علی گڑھ کالج میں رہ سکیں گے یا نہیں ۔ جب سید صاحب کو افاقہ ہوا تو انھوں نے سید صاحب سے کہا کہ ''ہماری عمر کا یہی حصہ اس امر کے فیصلہ کرنے کا ہے کہ ہم کو اپنی زندگی کس طرح اور کس پیشے اور کس شغل میں بسر کرنی چاہیے ، لیکن تمھارے بعد کالج کی ملازمت پر ہم کو کسی طرح کا اطمینان نہیں ہے ، اس لیے ہم اپنی زندگی کا کارآمد اور عمدہ زمانہ کالج میں بسر نہیں کر سکتے ۔ کوئی ایسی تدبیر کی جائے جس سے ہم کو آئندہ کے لیے طمانیت ہو ۔''

لیکن سید صاحب نے اس بات کو ہنسی میں ٹال دیا اور یہ کہا کہ آپ لوگ خاطر جمع رکھیں ، میں ابھی مرنے والا نہیں ہوں ۔ مگر وہ برابر اس بات کے متقاضی رہے کہ ہم کو مطمئن کرنا چاہیے ۔

اس کے بعد ایک موقع پر مولوی سمیع اللہ صاحب نے پرنسپل کے بعض اختیارات پر اعتراض کیا اور چاہا کہ بعض اختیارات جو کہ تمام کالجوں میں پرنسپلوں کو حاصل ہوتے ہیں ، وہ محمڈن کالج کے پرنسپل کو نہ دیے جائیں ، مگر سید صاحب نے ان کی رائے کے برخلاف کارروائی کی اور پرنسپل کے اختیارات میں کمی کرنے سے

انکار کیا ۔ یوروپین پروفیسروں کو یہ بات زیادہ وحشت اور دل برداشتگی کا اور اپنے قدیم اندیشے پر زیادہ مستقل ہونے کا باعث ہوئی ۔

فروری سنہ ۱۸۸۷ع میں کالج کے طلبہ نے بورڈنگ ہاؤس میں بہ قصد و ارادہ بغاوت کی اور حکم کی تعمیل سے انکار کیا اور سید صاحب اور پرنسپل صاحب کے ساتھ گستاخی سے پیش آئے ، یہاں تک کہ ۵۶ طلبہ کو سید صاحب اور پرنسپل صاحب نے بورڈنگ ہاؤس سے خارج کر دیا ۔ اس وقت مولوی سمیع اللہ خاں صاحب علی گڑھ میں نہ تھے ۔ طالب علموں نے ان کو تار دیا ۔ وہ آئے اور انھوں نے اور بعض اور ممبروں نے ان طالب علموں کی نسبت یہ چاہا کہ پرنسپل کی مرضی کے خلاف وہ پھر کالج اور بورڈنگ ہاؤس میں داخل کر لیے جائیں ۔ مسٹر بک پرنسپل اور مسٹر ریلے نے ، جو کہ ایک نہایت زبردست فاضل ہیں ، اور اس وقت کالج میں پروفیسر تھے ، یہ حال دیکھ کر سید صاحب سے صاف کہہ دیا کہ اگر تمھارے کالج کے اس قسم کے اصول ہیں تو ہم کالج میں نہیں رہ سکتے ۔ لیکن سید صاحب نے مولوی سمیع اللہ خاں صاحب کی رائے کو تسلیم نہ کیا ، بلکہ اس کے برخلاف کارروائی کی ۔ اور پرنسپل اور مسٹر ریلے کی صلاح سے یہ تجویز کی کہ چند طالب علم ، جو سرغنہ ہیں ، وہ قطعاً بورڈنگ ہاؤس سے خارج کر دیے جائیں ، اور باقی اگر علانیہ اپنے قصور کی معافی چاہیں تو ان کا قصور معاف کیا جائے ۔ مولوی سمیع اللہ خاں صاحب اس کارروائی سے رنجیدہ ہوئے ، لیکن اگر ایسا نہ کیا جاتا تو بلاشبہ کالج کا انتظام ابتر ہو جاتا ، اور طالب علموں پر کسی کا رعب و داب باقی نہ رہتا ۔

سید صاحب نے اس واقعے کے بعد جو خطوط مولوی سمیع اللہ خاں صاحب کو کالج کے معاملات کے متعلق لکھے ، ان کا

انھوں نے صاف یہ جواب دیا کہ میری صلاح کی حاجت نہیں ہے ، تم جو چاہو سو کرو ۔ اس دن سے سید صاحب نے ان سے دوستانہ صلاح و مشورہ کرنا چھوڑ دیا ، صرف ضابطے کی کارروائی ، جیسی کہ اور ممبروں سے ہونی چاہیے ، جاری رہی ۔ لیکن یوروپین اسٹاف کو اپنے انجام کی نسبت ویسا ہی تردد اور اشتباہ باقی رہا ، بلکہ ان کے دیرینہ خیالات زیادہ مضبوط و مستحکم ہو گئے ، اور سید صاحب سے برابر ان کی یہ خواہش رہی کہ ہمارے آیندہ اطمینان کے لیے کوئی صورت نکالنی چاہیے ۔ اس مشکل کے حل کرنے کے لیے بہ ظاہر اس سے بہتر کوئی طریقہ نہ تھا کہ سید محمود کو بالفعل لائف جوائنٹ سکریٹری اور سید صاحب کے بعد لائف سکریٹری مقرر کیا جائے ، تاکہ اسی وقت یہ امر فیصل ہو جائے کہ یوروپین اسٹاف کو سید صاحب کے بعد کس سے کام پڑے گا ۔ موجودہ اسٹاف کو سید محمود کی ذات پر پورا پورا اطمینان ہے ، اور ہم نے سنا ہے کہ اگر سید محمود کا قدم بیچ میں سے نکال دیا جائے تو بہت کم امید ہے کہ موجودہ پروفیسروں میں سے ایک شخص بھی کالج میں رہے ۔ اس کے علاوہ جب کبھی اور پروفیسروں کو ولایت سے بلانے کی ضرورت ہو ، تو ان کے بلانے اور اپنے دوستوں کے ذریعے سے ان کے منتخب کرانے میں ، جو در حقیقت کالج کی جان ہے ، جیسے سید محمود کام آ سکتے ہیں ، تمام ممبروں یا ٹرسٹیوں میں کوئی ویسا کام نہیں آ سکتا ۔ یہ ہیں وہ واقعات اور اسباب جنھوں نے سرسید احمد خاں کو اس بات پر مجبور کیا کہ وہ اپنی زندگی میں آنریبل سید محمود کو لائف جائنٹ سکریٹری اور اپنے بعد لائف سکریٹری مقرر کرانے میں کوشش کریں ۔ کوئی شخص اس بات کا انکار نہیں کر سکتا کہ مدرسۃ العلوم کے بقا اور دوام کا خیال جیسا سرسید احمد خاں کو ہوگا ، ویسا اور کسی

شخص کو نہیں ہو سکتا ۔ یہ بھی سب کو معلوم ہے کہ وہ اس کی بقا اور دوام نہایت عظمت اور شان شوکت کی حالت میں ، جس سے اسلام اور اہل اسلام کی شان و شوکت ظاہر ہو ، چاہتے میں ، ورنہ وہ کئی بار اخبار میں اپنی رائے ظاہر کر چکے ہیں کہ ذلت اور پستی کی حالت میں رہنے سے ہزار درجہ بہتر ہے کہ ایک زلزلہ آئے اور ہمارا پیارا مدرسة العلوم زمین میں دھنس جائے ۔ اور ان کے نزدیک اس کی عظمت و شان زیادہ تر اس بات پر منحصر ہے کہ یوروپین شریف فاضل اور معزز پروفیسر اس میں مقرر کیے جائیں ، اور ولایت سے ایسے لوگ وہاں کے ذی اعتبار اشخاص کی معرفت بلائے جائیں ، اور جب وہ یہاں آکر رہیں تو ان کے ساتھ ایسا حسن سلوک اور عمدہ برتاؤ کیا جائے کہ ان کی حالت دیکھ کر انگلستان کے معزز ، شریف اور فاضل لوگوں کو یہاں آنے میں کبھی تردد نہ ہو ، اور سرسید صاحب کے بعد بھی یہ سلسلہ ہمیشہ جاری رہے ۔ جب ان سب باتوں پر نظر کی جاتی ہے اور اس کے ساتھ یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ سرسید احمد خاں نے ہمیشہ قوم کی خیرخواہی کے آگے لوگوں کی بدگمانیوں کو نہایت حقیر سمجھا ہے ؛ انھوں نے کافر اور ملحد کہلانا گوارا کیا ، لیکن اپنے خیالات ظاہر کرنے سے ، جن کو وہ قوم کے حق میں مفید سمجھتے تھے ، ہرگز دست بردار نہ ہوئے ۔ انھوں نے تمام بنگالی اخباروں کا ہدفِ ملامت بننا اور گورنمنٹ کا خوشامدی اور اینگلو انڈینز کا رضا جو مشہور ہونا منظور کیا ، لیکن چوں کہ نیشنل کانگریس کے بعض مقاصد مسلمانوں کے حق میں مضر معلوم ہوتے تھے ، اس لیے کانگریس کے ساتھ شریک ہونا اور اس کی تائید کرنی ہرگز پسند نہیں کی ، بلکہ جہاں تک ہو سکا اس کی مخالفت کی ۔ انھوں نے ممبری کونسل کے زمانے میں مسلمانوں کی جائداد کے حفظان کی غرض سے قانون وقف خاندانی کا مسودہ تیار کرکے کونسل میں پیش کیا ، اور باوجودیکہ اکثر علماے اسلام نے اس کے برخلاف گورنمنٹ میں عرض داشتیں اور میموریل بھیجے ، مگر ان سے جہاں تک ہو سکا ، اس کے پاس کرانے میں کوشش کی ، اگرچہ بدقسمتی سے وہ پاس نہ ہوا ۔ جب ان سب امور کا لحاظ کیا جاتا ہے تو وہ لوگ جو سرسید احمد خاں کی سرشت اور طبیعت سے واقف ہیں ، اور جانتے ہیں کہ خداے تعالیٰ نے ان کو کمینہ خود غرضی سے پاک اور مبرا پیدا کیا ہے ، ان کو اس بات میں کچھ شبہ نہیں رہ سکتا کہ سید محمود کا اپنی زندگی میں جائنٹ سکریٹری اور اپنے بعد سیکریٹری مقرر کرنا محض مدرسة العلوم کی خیرخواہی اور خیراندیشی پر مبنی ہے ، نہ کہ خود غرضی پر ۔

مولوی سمیع اللہ خاں صاحب نے ، جو سید محمود کی نسبت اپنی رائے لکھی ہے ، اس کا ماحصل یہ ہے : ”اعتقاداً یا عملاً ان کی حالت ایسی نہیں ہے کہ مدرسة العلوم کا انتظام ان کے ہاتھ میں دیا جائے ، کیوں کہ ان پر مسلمانوں کو اعتماد اور بھروسا نہیں ہے ، اور بغیر کسی اندیشے کے وہ اپنی اولاد کو ان کے سپرد نہیں کر سکتے ۔“

لیکن ہمارے نزدیک اگر خوش قسمتی سے سید محمود کی حالت ایسی ہے کہ مسلمانوں کو ان پر اعتماد اور بھروسا نہیں ہے تو سید محمود سے بہتر اور موزوں تر اس مدرسے کے انتظام کے لیے کوئی شخص نہیں مل سکتا ۔ کیوں کہ اس مدرسے کو ایسی شخص کا ہاتھ راس آئے گا جس سے ہمارے بھائی مسلمان مذہبی سوء ظن رکھتے ہوں گے ۔ سید احمد خاں کو مسلمانوں نے کیا کیا نہیں کہا اور کیا کیا نہیں سمجھا : کافر کہا ، ملحد کہا ، نیچری کہا ، دجّال کہا ، سب کچھ کہا ، لیکن جوں جوں وہ برا کہتے تھے ، اُن کی گالیاں اور اُن کا سب و شتم سید کی کھیتی میں کھاد اور تپلے

کا کام دیتا تھا ۔

شاید اس تقریر کو لوگ ہزل اور مزاح پر محمول کریں ، لیکن فی الحقیقت ہماری رائے ہے کہ اس مدرسے کے انتظام اور اہتمام کے لیے ایسا شخص درکار ہے جو مذہبی تعصبات سے بالکل پاک و منزہ ہو ؛ ہندو ، عیسائی ، مسلمان ، شیعہ ، سنی ، نیچری وہابی ، بدعتی یہ سب اس کی نظر میں برابر ہوں ۔ ہر مذہب کے طالب علموں کو وہ ایک نگاہ سے دیکھے اور ہر مذہب کے پروفیسروں اور ٹیچروں سے یک ساں برتاؤ برتے ۔ شیعہ اپنی اولاد کو وہاں بھیج کر ایسے مطمئن ہو جائیں کہ گویا ان کو کربلا میں بھیج دیا ، اور ہندو اپنے بچوں کو وہاں داخل کرکے یہ سمجھیں کہ ان کو کاشی جی چھوڑ کر آئے ۔ یہ صفت جیسی کہ سید محمود میں ہو سکتی ہے ، ممکن نہیں کہ مولوی محمد سمیع اللہ خاں میں ، بلکہ خود سید صاحب میں ان کے برابر ہو سکے ۔ بلاشبہ متعصب سنیوں کو یہ امر ناگوار ہوگا کہ ایک سنی المذہب مہتمم دوسرے عقیدے کے مسلمانوں کے ساتھ بھی ویسا ہی برتاؤ رکھے جو سنیوں کے ساتھ رکھنا چاہیے ۔ لیکن اس ناگواری سے وہ مدرسۃ العلوم سے دست بردار نہیں ہو سکتے ۔ انگریزی تعلیم کی ضرورت ان کی گردن پکڑ کر مدرسۃ العلوم کی طرف کھینچ لائے گی ، کیوں کہ وہ اس مدرسے کے سوا تمام کالجوں اور اسکولوں کو ان برکتوں سے خالی پائیں گے جو مدرسۃ العلوم کی خصوصیات میں سے ہیں اور جو نفسِ تعلیم سے زیادہ ضروری اور زیادہ اہم ہیں ۔

مولوی محمد سمیع اللہ خاں صاحب لکھتے ہیں کہ :

> ”مدرسۃ العلوم حکومتِ شخصیہ نہیں ہے کہ باپ کے بعد بیٹا بطور ولی عہد کے تسلیم ہو ۔“

لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ اگر حکومتِ شخصیہ نہیں تو

سیاستِ شخصیہ ضرور ہے ۔ جمہوری سیاست یا جمہوری انتظام وہ کہلاتا ہے جس کے ساتھ تمام پبلک کو یکساں دل بستگی اور لگاؤ ہوتا ہے ۔ اور اگر یہ نہیں تو کم سے کم اس کی کار پرداز کمیٹی یا جماعت کے ہر ایک ممبر کو اس کے ساتھ برابر تعلق ہونا چاہیے ۔ یہاں جیسا کہ ہم اوپر لکھ چکے ہیں ، کمیٹی سب کاموں کا بوجھ سید احمد خاں پر ڈال کر آپ فارغ البال ہو گئی ہے ۔ انہی ممبروں میں سے مولوی محمد سمیع اللہ خاں کو اس بات کا خیال آیا ہے کہ مسودۂ قانونِ ٹرسٹیاں پر نکتہ چینی کریں ۔ اور اگر ان کو خود سکریٹری ہونے کی آرزو نہ ہوتی تو وہ بھی ہرگز یہ درد سر گوارا نہ فرماتے ۔

وہ لکھتے ہیں کہ :

> ”کمیٹی مدیرانِ تعلیمِ مذہبِ اہل سنت و جماعت کا میں آنریری سکریٹری تھا اور ہمارے آنریبل سکریٹری کا نام بھی اس کے ممبروں میں نہ تھا ۔“

بلاشبہ سید صاحب نے اس کمیٹی کے ممبروں میں کبھی اپنا نام داخل کرنا نہیں چاہا ، اور اسی وجہ سے تعلیم مذہبی کا صیغہ ہمیشہ نہایت شرم ناک پستی اور تنزل کی حالت میں رہا ۔ نہ مقدس ممبروں نے کبھی اس کی خبر لی اور نہ آنریری سکریٹری صاحب نے اس میں کوئی اپنا کرشمہ دکھایا ۔ سید پر خدا کی برکت ہو کہ اسی نے لاچار ہو کر تعلیم مذہبی کی پست حالت پر رحم کھایا اور خود ایک کورس تیار کرا کے مقدس ممبروں کے پاس ان کے ملاحظے کے لیے بھیجا ، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک مختصر سیرت تالیف کرائی اور ممبروں کی منظوری سے تعلیم میں داخل کی ۔

مولوی صاحب ممدوح مسودۂ قانون مذکور کے تیار کرنے کی نسبت اپنی رائے لکھتے ہیں جس کا خلاصہ یہ ہے :

> “اس کو مسٹر اسٹریچی بیرسٹرایٹ لا سے بنوانے اور ان کو معاوضہ دینے کی بالکل ضرورت نہ تھی۔” اور نہایت افسوس ظاہر کرتے ہیں کہ “اگر اس تجویز کے وقت میں موجود ہوتا تو اس رائے سے اختلاف کرتا اور تمام ممبر میرے دلائل سن کر ضرور میرے ساتھ اتفاق کرتے۔ جب کہ مسٹر محمد رفیق اور مسٹر حمید اللہ خاں وغیرہ وغیرہ بیرسٹر، جو ہمارے ہی کالج کے طالب علم ہیں، اور مسٹر اسٹریچی کی لیاقت سے کم لیاقت نہیں رکھتے، موجود تھے تو مسٹر اسٹریچی سے قانون بنوانے کی اور ان کو معاوضہ دینے کی کیا ضرورت تھی۔”

مگر ہم مولوی صاحب کو یاد دلاتے ہیں کہ مسٹر اسٹریچی اُس شخص کا بیٹا ہے جس کے مدرسۃ العلوم پر اس قدر احسانات ہیں کہ اگر اس کا نام اسٹریچی کالج رکھا جائے تو کچھ بے جا نہیں ہے۔ اور اُس شخص کا بیٹا ہے کہ اگر اُس کا دم نہ ہوتا تو آج کالج کی عمارت کا کہیں نام و نشان نہ ہوتا۔ اور اُس شخص کا بیٹا ہے جس کے ہاتھ کی برکت سے کالج کو پندرہ سو روپیہ ماہوار بہ طور گرینٹ ان ایڈ کے گورنمنٹ سے عطا ہوتا ہے۔ ایسے شخص کو مدرسے کے کام میں شریک کرنے اور اس کو ایک حقیر معاوضہ دینے پر خردہ گیری کرنی ایک ایسی بات ہے جس سے زیادہ سبک اور شرم ناک بات نہیں ہو سکتی۔ رہی یہ بات کہ مسٹر فلاں اور مسٹر فلاں اس کام کو بلامعاوضہ سرانجام کر سکتے تھے، سو اس کا ہم کو ہرگز یقین نہیں ہے۔ جتنے نام مولوی صاحب نے لیے ہیں ان میں سے ایک کو بھی ہم نے نہیں دیکھا کہ قومی کاموں میں انٹرسٹ رکھتا ہو۔ اس کے علاوہ بیرسٹر اور وکیل کی شان سے یہ بات بعید ہے کہ وہ دس منٹ ایسے کام میں صرف کرے جس میں اس کو کچھ معاوضہ ملنے کی امید نہ ہو۔ مجھ سے ایک نہایت

سچے اور صاف گو بیرسٹر نے، جو وکالت چمکنے سے پہلے قومی کاموں میں سرگرم رہتا تھا، یہ بیان کیا کہ جس قدر آمدنی بڑھتی جاتی ہے، اسی قدر بلا اجرت کام کرنے کی عادت چھوٹتی جاتی ہے۔

مولوی صاحب ممدوح لکھتے ہیں کہ:

> “ایک ایسے آزاد رائے اور لائق آدمی کے (جیسے کہ ہمارے آنریبل سکریٹری ہیں) اس قسم کے خیالات معلوم ہونے سے کہ وہ آنریبل جسٹس سید محمود کو اپنے بعد خواہ مخواہ اپنا قائم مقام بنانا چاہتے ہیں، لوگوں کو کچھ کم تعجب نہ ہوگا۔”

لیکن ہم کہتے ہیں کہ اس سے بہت زیادہ تعجب اُس وقت ہوتا جب کہ ایک ایسا آزاد رائے اور شیردل آدمی، جیسے کہ سر سید احمد خاں ہیں، محض اس خوف سے کہ لوگ مجھ سے بدگمان ہو جائیں گے یا مجھ کو خود غرض سمجھیں گے، جس بات کو وہ یقیناً مدرسے کے حق میں بہتر جانتے تھے، اُس سے دیدہ و دانستہ گریز اور انحراف کرتے، اور اپنے آئندہ قائم مقام کا تصفیہ ملتوی رکھ کر یوروپین اسٹاف کو نہایت بے اطمینانی کی حالت میں چھوڑ دیتے، اور جس چیز کو وہ مدرسے کی جان سمجھتے تھے، اس کی کچھ پروا نہ کرتے اور قومی مصلحت کو ایک شخصی مصلحت پر قربان کر دیتے۔

وہ لکھتے ہیں:

> “جو اختیارات آنریبل سکریٹری (یعنی سرسید احمد خاں) کے لیے تجویز ہوئے ہیں، شاید دنیا میں کسی صیغے کے سکریٹری کو حاصل نہ ہوں گے۔ (یہاں تک کہ سکریٹری آف اسٹیٹ کو بھی) مثلاً مکانات مملوکہ کالج کا منہدم یا ازسرنو تعمیر کرانا، تعمیر کے لیے دس ہزار روپیہ تک قرض

> لینا ، کالج فنڈ میں سے دس ہزار روپے تک لے کر بہ اختیار خود خرچ کرنا ، ایک مد کی توفیر کا روپیہ دوسری مد میں خرچ کرنا ، منظور شدہ اسکالرشپوں کے سوا اسکالرشپ جاری کرنا وغیرہ وغیرہ ۔"

ہم اوپر لکھ چکے ہیں کہ جب لوگوں کو ایسا معتمد اور لائق سکریٹری یا منیجر دست یاب ہو جائے جیسے کہ سر سید احمد خاں ہیں ، پھر اس کے اختیارات میں چون و چرا کرنا گویا اس کام میں رخنہ ڈالنا ہے جس کو وہ کمال ذوق و شوق ، دل سوزی و سرگرمی سے کر رہا ہے ۔ اور اس کی طاقت اور اقتدار گھٹانے سے سوا اس کے کہ نکتہ چین ممبروں کو یہ دکھانا منظور ہو کہ ہم بھی کچھ ہیں ، اور کوئی مطلب سمجھ میں نہیں آتا ۔ ہر عہدے دار کو اول تھوڑے اختیارات دیے جاتے ہیں ، پھر جس قدر وہ امتحان میں پورا اترتا جاتا ہے اسی قدر اس کے اختیارات بڑھتے جاتے ہیں اور آخرکار اس عہدے کے کامل اختیارات اس کو مل جاتے ہیں ۔ نہایت تعجب کی بات ہے کہ سر سید احمد خاں چودہ برس کی جاں فشانی اور سرگرمی کے بعد بھی اب تک اس بات کے مستحق نہیں ہوئے کہ ان کے اختیارات میں اضافہ کیا جائے ۔ اس کی مثال بالکل ایسی ہے کہ ایک مالی محض اپنے دل کی آپچ سے ، نہ کہ اور لوگوں کی خواہش سے ، اپنا گھر بار بیچ کر اور شہر اور نواح سے پیسہ پیسہ دو دو پیسے وصول کر کے شہر سے متصل خاص شہر والوں کی تفریح کے لیے نہایت کوشش اور جاں فشانی سے ایک ایسا باغ لگائے کہ شہر والوں نے کبھی ایسا باغ نہ دیکھا ہو ، اور اس کے پھل پھول ، ترکاری اور کل آمدنی اور کل فوائد کا مالک شہر والوں کو قرار دے کر ان سے صرف اس بات کا خواست گار ہو کہ جب تک میں زندہ ہوں ، مجھ کو یہ اختیار ملنا چاہیے کہ باغ کی ترقی اور افزائش کے لیے

جو تصرفات اور تدابیر میرے نزدیک مناسب ہوں ، بہ اختیار خود عمل میں لاؤں ، اور جن چیزوں کی میرے نزدیک ابھی باغ میں کمی ہے ان کو اپنی زندگی میں پورا کر جاؤں ؛ اس بات کو شہر کے عام باشندے تو خوشی سے قبول کر لیں لیکن بڑے بڑے مدبر اور دانشمند جو اصول و قانون کو چھانے بیٹھے ہیں ، وہ یہ سمجھ کر کہ ایک مالی کو اس قدر اختیار دینا عقلِ مآل اندیش اور خردِ دوربین کسی طرح تجویز نہیں کرتی ، اس کی درخواست نامنظور فرمائیں ۔

مولوی صاحب فرماتے ہیں کہ :

> "میری ہمیشہ سے یہ رائے رہی ہے کہ پرنسپل کو بورڈنگ ہاؤس میں کسی قسم کی مداخلت و تعلق نہ ہونا چاہیے ۔ بورڈنگ ہاؤس میں کثرت سے مسلمان لڑکے رہتے ہیں اور ان میں ایک بڑی جماعت چھوٹی عمر کے لڑکوں کی رہتی ہے ۔ مسلمانوں کے خیالات اور عادات سے واقف ہونا اور ان کی خلقی باتوں سے واقفیت اور چھوٹے بچوں کی باتوں کا ، جو اپنے مطالب اور شکایات کو اپنی زبان میں بھی اچھی طرح بیان نہیں کر سکتے ، ایک اسی ملک کا تجربہ‌کار ، متحمل مزاج مسلمان ، جو ان کے حالات کے موافق ان کے ساتھ برتاؤ کرے اور ان کے اخلاق کو درست کرے ، بورڈنگ کا پورا منتظم ہونا چاہیے ۔ پرنسپل سے ، جس کے لیے فرض کر لیا گیا ہے کہ ہمیشہ ایک یوروپین گریجویٹ ہوگا اور غالباً نو عمر ، ملکی زبان اور عادات سے ناواقف ، گرمِ خون والا ہوگا ، اس قسم کی امیدیں رکھنی ، جن کی ضرورت ہمارے بورڈنگ ہاؤس میں ہے ، قریب ناممکن کے ہے ۔"

کوئی شخص اس بات کا انکار نہیں کر سکتا کہ مسٹر حمیداللہ خاں کی ذات میں ، جن کی لیاقت ، سنجیدگی ، اخلاق و عادات اور دیگر

صفات محمودہ کی میں دل سے قدر کرتا ہوں ، جس قدر خوبیاں ہیں وہ تمام انگلش سوسائٹی کے نتائج و برکات ہیں ۔ ابتدا میں وہ علی گڑھ کالج کے یوروپین پروفیسروں کی صحبت سے مستفید رہے اور پھر تقریباً چھ برس تک لنڈن کی سوسائٹی میں ان کو برابر شب و روز رہنا پڑا ۔ ان پر اولاً بالذات سر سید احمد خاں کا احسان ہے جنھوں نے ان کی تعلیم و تربیت کی ایسی بنیاد ڈالی ، اور ثانیاً و بالعرض ان کے والد ماجد مولوی سمیع اللہ خاں صاحب کا احسان ہے جنھوں نے سید صاحب کی ہدایتوں پر پورا پورا عمل کیا ؛ ان کو ولایت لے گئے اور اندازے سے زیادہ ان کی تعلیم کے اخراجات برداشت کیے اور اخیر تک نہایت استقلال کے ساتھ بے دریغ روپیہ صرف کرتے رہے ۔ اب ہم مولوی صاحب سے پوچھتے ہیں کہ کیا آپ اس بات کو پسند نہیں کرتے کہ جن ذریعوں سے یہ خوبیاں اور صفات و فضائل آپ کے خلف الرشید میں پیدا ہوئی ہیں ، وہ ذریعے عام مسلمانوں کے بچوں کو میسر آئیں ؟ کیا ایک سول جج کے بیٹے کے سوا اور مسلمانوں کی اولاد اس بات کی مستحق نہیں ہے کہ وہ انگلش موریلٹی کے سایے میں تربیت پائے ؟ صاف پایا جاتا ہے کہ سید احمد خاں ہر مسلمان کے بچے کو یہ چاہتے ہیں کہ سید محمود ہو جائے ، لیکن مولوی سمیع اللہ خاں نہیں چاہتے کہ قوم میں کوئی حمید اللہ خاں ثانی نکلے ۔ مولوی صاحب کی ایسی ہی رایوں نے ، جیسی کہ اوپر مذکور ہوئیں ، سر سید احمد خاں کو اس بات پر مجبور کیا ہے کہ اپنی زندگی میں اپنے آئندہ جانشین کا فیصلہ کر جائیں ، اور مولوی سمیع اللہ خاں کو تا بمقدور ایسا موقع نہ دیں کہ مدرسۃ العلوم کے اصلی مقاصد کو ہاتھ سے کھو بیٹھیں ، اور جو چیز کہ مدرسۃالعلوم اور دیگر کالجوں اور اسکولوں میں مابہ‌الامتیاز ہے اس کو برباد کریں ۔

مولوی صاحب کی رائے کو کہ بورڈنگ ہاؤس میں کسی یوروپین افسر کی نگرانی اور مداخلت نہ ہو ، شاید پرانے خیالات کے متعصب مسلمان پسند کریں لیکن جو لوگ مسٹر تھوڈور بک کی خدماتِ نمایاں ، ان کے مربیانہ ، دل سوز اور فیاضانہ برتاؤ سے ، جو کچھ وہ طالب علموں کے ساتھ برتتے ہیں ، واقف ہیں ، وہ کبھی اس بات کو تسلیم نہیں کر سکتے کہ بورڈنگ ہاؤس کی نگرانی سے یوروپین افسروں کو کچھ تعلق نہ ہونا چاہیے ۔ سکریٹری کی رپورٹ نسبت ترقی کالج و بورڈنگ ہاؤس کے بابت سنہ ۱۸۸۷—۸۹ع حال ہی میں شائع ہوئی ہے ۔ اس سے اور سنینِ ماضیہ کی رپورٹوں سے ہر شخص اندازہ کر سکتا ہے کہ مسٹر بک کو کالج اور بورڈنگ ہاؤس کی ترقی اور اصلاح کا کس قدر خیال ہے ۔ وہ ان کاموں میں مثل ایک عام پرنسپل یا عام منیجر کے صرف اپنے فرائض منصبی ادا کرنے ہی پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ وہ قلم سے ، قدم سے ، درم سے غرض کہ ہر طرح سے اس کالج کی بھلائی اور بہبودی میں سرگرم رہتے ہیں ۔ اگر ایسے لوگوں کی خدمت کا یہی صلہ ہے جو مولوی صاحب نے تجویز کیا ہے تو اس سے زیادہ کوئی ناشکری اور ناسپاسی نہیں ہو سکتی ۔

مولوی صاحب جو یہ فرماتے ہیں کہ :

> ”اسی ملک کا تجربہ کار ، متحمل مزاج مسلمان ، جو بورڈروں کے اخلاق دوست کرے ، بورڈنگ کا منتظم ہونا چاہیے ۔“

اس کی بابت میں صرف یہ عرض کرتا ہوں کہ ایسے مسلمان ہم کو کیوں کر اور کہاں سے دست یاب ہو سکتے ہیں : جب کہ ہماری قوم کے اعلیٰ طبقے کے لوگوں کے اخلاق کا یہ حال ہے کہ وہ پرائیویٹ رنجشوں کو قومی کاموں میں دخل دیتے ہیں ۔ عمر بھر کی دوستی اور اخلاص کو ایک ادنیٰ غرضِ دنیوی کی خاطر حرفِ غلط کی طرح دل سے مٹا دیتے ہیں ، اور حقوق دیرینہ کو نسیاً منسیاً کر دیتے ہیں ۔ اگر کہیں ایسے مسلمان مل سکتے تھے ، جن کو مسلمانوں

کی اولاد کی تادیب و تربیت و عام نگرانی کا کام سپرد کیا جا سکے تو ٹرکی یا مصر یا ایران میں مل سکتے تھے ۔ لیکن افسوس ہے کہ وہاں بھی ایسے مسلمانوں کا قحط ہے ۔ ٹرکی وغیرہ کے اُمرا اور خاندانِ شاہی کے لوگ ، جو اپنی اولاد کو زمانۂ موجودہ کے موافق اعلیٰ درجے کی تعلیم و تربیت دینا چاہتے ہیں ، ان کو اس کے سوا کچھ چارہ نہیں کہ پیرس یا لنڈن یا برلن میں اپنی اولاد کو بھیجیں ۔

مولوی صاحب کے متعدد بیانات سے ، جو ان کی رائے میں درج ہیں ، یہ بات مفہوم ہوتی ہے کہ سنہ ۱۸۸۷ع سے پہلے سرسید احمد خاں مولوی صاحب ممدوح کو اپنے بعد اپنا قائم مقام بنانا چاہتے تھے لیکن سنہ ۱۸۸۷ع میں بعض پرائیویٹ رنجشوں کے سبب ان کا ارادہ بدل گیا ، اسی لیے انھوں نے سید محمود کو اپنی زندگی میں جائنٹ سکریٹری اور اپنے بعد سکریٹری قرار دیا ہے ۔

لیکن حسن اتفاق سے ایک صاحب نے ، جن کا نام دانشمند خاں ہے ، مقام موگہ ضلع فیروز پور سے سر سید احمد خاں صاحب کا ایک خط مورخہ ۲۲ جون سنہ ۱۸۸۶ع ، جو سر سید احمد نے ان کے خط کے جواب میں لکھا تھا ، ’سرمور گزٹ‘ میں بغرض اشاعت بھیجا ہے ، جو کہ ۳۱ جولائی سنہ ۱۸۸۹ع کے پرچے میں شائع ہوا ہے ۔ اس کا جس قدر مضمون اس مقام کے مناسب ہے ، حرف بحرف نقل کیا جاتا ہے :

‘‘آپ کا یہ خیال کہ میرے بعد کیا ہوگا ، بلاشبہ قابل غور ہے مگر زمانہ ترقی کرتا جاتا ہے اور لوگوں کے خیال تبدیل ہوتے جاتے ہیں ، اور قوم کو جو ضرورت ہے وہ بھی ظاہر ہوتی جاتی ہے ۔ پس ممکن نہیں ہے کہ میرے بعد دوسرا قائم مقام نہ ہو ۔ مولوی سمیع اللہ خاں صاحب کا ارادہ ہے کہ جس دن میں مروں گا غالباً وہ نوکری چھوڑ دیں گے اور

مدرسے میں چلے آئیں گے ۔ سید محمود کا ارادہ ان سے بھی زیادہ مستحکم معلوم ہوتا ہے ۔ انھوں نے اپنی خاص سکونت کے لیے اپنے خرچ سے مدرسۃ العلوم کے دروازے پر مکان بنوانا تجویز کیا ہے کہ مدرسۃ العلوم میں ہی سکونت اختیار کریں گے اور قومی تعلیم پر متوجہ ہوں گے ۔ ان کو ہائی کورٹ کے جج ہونے کی چنداں خوشی نہیں ہے ۔ جب تک میں زندہ ہوں ، وہ سمجھتے ہیں کہ ان کی ضرورت نہیں ہے ، مگر مدرسے میں رہنے کا سب سامان درست کر لیں گے ۔ انھوں نے تجویز کیا ہے کہ مدرسے ہی میں سکریٹریٹ کے دفتر کے لیے بھی مکان بنوایا جائے تاکہ ان کو کام کرنے میں دوسری جگہ جانا نہ پڑے ۔ مجھے یقین ہے کہ جس دن میں مرا اُسی دن وہ ہائی کورٹ کی ججی چھوڑ دیں گے ۔ یہ ان کے خیالات ہیں جن سے بہتری کی اُمید پائی جاتی ہے ۔ آپ کو شاید معلوم ہوگا کہ کالج کے ہمیشہ درست حالت میں رکھنے کے لیے دو چیزیں درکار ہیں : اول مستقل آمدنی ، دوم فیلو سسٹم ۔ ہم کو دونوں باتوں کا ازحد خیال ہے ۔ اگر خدا نے ان دونوں کو پورا کر دیا ، پھر کچھ اندیشہ نہیں ہے ۔ با ایں ہمہ ہم کو خدا کی ذات پر بھروسا ہے کہ اگر اس کی مرضی ہے ، سب کچھ اچھا ہوگا ، ورنہ سب تدبیریں اور خیالات ہیچ ہیں ، والسلام ۔’’

یہ خط جیسا کہ ظاہر ہے ۲۲ جون سنہ ۱۸۸۶ع کا لکھا ہوا ہے اور مولوی صاحب لکھتے ہیں کہ سنہ ۱۸۸۷ع میں بعض افسوس ناک واقعات پیش آئے ۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ کسی پرائیویٹ رنجش نے سید صاحب کے ارادے کو متزلزل نہیں کیا بلکہ وہ پہلے ہی سے ان تمام باتوں پر غور کر چکے تھے جن کا ظہور اب مسودۂ

قانون ٹرسٹیان کے ذریعے سے ہوا ۔ سید صاحب کے خط سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں صاحبوں کو اس امر کا خیال تھا کہ اگر خدا نخواستہ امر ناگزیر پیش آیا تو دونوں نوکری چھوڑ کر علی گڑھ میں چلے آئیں گے اور مدرسۃ العلوم کے انتظام اور نگرانی کے لیے یہیں سکونت اختیار کر لیں گے ۔ لیکن ساتھ ہی یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ سید محمود کو بہ نسبت مولوی صاحب ممدوح کے زیادہ فکر ہے ، جس کا ثبوت اس مکان کی تعمیر سے ہوتا ہے جو کہ انہوں نے خاص اپنے روپے سے مدرسۃ العلوم کے دروازے پر اپنی آیندہ سکونت کے لیے بنوایا ہے ۔ جو تفاوت مولوی صاحب اور سید محمود کے ارادوں میں اس خط سے ظاہر ہوتا ہے ، اسی کے موافق سید صاحب نے مسودۂ قانون ٹرسٹیان میں دونوں کے لیے حقوق قرار دیے ہیں ۔ اگر سید محمود کو جائنٹ سکریٹری مقرر کیا ہے تو مولوی صاحب کو بھی کچھ کم حقوق نہیں دیے ہیں ؛ وہ منیجنگ کمیٹی کے آنریری سکریٹری ہیں ، مذہبی کمیٹی کے وائس پریسیڈنٹ ہیں ، کمیٹی مدبرانِ تعلیمِ السنہ و علومِ دینیہ میں وہ ممبر ہیں ، ٹرسٹیوں میں وہ داخل ہیں ۔ ان کے صاحب زادے مسٹر حمید اللہ خاں بھی ٹرسٹیوں میں منیجنگ کمیٹی کے ممبروں میں اور کمیٹی مدبرانِ تعلیمِ السنہ و علومِ دینیہ کے ممبروں میں داخل ہیں ۔ بایں ہمہ قانون مذکور میں ٹرسٹیوں کو اختیار دیا گیا ہے کہ وقتاً فوقتاً اپنی رائے کے موافق کسی قانون اور قواعد کو جو اس مجموعے میں مندرج ہیں منسوخ یا ترمیم یا اس میں اضافہ کر سکیں ؛ پھر ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ مولوی صاحب کے قلم سے یہ الفاظ کیوں کر نکلے کہ :

> ”جو لوگ قوم کے لیڈر ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں وہ بھی خانگی معاملات اور ذاتی غصے کو قومی رفاہ کے کاموں میں موثر قرار دیتے ہیں ۔“

اور سید محمود کے جائنٹ سکریٹری مقرر ہونے سے ان کے نزدیک مدرسے کے حق میں ایسا کون سا لازوال خطرہ ہے جس کے دفعیے کے لیے ان کی کوششیں اعتدال اور اندازے سے متجاوز ہو گئی ہیں ۔ اور اگر وہ فی الواقعہ مدرسۃ العلوم کے دل سے خیرخواہ ہیں ، اس لیے اس بات کو غنیمت نہیں سمجھتے کہ وہ اور سید صاحب اور سید محمود سب مل جل کر مدرسے کی ترقی اور افزائش میں سرگرم ہوں ، تو کیوں وہ مسلمانوں کے لیے ایسی شرم ناک حالت پسند کرتے ہیں کہ مسلمانوں کے شایستہ اور مہذب طبقے میں دو پارٹیاں ایک دوسرے کے مخالف قائم ہوں اور مخالفوں کو ان پر ہنسنے کا موقع ملے ۔

سید صاحب نے ہمارے سامنے اس بات کا اقرار کیا ہے کہ جن خرابیوں کے انسداد کے لیے یہ قواعد بنائے گئے ہیں اگر ان کا انسداد کسی دوسرے طریقے سے ہو سکے تو مجھ کو ہرگز اپنی رائے پر اصرار نہ ہوگا ۔ لیکن چوں کہ انہوں نے اس بات پر کافی غور کر لیا ہے کہ یوروپین اسٹاف اور کسی طریقے سے مطمئن نہیں ہوسکتا اور اندیشہ ہے کہ وہ مدرسے کا تعلق قطع کر کے چلے جائیں ، اور اس سے بھی زیادہ یہ اندیشہ ہے کہ آیندہ کوئی یوروپین جنٹلمین مدرسے میں آنے کی ہامی نہ بھرے ، اور یہ سب صورتیں سید صاحب کے نزدیک مدرسے کی تباہی اور بربادی کی ہیں ، اس واسطے نہایت قوی اندیشہ ہے کہ اگر قانونِ ٹرسٹیان کی خاص خاص دفعات میں کچھ تبدیلی کی گئی تو سید صاحب مدرسے کے کاروبار سے دست بردار ہو جائیں گے ، اور جو نازک وقت مدرسۃ العلوم پر سید صاحب کی وفات کے بعد آنے والا ہے وہ ان کی زندگی ہی میں آ جائے گا ۔

ظاہرا جناب مولوی محمد سمیع اللہ خاں صاحب کے اکثر دوست ان کے ساتھ اتفاق رائے کریں گے ، کیوں کہ ہمارے ملک میں اور

خاص کر ہماری قوم میں دوستوں کے برخلاف رائے دینا اخلاق اور مروت بلکہ تہذیب کے خلاف سمجھا جاتا ہے۔ (اگرچہ کیسی ہی مصلحتِ عظیم فوت ہو جائے) اور کچھ تعجب نہیں کہ مجارٹی سے مولوی صاحب کی رائے کو غلبہ حاصل ہو جائے، لیکن ٹرسٹی صاحبوں کو یاد رکھنا چاہیے کہ ایک ایسے تجربہ کار شخص کی رائے کے سامنے، جیسے کہ سر سید احمد خاں ہیں، مجارٹی کی رائے وہی وقعت رکھتی ہے جو امریکن وار میں برک کی رائے کے روبرو انگلستان کی پارلیمنٹ اور تمام پبلک کی رائے رکھتی تھی، یا پلاسی کی لڑائی میں کلایو کی رائے کے آگے تمام افسران فوج کی رائے۔ مجارٹی کا قاعدہ روزمرہ کی کارروائیوں میں جزئیات کے تصفیے کے لیے مقرر کیا گیا ہے تاکہ کئی رایوں میں سے ایک رائے کو آسانی سے ترجیح دی جا سکے، ورنہ جو امور نہایت اہم اور عظیم الشان ہیں اور جہاں رائے کی غلطی سے کسی بڑی مضرت کا خطرہ ہوتا ہے وہاں مجارٹی پر فیصلہ کرنے سے بعض اوقات ایسا نقصان ہو جاتا ہے جس کی تلافی اور تدارک ممکن نہیں ہوتا، اور اسی لیے کہا گیا ہے کہ: ع

رای واحدٌ قد یغلب اراءً کثیرة

راقم
خاکسار الطاف حسین حالی
از دہلی
مورخہ ۶ اگست ۱۸۸۹ع

۷۔ متفرق مضامین

۱

قدیم ہندوؤں کا علم طب

(قلمی مسودے سے نقل کیا گیا)

یہ مختصر سا مضمون منشی گیان چند ایڈیٹر رسالہ 'مخزن العلوم'[1] کی فرمائش پر مولانا نے لکھا تھا مگر یہ معلوم نہ ہو سکا کہ بھیجا گیا تھا یا نہیں ؟ اور اگر بھیجا گیا تھا تو رسالے کے کس شمارے اور کس سنہ میں شائع ہوا تھا ۔ میں نے یہ مضمون مولانا کے اپنے ہاتھ کی لکھی ہوئی تحریر سے نقل کیا ہے ۔ (محمد اسماعیل)

علم طب کے نہایت قدیم مصنف ، جن کی تصانیف اب تک موجود ہیں ، چرک اور ششرت ہیں ۔ ان کی کتابوں کا ترجمہ عربی زبان میں ہوا ۔ اور ظن غالب ہے کہ عرب والے ان کا ترجمہ ہوتے ہی تحصیل علوم کی طرف متوجہ ہوئے ۔ عربی زبان کے مصنف علانیہ اقرار کرتے ہیں کہ ہم نے ہندوستان کے طبیبوں سے بے شک فائدہ اٹھایا ہے ۔ ابتدا میں اہل یورپ نے اس علم کی تعلیم انھی (ہندوؤں) سے پائی اور زمانۂ حال میں بھی دمے کی بیماری میں حقے میں دھتورا پلانا اور کونج کی پھلی سے کیڑوں کا علاج کرنا ان ہی سے سیکھا ہے ۔

---

[1] یہ ایک علمی رسالہ تھا جو یکم دسمبر ۱۸۶۶ء کو گوجرانوالہ سے جاری ہوا تھا ۔ (محمد اسماعیل)

۲

آریوں کا فن تعمیر

(قلمی مسودے سے نقل کیا گیا)

یہ نوٹ بھی مضمون سابق کی طرح رسالہ 'مخزن العلوم' کے لیے لکھا گیا تھا مگر یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ بھیجا گیا یا نہیں ، اور آیا اتنا ہی مضمون تھا یا مولانا نے اسے آگے بھی لکھا تھا ۔ (محمد اسماعیل)

فن تعمیر میں جو آریوں کی قدیم کتابیں ہیں ، اُن کو انصاف کی نظر سے دیکھ کر ایک دانش مند ہندوستانی نے جو مضمون لکھا ہے ، اُس میں اُن کے قواعد کو بہت ترتیب کے ساتھ بیان کیا ہے ۔ اس مضمون سے معلوم ہوتا ہے کہ اس فن کے اصول کو آریہ لوگ بخوبی سمجھتے تھے ، اور بہت سے قاعدے اُس کے اُنھوں نے ایجاد بھی کیے تھے ۔

۳

عربی الفاظ کی جمع اور تذکیر و تانیث کے اصول

(قلمی مسودے سے نقل کیا گیا)

جب میں مولانا حالی کی لائبریری کا انچارج تھا تو اُس وقت میں نے مولانا کے ہاتھ کے لکھے ہوئے ہر کاغذ کو بہت احتیاط سے دیکھا اور اُنھیں علیحدہ نقل کرتا رہا ۔ اس تلاش میں طویل مضامین کے علاوہ بہت چھوٹے چھوٹے مضامین بھی میری نظر سے گزرے جو مولانا نے مختلف پرچوں پر علیحدہ علیحدہ لکھے ہوئے تھے ، مگر اُن پر کوئی تاریخ لکھی ہوئی نہیں تھی ، جس سے معلوم ہوتا کہ یہ تحریر مولانا نے کب اور کس سنہ میں لکھی ۔ میں نے ان چھوٹے چھوٹے مضامین کو بھی جان کے برابر حفاظت سے رکھا ہے اور آج میں ان کو پہلی مرتبہ پیش کر رہا ہوں ۔

(محمد اسماعیل)

جہاں تک میرا خیال ہے ، اہل دہلی خاص خاص الفاظ کے سوا ایسی جموع کو عموماً جمع مؤنث کے طور پر استعمال کرتے ہیں ۔ چناں چہ میرزا غالب کا شعر ہے :

تھیں بنات النعش گردوں دن کو پردے میں نہاں
شب کو اُن کے جی میں کیا آئی کہ عریاں ہو گئیں

'اردوے معلیٰ' میں میری نظر سے گزرا کہ ''نسخے کے موافق حبوب بن گئی ہیں ۔'' مگر اس پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ کاتب نے ''بن گئے ہیں'' کی جگہ ''بن گئی ہیں'' لکھ دیا ۔ لیکن پہلی مثال بالکل صاف ہے ۔ تلاش سے اور بھی ایسی مثالیں مل سکتی ہیں ۔ یہ سچ ہے کہ اہل دہلی بھی بعض جموع مؤنث کو جموع مذکر پر قیاس کرکے بہ صورت جمع مذکر استعمال کر جاتے ہیں ؛ مثلاً حوادث و وقائع وغیرہ پر قیاس کرکے شدائد و مصائب و فضائل و رزائل وغیرہ کو بھی بہ صورت جمع مذکر بول جاتے ہیں ، مگر عام طور پر تمام جموع کی نسبت میرا یہ خیال نہیں ہے ۔

۴

بعض فارسی و عربی شعرا کی خصوصیات

(قلمی مسودے سے نقل کیا گیا)

مجھے مولانا حالی کے ہاتھ کے لکھے ہوئے کاغذات تلاش کرتے ہوئے مندرجہ ذیل تحریر ملی جو میں آج پہلی مرتبہ ہدیہٗ ناظرین کر رہا ہوں ۔ یہ صرف اشارے ہیں ۔ غالباً مولانا ان اشاروں کو سامنے رکھ کر کوئی مضمون لکھنا چاہتے تھے جو نہیں لکھ سکے ۔

(محمد اسماعیل)

سعدی در موعظت ، فردوسی در رزم ، نظامی در بزم ، امرءالقیس ذکرِ عیش و نشاط و وصفِ اسپ و زن میں ، اعشٰی در حسنِ طلب اور وصفِ شراب ، زہیر در رغبت و امید (مشہور ہیں) ۔

الطاف حسین حالی

۵

آصولِ فارسی کا دیباچہ

مولانا حالی نے آج سے ۹۹ برس پہلے ۱۸۶۸ع میں 'اصول فارسی' کے نام سے فارسی صرف و نحو کے متعلق ایک بسیط اور مفصل کتاب آردو میں لکھی تھی جو نہ مولانا کی زندگی میں زیور طبع سے آراستہ ہو سکی اور نہ مولانا کی وفات کے بعد مولانا کے گرامی قدر فرزند حضرت خواجہ سجاد حسین صاحب نے اس کی طباعت کا خیال فرمایا ۔ اور وہ آن کے ذاتی کتب خانے میں آن کے محترم والد کی دوسری نایاب کتابوں کے ساتھ محفوظ رہی ۔ سنہ ۱۹۳۶ع میں خواجہ سجاد حسین صاحب کا انتقال ہو گیا ۔ چوں کہ خواجہ صاحب مرحوم کے کوئی لڑکا نہ تھا اس لیے مکان بند پڑا رہا اور یہ علمی تبرکات الماریوں میں مقفل رہے ۔ سنہ ۱۹۴۷ع کے ہنگامے میں پتا نہیں کہ مکان مذکور لٹ گیا یا محفوظ رہا اور ان تبرکات کا کیا حشر ہوا ؟ اور یہ نایاب کتاب اس وقت کہاں ہے اور کس کے پاس ہے ؟

میں نے ۱۹۱۸ع میں خواجہ سجاد حسین صاحب کی لائبریری سے لے کر اس قلمی کتاب کا دیباچہ اور عنوانات و مندرجاتِ کتاب کی فہرست نقل کی تھی ۔ کتاب مولانا کے اپنے قلم سے لکھی ہوئی ہے ۔

تحریر بہت خوش خط اور صاف ہے ۔ بین السطور کھلا کھلا ہے ۔ فی صفحہ پندرہ سطریں ہیں اور فی سطر چودہ یا پندرہ لفظ ہیں ۔ کتاب کا سائز فل سکیپ ہے اور کتاب میں کہیں داغ دھبا نہیں ۔ البتہ کاغذ میلا ہو گیا ہے اور کتاب کو مع جلد کے کیڑے نے جگہ جگہ سے کھا لیا ہے ۔ جلد بہت بوسیدہ ہے ۔ کتاب کی تمہید ۹ صفحات میں آئی ہے ۔ اُس کے بعد علم صرف کا حصہ ۱۲۴ صفحات میں مولانا نے لکھا ہے ۔ بعد ازاں علم نحو کا بیان ۱۲۶ صفحات میں ہے ۔ یعنی کل کتاب کے ۲۵۹ صفحات ہیں ۔ تمام کتاب کالی سیاہی اور نیزے کے قلم سے لکھی ہوئی ہے ۔

اس کتاب کا تعارف ناظرین کرام سے کراتے ہوئے یہ بیان کرنا ضروری ہے کہ چوں کہ کتاب مذکور آج سے قریباً سو برس پہلے کی لکھی ہوئی ہے لہذا آج کل کے رسم الخط میں اور اُس وقت کی طرز کتابت میں کچھ فرق ہے ۔ مثلاً کتاب مذکور کے مسودے میں :

۱۔ ہر جگہ بجائے ''چونکہ'' کے ''جوکہ'' لکھا ہے :

۲۔ ساری کتاب میں کہیں ڈیش نہیں اور نہ الگ الگ پیرے ہیں ، بلکہ مضمون مسلسل چلا گیا ہے ۔

۳۔ ''اُن کی ، اُس کی ، اُس ، اُن'' وغیرہ الفاظ کو بالعموم اس طرح لکھا ہے : ''اون کی ، اوس کی ، اوس ، اون'' وغیرہ ۔

۴۔ تمام کتاب میں نون غنہ کا استعمال کہیں نہیں کیا گیا ۔ ہر جگہ پورا ''ن'' لکھا گیا ہے ۔ مثلاً ہیں ، زبانیں ، نہیں وغیرہ کو ہمیشہ ''ہین ، زبانین ، نہین'' لکھا ہے ۔

۵۔ جہاں جہاں کتاب میں ''ٹ'' آئی ہے ، اُس کو ہمیشہ اس طرح لکھا ہے : ''تؕ ۔''

۶۔ یائے مجہول کو بالعموم یائے معروف لکھا ہے : مثلاً ''نے ، جتنے ، ہے'' کو ''نی ، جتنی ، ہی'' تحریر کیا ہے ۔

۷۔ حرف گ کو ساری کتاب میں ک کی طرح لکھا ہے ۔ مثلاً 'اگر' کو 'اکر' ، 'گورنمنٹ' کو 'کورنمنٹ' لکھا ہے ۔

۸۔ ''پیچھے ، لکھی'' وغیرہ الفاظ کو ہر جگہ ''پیچہے لکہی'' لکھا ہے ۔ صرف ایک جگہ ''پارسی کہلانے لگی'' کی بجائے ''پارسی کھلانے لکی'' لکھا ہے ۔

۹۔ ساری کتاب میں مجھے کہیں اضافت کی علامت یعنی 'زیر' نظر نہیں آیا ۔ میں زیر نظر پیش کش میں مولانا کی اس تحریر کو بعینہ اُسی شکل میں ہدیۂ ناظرین کرتا لیکن ٹائپ کی مجبوریاں حائل تھیں ، اس لیے موجودہ رسم الخط اختیار کرنا ناگزیر ہو گیا ۔

(محمد اسماعیل)

بسم اللہ الرحمان الرحیم

تمہیدِ مطالبِ کتاب

خدا تعالیٰ نے جس طرح ہر ملک اور ہر ولایت میں نئی وضع اور نئے ڈھنگ کے آدمی بنائے ، اسی طرح ہر ملک کے آدمیوں کو نئی بولی اور نئی زبان عنایت کی ۔ دیکھو عرب کی زبان اور ہے ، عجم کی زبان اور ، ہندوستان کی زبان ان دونوں سے جدا ہے ، انگلستان کی زبان تینوں زبانوں سے نہیں ملتی ۔ اسی طرح جتنے

ملک ہیں آتنی ہی بولیاں ہیں ۔ اور ظاہر ہے کہ آدمی مدنی الطبع یعنی ہر کم میں آدمیوں سے میل جول اور لین دین کرنے کا محتاج ہے ، اور یہ بھی ظاہر ہے کہ دنیا کے معاملات کا مدار زبان کے سمجھنے اور سمجھانے پر ہے ۔ پس آدمی جس قدر زیادہ زبانیں جانتا ہوگا اسی قدر اُس کے معاملات آسانی سے سرانجام ہوں گے ۔ اور زبان کا جاننا ایک تو یہ ہے کہ انسان جس ملک میں پیدا ہوا ، اس ملک کی بولی اول اپنے ماں باپ اور ناتے رشتے والوں سے اور پھر ہر ایک کی زبان سے سنتے سنتے جان گیا اور ضرورت کے وقت اپنے دل کے مطلب اُس بولی میں ادا کرنے لگا ۔ اور دوسرے یہ کہ اُس زبان میں جو خواص کا محاورہ اور بول چال ہے ، اُس کے موافق تقریر اور تحریر کر سکے ۔ سو یہ بات بدون اس کے حاصل نہیں ہو سکتی کہ اہل زبان نے جو اصول اور قواعد اُس زبان کی تہذیب اور اصلاح کے لیے مقرر کیے ہیں ، اُس سے واقف ہو ۔ اور اگر بالفرض اپنی زبان کی تقریر اور تحریر میں اُن اصول و قواعد کے جاننے کا محتاج نہیں تو اس میں کچھ شک نہیں کہ دوسرے ملک کی زبان بدون واقفیت اصول کے ہرگز نہیں آ سکتی ۔ جو کہ ہماری گورنمنٹ کی ہمتِ عالی اس بات میں بہت مصروف ہے کہ جو زبانیں ہندوستان میں رائج ہیں یا جن زبانوں کی کتابیں ہندوستان کی درس و تدریس میں مستعمل ہیں ، اُن کی اصلاح بخوبی کی جائے اور ان کے اصول اور قواعد ایسے طور پر لکھے جائیں کہ ہر مبتدی بہ ادنٰی توجہ اُن قاعدوں کے ذریعے سے اُن زبانوں میں تقریر اور تحریر کا سلیقہ پیدا کر سکے ۔ اور ایک اشتہار جو گورنمنٹ پنجاب دام اقبالہ نے سنہ ۱۸۶۸ع عیسوی میں بہ وعدۂ انعام جاری فرمایا ہے ، اُس کا عمدہ مطلب یہ ہے کہ زبان فارسی کے اُصول اُردو زبان میں بعبارتِ روشن و واضح بیان کیے جائیں ، اس لیے خاکسار ہیچمدان الطاف حسین انصاری پانی پتی خدا تعالٰی کے بھروسے پر اس امر کا متصدی ہوا ۔ ہرچند مجھ کو اپنی بے بضاعتی اور ہیچمدانی سے توقع نہیں کہ میری تالیف حضور گورنمنٹ دام اقبالہ میں پسندیدہ اور مقبول ٹھہرے لیکن اس رسالے میں چند خصوصیتیں ایسی ہیں کہ اُصول فارسی کی اگلی کتابوں میں سے کسی خاص کتاب میں شاید نہ پائی جائیں : ایک یہ کہ اگلی کتابوں میں لوگوں نے جو زبان فارسی کے قاعدے لکھے ہیں ، اُن میں صرف و نحو کے اُصول کو باہم ایسا مخلوط کیا ہے کہ صرف کے مسائل نحو کے مسائل سے ہرگز ممتاز نہیں ہو سکتے ، بلکہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ صرف و نحو ایک ہی فن کا نام ہے ، حالاں کہ صرف ایک جدا فن ہے ، نحو جدا فن ۔ صرف میں مثلاً ایک حرف کا دوسرے حرف سے بدلا جانا اور مصدر کی حقیقت اور مصدروں کے وزن اور فعلوں کی قسمیں اور اشتقاق کی کیفیت اور ابدال و اسکان و تحریک و قلب و حذف و اشباع و ادغام و تخفیف و امالہ کی بحث ، اور اسموں کے تغیرات لفظی کا بیان کیا جاتا ہے ۔ اور نحو میں مثلاً کلموں کے ترکیب دینے کا دستور اور اجزاے کلمہ کے حالات اور اسناد اور اضافت ، وصف و عطف و تاکید و بدل و مبتدا و خبر و فعل و فاعل و نائب فاعل و مفعول و مستثنٰی و تاکید و ترکیب ناقص و ترکیب تام اور حرفوں کے استعمالات معنوی کا بیان کیا جاتا ہے ۔

ظاہر ہے کہ یہ دونوں بحثیں جدا جدا بیان کرنی منفعت سے خالی نہیں ؛ سو اس کتاب میں صرف کی بحث نحو کے فن سے بالکل جدا ہے ۔

دوسرے اگلی کتابوں کی ترتیب مفید نہیں ؛ یعنی جو باتیں پہلے لکھنے کی ہیں وہ اُن میں پیچھے لکھی گئیں ، اور جو پیچھے لکھنے کی ہیں وہ پہلے لکھی گئیں ۔ اور ظاہر ہے کہ حسن ترتیب کو مطالب

کے دل نشین کرنے میں بڑا دخل ہے ؛ سو اس رسالے میں رعایت ترتیب کی بہت ملحوظ رہی ہے ۔

تیسرے اصول فارسی کی اگلی کتابیں جو رائج ہیں ، ان میں نحو کے اکثر مطالب نہیں بیان کیے گئے اور خاکسار نے حتی الوسع مطالب نحو کو جمع کرنے میں قصور نہیں کیا ۔

چوتھے اصول کا لفظ کَے فنون کو شامل ہے ؛ صرف ، نحو ، معانی ، بیان ، بدیع ؛ سو جب تک کتاب میں یہ سب فنون بیان نہ کیے جائیں ، کتاب نا تمام ہے ، حالاں کہ اگلی کتابوں میں کوئی رسالہ ایسا نہیں دیکھا گیا جو ان پانچوں فنون کو شامل ہو ۔ اور رسالہ عبدالواسع بانسوی اور شجرۃالامانی اور نہرالفصاحت وغیرہ میں جو ان فنون کا کچھ کچھ ذکر ہے ، وہ کافی نہیں ۔ اس رسالے میں یہ پانچوں فن اپنے نزدیک اچھی طرح بیان کیے گئے ہیں ۔ ہاں مگر جو باتیں ضروری نہیں سمجھیں یا جن کا بیان کرنا الجھاؤ سے خالی نہ تھا اور مبتدیوں کا فہم اُن کے سمجھنے سے قاصر سمجھا گیا ، وہ باتیں البتہ چھوڑ دی گئیں ۔

پانچویں اکثر اُستادوں کے شعر جو بطور سند کے لائے جاتے ہیں ، بعضے اُن میں سے دقیق ہوتے ہیں اور اُن کے سمجھے بغیر قاعدہ طالب علم کی سمجھ میں نہیں آتا ۔ سو خاکسار نے ایسے شعروں کا ترجمہ کرکے اُس کا مطلب روشن اور واضح کر دیا ہے ۔

چھٹے ہر فن کے آخر میں تھوڑے سوال اُسی فن کے لکھ دیے ہیں اور اُن کا جواب نہیں لکھا تاکہ پڑھنے والوں کو اُن کے دیکھنے سے بصیرت حاصل ہو ، اُن کے امتحان میں بھی کام آئیں ۔

اگرچہ میں خوشہ چیں انھیں بزرگوں کا ہوں اور اُن کی تالیفیں اور تصنیفیں نہ ہوتیں تو بے شک مجھ کو کتاب لکھنی بہت دشوار ہوتی بلکہ شاید نہ لکھ سکتا ، لیکن دستور یہ ہے کہ جس کام کی طرف سلطانِ وقت کی توجہ ہوتی ہے وہ کام حدِ کمال کو پہنچتا ہے ، اور

جو بات کوئی اہلِ علم اپنے دل کی اُپج سے کرتا ہے ، اُس میں کچھ نہ کچھ نقصان رہ جاتا ہے ۔ ظاہر ہے کہ گورنمنٹ کے امتثالِ امر کے لیے جو اس زمانے میں لوگ سعی و کوشش کریں گے اور کرتے ہیں ، وہ اگلوں نے کاہے کو کی ہوگی ، کیوں کہ سلاطینِ ماضیہ نے اصول فارسی کی تہذیب کی طرف بہت توجہ نہیں کی ۔

تنبیه : پارس جو ایک ولایت کا نام ہے ، سو وہ پارس بن پہلو بن سام بن نوح[۴] کی آباد کی ہوئی ہے ، اس سبب سے اُس کو پارس کہتے ہیں ۔ جو زبان کہ اُس ملک میں رائج ہوئی وہ پارسی کہلانے لگی اور اُسی کو فارسی کہتے ہیں ۔ فارسی زبان کی کئی قسمیں ہیں : دری ، پہلوی ، پارسی ، ہروی ، سکری ، زاولی ، سغدی ۔ دری کو بعضے کہتے ہیں کہ بہمن اسفندیار کے درباریوں کی زبان ہے اور بعضے کہتے ہیں کہ کیانیوں کے دربار میں بولی جاتی تھی ۔ اور بعضوں کے نزدیک دری وہ زبان ہے جو درۂ کوہ کے رہنے والے بولتے تھے ۔ اس میں کسی غیر زبان کا ملاؤ نہ تھا ۔ بہرحال یہ زبان بہت فصیح گنی جاتی تھی ۔ پارسی اُس زبان کو کہتے ہیں جو خاص بلاد پارس میں رائج تھی ۔ پہلوی کو بعضے کہتے ہیں کہ ولایت رے اور اصفہان اور ہمدان اور دینور اور اُن کے مضافات کی زبان تھی ، اور جو کہ اس ملک کو 'پہلو' کہتے ہیں ، اس لیے وہاں کی زبان کو پہلوی کہنے لگے ۔ اور بعضے کہتے ہیں کہ پہلو پارس بن سام بن نوح کے باپ کا نام تھا ، یہ زبان اُس کی طرف منسوب ہے ۔ بہرحال یہ تینوں زبانیں رائج اور مستعمل رہیں اور باقی چار زبانیں ترک کی گئیں ۔ جب سے عجم میں اہل اسلام کی عمل داری آئی عربی زبان کی لغت فارسی میں مخلوط ہو کر ایک نئی زبان بن گئی ۔ جیسے ہندوستان کی قدیم زبان فارسی اور عربی کے ملنے سے بالکل بدل گئی ۔

اب جاننا چاہیے کہ فارسی زبان کی ایسی معرفت جس سے آدمی فصحائے اہل زبان کے طور پر تقریر اور تحریر کر سکے اور کلموں کے استعمال کرنے میں اور کلام کے ترکیب دینے میں غلطیوں سے محفوظ رہ سکے ، کئی باتوں کے جاننے پر موقوف ہے ۔ اول لغت اور اصطلاحیں اور محاورے ، دوسرے اشتقاق اور تصریف کے اصول ، تیسرے نظم کلام کا دستور ، چوتھے بہ حسب مقتضائے حال گفتگو کرنے کا طریقہ ، پانچویں ایک مطلب کو نئے نئے اسلوب سے ادا کرنے کے قاعدے ، چھٹے یہ بات کہ بعد رعایت فصاحت و بلاغت کے کلام میں کن باتوں سے حسن و خوبی زیادہ ہو جاتی ہے ۔

ان میں سے پہلی بات 'برہان قاطع' اور 'فرہنگ جہانگیری' اور 'فرہنگ رشیدی' اور 'فرہنگ سروری' اور 'مدار الافاضل' اور 'مؤید الفضلا' اور 'بہارعجم' اور 'مصطلحات وارستہ' اور 'سراج اللغة' اور سوا ان کے اور لغت کی کتابوں سے طلب کرنی چاہیے ۔ اور باقی پانچ مقدمے اس رسالے میں انشاء اللہ تعالیٰ بہت بسط اور شرح کے ساتھ بیان کیے جائیں گے ۔ اور اسی واسطے اس کتاب کے پانچ حصے کیے گئے ۔

پہلا حصہ علمِ صرف کے بیان میں :

مقدمہ صرف کی اصطلاحوں کے بیان میں ۔
پہلا باب حرفوں کے بیان میں ۔
دوسرا باب مصدر اور مشتق کے بیان میں ۔
تیسرا باب جامد کے بیان میں ۔
خاتمہ سوالات علمِ صرف میں ۔

دوسرا حصہ علمِ نحو کے بیان میں :

مقدمہ نحو کی اصطلاحوں کے بیان میں ۔

پہلا باب اسموں کے بیان میں ۔
دوسرا باب فعلوں کے بیان میں ۔
تیسرا باب حرفوں کے بیان میں ۔
چوتھا باب مرکب ناقص کے بیان میں ۔
پانچواں باب مرکب تام کے بیان میں ۔
خاتمہ سوالات علم نحو میں ۔

تیسرا حصہ علمِ معانی کے بیان میں :

مقدمہ علم معانی کی اصطلاحوں کے بیان میں ۔
پہلا باب اسناد خبری کے بیان میں ۔
دوسرا باب مسند الیہ کے بیان میں ۔
تیسرا باب مسند کے بیان میں ۔
چوتھا باب فعل کے متعلقات کے بیان میں ۔
پانچواں باب قصر کے بیان میں ۔
چھٹا باب انشا کے بیان میں ۔
ساتواں باب فصل و وصل کے بیان میں ۔
آٹھواں باب ایجاز و اطناب و مساوات کے بیان میں ۔
خاتمہ علم معانی کے سوالات میں ۔

چوتھا حصہ علمِ بیان میں :

مقدمہ علم بیان کی اصطلاحوں کے بیان میں ۔
پہلا باب تشبیہ کے بیان میں ۔
دوسرا باب استعارے کے بیان میں ۔
تیسرا باب مجاز مرسل کے بیان میں ۔
چوتھا باب کنایے کے بیان میں ۔
خاتمہ علم بیان کے سوالات میں ۔

پانچواں حصہ علم بدیع کے بیان میں :

مقدمہ علم بدیع کی اصطلاحوں کے بیان میں ۔
پہلا باب صنائع معنوی کے بیان میں ۔
دوسرا باب صنائع لفظی کے بیان میں ۔
خاتمہ علم بدیع کے سوالات میں[۱] ۔

---

[۱] ۱۔ محترمی و مکرمی ملک محمد طفیل صاحب ایڈیٹر رسالہ 'نقوش' لاہور کی فرمائش پر میں نے یہ غیر مطبوعہ مضمون انہیں دے دیا تھا جسے انھوں نے 'نقوش' کے اکتوبر ، نومبر ۱۹۵۳ع کے شمارے میں ایک علمی تبرک کے طور پر شائع کر دیا تھا ۔ (محمد اسماعیل)

۶

ہندوستانیوں کی قابلیت و استعداد کا مقابلہ

یورپ کے لوگوں کی لیاقت و تہذیب کے ساتھ

(رسالہ 'دہلی سوسائٹی' نمبر ۸ من ابتدائے ۲۱ مارچ ۱۸۷۱ع لغایت ۲۶ جولائی ۱۸۷۱ع ، صفحہ ۵۳ تا ۶۲)

دہلی کے بعض اہل علم اور صاحب ذوق حضرات نے ۱۸۶۵ع میں ایک علمی انجمن ''دہلی سوسائٹی'' کے نام سے قائم کی تھی ۔ اس کے سیکرٹری منشی پیارے لال آشوب تھے ۔ اس سوسائٹی کے جلسوں میں جو علمی ، ادبی اور اصلاحی مضامین پڑھے جایا کرتے تھے وہ بعد میں مجلس کے جرنل میں چھپ جایا کرتے تھے جس کا نام رسالہ 'دہلی سوسائٹی' تھا ۔ یہ مجلہ سوسائٹی کی طرف سے ۱۸۶۶ع میں جاری ہوا تھا ، سوسائٹی کا سیکرٹری رسالے کا ایڈیٹر ہوا کرتا تھا ۔

مندرجہ ذیل مضمون اسی سوسائٹی میں مولانا حالی نے سنایا تھا جو بعد میں رسالے میں شائع ہوا ۔ اس مضمون میں مولانا حالی نے تاریخی دلائل و شواہد سے اس بات کو ثابت کیا ہے کہ یوروپین تہذیب و شائستگی پر ہندوستان کے علم و تمدن کو فوقیت و برتری حاصل ہے ۔ میں اس مضمون کے لیے جناب مولانا امداد صابری

مولف 'تاریخ صحافتِ اردو' کا ممنون ہوں کہ انہوں نے رسالہ 'دہلی سوسائٹی' کے پرانے فائلوں میں سے یہ مضمون نقل کرا کے مجھے دہلی سے بھجوایا ۔

(محمد اسماعیل)

جہاں تک ہماری سمجھ اور ہماری نگاہ پہنچتی ہے ، ہم آدمی کو ایک ایسا جوہر بے بہا پاتے ہیں جس کا نظیر کارخانہ قدرت میں نہیں پایا جاتا ۔ اور یہ دعویٰ ایسا بدیہی ہے کہ اس پر دلیل لانی ایک سیدھی بات کو مفت الجھاؤ میں ڈالنا ہے ۔ لیکن یہاں ہم کو اس بات کی بحث کرنی ضرور ہے کہ جس طرح موتی کا بیش بہا ہونا اس کی جِلا پر موتوف ہے ، اسی طرح انسان کا کمال بھی کسی چیز کے حصول یا زوال پر موقوف ہے یا نہیں ۔ میرے نزدیک سب سے زیادہ تربیت کی محتاج وہ شے ہے جس میں سب سے زیادہ قابلیت و استعداد ہو ۔ پس انسان کی ذات جو کہ بےانتہا کمالات کی قابلیت رکھتی ہے ، اس سے بڑھ کر کوئی نوع انواعِ موجودات میں سے تربیت کی محتاج نہیں ۔ بلکہ انسان کو کبھی ایسی حالت نصیب ہونی ممکن نہیں جس کے بعد اس کو ترقی کرنے کی حاجت نہ رہے ۔ یورپ میں آج کل اعلیٰ درجے کی شائستگی مانی جاتی ہے ، بلکہ انگلستان کا ایک بڑا نامی مورخ لکھتا ہے کہ ”اب کی باری میں لوگ ہم سے بھی بڑھ جائیں گے ۔ شاید بیسویں صدی میں ایسا ہو جائے کہ ڈورسٹ شائر کے گنوار کو اگر ہفتے میں پندرہ شلنگ ملیں گے تو وہ اپنی اجرت کو بہت ہی قلیل سمجھے گا اور کچھ عجب نہیں کہ گرینچ کے بڑھئی کو دس شلنگ روز ملنے لگیں ، اور مزدوروں کو بے گوشت کھانا کھانے کی عادت ایسی چھوٹ جائے جیسے کہ وہ آج کل دیسی گندم کی روٹی نہیں کھاتے ۔ اور بہت سے اسبابِ عیش و عشرت ، جو آج کل

معلوم نہیں یا خاص خاص لوگوں کو نصیب ہیں ، آیندہ شاید ہر محنتی اور کم خرچ مزدور کو میسر آنے لگیں ۔“

ظاہر ہے کہ اس جلیل القدر مورخ نے انگلستان کی نسبت جو بیسویں صدی کی خبر دی ہے ، ہم ہندوستان کی نسبت اس کی امید چھبیسویں صدی تک بھی نہیں کر سکتے ۔ اور اگر ہم راستی سے تجاوز نہ کریں اور وطن کی پاسداری کو کام نہ فرمائیں تو کہہ سکتے ہیں کہ ہندوستان کی پست ہمتی اور بے پروائی اور سستی و کاہلی شاید انگلستان کی حالت موجودہ تک بھی اس کو کبھی نہ پہنچنے دے ۔ بعضے لوگوں کی یہ رائے ہے کہ اول تو قدرت کی فیاضی نے انگریزوں کو بعضے ایسے امتیاز بخشے ہیں جن سے ان کو عموماً ہندوستانیوں پر فوقیت حاصل ہے ۔ مثلاً معتدل المزاج اور قوی الخِلقت ہونا ایک ایسی صفت ہے جس پر جفا کشی اور تحمل اور بلند حوصلگی اور عالی ہمتی اور استقلال اور پختگی اور متانت کا بالکل مدار ہے ، اور یہ وہ خصلتیں ہیں جن کے بغیر انسان سے کوئی کام پورا نہیں اتر سکتا ۔ اس کے سوا شائستگی کی بدولت بہت سی ایسی مفید عادتیں ان کی طبیعت میں راسخ ہو گئی ہیں جن کی ہندوستانیوں کو ہوا تک نہیں لگی ۔ جیسے ہوادار مکانوں میں رہنا ، عفونت سے کوسوں دور بھاگنا ، غذائیں مقوی اور نافع استعمال کرنی ، بدن اور لباس اجلا اور صاف رکھنا ، ریاضیات بدنی کا پابند ہونا ۔ اس سے بڑھ کر یہ بات ہے کہ سلطانی رعایت کے سبب سے ان کے دل اکثر ان رنجوں اور فکروں سے پاک رہتے ہیں جو عام ہندوستانیوں کو کبھی نہیں ابھرنے دیتے ۔ مگر جن لوگوں نے یہ امتیاز نکالا ہے ، شاید انہوں نے ایک محال بات تسلیم کر لی ہوگی : یعنی یہ کہ انگریزوں کی جو اب حالت ہے ، یہ ان کی سعی و کوشش سے حاصل کی ہوئی نہیں ہے ، بلکہ ہمیشہ سے وہ

اسی حالت پر چلے آتے ہیں ۔ حالاں کہ چند قدرتی ذریعوں کے سوا انگلستان میں کوئی خاصیت ایسی نہیں پائی جاتی جو بدون سعی و کوشش کے اُن کے ہاتھ آ گئی ہو ۔ سنہ عیسوی سے کچھ ہی پہلے جو برٹن کا حال دیکھا جاتا ہے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت ملک میں جا بجا دلدل اور جھیلوں کے سوا کچھ نہ تھا ۔ اندرونی اضلاع کے باشندے اناج نہ بوتے تھے ، صرف دودھ اور گوشت پر بسر کرتے تھے ۔ اور جو لوگ شمالی سرحد پر رہتے تھے وہ بناس پتی کھاتے تھے اور جانوروں کی کھال پہنتے تھے ۔ باہیں اور ٹانگیں ننگی رکھتے تھے ، اور ان کو گود کر کسی درخت کے عرق سے نیلا رنگ لیتے تھے ۔ جو لوگ پیشوائے دین گنے جاتے تھے وہ سانپ اور چاند سورج اور درخت بلوط کو واجب التعظیم جانتے تھے ۔ اور عورت اور مرد کی قربانیاں کرتے تھے ۔ درختوں کی ٹہنیوں کے بڑے بڑے کھانچے سے بنا کر اُن میں آدمیوں کو بھر دیا اور آگ لگا دی ۔ جو لوگ چوری یا اور کسی حالت میں ماخوذ ہوتے تھے ان کی قربانی دیوتاؤں کے ہاں زیادہ مقبول سمجھ کر پہلے اُنھیں کو جلاتے تھے ۔ جب مجرم ہاتھ نہ آتے تو بے گناہوں کو بھی پھونک دیتے تھے ۔ اور اگر قدیم زمانے کے حال سے قطع نظر کی جائے اور اس سے بہت ورے کا حال ملاحظہ کیجیے تو بھی وحشت اور ناشائستگی سے خالی نہیں معلوم ہوتا ۔ سنہ ایک ہزار کے بعد چوری کے لیے اول موت کی سزا ملتی تھی ، پھر اعضا کے کاٹنے کا حکم ملا ۔ اور جس پر چوری کا جرم تین بار ثابت ہو جاتا تھا اس کا اوپر کا ہونٹ اور ناک کان کاٹے جاتے تھے اور آنکھیں نکلوائی جاتی تھیں ۔ مجرم کے جھوٹ سچ کی آزمایش کا طریقہ یہ تھا کہ یا تو کھولتے ہوئے پانی کی دیگ کو گرجا میں رکھ کر پتھر یا لوہے کا ٹکڑا اُس میں ڈال دیتے تھے اور شخص ملزم گرم پانی میں ہاتھ ڈال کر وہ ٹکڑا نکال لیتا تھا ۔

یا لوہے کا سیخچہ آگ میں لال کرکے رکھ دیتے تھے اور ملزم اُسے اُٹھا کر تین قدم چلتا تھا ، پھر ڈال دیتا تھا ۔ اور دونوں صورتوں میں اُس کے زخم پر پادری اپنے ہاتھ سے صاف کپڑے کی ایک پٹی باندھ کر گرجا کی مُہر لگا دیتا تھا اور تیسرے دن کھولتا تھا ۔ اگر زخم بالکل بھر جاتا تھا تو ملزم کو رہائی ہو جاتی تھی ۔ انگلستان کی سکن قوم میں سے دو تہائی کے قریب غلام تھے ۔ اور غلام دو قسم کے ہوتے تھے : ایک تو غلاموں کی اولاد ، دوسرے جو لڑائی میں پکڑے آتے تھے ، یا قرض یا کسی جرم کی علت میں گرفتار ہو جاتے تھے ۔ غلام کی جو خرید و فروخت ہوتی تھی ، اس میں غلام کی قیمت بیل سے چوگنی ہوتی تھی ۔ جو لوگ نہایت ممتاز اور امیر تھے اُن کا یہ حال تھا کہ دن بھر تو شکار میں مصروف رہتے تھے اور شام کو جب اپنے محل میں آتے تھے تو اُن کے غلام گوشت کے بڑے بڑے پارچے سیخوں میں پروئے ہوئے سرداروں کے سامنے پیش کرتے تھے اور وہ اپنے خنجروں سے تکے کاٹ لیتے تھے اور کھا کر بچا کھچا چبوترے سے نیچے پھینک دیتے تھے اور اُس کو غلام اور کتے جھپٹ جھپٹا کر چٹ کر جاتے تھے ۔ مکالے صاحب سولھویں صدی کا حال لکھتے ہیں کہ اچھے اچھے خاندانوں کے تعلیم یافتہ آقا اپنے نوکروں کو مارنے پیٹنے کے عادی تھے ۔ معلم طالب علموں کو مار کر تعلیم دینے کے سوا کوئی طریقۂ تعلیم نہ جانتے تھے ۔ جن شوہروں کا مجلس میں اعزاز کیا جاتا تھا ، اُن کو اپنی بیویوں کے مارنے سے شرم آتی تھی ۔ جو مجرم پلورے میں کھڑا کیا جاتا تھا ، وہ اگر گلی کے پتھروں اور روڑوں کی بوچھاڑ سے جاں بر ہو جاتا تھا تو بڑا خوش قسمت گنا جاتا تھا ۔ جو شخص جواب دہی کرنے سے انکار کرتا تو اُس کو مار کر دبا ڈالتے ؛ یا جو عورت سکہ قلب بناتی ، اُس کو جلا ڈالتے

اور آدمیوں کو اُس پر اتنا بھی رحم نہ آتا تھا جتنا کہ آج کل بہت بیمار گھوڑے یا بہت تھکے ہوئے بیل پر آتا ہے ۔ جس دنگل میں پکھیت لوگ اسلحۂ قتل سے ایک دوسرے کو کاٹ کاٹ کر ٹکڑے کرتے تھے ، وہ شہر کے لوگوں کی دل لگی کا تماشا ہوتا تھا اور اس کی سیر دیکھنے کو ایک جماعت کثیر فراہم ہو جاتی تھی ۔ اور جب کسی لڑنے والے کی انگلی یا آنکھ جاتی رہتی تو لوگ خوش ہو ہو کر غل مچایا کرتے تھے ۔ اسی طرح اور بہت سی ایسی باتیں لکھی ہیں جو شائستگی سے بہ مراحل دور ہیں ۔ باوجود ان سب باتوں کے اگر انگلستان کا حال اب جا کر دیکھیے تو قیاس میں نہیں آتا کہ یہاں کبھی ناشائستگی کی پرچھائیں بھی پڑی ہو ۔ بہرحال شائستگی ایک ایسی کسبی حالت ہے جو انسان کے ہر طبقے کو بہ آسانی یا بہ دشواری حاصل ہو سکتی ہے ۔ اور ہمارے نزدیک جتنی قومیں نصف تربیت یافتہ ہیں اُن میں سے اس بات کی قابلیت جتنی ہندوستانیوں میں ہے اور کسی قوم میں نہیں ۔ ہندوستان کے قدیم باشندے ہندو ہیں ۔ اُن کے بزرگوں کا حال جو تاریخ میں دیکھا جاتا ہے اُس سے اس گروہ کی کمال قابلیت و استعداد ظاہر ہوتی ہے ۔ ہندوؤں کے قدیم طبقوں نے علوم حکمیہ میں بڑی بڑی ترقیاں کی ہیں ۔ یہ بات بالاتفاق تسلیم کی گئی ہے کہ علمِ ہیئت میں جو ہندوؤں نے کتابیں تصنیف کی ہیں اُن میں نقصان اگرچہ نہایت درجے کا ہے ، مگر اُس کے ساتھ کمال بھی اعلیٰ درجے کا پایا جاتا ہے ۔ اور ہیئت کے سوا ریاضی کے فروغ میں جو اُنھوں نے ترقی کی ہے وہ علمِ ہیئت سے بھی زیادہ جتانے کے قابل ہے ۔ چناں چہ کتاب 'سورجا سدھانتا' جو عام مورخوں کے نزدیک پانچویں یا چھٹی صدی عیسوی کی تصنیف مانی جاتی ہے ، اُس میں علم مثلث کا بیان ایسا پایا جاتا ہے جس سے اُن کو یونانیوں ہی پر ترجیح نہیں دے سکتے ،

بلکہ کہہ سکتے ہیں کہ اُس میں بہتیرے سوالات ایسے ہیں جن کا علم عموماً اہل یورپ کو سولھویں صدی تک حاصل نہ ہوا تھا ۔ علم ہندسہ کے بعضے اصول کا علم ہندوستان ہی کے ساتھ خصوصیت رکھتا تھا ۔ خصوصاً وہ نسبت جو نصف قطر کو محیط دائرے کے ساتھ ہے ، اُس کا علم زمانۂ حال تک ہندوستان کے سوا کسی اور ملک کے لوگوں کو نہ تھا ۔ علم حساب میں سب کے نزدیک کسور اعشاریہ کے موجد ہندو ہیں اور ظاہرا اسی امتیاز کے سبب سے علم حساب میں اُن کو یونانیوں پر فوقیت دی جاتی ہے ۔ جبر و مقابلہ میں بھی برہمن لوگ اپنے ہم عصروں سے سبقت لے گئے تھے ۔ چناں چہ اس علم کی بابت اُن کی تحقیقات کامل 'برہماگنا' کی کتابوں سے ؛ جو کہ چھٹی صدی عیسوی میں ہوا ہے اور 'بھا سکرا اچاریہ' کی کتاب سے ، جو کہ بارھویں صدی میں ہوا ہے ، دریافت ہوتا ہے ، اور ان دونوں نے آرجا بھاٹا کی تصنیفات سے مضامین اخذ کیے ہیں ۔ ظاہرا اس شخص کے زمانے میں علم کمال کے درجے کو پہنچا ہوا تھا ۔ اور یہ اور ڈائی فانٹس ، جس نے یونان میں جبر و مقابلہ سب سے پہلے لکھا ہے ، بعض مؤرخین کے نزدیک ایک زمانے میں ہوئے ہیں ۔ اور یہ بات مانی ہوئی ہے کہ یہ شخص ڈائی فانٹس سے اس علم کی ایسی تحقیقات میں سبقت لے گیا ہے جن کے حاصل کرنے اور سمجھنے پر متاخرین کر فخر ہے ۔ اور چونکہ ہندوؤں کے ابتدائی ترقی کے زمانے میں اور تمام قومیں اُن سے زیادہ جاہل تھیں ، اس سے یہ نتیجہ نکل سکتا ہے کہ اُنھوں نے یہ علوم کسی غیر ماخذ سے نہیں لیے ۔ اور جس زمانے میں ان علموں کا غیر قوموں سے اخذ کرنا ممکن ٹھہر سکتا ہے ، اس وقت اُن کی علمی تحقیقات کے طریقے ایسے اصول پر مبنی تھے جن سے کوئی اگلی قوم اصلاً واقف نہ تھی ۔ اور اُن سے ایسی تحقیقات کا علم ظاہر ہوتا ہے جن کو اب سے دو سو برس

پہلے تک اہل یورپ بھی نہ جانتے تھے ، اسی طرح الٰہی اور طبیعی اور منطقی مسائل میں حکمائے ہند کی رائیں اور اختلافات اور مباحث اس قدر ہیں جن سے اُن میں اور حکمائے یونان میں ایک نسبت معتدبہ نکل سکتی ہے ۔ البتہ علم جغرافیہ میں بہ نسبت اور علموں کے ہندوؤں نے بہت کم ترقی کی ہے ۔ مگر ہندوستان کی تقسیم جو اُنھوں نے جغرافیے کی رو سے کی ہے وہ اُن کی قدیم کتابوں سے معلوم ہوتی ہے ، اور ہر اقلیم کے شہروں اور پہاڑوں اور دریاؤں کی فہرستیں موجود ہیں ۔ اگرچہ اُن فہرستوں میں تاریکی اور بے ترتیبی بہت کچھ ہے مگر بایں ہمہ اُن میں سے زمانۂ حال کے اضلاع اور شہر اور پہاڑ وغیرہ بخوبی معلوم ہو سکتے ہیں ۔ علم طب کے نہایت قدیم مصنف جن کی تصنیفیں اب تک موجود ہیں ، چرک اور سُشسرت ہیں ۔ اُن کی کتابوں کا ترجمہ عربی زبان میں ہوا اور ظن غالب یہ ہے کہ عرب والے ان کا ترجمہ ہونے پر ہی تحصیل علم کی طرف متوجہ ہوئے ۔ عربی کے مصنف علانیہ اقرار کرتے ہیں کہ ہم نے ہندوستان کے طبیبوں سے بے شک فائدہ اُٹھایا ہے ۔ اور ہندو طبیبوں کے مرتبے یونانی طبیبوں کے برابر سمجھتے ہیں ۔ ہندوؤں کا علمِ ادویہ نہایت وسیع معلوم ہوتا ہے ۔ ابتدا میں اہل یورپ نے اس علم کی تعلیم اُنھیں سے پائی ہے اور زمانۂ حال میں بھی دمے کے لیے حقے میں دھتورا اور کونچ کی پھلی سے کیڑوں کا علاج کرنا انھی سے سیکھا ہے ۔ ہندوؤں کے علم کیمیا کی نسبت آنریبل الفنسٹن صاحب بہادر کی یہ رائے ہے کہ قیاس ہرگز نہیں چاہتا کہ یہ علم اُن میں اس قدر پایا جائے ۔ شورہ اور گندھک اور نمک کا تیزاب بنانا ، تانبے اور لوہے اور سیسے اور ٹین کا کشتہ کرنا اور خاص کر جست کا کشتہ دونوں طرح یعنی کھیل اور سپیک کرنا ۔ اور تانبے یا لوہے یا پارے یا سرمے یا سنکھیا کے ساتھ

گندھک ملا کر ایک مرکب دوا بنانی ، اور لوہے اور جست کا گندھک کے تیزاب کے ساتھ کھار بنانا اور کاربون کے تیزاب سے سیسے کا کھار بنانا ، اگر بالکل نہیں تو بعض صورتوں میں ان دواؤں کے تیار کرنے کے طریقے ہندوؤں ہی کے ساتھ مخصوص ہیں ۔ معدنیات کو بطور دوا کے کھلانا سب سے پہلے اُنھی کے ہاں سے نکلا ہے ۔ شنجرف کا بھپارہ جس سے بہت جلد منہ آ جاتا ہے اور صحت ہو جاتی ہے ۔ اور پارہ اور باری کے تپ میں زہر کا تیزاب مدت سے اُن کے برتاؤ میں ہے ۔ فن جراحی میں جو ہندوؤں کو دست گاہ تھی ، وہ بھی اُسی قدر حیرت انگیز ہے جس قدر علم کیمیا ، حالاں کہ اس حالت میں وہ علم تشریح سے بالکل ناواقف تھے ۔ چناں چہ پتھری نکالنی ، آنکھیں بنانی ، رحم میں سے بچہ نکالنا یہ سب اُن کے ہاں شایع تھا ۔ کچھ اُوپر سوا سو آلات فن جراحی کے اُن کے ہاں مستعمل تھے ۔ چیچک میں ٹیکہ لگانا اُن کے ہاں مدت سے چلا آتا تھا ۔ سنسکرت زبان کی نسبت ایک بہت بڑے محقق کا قول ہے کہ یہ زبان یونانی زبان سے زیادہ کامل اور رومی سے زیادہ وسیع اور دونوں سے زیادہ فصیح اور بلیغ ہے ۔ اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ ہندوؤں کے بزرگوں نے اس کی تکمیل اور تہذیب میں جیسے چاہیے ویسی ہی توجہ سے لکھا ہے ، کہ اس زبان کی صرف و نحو ایسی مکمل ہے کہ تمام دنیا میں کلام انسانی کے اصول اس سے زیادہ قائم نہیں کیے گئے ۔ ہندوؤں کا علم موسیقی بقول سر ولیم جونس اور پیٹرسن صاحب کے نہایت مرتب اور شائستگی سے بھرا ہوا ہے ۔ اُن کے ہاں چوراسی راگنیاں ہیں جن میں سے چھتیس راگنیاں عموماً مستعمل ہیں اور ہر ایک کے تال سُر علیحدہ ہیں اور طبیعت کے خاص خاص ولولوں کے انگیختہ کرنے میں ایک جداگانہ تاثیر رکھتے ہیں ۔ فن عمارت میں جو ہندوؤں کی قدیم کتابیں ہیں ، اُن

کو انصاف کی نظر سے دیکھ کر ایک دانشمند ہندوستانی نے جواب مضمون لکھا ہے اور اُس میں اُن کے قواعد کو بہت ترتیب کے ساتھ بیان کیا ہے ۔ اس جواب مضمون سے معلوم ہوتا ہے کہ اس فن کے اصول کو ہندو بخوبی سمجھتے تھے اور بہت سے قاعدے اُس کے اُنھوں نے ایجاد بھی کیے ہیں ۔ روئی کا کپڑا ہندوستان کی مصنوعات میں سے وہ مشہور چیز ہے جس کی خوبی اور نزاکت مدت تک ضرب‌المثل رہی ہے اور بناوٹ کی عمدگی میں اب تک بھی کسی اور ملک کے آدمیوں نے اس کی برابری نہیں کی ۔ اور ریشم بہم پہنچانا اور ریشمی کپڑا بُننا غالباً وہ قدیم سے جانتے تھے ۔ اور سنہری اور روپہلی کمخواب زربفت وغیرہ شاید اُنھی کا ایجاد ہے ۔ رنگتوں کی چمک دمک اور پختگی میں بقول آنریبل الفنسٹن صاحب اب تک اہل یورپ نے ہندوستانیوں کی ہمسری نہیں کی ۔ اس کے سوا بعضے اور فن بھی ایسے ہیں جن میں اگلے زمانے کے ہندوؤں کو خاص دست‌گاہ تھی ۔ مگر انصاف یہ ہے کہ اُن لوگوں کی نظر زیادہ تر حکمت نظری پر مقصود رہی ، حکمت عملی کی طرف بہت کم توجہ کی گئی ۔ اور اہل اسلام کی عمل داری سے اس حکمت نظری کو بھی یوماً فیوماً تنزل ہونے لگا ، یہاں تک کہ اگر ہندوؤں کے ہاں قدیم مصنفوں کی کتابیں شہادت دینے کو موجود نہ ہوتیں تو آج اُن کی موجودہ حالت ایسی تاریکی میں تھی . جس میں اگلے زمانے کی روشنی کا پتا ملنا دشوار تھا ۔ ہاں مگر اسلامی سلطنت میں علوم حکمیہ نے عربی زبان کے ذریعے سے بے شک ہندوستان میں رواج پایا ۔ لیکن اس سے زیادہ تر مسلمان ہی متمتع ہوئے ۔ ہیئت اور طبیعیات اور منطق اور ریاضی میں جتنے مباحث حکمتِ نظری کے ساتھ علاقہ رکھتے ہیں ، اُن میں اگر ہندوستان کے فاضلوں کی تصنیفات دیکھی جائیں ، اور ان میں جو اُنھوں نے محققانہ گفتگو کی ہے اور ہر مسئلے کو خوب چھان بین کرکے منقح کیا ہے ، اس پر نظر کی جائے تو یہ کہنا ممکن ہے کہ یونانیوں نے جس عمارت کی بنیاد ڈالی تھی اُس کے پورا کرنے میں ہندوستانی بھی عرب والوں کے شریک ہیں ۔ لیکن ان کا علم بھی نظر و استدلال کی حد سے آگے نہ بڑھا ، اور حکمت عملی جس کو حکمت نظری کا نتیجہ کہنا چاہیے ، اُس کی طرف کسی نے اصلاً التفات نہ کیا ۔ ہندوؤں کے اخلاق اور عادات میں انگلستان کے ایک بڑے محقق نے کمال انصاف سے گفتگو کی ہے ۔ اگرچہ اُس کی تقریر سے بہ نسبت مدح کے اُن کی مذمت زیادہ نکلتی ہے ، مگر اُن کی خوبیاں بھی قدرِ معتدبہ سے کم نہیں ۔ اُس نے لکھا ہے کہ عام ہندو اگرچہ طبیعتوں کے بودے اور بزدلے ہوتے ہیں مگر مذہب اور عزت کے ذرا سے خیال پر جان کھودینی اُن کے نزدیک کچھ بات نہیں ۔ ایک ادنٰی برہمن بجائے ایسی چیز کھانے کے ، جس کا کھانا مذہب کی رو سے منع ہے ، مر جانا قبول کرتا ہے ۔ پختگی اگرچہ ان کی اصل فطرت میں نہیں پائی جاتی مگر ایسے شخص بہت کم نکلیں گے کہ بازپرس کے وقت جس کو رشوت دی ہے اُس کا نام بتا دیں اور آپ سزا پانی گوارا نہ کریں ۔ کاہلی اگرچہ ہندوؤں کی خاص خصلت ہے مگر اکثر جفاکش اور محنتی بھی ہوتے ہیں ۔ یہ ایک عجیب بات ہے کہ باوجود اپنی عام بزدلی کے موت کی کچھ حقیقت نہیں سمجھتے ۔ ادنٰی سے ادنٰی ہندو اُس سختی اور مصیبت کو ، جو اُس کے سر سے ٹل نہیں سکتی ، ایسی بے پروابی سے جھیلتا ہے کہ اہل یورپ حیران رہ جاتے ہیں ۔ اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ ہنسنا بولنا کبھی نہیں چھوڑتا ۔ اور بے اس کے کہ اس کے حواس اور عادات میں کچھ فرق آئے ، موت کا منتظر رہتا ہے ۔ گاؤں والے ہر جگہ کم آزار اور ہر دل عزیز اور اپنے خاندان والوں پر شفیق اور ہمسایوں

پر مہربان ہوتے ہیں ۔ اور شہر کے لوگ سکون و وقار اور انتظام کے ساتھ رہتے ہیں ۔ شور و غل اور فتنہ و فساد سے عام امن و آسایش میں اور خانگی جھگڑوں سے اپنے آرام و راحت میں بہت کم خلل ڈالتے ہیں ۔ اور اگر ہم اُن لوگوں کو جو گورنمنٹ سے علاقہ رکھتے ہیں ، علیحدہ کر دیں تو شہر کے باشندے ایسے نیک اور شائستہ رہ جائیں جیسے انگلینڈ والے ۔ بلکہ ہندوؤں میں ایسا بدکردار اور بداخلاق کوئی فرقہ نہیں جیسے انگریزوں کے بڑے بڑے شہروں میں نیچ قوم کے لوگ ہیں ۔ انگلستان میں جو ایسی نیچ قوموں کے گروہ در گروہ دغا اور فریب سے اوقات بسر کرتے ہیں ، یعنی نٹ کھٹ آچکے ، دغا باز ، فریبی ، اور اُن میں سے بھی وہ دل چلے اور بدمعاش جن کی شرارت سے اعلی درجے کے خاندانوں سے لے کر عوام الناس تک محفوظ نہیں رہ سکتے ، ایسے لوگ ہندوستان میں کہیں ڈھونڈے سے نہیں ملتے ۔ ہندوؤں کے لڑکے اہل یورپ کے بچوں سے زیادہ تیز اور ہوشیار ہوتے ہیں ۔ بارہ تیرہ برس کے بچوں کی سمجھ اکثر حیرت انگیز ہوتی ہے ۔ اور اسی قدر حیرت انگیز بات یہ ہے کہ بالغ ہو کر ایسے ہی کند ذہن اور ناقابل ہو جاتے ہیں ۔ ہندوؤں کے ملک کی آب و ہوا اور جو اُس کے خواص ہیں ، اس سے یہ توقع نہیں ہو سکتی کہ ہندو اور قوموں کی نسبت عیاشی میں کم تر ہوں ۔ باوجود اس کے اگر ہم انگریزوں کی قوم سے اُن کا مقابلہ کریں تو بدمستی اور برائیوں میں ملوث نہ ہونے اور چال چلن کی صفائی اور عمدگی میں اُن کو وہ فوقیت حاصل رہے گی جو ہماری خود پسندی کے حق میں مضر ہی ہے ۔ یہاں تک جو ہم نے ہندوؤں کا حال انگریزی مورخوں کی شہادت سے بیان کیا ، یہ کسی قدر اُن کی شائستگی اور اُن کی اولاد کی قابلیت اور استعداد کا ایک ایسا نمونہ ہے جس سے یہاں کے مسلمانوں کے حالات کا سراغ بھی خاطر خواہ لگ سکتا ہے ، کیوں کہ ہم وطنی کے سبب سے جو ایک قوم کے اطوار اور خصلتوں کا اثر دوسری قوم پر ہوتا ہے ، اور پھر مل جل کر دونوں میں ایک مشابہت و مماثلت پیدا ہو جاتی ہے ، یہ ایسی بات نہیں ہے جس کے تسلیم کرنے میں کسی کو تردد ہو ۔ اور ایک وجہ سے مسلمانوں کو ہندوؤں پر ترجیح دینی بھی قرین انصاف معلوم ہوتی ہے ۔ منو شاستر کی رو سے شائستگی کا جزو اعظم ، یعنی علم ، جو برہمنوں کے ساتھ مختص کیا گیا اور باقی تمام قومیں اس دولت کے حاصل کرنے سے محروم ٹھہرائی گئیں ، اس سے بادی النظر میں تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ علم کا اثر صرف برہمنوں ہی پر مترتب ہوا ہوگا ۔ اور غور کرنے کے بعد یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس بے معنی اختصاص کے سبب سے برہمن بھی علم کے اصلی اور حقیقی فائدوں سے بہرہ مند نہیں ہوئے ، بلکہ راہ پر آنے کی جگہ اور اُلٹے گمراہ ہو گئے ، بخلاف مسلمانوں کے کہ اُن کے ہاں کوئی شرعی قید یا قانونی بندش ایسی نہ تھی جس کے سبب سے تحصیل علم کسی خاص فرقے کے ساتھ مخصوص ہوتی ۔ بہرحال ہندوستان پر رائے لگانے کے لیے ہندو مسلمان دونوں قوموں میں کسی ایک قوم کے حالات لکھنے کافی معلوم ہوتے ہیں ۔ اب ہم ہندو مسلمان دونوں قوموں کی موجودہ حالت کو بر سبیل اشتراک بیان کرتے ہیں : علوم جدیدہ میں سے جن علموں کی تعلیم سرکاری کالجوں اور مدرسوں میں ہندوستانیوں کو ہوتی ہے ، گو اُن علموں کے خاص فائدے ہندوستانیوں پر بہ سبب اُن کی بےپروابی کے مترتب نہ ہوں ، مگر ان کی تحصیل اور تکمیل میں یہاں کے لوگ خود انگریزوں سے تعلیم پاتے ہیں ، اُن کو لندن کے تربیت یافتہ لوگوں سے کم‌تر ٹھہرانا بعینہ ایسی بات ہے جیسا ہندوستان میں مشہور ہے کہ مٹی کا باسن اپنی سرحد سے باہر نکل کر ویسا عمدہ خود وہاں کے کاریگروں سے نہیں بن سکتا ، جیسا امروہے

کے اندر بن سکتا ہے - فنون جدیدہ کی عام تعلیم کا کوئی طریقہ اب تک ہندوستان کے لیے گورنمنٹ کی طرف سے مقرر نہیں ہوا اور ہندوستانیوں کی توجہ بھی اس طرف بہت کم معلوم ہوتی ہے - مگر باوجود اس کے ہم دیکھتے ہیں کہ ادنیٰ سے ادنیٰ گاؤں کے بڑھئی اور لوہار جن کی غذا اکثر جوار یا باجرہ کی روٹی اور کچی پیاز یا دہی اور چھاچھ کے سوا کچھ نہیں ہوتی ، اور جن کے رہنے کے مکانوں کی ٹھیک تمثیل جانوروں کے دڑبے کے سوا اور کسی چیز کے نہیں دی جا سکتی ، اور جن کو تربیت یافتہ لوگوں کی صحبت کبھی خواب میں بھی نصیب نہیں ہوئی ، وہ ولایت کی باریک باریک صنعتوں کے ایسے چربے آتارتے ہیں جن کو خود ولایت کے اہل انصاف پسند کرتے ہیں ، اور بغیر تعلیم و تربیت کے جہاں تک انسان کا ذہن اور فکر پہنچ سکتا ہے ، اپنی قابلیت کی اپج سے ایجاد اور اختراع بھی کرتے ہیں - گو تربیت یافتہ لوگوں کی ایجادات سے اس کو کچھ نسبت نہ ہو ، غیر زبانوں کی تحریر میں کمال بہم پہنچانا اور اپنی نظم یا نثر کو اہل زبان کی نظم و نثر میں ملا دینا ظاہرا ہندوستانیوں کی ہی ذاتی خاصیت معلوم ہوتی ہے - اس بات میں ایک عجم والوں نے صرف عربی زبان میں ہندوستانیوں کی ہمسری کی ہے - کیوں کہ قصائد اور خطبے اور ہر فن کی کتابیں جس قدر ہندوستانیوں نے عربی زبان میں فصاحت اور بلاغت کے ساتھ لکھی ہیں ، اس سے زیادہ اہل عجم کا کلام عربی میں پایا جاتا ہے - اس کے سوا اور کسی ملک کے آدمیوں سے اس باب میں ہندوستانیوں کی برابری نہیں ہو سکی - اہل یورپ غیر زبانوں میں بہ قدر حاجت گفتگو کرنا اور آن کی لغات و محاورات کی تحقیقات میں کمال بہم پہنچانا اور آن سے اپنی زبان میں کتابیں ترجمہ کرنی بےشک خوب جانتے ہیں ، مگر ہم نے آج تک یہ کبھی نہیں سنا کہ یورپ کے

سو پچاس فاضلوں نے مشرق زبانوں میں کچھ قصائد لکھے ہوں یا علمی کتابیں تصنیف کی ہوں ، اور اہل زبان نے بھی آن کو پسند کیا ہو - عام ہندوستانیوں کے اخلاق اور عادات میں ہم بہت سی خوبیاں ایسی پاتے ہیں جن کو اہل یورپ یا تو عیب سمجھتے ہیں یا وہ آن کی طبیعت میں پیدا ہی نہیں کی گئیں - ہندوستانی سے یہ ہرگز نہیں ہو سکتا کہ کوئی شخص ، عام اس سے کہ آس کا ہم وطن یا ہم زبان یا ہم مذہب ہو یا نہ ہو ، اس کے پاس آئے اور وہ اپنا ضروری کام چھوڑ کر اس کی طرف متوجہ نہ ہو ، یا کم فرصتی کا عذر کرکے آسے ٹال دے ، یا ”اچھا رخصت“ کہہ کر اپنے پاس سے آٹھا دے - ہندوستان میں ایک عام دستور ہے کہ خاص موقعوں پر یہاں کے خاص خاص فرقے جواں مردانہ ہمت صرف کرتے ہیں اور اپنے بنی نوع کے درد میں شریک ہوتے ہیں - ظاہر ہے کہ اس ملک میں علوم قدیمہ کے پڑھنے پڑھانے کا رواج گویا بالکل نہیں رہا اور مجالس علمی اکثر درہم برہم ہو گئیں - مگر اب بھی سینکڑوں فاضل اور پنڈت ایسے ملیں گے جو بے اس کے کہ کسی سے آجرت کے طلب گار یا گورنمنٹ کی طرف سے وظیفہ دار ہوں ، اپنا وقت عزیز درس و تدریس میں صرف کرتے ہیں - اکثر طبیب اور کحال اور بید وغیرہ جن کی معاش کی کوئی وجہ معین نہیں ، بے اس کے کہ کسی سے کچھ آجرت مقرر کریں ، ہر غریب اور محتاج آدمی کے علاج میں اسی قدر سعی کرتے ہیں جیسے دولت مندوں اور امیروں کے علاج میں کرتے ہیں - آسی طرح حسب حیثیت اپنے سارے کنبے کے ساتھ سلوک کرنا اور اپنی کمائی کے ایک معتدبہ حصے سے آن کی خبر لینی ، محتاج آدمی کو دیکھ کر بے چین ہو جانا اور اپنے مقدور کے موافق آس کو کچھ نہ کچھ دینا

ہندوستانیوں کی عام خاصیت ہے ۔ اور اس کا سبب غالباً یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کے لوگ عموماً رقیق القلب اور نرم دل ہوتے ہیں اور اس وجہ سے شفقت اور رحم اُن کی سرشت میں ہوتا ہے ۔ خلاصہ یہ ہے کہ جس قدر ہم ہندوستانیوں کی اصل فطرت میں خوبیاں پاتے ہیں ، گو بہ سبب پختہ نہ ہونے کے کسی شمار میں نہ ہوں ، لیکن ان کے لحاظ سے یہ کہنا ممکن ہے کہ جس آفتاب کی روشنی نے یورپ کے چاروں طرف اُجالا کر رکھا ہے ، وہ ہندوستان کے بادلوں میں جھلکتا ہوا معلوم ہوتا ہے ۔ مگر ہمارے ہم وطن اس تقریر پر فریفتہ ہو کر اپنے کو کچھ چیز نہ سمجھیں ۔ کیوں کہ ہم کو ہندوستانیوں کی اصل فطرت میں شائستگی کی پوری پوری قابلیت ثابت کرنی منظور تھی ، اس لیے ہم نے اُن کی وہ خوبیاں کہی ہیں جن سے اُن کا جوہر قابل ہونا سب پر آشکارا ہو جائے ، ورنہ جن برائیوں میں سے ہم نے یہ خوبیاں انتخاب کی ہیں ، وہ شمار میں اس قدر زیادہ ہیں کہ اُن میں سے ان خوبیوں کا انتخاب کرنا ایسا ہی مشکل ہے جیسے ایک ریگستان میں سے خاک چھان کر چند موتی نکالنے ۔ ہمارا حال زیادہ تر اسی سبب سے الزام کے قابل ہے کہ باوجود دعوئ قابلیت اور استعداد کے ، ہم کو اُن قوموں میں جو تربیت کی محتاج ہیں ، ایک نہایت عمدہ امتیاز یہ ہے کہ ہم کو خدا تعالیٰ نے وہ گورنمنٹ دی ہے جو خود بھی تربیت یافتہ ہے اور ہماری تربیت کے اسباب مہیا کرنے میں دل و جان سے مصروف ہے ؛ باوجود اس کے ہم نے اپنے دامن حال سے آج تک ناشائستگی کے دھبے نہیں دھوئے اور اپنے جوہر قابلیت کو جلا کرکے اس سے زنگ نہیں چھٹایا ۔ اب میں اس مضمون کو ختم کرتا ہوں اور اپنے ہم وطنوں سے یہ التماس کرتا ہوں کہ جب تک اپنے

حال کی اصلاح نہ فرمائیں اور اپنی ناقص استعداد کو حدِ کمال تک نہ پہنچائیں ، اُس وقت تک اس تمام مدح و ستائش کو اپنے حق میں ایک ہجو ملیح سمجھیں اور آیندہ کو سچی تعریف اور حقیقی ستائش کے مستحق ہونے کی لیاقت پیدا کریں ۔

۷

ایام تعطیل میں ایک سفر کی کیفیت

(علی گڑھ انسٹیٹیوٹ گزٹ ۱۸۸۰ء صفحہ ۱۸۰۳)

مولانا حالی جب اینگلو عربک سکول دہلی میں فرسٹ اورینٹل ٹیچر تھے تو موسمی تعطیلات میں، جو اُس وقت ایک مہینے کی ہوا کرتی تھیں، اُنھوں نے خاص طور پر ایک تفریحی سفر ریاست اَلوَر کا کیا تھا۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ تفریح کے لیے خاص الور ہی کو مولانا نے کیوں منتخب کیا۔ بہرحال اس سفر میں وہ علی گڑھ، فیروز آباد، اٹاوہ، مین پوری، کان پور، ہمیر پور اور باندی کوئی ہوتے ہوئے الور پہنچے۔ علی گڑھ میں سرسید کے مہمان رہے اور علی گڑھ کالج دیکھنے کا اُن کا یہ تیسرا موقع تھا۔ اس کا حال بیان کرتے ہوئے مولانا کے ایک ایک لفظ سے اُس محبت اور عقیدت کا اظہار ہوتا ہے جو مولانا کو علی گڑھ اور سرسید کی ذات سے تھی۔ راستے میں مولانا جن جن مقامات سے گزرے، اُن کی مختصر کیفیت بیان کی ہے۔ سب سے مفصل حالات الور کے لکھے ہیں جہاں وہ خاص طور پر تشریف لے گئے تھے۔ مگر اب تو سب کچھ اس قدر بدل گیا ہے کہ یہ حالات ایک پرانی کہانی معلوم ہوتے ہیں۔ (محمد اسماعیل)

ایام تعطیل میں دوستوں اور عزیزوں سے ملنے کی غرض سے ہم کو چند مقامات میں دورہ کرنے کا اتفاق ہوا اور ہم دہلی سے علی گڑھ پہنچے، اور جناب آنریبل سید احمد خاں بہادر کی کوٹھی پر ٹھہرے۔

علی گڑھ:

اب کی دفعہ ہم نے مدرسۃ العلوم کو تیسری بار دیکھا اور اس کی روز افزوں ترقی دیکھ کر خدا کا شکر ادا کیا۔ مدرسے کو دیکھ کر ہم کو اس بات کا پورا یقین ہو گیا کہ اولوالعزم اور مستقل مزاج آدمی اپنے ارادوں کی مزاحمت سے اور زیادہ کامیاب ہوتے ہیں۔

اُن لوگوں کے سوا جو عناد اور دشمنی سے اس مدرسے کے مخالف ہیں، باقی سب مسلمان رفتہ رفتہ اس کی قدر کرتے جاتے ہیں اور جن عمدہ اصول پر اس مدرسے کی بنیاد قائم کی گئی ہے، اب ان کی خوبی و عمدگی سب پر ظاہر ہو رہی ہے، اور اسی وجہ سے طلبہ کی تعداد روز بروز بڑھ رہی ہے۔ بہت سے بے خبر اور ناواقف لوگ جو اپنی اولاد کو یہاں بھیجتے ہوئے جھجکتے تھے اور ان کے مذہب و عقائد کے بدل جانے سے ڈرتے تھے، وہ اب نہایت اطمینان اور دل جمعی سے اپنی اولاد کو وہاں بھیجنے لگے ہیں۔

یہ بات تحقیق ہو گئی ہے کہ بانیِ مدرسۃ العلوم کے مذہبی اعتقادات اور رایوں کو مدرسۃالعلوم کی تعلیم میں کچھ بھی دخل نہیں ہے۔

اس امر کا یہاں تک خیال رکھا جاتا ہے کہ رسالہ "تہذیب الاخلاق جو مطبع علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ سے چھپ کر شائع ہوتا ہے، اُس کی کوئی کاپی مفت یا بہ قیمت کسی طالب علم کو نہیں دی جاتی۔

طلبائے مدرسہ کے افعال و اخلاق کی نگرانی پر یہاں وہ لوگ مامور ہیں جو جمہور اہل اسلام کے طریقے سے سرمو تجاوز کرنے کو بھی کفر جانتے ہیں ۔

علی گڑھ میں ہم بعض ایسے دوستوں سے بھی ملے جو چند سال پہلے اس مدرسے کو ''دارالکفر'' سمجھتے تھے ، لیکن اب حد سے زیادہ اس کے مداح اور ثنا خواں ہیں اور اپنے بچوں کو وہاں تعلیم کے لیے بھیجتے ہیں ۔

مدرسے میں دو چار کے سوا ، جو کہ مریض تھے ، ہم نے سب مسلمان طالب علموں کو روزہ‌دار پایا ۔ افطار کے وقت نماز کے چبوترے پر ، جو بالفعل عارضی طور پر بنایا گیا ہے ، سب جمع ہوتے تھے اور نہایت لطف کے ساتھ روزہ افطار ہوتا تھا ۔ نماز عشا کے بعد جناب مولوی محمد امیر صاحب تراویح میں قرآن سناتے تھے اور اکثر طالب علم ان کا قرآن سنتے تھے ۔ ایک روز جناب مولوی سید فرید الدین احمد خاں بہادر نے اور دوسرے روز ہمارے جلیل‌القدر میزبان (یعنی سید احمد خاں صاحب) نے بھی روزہ افطار کی تقریب میں اپنے دوستوں کو بلایا تھا اور ان دونوں صحبتوں میں ہم بھی شریک تھے ۔

مدرسۃ العلوم کی تعمیر نہایت شد و مد سے جاری ہے اور جس قدر کام اس میں ہو چکا ہے اور ہو رہا ہے ، اس کو دیکھ کر بے انتہا تعجب ہوتا ہے ۔

مدرسۃ العلوم کے حامیوں اور کارپردازوں کی سرگرمی اور کوشش دیکھ کر اُن لوگوں کے دل میں بھی ، جو مسلمانوں کی ترقی سے مایوس ہیں ، ایک جوش اور ولولہ پیدا ہوتا ہے اور یہ امید ہوتی ہے کہ اس قوم کی ترقی کا اگر ذمہ‌دار ہو سکتا ہے تو یہی مدرسہ ہو سکتا ہے ۔

علی گڑھ میں پانچ روز ٹھہر کر ہم فیروز آباد ، اٹاوہ ، مین پوری اور کان پور ہوتے ہوئے ہمیر پور میں پہنچے ۔

فیروز آباد :

فیروز آباد ضلع آگرہ کا ایک مشہور قصبہ ہے جس میں سرکاری تھانہ اور تحصیل بھی ہے ۔ یہ قصبہ جیسا کہ مشہور ہے ، فیروز خواجہ سرا کا آباد کیا ہوا ہے ، لیکن یہ ایک غیر محقق بات ہے ؛ کچھ عجب نہیں کہ فیروز شاہ کا آباد کیا ہوا ہو ، جیسے فیروز پور یا حصار فیروزہ وغیرہ ۔

یہاں کھجور کے پٹھے کی پنکھیاں ایسی عمدہ بنتی ہیں کہ ہندوستان میں شاید ہی کہیں اور بنتی ہوں ۔ سادی پنکھیاں جن میں کسی قدر ریشم کا کام بھی ہوتا ہے ، ایک روپیہ قیمت کی ہم نے بھی یہاں دیکھیں ۔ اس کے سوا یہاں کی کوئی بات ذکر کے قابل نہیں ہے ۔

یہاں کے مسلمان جو پہلے بہت آسودہ اور مرفہ الحال تھے ، اب اس قدر پست حالت میں ہیں کہ وہاں کے ذی اعتبار باشندوں میں اُن کا کوئی ذکر نہیں آتا ۔

اٹاوہ :

اٹاوے میں ہم کو زیادہ ٹھہرنے کی مہلت نہیں ملی اور نہ اپنے شفیق میزبان کے مکان کے سوا کہیں جانے کا اتفاق ہوا ۔

مین پوری :

مین پوری میں ہم دو روز ٹھہرے ۔ خوش قسمتی سے ہم کو ایک دن اور ایک رات جناب میرزا عابد علی بیگ صاحب سب آرڈنیٹ جج کی خدمت میں رہنے کا موقع ملا ۔ یہاں بھی طریقۂ معاشرت میں ہم نے وہی انوار و برکات مشاہدہ کیے جو علی گڑھ میں کیے تھے ۔ جناب میرزا صاحب بھی اُسی ''مردود گروہ'' میں

سے ہیں جو قومی ہمدردی کو راس‌الحسنات اور مخ العبادات جانتا ہے۔ جب ہم اُن کے دولت خانے سے رخصت ہو کر ڈاک گاڑی پر پہنچے تو اُن کے دو آدمی ہمارے ساتھ تھے، جن سے کوچبان کو معلوم ہوا کہ وہ صدر اعلیٰ کے ہاں سے آئے ہیں۔ اس بات نے ہم کو بہت تکلیف میں ڈالا کیوں کہ گاڑی کا کوچبان اتفاق سے مسلمان ہونے کے ساتھ ہی نہایت متقی بھی تھا۔ اس نے یہ بات معلوم ہونے پر راستے میں ہم کو پانی پینے کے لیے اپنا کٹورا تک نہیں دیا اور ہم سے برابر ایسا پرہیز کرتا رہا جیسے بعض ہندو مسلمان سے کرتے ہیں۔ اول تو ہم کو اس سے بہت تعجب ہوا، لیکن پھر یاد آیا کہ ہم نے اپنے عالی قدر میزبان کے ہاں برابر دو وقت میز پر کھانا کھایا تھا اور اسی لیے ہم سے پرہیز کرنا ضروری تھا۔

ہمیر پور :

جب ہم کانپور میں پہنچے تو معلوم ہوا کہ وہاں سے ہمیر پور تک آونٹ گاڑی کے سوا کوئی سواری نہیں جاتی، اس لیے لاچار اسی میں جانا پڑا اور اتفاقاً ہم کو اوپر کے درجے میں جگہ ملی۔ ہم کو یاد نہیں کہ ہم نے کبھی کسی سواری یا پیدل چلنے میں ایسی تکلیف اٹھائی ہو جیسی اس اونٹ گاڑی میں ہمیں پہنچی۔

ریل کے زمانے سے پہلے یہی سواریاں نہایت غنیمت سمجھی جاتی تھیں مگر اب تو اُن کے نام سے ہول آتی ہے۔ افسوس کہ یورپ کی صنعتیں روز بروز ہم کو پہلے درجے کا آرام طلب اور راحت پسند بناتی جاتی ہیں، اور اب وہ تمام اسباب اور ذریعے مفقود ہیں جن کے باعث سے کبھی کبھی ہم کو جفا کشی اور محنت کرنے کا بھی موقع ملتا رہے۔

ہمیرپور کو جاتے ہوئے پچھم کی طرف سڑک سے کسی قدر فاصلے پر ہم نے ایک مندر دیکھا جو بیربر کا بنایا ہوا مشہور

ہے۔ گو یہ مندر کچھ زیادہ شان دار نہیں ہے مگر اس سنسان جنگل میں ایک ایسے زمانے کو یاد دلاتا ہے جو ہندوستان کی تاریخ میں ’طلائی زمانہ‘ کہلانے کا مستحق ہے۔

اب ہم جمنا سے اُتر کو ہمیر پور پہنچے۔ ہمیر پور راجا ہمیر سنگھ کا آباد کیا ہوا مشہور ہے، جس کے خاندان کی عمارتوں کے کھنڈر اب تک وہاں موجود ہیں۔ یہ قصبہ کانپور سے چالیس میل جانب جنوب بہت بلندی پر واقع ہے۔

اس کے شمال میں جمنا اور جنوب میں بیدوتی ندی بہتی ہے، اور مشرق میں ایک میل پر جا کر دونوں مل گئی ہیں۔ مغرب میں ایک نالہ ہے جو بیدوتی میں جاکر گرتا ہے۔ یہ نالہ برسات میں جاری ہو جاتا ہے اور ویسے ایام میں خشک رہتا ہے، اور اس لحاظ سے ہمیر پورکو کبھی جزیرہ اور کبھی جزیرہ نما کہا جا سکتا ہے۔

قدیم باشندے یہاں کے زیادہ تر ہندو ہیں۔ شریف مسلمانوں میں صرف ایک سیدوں کا خاندان ہے جو اکثر خانہ نشین اور بزرگوں کے متروکے پر قانع ہے۔ اس خاندان کے جتنے آدمی میں نے دیکھے ہیں سب پرانی روش کے بھولے بھالے سیدھے سادے سید ہیں، جن پر زمانۂ حال کی چھینٹ بھی نہیں پڑی۔

اس مقام کی رونق زیادہ تر سرکاری ملازموں سے ہے۔ اور یہ نہایت خوشی کی بات ہے کہ یہاں سرکاری ملازموں میں جس قدر پردیسی مسلمان ہیں، وہ برخلاف عام مسلمانوں کے باہم برادرانہ محبت اور برتاؤ رکھتے ہیں، اور ایک دوسرے کے درد اور دکھ میں شریک ہوتے ہیں، مگر باوجود اس کے تعصباتِ بے جا میں سب گرفتار ہیں۔ حقیقت میں ہمیر پور ایک ایسے گوشے میں واقع ہے جہاں زمانے کے شور و شغب کی آواز بہت کم پہنچتی ہے۔ مدرسة العلوم کا نام وہاں کے اکثر مسلمانوں نے کبھی کان سے بھی

نہیں سنا اور جنھوں نے سنا ہے ، ان کے ذہن میں اُس کی ایسی ہول ناک صورت سمائی ہوئی ہے کہ اس کے نام سے پناہ مانگتے ہیں ۔

دلی سے ہمیر پور تک :

دلی سے ہمیرپور تک ہم کو شریف مسلمانوں کی اکثر صحبتوں میں بیٹھنے اور اُن کی بات چیت سننے کا اتفاق ہوا ۔ تقریباً تمام مجلسوں کا رنگ ہم نے ایک ہی اصل پر دیکھا ۔ وہی بے جا شیخی اور تعلی اور ہر ایک پہلو سے اپنی تعریف نکالنی ، لوگوں کے عیب ڈھونڈنے اور اُن کو برائی سے یاد کرنا ، حاضرین کی خوشامد اور غائبین کی بدگوئی ، بات بات میں فحش اور دشنام سے زبان کو آلودہ کرنا اور سب سے زیادہ خود غرضی اور تعصب کا بازار ہر جگہ گرم پایا ۔

آگرے سے باندی کوئی تک :

مراجعت کے وقت ہم ایک دن آگرے میں ٹھیر کر الور پہنچے ۔ یہاں ہم کو ”راجپوتانہ اسٹیٹ ریلوے“ میں بیٹھنا پڑا ۔ چوں کہ یہ سرکاری ریل ہے اس وجہ سے ہم کو امید تھی کہ اس میں زیادہ آرام ملے گا ، مگر برخلاف اس کے سب سے زیادہ اسی میں تکلیف اٹھانی پڑی ۔ اول تو اس میں انٹر میڈیٹ کلاس کے نہ ہونے سے بڑا نقص ہے ، کیوں کہ متوسط الحال آدمیوں کے لیے یہ درجہ فرسٹ کلاس کا حکم رکھتا ہے ۔ دوسرے گاڑیاں اس قدر چھوٹی ہیں کہ ایک کمرے میں صرف چار آدمی آرام سے بیٹھ سکتے ہیں ۔ باوجود اس کے ایک ایک کمرے میں آٹھ آٹھ آدمی بٹھائے جانے کا حکم ہے ، اوراس پر غضب یہ ہے کہ جب تک ایک کمرے میں پورے آٹھ آدمی نہیں بیٹھ لیتے ، تب تک دوسرا کمرہ

نہیں کھولا جاتا ، حالاں کہ اکثر اسی کلاس کی پانچ پانچ سات سات گاڑیاں ٹرین میں بالکل خالی جاتی ہیں ۔

ہم رات کی ٹرین میں سوار ہوئے تھے اور ہماری گاڑی کے کسی کمرے میں آٹھ آدمی سے کم نہ تھے ۔ نیند کے مارے ایک دوسرے پر گرا پڑتا تھا اور تمام راستے مسافروں میں باہم تکرار ہوتی رہی ۔ علاوہ ان ”خوبیوں“ کے یہ ریل اور ریلوں کی نسبت سست رفتار بھی بہت ہے ۔ صبح کے سات بجے ہم باندی کوئی میں پہنچے اور دس بجے تک یہاں ٹھیرے رہے ۔ یہاں تقریباً ڈیڑھ میل طول اور اسی قدر عرض کے میدان میں بالکل سنگین عمارتیں اس قدر بنائی گئی ہیں کہ بجائے خود ایک شہر آباد ہو گیا ہے ۔ سنا جاتا ہے کہ یہاں کسی قدر سرکاری فوج رکھی جائے گی ۔

الور :

وہاں سے چل کر ساڑھے بارہ بجے ہم الور پہنچے اور دوپہر تک نئی سرائے میں ، جو کیڈل صاحب پولٹیکل ایجنٹ کے عہد میں تیار ہوئی ہے ، ٹھیرے ۔ اس سرائے کی عمارت بالکل سنگین ہے ۔ ظاہرا ہندوستان میں یہ پہلی سرائے ہے جس کے نقشے میں ہر ایک مسافر کی آسایش اور تمام ضروریات کا پورا پورا لحاظ رکھا گیا ہے ۔ رات کو ہمارے ایک معزز دوست نے ہم کو اپنے مکان پر بلا لیا اور پانچ روز تک ہم اُن ہی کے مکان پر ٹھیرے رہے ۔

الور کو ہم نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا ۔ شہر کی آبادی عین دامن کوہ میں واقع ہوئی ہے اور اسی وجہ سے شہر کا شمالی حصہ جنوبی حصے سے کسی قدر بلند ہے ۔ یہاں کے بازار اگرچہ بہت وسیع نہیں مگر پُر رونق ضرور ہیں اور عمارتیں اکثر سنگین ہیں ۔ شہر کی عام عمارتیں کچھ زیادہ امتیاز نہیں رکھتیں لیکن سرکاری محلوں سے راج کی پوری شان وشوکت ظاہر ہوتی ہے ۔

خصوصاً وہ محل جو موتی ڈونگری کے باغ میں مہاراجا بنے سنگھ نے بنوایا ہے۔ عمارت کی خوبی کے علاوہ وہ ایک ایسے موقع پر واقع ہوا ہے جس سے اس کی شان اور عظمت دس گنی ہو گئی ہے۔ محل کے اوپر کے درجے پر چڑھ کر جس طرف نظر ڈالیے زمین اور پہاڑ اور فرش زمردیں کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ اگرچہ اب تک وہاں بارش کم ہوئی تھی مگر پھر بھی وہاں کی قدرتی فضا دیکھنے کے قابل تھی۔

یہاں ایک اور مقام بھی کمال دل کش اور روح افزا ہے جو سیلی سیڑھ کے نام سے مشہور ہے۔ شہر سے تقریباً چھ میل کے فاصلے پر ایک سیتلا کا مندر ہے، جس کو وہاں کے لوگ سیلی سیڑھ کہتے ہیں۔ (سیلی سیڑھ کے لفظی معنی ٹھنڈی سیتلا کے ہیں)

یہاں دو طرف سے پہاڑ آ کر مل گیا ہے اور ایک مثلث کی سی شکل پیدا ہو گئی ہے۔ اس مثلث کے گوشے میں ایک بڑا اور نہایت مستحکم بند باندھا گیا ہے جس میں وقتاً فوقتاً بارش کا پانی دونوں پہاڑوں سے جھر جھر کر اکٹھا ہوتا رہتا ہے۔ اور یہاں سے الور تک ایک پختہ نہر بنی ہوئی ہے جس کے ذریعے سے بند کا پانی رستے کے تمام کھیتوں کو سیراب کرتا ہوا شہر تک پہنچتا ہے اور وہاں جا کر الور کے تمام باغات اور اس کے تمام سواد کو سال بھر تک سرسبز و شاداب رکھتا ہے۔ بند کے ایک جانب پہاڑ پر ایک نہایت پختہ گئو گھاٹ تقریباً پاؤ میل اونچا بنا ہوا ہے جو پہاڑ کی چوٹی پر جا کر ختم ہوتا ہے اور وہاں سرکاری محل بنے ہوئے ہیں۔ یہ مہاراجا بنے سنگھ کی ایک نمودار یادگار ہے جو ہمیشہ ان کے عہد حکومت کو یاد دلائے گی۔

الور کا سواد نہایت دل کش اور دل ربا ہے اور تمام باغات سے گھرا ہوا ہے۔ موتی ڈونگری کے باغ کے سوا، جو کہ مشہور

ہے، ایک کمپنی باغ بھی ہے جو مہاراجا شیودھیان سنگھ نے حضور ڈیوک آف ایڈنبرا کی تشریف آوری کے زمانے میں تیار کروایا تھا۔ یہ بھی ایک عمدہ پارک ہے۔

اس کے سوا کیڈل گنج، شفاخانہ اور اسکول وغیرہ کی عمارتیں جو کیڈل صاحب کے عہد میں بنی ہیں، نہایت عمدہ اور شہر کے لیے باعث زینت ہیں۔

ریاست الور کے پولٹیکل حالات جس قدر ہم کو معلوم ہوئے ہیں، ان سے ریاست کی آیندہ بہبودی اور ترقی کی بہت کچھ امید ہوتی ہے۔

مہاراجا منگل سنگھ، جو تقریباً دو ڈھائی برس سے با اختیار ہوئے ہیں، ان کی تعریف میں صرف اس قدر کہنا کافی ہے کہ نواب گورنر جنرل بہادر سابق جب سال گزشتہ کے ختم پر اجمیر میں تشریف لے گئے تھے تو انھوں نے میو کالج کے طالب علموں سے خطاب کرکے ایک لمبی اسپیچ کی تھی جس میں مہاراجا منگل سنگھ کی شہ سواری، گولہ اندازی، بہادری، جفا کشی، شایستگی اور عالی دماغی کی نہایت تعریف کرکے مخاطبین کو ان کی پیروی کرنے کی ہدایت فرمائی تھی۔

مہاراجا صاحب نے اس نہایت قلیل زمانے میں، جو دو ڈھائی برس سے زیادہ نہ ہوگا، کئی ایسے کام کیے ہیں جن کا ایک نوجوان ہندوستانی رئیس سے وقوع میں آنا نہایت عجیب معلوم ہوتا ہے۔ انھوں نے پہلے جنوبی ہندوستان کا ایک سفر اختیار کیا جس میں کسی قدر بحری سفر اور جزیرۂ سیلون کی سیاحت بھی شامل تھی، اور بہت شوق سے اپنا سفرنامہ بھی تیار کرایا۔ پھر با اختیار ہونے کے وقت خزانہ بالکل خالی تھا، بلکہ ریاست کسی قدر مقروض تھی، مگر اب سنا جاتا ہے کہ خزانے میں تقریباً سات آٹھ لاکھ روپیہ

جمع ہے ۔ ہر جمعرات کے دن ایک عام دربار مقرر کیا ، جس میں تمام ریاست کے مستغیثوں کو اجازت دی گئی کہ خود مہاراجا کے روبرو حاضر ہو کر عرض معروض کریں ۔ اور معمولی دربار جو ہر روز تین گھنٹے سے چار گھنٹے تک رہتا ہے ، اور جس میں کونسل کی تجویزات اور فیصلے پیش ہوتے ہیں ، یہ اُس عام دربار کے علاوہ ہے ۔ پولیس اور مال کا از سر نو انتظام کیا جس کی وجہ سے تقریباً پانچ سو روپے ماہوار کا اضافہ عملہٴ پولیس اور عملہٴ مال کی تنخواہوں میں کیا گیا ۔ سر رشتہٴ تعلیم میں بھی روز بروز ترقی ہوتی جاتی ہے ۔

ایک بڑا اسکول شہر میں عام رعایا کی تعلیم کے لیے ہے جس میں انٹرنس تک پڑھائی ہوتی ہے ۔ اور جو لڑکے یہاں سے انٹرنس پاس کرتے ہیں ان کو وظیفہ دے کر کسی کالج میں بھیج دیا جاتا ہے ۔ اگلے برس دو لڑکوں نے انٹرنس پاس کیا تھا ، وہ دونوں لڑکے اجمیر کے گورنمنٹ کالج میں ترقیِ تعلیم کے لیے بھیج دے گئے اور آٹھ روپیہ ماہوار اُن کا وظیفہ مقرر کیا گیا ۔

اس کے سوا ایک اور اسکول شہر میں ہے جو خاص ٹھاکروں اور سرداروں کی اولاد کے لیے مخصوص ہے ۔ اس مدرسے کی حالت ابھی تک کچھ اچھی نہیں ہے ۔

علاقہ الور کے دیہاتی مدارس کی ٹھیک تعداد ہم کو یاد نہیں رہی لیکن غالباً سو سے زیادہ اور ڈیڑھ سو سے کم ہے ۔

چودہ مدرسے زنانے بھی ہیں جن میں ہندو مسلمان دونوں قوموں کی لڑکیاں تعلیم پاتی ہیں ۔

سب سے بڑی بات یہ ہے کہ آرام طلبی اور سستی اور کاہلی جو ہندوستانی رئیسوں کی سرشت میں داخل ہے ، وہ مہاراجا کے مزاج میں بالکل نہیں ہے ۔ اور سادگی اور بے تکلفی ایسی ہے کہ اہل یورپ

میں بھی ایسی نہیں دیکھی گئی ۔ البتہ شکار کا شوق جس قدر ہونا چاہیے اُس سے کسی قدر زیادہ ہے ۔ باقی تعیش ، لہو و لعب اور مسکرات سے ، جہاں تک ہم نے سنا ہے ، بہ کلی نفرت ہے ۔ اور یہ تمام باتیں بشرطیکہ استقلال کے ساتھ قائم رہیں ، ایسی ہیں جو انسان کی ترقی کی اصل اصول ہیں ۔

ہم جناب ماسٹر سری رام صاحب کے ، جو مہاراجا کے پرائیوٹ سکریٹری ہیں ، اور جناب ماسٹر کنج بہاری لال صاحب ہیڈ ماسٹر ہائی سکول الور کے دل سے شکر گزار ہیں جن کی عنایت سے ہم ۔ الور کی خاطر خواہ سیر کی ۔

پانچ روز الور میں ٹھہر کر ہم رمضان کی اُنتیسویں تاریخ دن کی ریل میں الور سے روانہ ہوئے اور شام کو دلی میں پہنچ گئے ۔

۸

دیباچہ مثنوی ہادم اللذات

التماس از طرف مصنفِ کتاب

مثنوی ’ہادم اللذات‘ جو عام طور پر مثنوی ’مناجات بیوہ‘ کے نام سے مشہور ہے ، مولانا حالی نے ستمبر ۱۸۸۴ء میں مطبع امام المطابع دہلی میں چھپوا کر شائع کی تھی ۔ درسی کتابوں کی تقطیع تھی اور قیمت دو آنے رکھی تھی ۔ صفحات ۳۶ تھے ، کاغذ اور لکھائی چھپائی معمولی تھی ۔ اس مثنوی کے آخر میں جو وجہ مثنوی لکھنے کی بعنوان ”التماس“ حضرت مولانا نے لکھی تھی ، وہ ہم مثنوی مذکور کے اولین ایڈیشن سے لے کر یہاں درج کرتے ہیں ۔ (محمد اسماعیل)

حال کی مردم شماری سے معلوم ہوا ہے کہ صرف صوبہ پنجاب میں ، جس کی کل آبادی ۲ کروڑ ۲۷ لاکھ ۱۲ ہزار ۱۲۰ ہے ، بیوہ عورتیں ۱۵ لاکھ ۳ ہزار ۲ سو ۳۳ ہیں ، اور ان میں ۳ لاکھ ۴۵ ہزار ۲ سو ۸۷ ایسی ہیں جن کی عمر سات آٹھ برس سے لے کر ۳۹ برس تک کی ہے ۔ چوں کہ پنجاب کی آبادی کو تمام ہندوستان سے وہ نسبت ہے جو ایک کو ۱۱ سے ہے ، اس لیے تمام ہندوستان کی بیوائیں کم سے کم ایک کروڑ ۶۵ لاکھ ۳۵ ہزار ۵ سو ۶۳ سمجھنی چاہیں ، جن میں ایک چوتھائی سے زیادہ دوبارہ شادی کرنے کے قابل ہیں ۔ مگر ملک کی رسم و رواج سے مجبور ہیں ۔

پس جن جواں مردوں نے بیواؤں کی واجب الرحم حالت پر توجہ فرمائی ہے ، اُن کے مقاصد کی تائید اور تمام ہندو مسلمانوں کی تنبیہ کے لیے راقم نے یہ مثنوی لکھی ہے ، جس میں تا بہ مقدور اُن خیالات کی صحیح صحیح تصویر کھینچی گئی ہے جو ہندوستان کی نوجوان اور مجبور بیواؤں کے دل میں گزرنے ممکن ہیں ۔ اُمید ہے کہ ہمارے ہم وطن اس ناچیز نظم کو غور سے ملاحظہ کریں (گے) اور راقم کی اس اضطراری حرکت کو معاف فرمائیں (گے)[1] ۔

راقم : الطاف حسین حالی ، مقام دہلی

۱۔ متذکرہ نثری عبارت بہ عنوان ’التماس‘ صرف ’مناجات بیوہ‘ کے پہلے ایڈیشن میں ہے ، بعد کے کسی ایڈیشن میں نظر نہیں آئی ، اگرچہ بعد میں بلا مبالغہ اس عجیب کتاب کے سینکڑوں ایڈیشن شائع ہوئے ۔ (محمد اسماعیل)

٩

بڑے آدمیوں کے باپ

(قلمی مسودے سے نقل کیا گیا)

یہ ایک یادداشت ہے جو مولانا نے کسی امریکن اخبار سے ترجمہ کروا کے بطور خود لکھی تھی۔ شاید وہ اسے اپنے کسی مضمون میں استعمال کرنا چاہتے تھے جس کا انھیں موقع نہیں ملا۔ (محمد اسماعیل)

ایک امریکن اخبار نے ۱۸۸۶ع میں ایک عجیب تحقیقات شروع کی ہے؛ یعنی یہ کہ جتنے بڑے بڑے مشہور آدمی گزرے ہیں اُن میں سے اکثر کے باپ ادنٰی درجے کے کام کرتے تھے۔ حکیم ویانھنس کا باپ لوہار تھا۔ سقراط کا باپ عطار۔ اٹیکوس کا باپ گڈریا۔ ورجن کا باپ بھٹیارا۔ کامبس کا باپ اُون صاف کرنے والا۔ شیکسپئر کا باپ بوچڑ۔ لوتھر کا باپ کان کھودنے والا۔ کرانول کا باپ شراب کھینچنے والا۔ سکیٹس کا باپ سؤر چرانے والا۔ فرینکلن کا باپ صابن تیار کرنے والا تھا۔

۱۰

دیوتاؤں اور راکشسوں کی جنگ

(مجموعۂ نظم حالی، صفحہ ۱۰۷)

مولانا حالی نے اپنا دیوان شائع کرنے سے پہلے ۱۸۹۰ع میں اپنی متفرق نظمیں 'مجموعۂ نظم حالی' کے نام سے شائع کی تھیں۔ اُس میں ایک نظم 'زمزمۂ قیصری' بھی ہے جو ایک انگریزی نظم کا ترجمہ ہے، جس میں انگریز شاعر نے ہندوستان میں انگریزی سلطنت کی بہت تعریف و توصیف کی ہے۔ اُسی نظم کے ایک شعر کی نثر میں تشریح کرتے ہوئے مولانا نے ایک بہت مزے دار قصہ لکھا ہے جو ذیل میں نقل کیا جاتا ہے۔
(محمد اسماعیل)

'مہا بھارت' میں لکھا ہے کہ ایک مرتبہ دیوتاؤں اور راکشسوں[1] کی لڑائی ہوئی جس میں دیوتا فتح یاب ہوئے اور راکشس ہار گئے۔ اس پر راکشسوں نے سوچا کہ ہم باوجودیکہ دیوتاؤں سے قوی اور زبردست ہیں مگر پھر ہم کیوں اُن سے مغلوب ہو گئے؟ سوچتے سوچتے آخر انھوں نے معلوم کر لیا کہ دیوتاؤں کے پاس

---

[1] راکشس کے معنی دیو، بھوت، جن اور شیطان کے ہیں۔
(محمد اسماعیل)

منتروں کی طاقت ہے اس لیے وہ غالب ہو گئے ۔ اس پر اُنھوں نے سوچا کہ اگر دیوتاؤں کے منتر چُرا لیے جائیں تو اُن کی طاقت ختم ہو جائے گی اور پھر ہم اُنھیں آسانی سے مغلوب کر سکیں گے ۔ اس پر اُنھوں نے ایک منصوبہ بنایا اور اُن کی تمام کتابیں اور منتر چُرا لیے ۔ اور چُرانے کے فوراً بعد ایک راکشس ، جس کا نام سنکھا سُر تھا ، اُن منتروں اور کتابوں کو لے کر سمندر میں غائب ہو گیا ۔ جب ایشور (خدا) نے یہ ماجرا دیکھا تو اُسے بڑا غصہ آیا اور مچھلی کی شکل بن کر سمندر میں غوطہ لگایا اور وہاں پہنچ کر سنکھا سُر کو ہلاک کر دیا ، اور دیوتاؤں کے سارے منتر اور پُستکیں صاف نکال لائے اور دیوتاؤں کے حوالے کر دیں ۔

ایشور نے دیوتاؤں سے یہ بھی کہا کہ میں نے سمندر میں جا کر دیکھا ہے کہ وہاں بہت سے عجیب و غریب رتن (مفید اور کارآمد اور نایاب چیزیں) قعرِ سمندر میں موجود ہیں ۔ اگر ان سب رتنوں کو سمندر میں سے نکال لیا جائے تو بہت ہی اچھا ہو ۔ سب نے ایشور کی اس تجویز پر صاد کیا ۔ لیکن اب سوال یہ تھا کہ ان بے بہا رتنوں کو سمندر کی تہہ میں سے نکالا کس طرح جائے ۔

اس پر ایشور نے فرمایا کہ میں کچھوا بنتا ہوں ۔ تم سب یہ کام کرو کہ مل کر میری پیٹھ پر رَئی کی جگہ ہمالیہ پہاڑ کو اُٹھا کر رکھ دو ، اور تسمے کی جگہ باسکی (ایک نہایت لمبا سانپ) کو ہمالیہ پہاڑ کے گرد لپیٹ دو ۔ سانپ کے دونوں سرے سُر (دیوتا) اور اَسر (جن بھوت) اس طرح پکڑیں کہ سانپ منہ کی طرف سے سُروں کے اور دم کی طرف سے اَسروں کے ہاتھ میں رہے ۔ یہ انتظام کرنے کے بعد ایشور کی نگرانی میں رَئی کے ذریعے سے سارا سمندر خوب اچھی طرح بلویا گیا ۔ اس سخت مشقت کے نتیجے میں سمندر میں سے چودہ رتن برآمد ہوئے ؛ یعنی لچھمی ، جواہر ، شراب ، دھنتر بید ، چاند ، کنُو ،

گھوڑا ، سفید ہاتھی ، تیر کمان ، امرت اور بِس وغیرہ ۔

اور رتن تو آسانی سے باہم تقسیم ہو گئے مگر امرت پر سُروں اور اَسروں میں باہم جھگڑا ہو گیا ۔ سُروں نے کہا کہ امرت ہمیں ملنا چاہیے ، اَسروں نے کہا نہیں ہمیں ملنا چاہیے ۔

اس پر ایشور نے ایک نہایت ہی حسین و جمیل عورت کا روپ دھارا اور موقع واردات پر تشریف لائے ۔ ایسی خوب صورت اور دل فریب شکل دیوتاؤں اور راکشسوں نے کہاں دیکھی تھی ۔ دونوں اُس پر جی جان سے فریفتہ ہو گئے اور کہنے لگے ”بس بس ، یہ حسن و رعنائی کی مورت جو کچھ فیصلہ کر دے ، ہمیں بدل و جان منظور اور قبول ہوگا ۔“

اس پر عورت ، یعنی ایشور نے کہا کہ رتنوں کی یہ تقسیم شروع ہی سے غلط ہوئی ہے ، دوبارہ تقسیم ہونی چاہیے ۔

دیوتا اور راکشس دونوں بے صبری کے ساتھ عورت کے حسین و جمیل چہرے کو دیکھ رہے تھے ۔ اُن میں مخالفت کی طاقت ہی باقی نہ رہی تھی ۔ بلا تامل اُنھوں نے کہا کہ جس طرح آپ چاہیں نئے سرے سے تقسیم کر دیں ، ہمیں منظور ہوگا ۔

اس اجازت کے بعد ایشور مہاراج نے ، جو عورت کا روپ دھارے ہوئے تھے ، یہ کام کیا کہ لچھمی کو تو اپنے لیے رکھ لیا اور باقی سارے رتن اَسروں اور سُروں میں تقسیم کر دیے ۔ اور امرت جس پر یہ سارا فساد برپا ہوا تھا ، دیوتاؤں کو دے دیا ۔

اس پر جھٹ ایک چالاک اور عیار راکشس بڑی پھرتی کے ساتھ آگے بڑھا اور اُس نے امرت اُٹھا کر فوراً منہ سے لگایا اور غٹاغٹ پی گیا ۔

دیوتاؤں نے جو راکشسوں کی یہ چالاکی دیکھی تو اُن کو بڑا طیش آیا ، اور اُن میں سے ایک نے فوراً تلوار کھینچی اور اُس

راکشش کا سر اُڑا دیا جس نے امرت پیا تھا ۔

یہ بات بیان کرنی رہ گئی کہ جب ایشور مہاراج عورت بنے ہوئے رتن تقسیم کر رہے تھے تو بِس (زہر) کو نہ دیوتاؤں نے قبول کیا اور نہ راکششوں نے ۔

اس پر معاملے کو ختم کرنے کے لیے شیو جی مہاراج (یعنی مہادیو) نے فرمایا کہ اگر کوئی بِس کو قبول نہیں کرتا تو لاؤ میں اسے کھا جاؤں تاکہ قصہ ختم ہو ۔ چناں چہ شیو جی نے بِس اُٹھایا اور منہ میں رکھ لیا ۔ مگر بِس اُن کے حلق سے نیچے نہ اُترا اور گلے میں پھنس کر رہ گیا ، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شیو جی مہاراج کا سارا گلا نیلا پڑ گیا اور آج تک نیلا ہے ۔ حالی

۱۱

زبانِ گویا

(منقول از کتاب 'تزک اُردو' مطبوعہ سنہ ۱۸۹۸ع)

مولانا حالی کا یہ ناصحانہ اور مشفقانہ مضمون نہایت ہی دل چسپ اور پُرلطف عبارت میں لکھا گیا ہے ۔ مولانا نے اصلاح اور اخلاق کے علاوہ اس مضمون میں اپنی ادبی شان کو بھی نہایت خوب صورتی سے قائم رکھا ہے ۔ یعنی نصیحت کی کڑوی گولی پر ادب و انشا کی چاشنی چڑھا کر اُسے میٹھی کونین کا درجہ دے دیا ہے ۔ تاکہ ناگوار بھی نہ گزرے اور حلق سے آسانی کے ساتھ اُتر بھی جائے ۔ جو لوگ کہا کرتے ہیں کہ مولانا حالی کے مضامین بالعموم خشک ہوتے ہیں ، وہ یہ مضمون پڑھ کر دیکھیں ۔ اُن کو محمد حسین آزاد کی حلاوت اور ابوالکلام آزاد کی فصاحت کے نمونے اس میں یک جا نظر آئیں گے ۔ (محمد اسماعیل)

اے میری بلبلِ ہزار داستان ! اے میری طوطیِ شیوا بیان ! اے میری قاصد ! اے میری ترجمان ! اے میری وکیل ! اے میری زبان ! سچ بتا تُو کس درخت کی ٹہنی اور کس چمن کا پودا ہے ؟ کہ تیرے ہر پھول کا رنگ جدا اور تیرے ہر پھل میں ایک نیا مزا ہے ۔ کبھی تو ایک ساحرِ فسوں ساز ہے جس کے سحر کا رد ،

نہ جادو کا آتار۔ کبھی تو ایک افعیِ جاں گداز ہے جس کے زہر کی دارو نہ کاٹے کا منتر۔ تُو وہی زبان ہے کہ بچپن میں کبھی اپنے ادھورے بولوں سے غیروں کا جی لبھاتی تھی اور کبھی اپنی شوخیوں سے ماں باپ کا دل دُکھاتی تھی۔ تُو وہی زبان ہے کہ جوانی میں کبھی اپنی نرمی سے دلوں کا شکار کرتی تھی اور کبھی اپنی تیزی سے سینوں کو فگار کرتی تھی۔

اے میری زبان! دشمن کو دوست بنانا اور دوست کو دشمن کر دکھانا تیرا ایک ادنی کھیل ہے، جس کے تماشے سینکڑوں دیکھے اور ہزاروں دیکھنے باقی ہیں۔

اے میری بنی بات کی بگاڑنے والی اور میرے بگڑے کاموں کی سنوارنے والی! روتے کو ہنسانا اور ہنستے کو رلانا، روٹھے کو منانا اور بگڑے کو بنانا، نہیں معلوم تو نے کہاں سے سیکھا اور کس سے سیکھا؟ کہیں تیری باتیں بِس کی گانٹھیں ہیں اور کہیں تیرے بول شربت کے گھونٹ ہیں۔ کہیں تو شہد ہے اور کہیں حنظل، کہیں تو زہر ہے اور کہیں تریاق۔

اے زبان! ہمارے بہت سے آرام اور بہت سی تکلیفیں، ہمارے سینکڑوں نقصان اور ہزاروں فائدے، ہماری عزت، ہماری ذلت، ہماری نیک نامی، ہماری بدنامی، ہمارا سچ، ہمارا جھوٹ، صرف تیری ایک 'ہاں' اور ایک 'نہیں' پر موقوف ہے۔ ایک تیری اس 'ہاں' اور 'نہیں' نے کروڑوں کی جانیں بچائیں اور لاکھوں کے سر کٹوائے۔

اے زبان! تو دیکھنے میں تو ایک پارۂ گوشت کے سوا کچھ نہیں مگر تیری طاقت نمونۂ قدرتِ الٰہی ہے۔ دیکھ! اس طاقت کو رایگاں نہ کھو اور اس قدرت کو خاک میں نہ ملا۔ راستی تیرا جوہر ہے اور آزادی تیرا زیور۔ دیکھ اس جوہر کو برباد نہ کر اور اس زیور کو زنگ نہ لگا۔ تو دل کی امین ہے اور روح کی ایلچی۔

دیکھ دل کی امانت میں خیانت نہ کر اور روح کے پیغام پر حاشیے نہ چڑھا۔

اے زبان! تیرا منصب بہت عالی ہے اور تیری خدمت نہایت ممتاز۔ کہیں تیرا خطاب کاشفِ اسرار ہے اور کہیں تیرا لقب محرم راز۔ علم ایک خزانۂ غیبی ہے اور دل اس کا خزانچی؛ حوصلہ اُس کا قفل ہے اور تو اُس کی کنجی۔ دیکھ اس قفل کو بے اجازت نہ کھول اور اس خزانے کو بےموقع نہ اُٹھا۔ وعظ و نصیحت تیرا فرض ہے اور تلقین و ارشاد تیرا کام۔ ناصحِ مشفق تیری صفت ہے اور مرشدِ برحق تیرا نام۔ خبردار! اس نام کو عیب نہ لگانا اور اس فرض سے جی نہ چرانا، ورنہ یہ منصب عالی تجھ سے چھن جائے گا اور تیری بساط میں وہی ایک گوشت کا چھیچھڑا رہ جائے گا۔ کیا تجھ کو یہ امید ہے کہ تو جھوٹ بھی بولے اور طوفان بھی اُٹھائے، تو غیبت بھی کرے اور تہمت بھی لگائے، تو فریب بھی کرے اور چغلیاں بھی کھائے، اور پھر وہی زبان کی زبان کہلائے۔ نہیں ہرگز نہیں۔ اگر تو سچی زبان ہے تو زبان ہے ورنہ زبون ہے بلکہ سراسر زبان ہے۔ اگر تیرا قول صادق ہے تو شہدِ فائق ہے ورنہ تھوک دینے کے لائق ہے۔ اگر تو راست گفتار ہے تو ہمارے منہ میں اور دوسروں کے دلوں میں جگہ پائے گی، ورنہ گُدّی سے کھینچ کر نکالی جائے گی۔

اے زبان! جنھوں نے تیرا کہنا مانا اور جو تیرا حکم بجالائے، انھوں نے سخت الزام اُٹھائے اور بہت پچھتائے۔ کسی نے انھیں فریبی اور مکار کہا، کسی نے گستاخ اور منہ پھٹ اُن کا نام رکھا۔ کسی نے ریاکار ٹھہرایا اور کسی نے سخن ساز۔ کسی نے بد عہد بتایا اور کسی نے غماز۔ غیبت اور بہتان، مکر اور افترا، طعن اور تشنیع، گالی اور دشنام، پھکڑ اور ضلع جگت اور پھبتی،

غرض دنیا بھر کے عیب اُن میں نکلے اور وہ اُن سب کے سزاوار ٹھہرے ۔ اے زبان ! یاد رکھو ۔ ہم تیرا کہنا نہ مانیں گے اور تیرے قابو میں ہرگز نہ آئیں گے ۔ ہم تیری ڈور ڈھیلی نہ چھوڑیں گے اور تجھے مطلق العنان نہ بنائیں گے ۔ ہم جان پر کھیلیں گے پر تجھ سے جھوٹ نہ بُلوائیں گے ۔ ہم سر کے بدلے ناک نہ کٹوائیں گے ۔

اے زبان ! ہم دیکھتے ہیں کہ گھوڑا جب اپنے آقا کو دیکھ کر محبت کے جوش میں آتا ہے تو بے اختیار ہنہناتا ہے ، اور کتا جب پیار کے مارے بے تاب ہو جاتا ہے ، تو اپنے مالک کے سامنے دُم ہلاتا ہے ۔ سبحان اللہ ! وہ نام کے جانور اور اُن کا ظاہر و باطن یکساں ۔ ہم نام کے آدمی مگر ہمارے دل میں 'نہیں' اور زبان پر 'ہاں' ۔

الٰہی ! اگر ہم کو رخصتِ گفتار ہے تو زبانِ راست گفتار دے ، اور اگر دل پر تجھ کو اختیار ہے تو زبان پر ہم کو اختیار دے ۔ ہم جب تک دنیا میں رہیں سچے کہلائیں اور جب تیرے دربار میں آئیں تو سچے بن کر آئیں ۔ آمین

۱۲

تحریکِ سودیشی کے متعلق تین سوالوں کے جواب

(از رسالہ 'زمانہ' کان پور ، جلد ۶ ، نمبر ۴
بابت اپریل ۱۹۰۶ع ، صفحہ ۲۱۴)

اوائل ۱۹۰۶ع میں جناب دیا نراین نگم بی ۔ اے ایڈیٹر رسالہ 'زمانہ' کان پور نے تمام مسلم مشاہیر ہند سے 'تحریک سودیشی' کے متعلق تین سوال پوچھے تھے اور اُن کے جوابات کو رسالہ 'زمانہ' میں شایع کیا تھا ۔ وہ تینوں سوال مندرجہ ذیل تھے :

۱۔ سودیشی تحریک بذاتِ خود ملک کی ترقی کے لیے کہاں تک مفید ہے اور اس تحریک کے نشیب و فراز اور نفع و نقصان اور عمل درآمد کے متعلق آپ کی مفصل رائے کیا ہے ؟

۲۔ اس تحریک میں ہندو مسلمانوں کے اتفاق کی کہاں تک ضرورت ہے ۔ خاص مسلمانوں کے لیے اس سے کوئی نفع یا نقصان پہنچنے کی کہاں تک امید ہے ؟

۳۔ اس تحریک کی کامیابی کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے ؟ اور اس کی کامیابی کا ہندو مسلمانوں پر جداگانہ اور ملک پر بہ حیثیتِ مجموعی کیا اثر ہوگا ؟

منجملہ دیگر مشاہیر کے مولانا حالی کی خدمت میں بھی یہ سوالات نگم صاحب نے لکھ کر بھیجے تھے ۔ مولانا نے اُن کے جو صائب اور معقول جواب دیے ، وہ ذیل میں درج ہیں (محمد اسماعیل)

پہلے سوال کا جواب :

جس قدر تحریکیں اب تک ہندوستان کی بھلائی کے لیے دیسیوں کی طرف سے ہوئی ہیں ، میرے نزدیک اُن میں سے کوئی ایسی تحریک ، جس سے ملک کو حقیقی فائدہ پہنچنے کی امید ہو ، سودیشی تحریک سے بہتر نہیں ہوئی ۔ لیکن اس تحریک کو تقسیم بنگال کے معاملے سے متعلق کرنا گویا اس بات کا اعتراف کرنا ہے کہ اگر یہ تجویز منسوخ ہو جائے تو ہم اس تحریک سے دست بردار ہو جائیں گے ۔ میں نے سنا ہے کہ گزشتہ کانگرس کے اجلاس میں ایک رزولیوشن اس مضمون کا پیش ہوا تھا کہ سودیشی تحریک کو تقسیم بنگال کے مسئلے سے کچھ تعلق نہ ہونا چاہیے ، لیکن بنگالیوں نے اس کی سخت مخالفت کی اور اس کو ہرگز پاس نہ ہونے دیا ۔ جب اس تحریک کے اصل محرکوں کے یہ خیالات ہیں ، اور جب کہ اس کی بنیاد محض بنگالیوں کی خود غرضی (نہ کہ تمام ہندوستان کی بھلائی) پر ہے ، تو ایسی تحریک سے کیا بھلائی کی اُمید ہو سکتی ہے ؟ خود اکثر انگریز جو منصف مزاج ، راست باز اور نوعِ انسان کے ہمدرد ہیں ، اس تحریک کو پسند کرتے ہیں ۔ خود مجھ سے ایک معزز انگریز نے کہا کہ ”یہ تحریک ہندوستان کے حق میں نہایت مفید ہوگی بشرطیکہ ہندوستانی استقلال کے ساتھ اس باب میں اپنی کوشش جاری رکھیں ۔“ مگر میں کہتا ہوں کہ جس طریقے سے یہ تحریک شروع کی گئی ہے ، اس میں خود بے استقلالی کا تخم موجود ہے ۔

دوسرے سوال کا جواب :

ہندو مسلمانوں کے اتفاق کی نہ صرف سودیشی تحریک میں ، بلکہ ہر کام میں جو ہندوستان کی عام بھلائی سے تعلق رکھتا ہو ، اشد ضرورت ہے ۔ اور جہاں تک میں سمجھ سکتا ہوں سودیشی تحریک جیسی ہندوؤں کے حق میں مفید ہے ، ایسی ہی مسلمانوں کے حق میں مفید ہے ۔ مگر مجھے امید نہیں ہے کہ جب تک بنگالی سودیشی تحریک کو تقسیم بنگال کی منسوخی پر معلّق رکھیں گے ، اور ملک کی عام ہمدردی کے خیال کو اس خود غرضی کے میل کچیل سے پاک نہ کریں گے ، تب تک مسلمان اُن کے شریک نہ ہوں گے ۔ ممکن ہے کہ تقسیم بنگال کی مخالفت کو پبلک کا جوش قائم رکھنے کا ایک آلہ سمجھا گیا ہو ، مگر میرے نزدیک سودیشی تحریک کا خیال اب اس بات کا محتاج نہیں رہا کہ اُس کے قائم رکھنے کے لیے تقسیم بنگال کی مخالفت کا جوش برقرار رکھا جائے ۔ تقسیم بنگال کے موقوف ہو جانے سے اگر کوئی فائدہ ہندو مسلمان یا خاص کر اہل بنگال کے حق میں متصور ہے تو اُس کے سمجھنے والے بنگال میں بھی خال خال اشخاص ہوں گے ۔ لیکن سودیشی تحریک کے عمدہ نتائج سے ہندوستان کے خاص و عام واقف ہو گئے ہیں یا ہوتے جاتے ہیں ۔ پس اُس کے قائم رکھنے کی اس کے سوا کوئی صورت نہیں ہے کہ عملی تدابیر سے اس کو ترقی دی جائے اور اس کو کسی ایسی شرط سے مشروط نہ کیا جائے کہ جب وہ فوت ہو جائے تو مشروط بھی فوت ہو جائے ۔

تیسرے سوال کا جواب :

اس تحریک کا اثر ملک پر ضرور ہوگا اور رفتہ رفتہ کم و بیش ہوتا جاتا ہے ۔ لوگوں کو اس سرنگ کا راستہ معلوم ہو گیا ہے جس راستے سے ملک کی دولت غیر ملکوں میں کھنچی چلی جاتی ہے ۔

مگر اس راستے کا بند کرنا کوئی ہنسی کھیل نہیں ہے اور اس کے لیے جلدی کرنا نیچر سے مقابلہ کرنا ہے :

ایک دن کا کام کچھ روما کی آبادی نہیں

اگر ایک صدی میں بھی ہندوستان غیر ملکوں کی مصنوعات کا مقابلہ کرنے کے قابل ہو جائے تو سمجھو اس کو بہت جلد کامیابی ہوئی ۔

۱۳

آل نامہ

> مولانا حالی بہت ہی سنجیدہ اور متین بزرگ تھے ، مگر ابنائے زمانہ کی حالت کو دیکھ کر کبھی کبھی آپ کو خیال آتا تھا کہ مزاح کے رنگ میں ان کے اصلی رنگ کا اظہار کیا جائے ۔ اس سلسلے میں آپ نے بزبان فارسی ایک 'آل نامہ' تصنیف کیا تھا جس کے ایک ایک جملے میں ایک ایک حقیقت پنہاں تھی ۔ ان کا ارادہ تھا کہ اس قسم کے ایک سو جملے مرتب کرکے بغیر نام کے کسی رسالے میں چھپوائیں ۔ وہ سو جملے تو مرتب نہیں ہوئے مگر ان میں سے بعض انھوں نے ایک مرتبہ لکھ کر مولوی عبدالحق کو بھیجے تھے ، صرف وہی ہم تک پہنچ سکے ۔ باقی جو ذخیرہ انھوں نے ترتیب دیا تھا وہ مجھے ان کی ذاتی لائبریری میں نہیں ملا ، اس لیے مجبوراً یہاں ان ہی فقرات کے پیش کرنے پر قناعت کرنی پڑتی ہے جو مولانا نے اپنے ۲۹ اگست ۱۹۰۶ع کے خط میں مولوی عبدالحق کو لکھ کر بھیجے تھے ۔ (محمد اسماعیل)

میں نے ایک 'آل نامہ' فارسی زبان میں لکھنا شروع کیا تھا ۔ پچاس ساٹھ جملے لکھے تھے ۔ اب بہت دن سے کچھ نہیں لکھا ۔ اگر

وہ پورا ہو گیا ، یعنی پورے سو جملے بھی لکھے گئے تو ‘دکن[1] ریویو’ کے لیے بھیج دوں گا ۔ مگر میں اس کے ساتھ اپنا نام ظاہر کرنا نہیں چاہتا ۔ اس میں ہر فرقے اور ہر گروہ پر چوٹ ہے اور ہزل اور تمسخر کے پیرائے میں فیکٹس (حقائق) بیان کیے گئے ہیں ۔ چند جملے آپ کی ضیافت طبع کے لیے یہاں لکھتا ہوں :

المذہب : اعلان جنگ ۔
الدین : تقلید آبا و اجداد ۔
العلم : قسمے از جہل مرکب ۔
الامتحان : آزمائشِ لیاقت ممتحنان ۔
الیونیورسٹی : کارخانۂ کارک سازی ۔
المسلمانان ہند : چوں مارگزیدہ از ریسماں ترسندگاں ۔
العلی گڈھ پارٹی : شہید وفا ۔
العلی گڈھ کالج : پرورش گاہ طفلاں بدست مائندراں ۔
الانجمن ہائے اسلامیہ : سبزۂ برشگال ۔
الاتفاق در مسلمانان : چوں اجتماع در نقیضین ۔
الرئیس : آنکہ از ریاست بےخبر باشد ۔
الامیر : آنکہ تہی دست و قرض دار باشد ۔

---

[1] ‘دکن ریویو’ مولوی ظفر علی خاں کا رسالہ تھا جو انھوں نے قیام حیدر آباد کے زمانے میں بمبئی سے ۱۹۰۳ع میں نکالا تھا ۔ اعلیٰ درجے کا ادبی ، تنقیدی اور تاریخی پرچہ تھا ۔ $\frac{۱۸ \times ۲۲}{۸}$ سائز کے ۷۲ صفحات پر چھپا کرتا تھا ۔ کاغذ بہت اعلیٰ لگایا جاتا تھا ۔ ملک کے تمام بڑے بڑے ادیب اور انشا پرداز اس کے مضمون نگار تھے ۔ مولانا حالی بھی کبھی کبھی اس میں مضمون بھیجا کرتے تھے ۔ ہر پرچے میں کسی بڑے آدمی کے حالات بھی مع تصویر چھپا کرتے تھے ۔ ۱۹۰۸ع میں یہ پرچہ بند ہوگیا ۔ (محمد اسماعیل)

المولوی : آنکہ مسلمانان را از دائرۂ اسلام خارج می کردہ باشد ۔
الواعظ : آنکہ در تفریق بین‌المسلمین خطا نہ کند ۔
الشکار : بہانۂ آدم کشی ۔
الکمیشن : وجہِ موجہ برائے فیصلۂ یک طرفہ ۔
النیشنل کانگریس : در حق تعلیم ہند چوں بغاوت ۱۸۵۷ع درحق اسلحہ اہل ہند ۔

یہ جملے مسودے کو دیکھ کر نہیں لکھے ، اس لیے ان میں ترتیب باقی نہیں رہی ۔ اگر آپ کو یہ جملے پسند ہوں تو مجھے لکھیے تاکہ اُن کی تعداد سو تک پہنچا کر آپ کو لکھ بھیجوں (اور آپ انہیں ظفر علی خاں کو دے دیں جو انہیں ‘دکن ریویو’ میں چھاپ دیں گے) مگر میرا نام کسی پر ظاہر نہ کیجیے گا ورنہ پھر اس کا اخفا کرنا ناممکن ہوگا ۔

بہت دن سے آپ کے ساتھ باتیں کرنے کو جی چاہتا تھا اس لیے بہت سی باتیں بے ضرورت لکھی گئیں ۔

راقم : آپ کا صادق دوست الطاف حسین حالی
پانی پت ۔ ۲۹ اگست ۱۹۰۶ع

۱۴

ترجمۂ قصیدۂ عربیہ

مولانا حالی ریاست حیدر آباد سے ایک سو روپیہ ماہوار وظیفہ پاتے تھے ، اس لیے جب ۱۹۰۵ع میں میر محبوب علی خان والیِ دکن کو سلطنت کرتے چالیس سال ہو گئے تو اس خوشی میں وہاں ایک شان دار جشن منایا گیا ۔ ضرورت تھی کہ کوئی بہت بڑا قابل اور فاضل ادیب ، جس کی لیاقت کو سارا ملک تسلیم کرتا ہو ، اس جشن کی روئداد مرتب کرے ۔ چناں چہ سارے ہندوستان میں اس کام کے لیے مولانا حالی کا انتخاب کیا گیا اور مولوی عبدالحق (بابائے اردو) کو ، جو اُس وقت حیدر آباد میں ملازم تھے ، اُن کی ماتحتی میں دیا گیا ۔ جب مولانا حیدر آباد تشریف لے گئے تو اُن کی عزت اور عظمت ریاست میں اتنی غیرمعمولی تھی کہ ہر شخص کو اُن سے ملنے کا اشتیاق تھا اور روزانہ بیسیوں آدمی اُن کی ملاقات کے لیے اُن کی جائے قیام پر آیا کرتے تھے ۔ ایک دن مولوی حکیم محمد وحیدالدین عالی (مہتمم صدر شفاخانۂ یونانی سرکار عالی) بھی اپنے دوست مولوی قطب الدین محمود علی (رکن مجلس پائیگاہ و ممبر لیجس لائف کونسل سرکار عالی) کے ساتھ مولانا سے ملنے آئے ۔ مولانا ان سے مل کر نہایت خوش ہوئے

کیوں کہ دونوں صاحب ذوق بزرگ اور عربی زبان کے نہایت فاضل تھے ۔ مولانا نے اُن سے خواہش ظاہر کی کہ جس طرح اندلس مرحوم کے مشہور شاعر صالح نے اندلس کی تباہی کا مرثیہ نہایت درد ناک الفاظ میں تصنیف کیا ہے ، اُسی طرح آپ بھی ایک ایسا ہی پُر زور مرثیہ مسلمانان ہند کی تباہی و بربادی پر لکھیں ، تا شاید قوم کو اپنی موجودہ پستی اور تنزل کا احساس ہو اور وہ اس ذلت و نکبت کے سمندر میں سے نکلنے کے لیے کچھ ہاتھ پاؤں ماریں ۔ حکیم وحیدالدین صاحب نے مولانا کا یہ قومی درد دیکھ کر اُن سے وعدہ کر لیا کہ کوشش کروں گا ۔ چنانچہ بہت جلد ۱۱ اشعار کا ایک غم انگیز عربی مرثیہ تصنیف کرکے لائے اور مولانا کو سنایا ۔ مولانا نے سن کر بے حد پسند کیا اور کہا کہ ”اسے فوراً چھپوا کر شائع کر دیجیے ۔“ اُنھوں نے کہا ”میں اس کے لیے تیار ہوں بشرطیکہ اس مرثیے کا اُردو ترجمہ آپ کر دیں“ ۔ چناں چہ مولانا نے حکیم صاحب کی فرمائش قبول کرتے ہوئے اس مرثیے کا اُردو نثر میں ترجمہ کر دیا اور حکیم صاحب نے اصل اور ترجمہ دونوں کو کتابی شکل میں بماہ رمضان المبارک ۱۳۲۴ھ (مطابق اکتوبر ۱۹۰۶ع) چھپوا کر شائع کر دیا ۔ کتاب ۱۶ صفحے کی تھی اور مطبع شمسی آگرہ میں چھپی تھی ، تقطیع $\frac{۲۶ \times ۲۰}{۸}$ تھی ۔

میرے پاس پانی پت میں یہ کتاب موجود تھی مگر ۱۹۴۷ع کے قیامت خیز ہنگامے میں میری ساری لائبریری

کے ساتھ وہ بھی برباد ہوگئی ۔ لاہور آکر میں اس کتاب کو ۱۷ برس تک تلاش کرتا رہا مگر سب کوششیں ناکام ہوئیں اور کتاب نہ ملی ۔ آخر میں نے اپنے محترم دوست پروفیسر محمد اکبرالدین صدیقی ایم ۔ اے معتمد شعبۂ کتب خانہ ادارۂ ادبیات اُردو حیدر آباد دکن کو خط لکھا کہ اگر اس کتاب کا حیدر آباد دکن کی کسی لائبریری میں سراغ مل سکے تو تلاش کرکے مطلع فرمائیں ۔ اتفاق سے ادارۂ ادبیات اُردو میں یہ کتاب موجود تھی ۔ اُنھوں نے بے انتہا مہربانی فرما کر اور اپنا بڑا قیمتی وقت صرف کرکے تمام کتاب کی خود نقل کی اور مجھے ۱۸ فروری ۱۹۶۴ء کو بذریعہ رجسٹری بھیج دی ۔ پروفیسر صاحب کی اس خاص عنایت کے نتیجے میں میں آج یہ نایاب مرثیہ ناظرین کی خدمت میں پیش کرنے کے قابل ہو سکا ۔ اللہ تعالیٰ پروفیسر صاحب کو جزائے خیر دے ۔

اس عربی قصیدے کے مصنف حکیم محمد وحیدالدین نہایت ذی علم بزرگ تھے ۔ اس قصیدے کے علاوہ اُن کی دیگر تصنیفات کے نام یہ ہیں (۱) الجواہرالزہرہ فی مدح النبی و آلہ الطاہرہ ۔ (۲) قصیدۃ العربیۃ فی الرتبۃ الآصفیہ ۔ (۳) المرثیۃ العربیۃ فیھا تواریخ ھجریۃ ۔ (۴) قصیدہ وحیدیہ فی نعت خیرالبریہ ۔ (۵) مثنوی مشعل اسلام ، اُردو ۔

میں یہ قصیدہ حوالۂ پریس کر چکا تھا کہ محض اتفاق سے مجھے مکرمی محمد عالم صاحب کے پاس سے اس کا مطبوعہ نسخہ مل گیا جس سے مجھے عربی اشعار کا مقابلہ کرنے میں بڑی آسانی ہو گئی ۔ اس کے لیے میں محمد عالم صاحب کا بے حد ممنون ہوں ۔ (محمد اسماعیل)

دیباچہ

۱۳۲۳ ہجری میں جو بہ تقریب جشن سال گرہ چہل سالہ اعلیٰ حضرت نظام الملک آصف جاہ سادس خلداللہ ملکہ حیدرآباد فرخندہ بنیاد میں خاکسار کا آنا ہوا ، اثنائے قیام میں ایک روز اہالیِ حیدرآباد میں سے مولوی حکیم وحیدالدین صاحب اور مولوی قطب الدین محمود علی صاحب جن کی فضیلت ، قابلیت ، محبت اور صداقت کا نقش کبھی میرے دل سے محو نہ ہوگا ، مجھ سے ملنے کو تشریف لائے ۔ میں نے اس خیال سے کہ دونوں صاحب عربی علمِ ادب سے خاص دل بستگی رکھتے ہیں ، اندلس کے نامور ادیب صالح بن شریف رندی کے اُس مشہور و معروف قصیدے کا ذکر اُن سے کیا جو ادیب موصوف نے خرابیِ اندلس اور وہاں کے مسلمانوں کی تباہی پر لکھا ہے ۔ اور نیز قصیدۂ مذکورہ جو اتفاق سے اُس وقت موجود تھا ، دونوں صاحبوں کو دکھایا ۔ اور مولوی وحیدالدین صاحب سے یہ درخواست کی کہ اسی بحر و قافیہ میں اگر آپ بھی ایک عربی قصیدہ مسلمانوں کی موجودہ حالت پر لکھیں تو نہایت ہی مناسب ہے ۔ میں اُن کا دل سے شکر گزار ہوں کہ اُنھوں نے میری اس درخواست کو بطوع و رغبت منظور فرمایا ، اور باوجود ہجومِ خدماتِ سرکاری ایک ہفتے کے اندر اندر ایک سو سترہ بیت کا قصیدہ ، جس میں باوجود زبان کی صفائی اور سلاست کے مسلمانوں کی حالت کا نقشہ نہایت خوبی کے ساتھ درد انگیز پیرائے میں کھینچا گیا ہے ، تیار کر لیا ۔ اور دونوں صاحبوں نے از راہ محبت مجھ سے یہ خواہش کی کہ میں اُس کا اُردو میں ترجمہ کر دوں ، تاکہ اصل اور ترجمہ دونوں ایک ساتھ چھپوا کر شائع کیے جائیں ۔ اگرچہ میں نہایت عدیم الفرصت تھا مگر اُن کا شکریہ ادا کرنے کا اس سے بہتر کوئی طریقہ نہ تھا کہ اُن کے اس حکم کی تعمیل کی جائے ۔ چناں چہ اُٹھتے بیٹھتے جس طرح ہو سکا میں

نے اس خدمت کو انجام دیا ۔ امید ہے کہ یہ قصیدہ مع اپنے اُردو ترجمے کے ہماری یک جہتی اور اتحاد کو ہمیشہ یاد دلائے گا ۔ وآخر دعوانا ان الحمدللہ رب العلمین ۔

الطاف حسین حالی
نظام کالج ۔ حیدر آباد دکن
۷ ربیع الثانی ۱۳۲۴ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

هل من سبیل الی وصل الالی بانوا　　بینی و بینهم بید و قیعان
کیا اُن لوگوں سے ملنے کی کوئی صورت ہے جو بچھڑ گئے ہیں (اور) میرے اور
اُن کے درمیان صحرا اور چٹیل میدان (حائل) ہیں ؟

اوللزمان رجوع بالوصال اذا　　کانت له کالرحیٰ فی الدور احیان
کیا زمانہ جس کے اوقات آسیا کی طرح گردش میں ہیں ؛ ایام وصل کو پھیر
لائے گا ؟

اوللدموع رقوء وهی جاریة　　تدمی شئون اراقتها و اجفان
کیا آنسو جو جاری ہیں اور جن کے بہنے سے اُن کے مجاری اور پلکیں لہولہان
ہیں (کبھی) تھمیں گے ؟

اوعن همومٍ اقاسیها بحبهم　　لقلبی الهائم الولهان سلوان
کیا اُن رنجوں سے جو میں اُن کی محبت میں اُٹھا رہا ہوں ، میرے آوارہ اور
شیدائی دل کو تسلی (ہونے والی) ہے ؟

اَنّیٰ خمود النار فی الغرام بها　　ما فی الجوانح والاحشاء لهبان
کیوں کر بجھے گی عشق کی آگ جس کے سبب سینے کی تمام ہڈیاں اور اندر
الاؤ بھڑکا ہوا ہے

من لی بشوقهم هاد هدل الی　　ارض بها لی اوطار و اوطان
اُن کے شوق میں میرا کون (ایسا) رہنما ہے جو اُس سرزمین کا رستہ بتائے
جہاں میرے مقاصد اور ٹھکانے ہیں ؟

این السروب التی سارت بها ظعن　　لی اثرها کان اعوال و ارنان
کہاں ہیں وہ حسینوں کے جھرمٹ جو محملوں میں سوار تھیں (اور) میں اُن
کے پیچھے گریہ و زاری (کرتا چلا جاتا تھا) ؟

بیض کواعب مذ شدت رکائبها　　قلبی الیهن مشتاق و حنان
وہ گوری گوری اُبھرواں سینے والیاں کہ جب سے اُنھوں نے اپنے اونٹوں پر
محمل باندھے ہیں میرا دل اُن کی طرف اُڑا جاتا ہے

اذا النسیم بانفاس لهن سرت　　تفوح کالمسک اقناء و کثبان
جب نسیم اُن کی بوے دہن لے کر چلتی ہے تو مشک کی طرح ریت کے ٹیلے
اور تودے مہک اُٹھتے ہیں

لم تخل دورهم لکن بها سکنت　　بعد الخراعب آرام و غزلان
(اگرچہ) اُن کے گھر اُن کے جانے کے بعد خالی نہیں رہے لیکن اب اُن میں
ہرن اور ہرنیاں رہتی ہیں

لولا تذکر ایام لهن مضت　　و شوق ربع اقامت فیه جیران
اگر اُن کے ساتھ گزرے ہوئے دنوں کی یاد اور اُس مقام کا شوق جہاں
سب رفیق ٹھہرے ہوئے تھے ، نہ ہوتا

لما ذکا تحت صدری ما یحرقہ   ولم یذب لی قلب و ھو ھیمان

تو میرے سینے میں وہ (آگ) نہ بھڑکتی جو اس کو پھونک رہی ہے اور میرا دل جو سرگرداں ہے (یوں) نہ پگھلتا

اخشی زفیرا و اعوالا ینازعنی   الا یبوح بسر الحب اعلان

مجھ کو اپنی آہ و زاری سے ، جو مجھ سے چپقلش کر رہی ہے ، خوف ہے کہ (اس کا) اعلان (کہیں) محبت کا بھید ظاہر نہ کر دے

عینی تفیض علی صدر بہ حرق   حبا لتجمع امواہ و نیران

میری آنکھ آگ لگے ہوئے سینے پر (مینہ) برسا رہی ہے ۔ چاہتی یہ ہے کہ پانی اور آگ (ایک جگہ) جمع ہو جائیں

و فتیۃ عذلونی حین ھیج لی   نوح الطیور بکاء فیہ اشجان

اکثر لوگوں نے مجھ کو طعنہ دیا ، جب کہ پرندوں کے نالے نے مجھ کو (بھی) گریہ و زاری کی تحریک کی

تقول ما لک تبکی فی اشتیاقھم   لکل طیر لھا فی الایک الحان

وہ کہتے تھے ”تجھ کو کیا ہو گیا ہے کہ پرندوں کی ہر ٹکڑی کی آواز درختوں پر سن کر اپنے دوستوں کے اشتیاق میں رو پڑتا ہے ؟“

فقلت ویحکم مھلا لانی بی   حزن تسعرہ کالنار احزان

میں نے کہا ”تم کو خبر ہے ، بس جانے دو ۔ مجھ کو وہ غم ہے جس کو غم (اس طرح) بھڑکاتے ہیں جیسے (آگ کو) آگ

لما مضوا طفقت تعفو دیارھم   کانھا مصحف تمحوہ ازمان

جب وہ چل بسے تو اُن کے گھر یوں ناپید ہو گئے کہ گویا صحیفے تھے جن کو زمانے (کی گردش) نے مٹا دیا

حتی غدت بمرورالدھر طامسۃ   تزعزعت سقف منھا و جدران

یہاں تک کہ جوں جوں زمانہ گزرتا گیا وہ (گھر) ویران ہوتے گئے اور اُن کی چھتیں اور دیواریں سب متزلزل ہوگئیں

فقد وقفت بھا ذا وحشۃ و اسیٰ   اذا قفرت و بھا آدم و وحشان

میں نے وحشت اور غم (کی حالت) میں ، جب کہ وہ سنسان پڑے تھے اور ہرن اور وحشی (جانوروں کے) مسکن تھے ، توقف کیا

قلبی بہ الم کالنار مضطرم   والدمع منسجم والجفن ملآن

میرے دل میں ایک الم تھا جو آگ کی طرح بھڑک رہا تھا اور آنسو جاری تھے اور آنکھیں ڈبڈبائی ہوئی تھیں

ادور الثم ترباً فی محلھم   کانی فیہ ذوالاشواق نشوان

میں اُن کے مسکن کی مٹی کو یوں چومتا پھرتا تھا گویا کہ میں وہاں ایک مشتاق کے مانند تھا جو نشے میں متوالا ہو

یاراکب الخیل قدطارت بہ عجلا   بلغ سلامی صحبی اینما کانوا

اے سوار ! جس کو گھوڑا اڑائے لیے جا رہا ہے ، میرا سلام میرے یاروں کو ، جہاں کہیں وہ ہوں ، جلد پہنچا

طول ادکاری لھم لیلی یطول بہ   و ان یکن منھم للصب نسیان

جس قدر اُن کی یاد ، جو میں کرتا ہوں ، طویل ہوتی جاتی ہے (اُسی قدر) میری رات طویل ہوتی جاتی ہے ، اگرچہ اُن کی طرف سے عاشق کو بھلا دینا ہے (اور بس)

مالی اری زمنا بالشر یحزننی   وظل یلقف قومی وھو ثعبان

میری کیا بدبختی ہے کہ میں زمانے کو دیکھتا ہوں ، مکروہات سے مجھے غمگین کر رہا ہے اور میری قوم کو اژدہا بن کر نگل رہا ہے

این الالی ادرکوا بالسعی من رتب   ما لا یسامتہ بدر و کیوان

کہاں ہیں وہ لوگ جنھوں نے (اپنی) کوشش سے وہ رتبے پائے تھے جن میں نہ بدر اُن کا مقابلہ کر سکتا تھا اور نہ زحل

این الالی ملکوا شرقا کما ملکوا   غربا و سادوالوریٰ حتی لھم دانوا

کہاں ہیں وہ لوگ جو مشرق کے ایسے ہی مالک تھے جیسے کہ مغرب کے ۔ اور جنھوں نے مخلوق پر وہ سرداری کی کہ مخلوقات اُن کی مطیع ہوگئی

این الالی طلعت شھب العلوم بھم   حتی استنارت بھا فی الارض بلدان

کہاں ہیں وہ لوگ جن کی بدولت علوم کے ایسے ستارے طالع ہوئے جن سے روے زمین پر بستیاں منور ہوگئیں

این الالی رتقوا فتق الوری و حموا   دینا بہ نسخت فی الناس ادیان

کہاں ہیں وہ لوگ جنھوں نے خلایق کی برائیوں کی اصلاح کی اور اُس دین کی حمایت کی جس سے اور ادیان ، جو قوموں میں رائج تھے ، منسوخ ہو گئے

این الالی نور الارجا سراجھم   و زال عنھا بھم کفر و طغیان

کہاں ہیں وہ لوگ جن کے چراغ نے اطراف عالم کو روشن کر دیا اور جن کی بدولت وہاں سے کفر و ضلالت کافور ہو گئی

کم من ملوک بھم حاق المنون وھم   اہل الجنود فحول الحرب شجعان

کتنے بادشاہ تھے جن کو موت نے گھیر لیا حالاں کہ وہ اہل لشکر اور مرد میدان اور شجاع تھے

کانت ارائکھم تعلو السماء کما   کانت تضئی لھم کالشھب تیجان

اُن کے تخت آسمان کو نیچا دکھاتے تھے اور اُن کے تاج شہاب ثاقب کی طرح اُن پر چمکتے تھے

یوماً حضرت اذا ماتوا منازلھم   وفوق نحری لدمع العین تھتان

میں ، جب کہ وہ گزر گئے ، اک دن اُن کے محل سراؤں میں پہنچا اور حال یہ تھا کہ میرے سینے پر آنسوؤں کا ڈریڑا تھا

شاھدت ابنیۃ فیھا تشیر الی   فضل الالی قد بنوھا وھی درسان

میں نے وہاں وہ عمارتیں دیکھیں جو اپنے بانیوں کی بڑائی کی طرف اشارہ کرتی تھیں ، حالاں کہ وہ بوسیدہ ہو گئی تھیں

لم یبق من اثر فیھا لاھلھم   ولا عماد ولا نوی واعطان

نہ اُن کے باشندوں کا وہاں کوئی نشان باقی تھا ، نہ کوئی ستون ، نہ خندقیں ، نہ اصطبل

فناب فی الدھر اقوام منابھم   لم یقتفوا اثرھم قطعا اذا حانوا

پھر اُن کے قائم مقام زمانے میں وہ لوگ ہوئے جنھوں نے اُن کے گزرنے کے بعد ان کی پیروی نہ کی

خلف اضاعوا ھدی اسلافھم ونسوا   ماقد اتاھم بہ للضبط[1] قرآن

ایسے قائم مقام جنھوں نے اپنے اسلاف کی خوبیاں کھو دیں اور اُس (سبق) کو بھلا دیا جس کے یاد رکھنے کے لیے اُن پر قرآن نازل ہوا تھا

حتی غووا و علیھم نخوۃ غلبت   فیستزلھم بالختل شیطان

یہاں تک کہ وہ گمراہ ہو گئے اور اُن پر نخوت چھا گئی تا کہ شیطان اپنے مکر سے اُن کو ڈگمگا دے

فلا لشابھم راب لانھم   کل امرءٍ منھم فی الحق سھوان

اب اُن کی بگاڑ اصلاح پذیر نہیں کیوں کہ اُن میں ہر شخص حق کی باتوں میں غفلت کرنے والا ہے

---

[1] للضبط بالکل حشو ۔ حالی

ان حدثوا کذبوا ان خاصموا فجروا　　و ان هم ائتمنوا اف لهم خانوا

(یہ ایسے لوگ ہیں) کہ جب کہیں کوئی خبر بیان کریں تو جھوٹ بولیں اور لڑیں تو گالی گلوچ کریں ۔ اور جب اُن کو کوئی امانت سپرد کی جائے تو افسوس ہے کہ اس میں خیانت کریں

ان الزمان بنا حلت نوازله　　یموج موجاً له کالبحر طغیان

زمانے کے حوادث ہم پر نازل ہو رہے ہیں اور وہ اس طرح موجیں مار رہا ہے کہ اُس میں سمندر کی سی طغیانی ہے

لازال یوبقنا بالشر و هو الی　　اکل المکارم والاقدار غرثان

وہ برابر ہم کو تباہ کر رہا ہے اور ہماری خوبیوں اور مرتبوں کے نگل جانے کا مشتاق اور بھوکا ہے

نمعشری غفلت عما یحیق بهم　　من البلاء کما فی الشاء سرحان

میری قوم اُس بلا سے غافل ہے جو اُن پر اس طرح نازل ہو رہی ہے جیسے بھیڑیا بکریوں پر آ پڑتا ہے

یا ایها القوم قوموا اذ تسومکم الا　　ایام خطة خسف وهی سرعان

لوگو ! اٹھو کیوں کہ زمانہ تم کو مکروہات کا مزہ چکھانے کے لیے جلدی کر رہا ہے

یاتی اماکم ما فی ورائکم　　من داهیات لها تحتد نیران

جو مصیبتیں آنکھوں سے اوجھل ہیں اور جن کی آگ بھڑک رہی ہے ، (بہت جلد) تمھارے سامنے آنے والی ہیں

یردیکم زمن طالت شدائده　　کانها مشرفیات و خرصان

زمانہ جس کی سختیاں اس قدر بڑھ گئی ہیں کہ گویا (تمھارے) حق میں وہ تلواریں اور نیزے ہیں ، تم کو تباہ کر رہا ہے

کالسیل باللیل تسعی نحوکم فتن　　تردی رجال لکم فیها و نسوان

تمھاری طرف فتنے اس طرح دوڑ رہے ہیں جیسے رو اندھیری رات میں دوڑتی ہے ، اور تمھارے مرد اور عورتیں اس میں ہلاک ہو رہے ہیں

یا معشری بلغ السیل الزبی وطما　　بحرالخطوب بها فی الارض طوفان

اے میری قوم ! سیلاب ٹیلوں چڑھ گیا اور اُن حوادث کا دریا ، جن کا دنیا میں طوفان برپا ہے ، اُبل پڑا

یا لهف انفسکم انتم ذو وسنة　　جهلا وغیرکم ذوالرای یقظان

تم پر افسوس ہے کہ تم نادانی سے سوتے ہو اور تمھارے اغیار بیدار اور صائب الرائے ہیں

اما بکم خبر من معشر لهم　　فی کل متسع عز و سلطان

کیا تم کو اُن لوگوں کی خبر نہیں ہے جو ہر ایک میدان میں عزت اور اقتدار رکھتے ہیں

من کان فی ارضهم قد کان مهتضماً　　یغضی علی الضیم ذلا و هو خزیان

جو اپنے ملک میں شکستہ حال تھے اور ذلت و خواری سے سختیاں جھیلتے تھے

سادوا الانام و قادوهم بسعیهم　　ففی اکفهم للملک ارسان

اب وہی اپنی کوششوں سے خلائق کے سردار اور پیش رو ہیں اور اُن کے ہاتھوں میں ملک کی باگ ہے

قوم اذا نهضت بالعلم طال لها　　الی نجوم السما بالعز بنیان

وہ لوگ کہ جب علم کے لیے اُٹھ کھڑے ہوئے تو اُن کی عزت کا ایوان آسمان کے ستاروں تک جا پہنچا

فی الماء ترقم حذقا حیث ان لها   مهارة و صناعات لها شان
وہ اپنی دانائی سے پانی پر نقاشی کرتے ہیں کیوں کہ وہ (ہر کام میں) مشاق ہیں اور فنون شریفہ سے واقف ہیں

یا ویح قومی لهم جهل یضلهم   و فی الاساءة ایضاع و امعان
افسوس ہے ہماری قوم پر جن کی جہالت اُن کو گمراہ کر رہی ہے اور جن کو اپنی برائی پر وہی اصرار چلا جاتا ہے

ولم تزل بجدال شب بینهم   تشوی صدورهم کالنار اضغان
اور ہمیشہ بسبب اُس (آتش) جنگ کے جو اُن میں باہم بھڑک رہی ہے ، دل کے کینے اُن کے سینوں کو آگ کی طرح بھونتے ہیں

یسب بعضهم بعضا مخاصمة   کانما نکثت للحب ایمان
خصومت سے ایک دوسرے کو برا بھلا کہتے ہیں ؛ گویا اخوت کے پیمان جو اُن کے باہم تھے وہ سب ٹوٹ گئے

قوم لهم ملة فی الدین واحدة   ما زال بینهم بغض و شنان
وہ لوگ جو دین و ملت میں واحد تھے ، ہمیشہ اُن میں بغض و دشمنی (تازہ) رہتی تھی

والاختلاف الذی قد شاع بینهم   صاروا به شیعا بین الوری هانوا
جو اختلاف کہ اُن میں پھیل رہا ہے ، اُس کے سبب سے وہ الگ الگ فریق بن کر حقیر ہو گئے ہیں

یا ایها القوم من فی الدهر مخلصکم   عن کل خطب به ذو الحزم خشیان
اے لوگو! تم کو دنیا میں اُن آفتوں سے کون بچانے والا ہے جن سے دور اندیش لوگ خوف زدہ ہو رہے ہیں

ما عندکم من فنون عند غیرکم   یزول عنکم بها ذل و حرمان
تمہارے پاس اغیار کے کمالات میں سے کوئی ہنر نہیں ہے جس کی بدولت ذلت اور محرومی تم سے کنارہ کرے

ان الالی بلغوا فی العلم غایته   فی النوع لیس لهم فضل و رجحان
جو لوگ علم میں انتہا کے درجے کو پہنچ گئے ہیں ، انسان ہونے کی حیثیت سے اُن میں کوئی فضیلت اور برتری نہیں ہے

هم مثلنا بشر ما فی عروقهم   الا دم کدم تحویه ابدان
وہ بھی ہماری طرح بشر ہیں اور اُن کی رگوں میں اُس خون کے سوا جو ہر انسان کے بدن میں ہوتا ہے ، کوئی اور خون نہیں ہے

و مثلنا لهم اید و ارجلهم   کمثلنا وکذا مقل و آذان
اور ہمارے ہی جیسے اُن کے ہاتھ ہیں اور ہمارے ہی جیسے اُن کے پاؤں ہیں اور یہی حال آنکھوں اور کانوں کا ہے

لکنهم منکم اوفی بمالهم   به یرجح للتفضیل میزان
لیکن وہ تمہاری نسبت اُن کمالات سے زیادہ بہرہ مند ہیں جن سے فضیلت کی ترازو (کا پلہ) غالب سمجھا جاتا ہے

قد شمروا الذیل عن ساق اجتهادهم   فادرکوا غب احوال بها ازدانوا
اُنہوں نے سعی و کوشش کے لیے دامن ہمت چست باندھا اور اُن باتوں کا انجام معلوم کر لیا جو اُن کے لیے باعث زینت ہو گئیں

و جاهل تاه فی عشو انه فغوی   و شانه الجهل شینا فیه خسران
وہ جاہل جو اپنے دھوکے میں سرگردان رہ کر راہ سے بھٹک گیا ہے اور جہالت نے اُس کو وہ عیب لگا دیا ہے جس میں نقصان ہی نقصان ہے

هذا الذی ان یقم للسعی فهو به   لقوة فیه بقراط ولقمان
یہی شخص اگر کوشش کے لیے کھڑا ہو جائے تو وہ بسبب اُس قابلیت کے جو اُس کی فطرت میں موجود ہے ، بقراط اور لقمان ہے

یا حاملین رماحا لاتخونکم   فی شدة ولها فی الصخر اطعان
اے اُن نیزوں کے اُٹھانے والو ! جو سختیوں میں تم کو دغا نہیں دیتے اور جو پتھروں میں چھید کر دیتے ہیں

وشاهرین سیوفا فی الحدید لها   مورا اذا ما التقت للحرب فرسان
اور اُن تلواروں کے کھینچنے والو! جب جنگ کے لیے سواروں کی ٹکر ہوتی ہے تو وہ تلواریں لوہے میں سوراخ کر دیتی ہیں

و مسعرین حروبا حینما اضطرمت   تصفر فیه لاهل الباس الوان
اور لڑائی کی آگ بھڑکانے والو ! کہ جب وہ آگ بھڑک اٹھتی ہے تو جنگ جوؤں کے رنگ زرد پڑ جاتے ہیں

و راکبین علی جرد مسوّمة   کانها فی سیول الشر حیتان
اور ان باریک جلد گل‌دار گھوڑوں پر سوار ہونے والو ! جو جنگ و جدال کے سیلاب میں ایسے معلوم ہوتے ہیں جیسے مچھلیاں

و ناطقین باسرار العلوم لهم   علی المنابر مثل السحر تبیان
اور اے حقایق علمیہ پر گفتگو کرنے والو ! جن کا بیان بالائے منبر مثل جادو کے اثر کرتا ہے

و ساکنین بارض کالجنان بها   حور لخدمتهم تمشی و غلمان
اور اُس جنت نشان زمین پر رہنے والو ! جہاں ان کی خدمت کے لیے سیاہ پُتلی والی عورتیں اور لڑکے خراماں ہیں

و رافعین قبباً بالسکون بها   قصر مشید و للایواء ایوان
اور اے سکونت کے لیے قبے بلند کرنے والو ! جن میں اُن کے آرام کے لیے مضبوط قصر و ایوان تیار ہیں

و وارثین باموال بها لهم   عن المعصب اعراض و نسیان
اور اُس مال و دولت کے وارث ہونے والو ! جس کے بھروسے پر ان کو پیٹ پر پتھر باندھنے والے بھوکوں سے بے پروائی اور غفلت ہے

هل عندکم نبأ من قومکم و لهم   ذل یطوقهم عار و خذلان
کیا تم کو اپنی قوم کی خبر ہے جس کا یہ حال ہے کہ ذلت و خواری نے ننگ و عار کو اُن کے گلے کا ہار کر دیا ہے؟

اصابهم من دواه ما بصدمته   لاغر وان احد یهوی و ثهلان
ان کو وہ مصائب پہنچے ہیں جن کے صدمے سے کچھ شک نہیں کہ اُحد اور ثہلان جیسے پہاڑ گر کر ڈھیر ہو جائیں

امسوا بذلتهم لحما علی وضم   بین العباد ولایهتز انسان
وہ اپنی ذلت و پستی کے سبب دنیا میں مورد آفات ہو گئے مگر کسی کو (اُن کا یہ حال دیکھ کر) جنبش نہیں ہوتی

الیس یلزمکم انقاذ قومکم   عن موبقات بها تنهد عرنان
کیا تم کو لازم نہیں ہے کہ اپنی قوم کو اُن مہلکات سے بچاؤ جن سے عرنان جیسا پہاڑ اپنی جگہ سے ہٹ جائے؟

ان لم تقم فئة منکم لنصرتهم   فمن لهم بزمان الخطب اعوان
اگر تم میں سے کچھ لوگ اُن کی مدد کے لیے نہ اُٹھے تو پھر مشکل کے وقت اُن کے کون مددگار ہوں گے

ان الالی لم یکن للعلم سعیهم   ولاوری زندهم فیه لذلان

بے شک جن کی کوشش علم کے لیے نہیں ہے اور جنھوں نے اپنی چقماق سے آگ نہیں نکالی وہ ذلیل ہیں

قوموا لکسب معال عنکم ذهبت   واسعوا لها وهی للارواح اثمان

اُن بڑائیوں کے حاصل کرنے کے لیے اٹھو جو تمھارے ہاتھ سے جاتی رہی ہیں اور اُن کے لیے کوشش کرو کہ جانوں کی قدر و قیمت انھی سے ہے

امالکم قوة بالحق تدفع ما   به العیون جرت والقلب حیران

کیا تم کو خدا نے وہ قوت نہیں دی جو اُس مصیبت کو دفع کر دے جس کی بدولت آنکھیں گریاں اور دل حیران ہیں ؟

ویل لمن حاد یوما عن محجة من   للحق منه امارات و عنوان

افسوس ہے اُس شخص پر جو ذرا بھی اُس شخص کے راستے سے کترایا جس کی طرف سے حق کی علامتیں اور عنوان مقرر ہوئے

فاین فیکم لذی الاقتار مرحمة   و این فیکم لامر الله اتقان

مفلسوں پر تمھارا رحم کہاں گیا اور خدا کے حکم کا ادب (جو تم میں تھا) کہاں ہے ؟

واین عهد و اخلاص و معدلة   واین صدق و معروف و احسان

وفاے عہد اور خلوص اور انصاف کہاں گیا اور سچائی اور احسان اور بھلائی کہاں گئی ؟

والله کلفکم فی الدین وسعکم   لانه عالم الاسرار حنان

خدا نے تم کو احکام دین میں تمھاری طاقت کے موافق تکلیف دی ہے کیوں کہ وہ دلوں کا حال جاننے والا اور رحم والا ہے

فالدین یسر کما قال ابن آمنة   لکنه عندکم فی الثقل لبنان

(دیکھو) دین آسان ہے جیسا کہ آمنہ کے بیٹے (صلعم) نے فرمایا ہے لیکن وہ تمھارے نزدیک بوجھل ہونے میں کوہ لبنان کے مانند ہے

الم یواخ رسول الله بینکم   ولم یقل ان اهل الدین اخوان

کیا رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے تم میں اخوت قائم نہیں فرمائی ؟ کیا اُس نے نہیں کہا کہ کل مومن بھائی ہیں؟

محمد سید الکونین قدوتنا   رقت به ذروة الافلاک عدنان

محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) دونوں جہان کا سردار اور ہمارا پیشوا ، جس کی بدولت قبیلۂ عدنان آسمان کی بلندی تک پہنچ گیا

کالبدر لاح سناه فی الانام اذا   ارخی سدول الدجی کفر وطغیان

اُس کا نور چودھویں رات کے چاند کی طرح عالم میں اُس وقت چمکا جب کہ کفر و ضلالت نے (اُس پر) تاریکی کے پردے ڈال رکھے تھے

فالله ارسله بالحق فی زمن   عن ذکره فیه عم الناس غفلان

خدا تعالیٰ نے اُس کو حق کے ساتھ اُس زمانے میں بھیجا جب کہ حق کی یاد سے لوگوں میں غفلت پھیل رہی تھی

فقام یوقظ الطافاً و مرحمةً   من بالغواية واهی العقل وسنان

وہ اپنی مہربانی اور عنایت سے اُن لوگوں کے جگانے کو کھڑا ہوگیا جو اپنی گمراہی اور ضلالت کے سبب غافل پڑے سوتے تھے

لو لم یقم لمحا دین الهدی و حوت   بیتاً بمکة اصنام و اوثان

اگر وہ (اس طرح) کھڑا نہ ہوتا تو دین حق مٹ جاتا اور مکے میں بیت اللہ پر اصنام اور اوثان چھا جاتے

بیت بناه الذی نـار العدو غدت   بردا عـلـیـه بها روح و ریحان

وہ گھر جس کو اُس شخص نے تعمیر کیا جس پر دشمن خدا کی آگ اس طرح ٹھنڈی ہو گئی کہ گویا اُس کے لیے راحت اور رحمت تھی

فقد حـواه الالی فی غیهم سدروا   و عـمـه بهم للـکـفـر عـمـران

پھر اُس گھر پر وہ لوگ محیط ہو گئے جو اپنی گمراہی میں حد سے گذر گئے تھے اور جن کے سبب وہاں کفر کی آبادی پھیل گئی

وظل اسیر فی الافاق من مـثـل   ظلم بهم شاع فی الدنیا وعدوان

اور جو ظلم و ستم اُن کے سبب دنیا میں شائع ہوا ، اطراف عالم میں وہ ضرب المثل سے بھی زیادہ مشہور ہو گیا

لولاالنبی امـام المرسلین غـوت   کل الانام نـواقـیـس و صلـبـان

اگر یہ نبی (صلعم) جو کہ رسولوں کا امام ہے ، نہ آتا تو تمام عالم کو ناقوس اور صلیبیں گمراہ کر دیتیں

بمهجتی من ظلام الکفر زال به   و کفه بـالـعـطـا کالمزن هتان

میری جان فدا ہو اُس پر جس کی بدولت کفر کی تاریکی جاتی رہی اور جس کا ہاتھ مینہ کی طرح بخشش و عطا کا برسانے والا ہے

نـبـیـنـا الآمرالناهی و شافعنا   یوما یشیب به بـالخوف ولدان

ہمارا نبی (صلعم) امر و نہی کرنے والا ، اور ہماری اُس روز شفاعت کرنے والا جس کے خوف سے بچے بوڑھے ہو جائیں گے

خیرالانـام اجل الانـبـیـا شرفا   بحر به کل من فی الـدهـر ریـان

بہترین خلائق اور بڑائی میں تمام انبیا سے افضل اور ایسا دریا جس سے ہر شخص ، جو دنیا میں ہے ، سیراب ہے

بدر الرسالـة فی الدنـیـا مـآثـره   مثل النجوم مدی الایام غـران

وہ رسالت کا ایسا ماہ کامل ہے کہ دنیا میں جس کی خوبیاں ہمیشہ ستاروں کی طرح چمکتی رہیں گی

و کل قول من الاقـوال لم یک   فیه مدحه فهو قول فیـه نقصان

اقوال انسانی میں سے ہر قول جس میں اُس کی تعریف نہ ہو ، وہ ایک ایسا قول ہے جو نقص سے خالی نہیں

وانـه شجـر طـالـت لـه ابدا   علی الانام لـمدالـظـل اغـصان

اُس کی ذات پاک ایک درخت ہے جس کی ٹہنیاں ہمیشہ مخلوقات پر سایہ ڈالنے کے لیے پھیلی ہوئی ہیں

یفدی علیه بفرط الشوق مهجته   من کان فی قلـبـه دین و ایمان

اُس پر اُن لوگوں کی جانیں نہایت شوق کے ساتھ فدا ہوتی رہیں گی جن کے دل میں دین و ایمان ہے

یقری الالی عنده باتـوا ویشبعهم   بمـالـدیه جمیعـا و هو طـیـان

جو اُس کے پاس رات بسر کرتے تھے وہ اپنے تمام آزوقے سے اُن کی دعوت کرتا اور اُن کا پیٹ بھرتا اور آپ بھوکا رہتا تھا

شکنی الـیـه بعیر فی البلاء کما   حنت الـیـه جذوع وهی عیدان

اُونٹ نے مصیبت کے وقت اُس سے اپنی شکایت بیان کی جس طرح کہ اُس کی جدائی میں ستون حنانہ باوجود لکڑی ہونے کے رویا

ان الالی مـعـه هم معشر خشن   شم الانوف کماة القوم اعـیـان

جو لوگ اُس کے رفیق تھے وہ ایک گروہ تھا پُر ہیبت ، صاحب غیرت ، بہادر اور سردار

زکوا بصحبتہ حتی غدوا فئة   ما فی سجایا ھم عیب و لا ذان

وہ اُس کی صحبت (کی برکت) سے پاک ہو گئے تھے، یہاں تک کہ وہ ایک
ایسی جماعت بن گئے جن کے خصائل میں نہ کوئی عیب تھا ، نہ کوئی دھبا

ان حاز غیرھم مالاً فانھم   لفتیة للمعالی الغر خزان

اگر اُن کے اغیار نے مال جمع کیا تھا تو اُن کی جماعت نے نمایاں بزرگیاں
فراہم کی تھیں

قوم سیوفھم اھل النفاق کوت   فوق الجباہ و فی الارزاء ما لانوا

یہ وہ لوگ تھے جن کی تلواروں نے اہل نفاق کی پیشانیوں پر داغ دیے
تھے اور جو مصائب میں کچپائے نہ تھے

ھم للاخوۃ فی دین الھدیٰ رحما   ء بینھم کذوی القربات خلان

وہ دینی اخوت کی وجہ سے ایک دوسرے کے ہمدرد تھے اور مثل رشتہداروں
کے سچے دوست تھے

کالاسد قاموا اذا نادیٰ لنائبة   اخوھم و ھو اھل الخوف اسوان

وہ شیروں کی طرح مدد کرنے کو کھڑے ہوتے تھے ، جب بُرے وقت میں
بحالت خوف و غم اُن کا بھائی (اُن کو) پکارتا تھا

نفسی فداہ رسول کان قدوتھم   من اوضح الحق فیھم و ھو عریان

میری جان اُس رسول پر فدا ہو جو اُن کا پیشوا تھا اور جس نے اُن پر حق
کو ایسا واضح کر دیا کہ کسی طرح کا پردہ باقی نہ رہا

ما اورق العود مخضرّا و ماسجعت   حامة الایک یوری شوقھا البان

جب تک کہ درخت کی ٹہنیاں سرسبز ہوتی رہیں اور جب تک جنگل میں قمری
سرو کی آتش شوق میں چہکتی رہے

صلی علی المصطفیٰ والآل کلھم   ربی الذی ھو ذوالا کرام منان

میرا پروردگار ، جو کہ بزرگی والا اور احسان والا ہے ، محمد مصطفیٰ اور اُس
کی آل پر رحمت نازل فرماتا رہے

۱۵

حافظ محمد یعقوب صاحب مجددی

(قلمی مسودے سے نقل کیا گیا ، غالباً ۱۹۱۳ع)

پرانی وضع اور معمولی لیاقت کے یہ بزرگ مولانا حالی کے ملنے والوں میں سے تھے اور قریباً سارا ہی وقت اُن کا مولانا کے پاس گزرتا تھا ۔ مولانا کو اُن کی خاطر بڑی عزیز تھی اور وہ اُن کا بڑا لحاظ کرتے تھے ۔ جو کتاب بھی مولانا لکھتے ، وہ ضرور اُن سے دو تین نسخے لے لیا کرتے تھے ۔ خاکسار راقم الحروف نے مولانا کی بعض کتابوں کے اولیں ایڈیشن اُن ہی سے خریدے تھے ۔ خواجہ سجاد حسین صاحب مرحوم بھی اپنے والد مرحوم کی بعض نادر کتب ، جو عام طور پر نہیں ملتی تھیں ، اُن ہی سے خرید فرمایا کرتے تھے ۔ چناں چہ میں نے بھی ’مناجات بیوہ‘ کی ایک پہلے ایڈیشن کی کاپی اُن سے خریدی ہوئی خواجہ صاحب مرحوم کے پاس دیکھی تھی ، جس پر یہ الفاظ لکھے ہوئے تھے ۔” ہدیہ بخدمت حافظ محمد یعقوب صاحب مجددی ۔ ۲۸ ستمبر سنہ ۸۳ع منجانب خاکسار الطاف حسین حالی :“ حافظ محمد یعقوب صاحب مجددی کا انتقال حضرت شمش العلماء مولانا الطاف حسین حالی کے ۱۸ برس بعد ۸ اکتوبر

۱۹۳۲ع کو ہفتے کے روز پانی پت میں ہوا ۔

(محمد اسماعیل)

حافظ محمد یعقوب صاحب سے میں تقریباً پچاس برس سے واقف ہوں اور بہ وجوہ چند در چند وہ میرے رشتہ دار بھی ہیں ۔ وہ والدہ اور والد دونوں کی طرف سے ہندوستان کے نہایت مشہور اور نامور خانوادوں سے علاقہ رکھتے ہیں ۔ اُن کے والد ماجد حافظ غلام مجدد صاحب حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ العزیز سے آٹھویں پشت میں ہیں اور اخیر وقت تک بہ مقام دہلی خانقاہ شریف حضرت شاہ غلام علی رحمۃ اللہ علیہ میں سکونت پزیر رہے ۔ اور اُن کے جدِ مادری سید ناصر الدین ثانی سونی پتی حقیقی نواسے حضرت شاہ رفیعؔ الدین صاحب خلف حضرت شاہ ولی اللہ صاحب محدث دہلوی کے ہیں ۔ غدر ۵۷ع کے بعد جب کہ حضرت خانقاہ سے ہجرت کرکے حرمین کو جانے لگے ، اُس وقت حافظ محمد یعقوب صاحب موصوف کو بہ سبب صغر سن کے پانی پت میں اُن کی ہمشیرہ صاحبہ کے پاس چھوڑ گئے تھے ۔ چناں چہ اُس وقت سے وہ برابر پانی پت میں یا کبھی سونی پت یا دہلی میں مقیم رہے ہیں ۔ اور بہ سبب عالی خاندان ہونے کے اور نیز اُن کے خصائل حمیدہ کی وجہ سے سب لوگ اُن کی تعظیم و تکریم کرتے ہیں ۔

الطاف حسین حالی

کتاب کے چار مضامین بعض اہم دینی مسائل سے تعلق رکھتے ہیں ؛ پندرہ مضامین اصلاحِ اخلاق و معاشرت کے متعدد پہلوؤں سے بحث کرتے ہیں ؛ تین مضامین تاریخی اور تین سوانحی ہیں ؛ دو مضامین کا تعلق سرسید سے ہے ، اور دو مضامین علی گڑھ کالج کے مختلف معاملات پر روشنی ڈالتے ہیں ۔ آخری حصہ متفرق مضامین کا ہے جن کی تعداد پندرہ ہے ۔

اگرچہ ان مضامین کا مقصد مسلمانوں کی اصلاح اور ان غلط افکار و نظریات کی تردید تھا جو مسلمانوں میں رواج پا چکے تھے لیکن ان میں روایتی وعظ و نصیحت کا رنگ کہیں نظر نہیں آتا ۔ ہر بات علمی انداز میں اس دردمندی اور دل سوزی سے کہی گئی ہے کہ دل میں اترتی چلی جاتی ہے ۔ ان مضامین کو لکھے اب قریباً سو سال پورے ہو رہے ہیں ، اس دوران میں مسلمانوں کی تہذیب و ثقافت اور رسم و رواج بعض بنیادی تبدیلیوں سے دو چار ہوئے لیکن یہ مضامین آج بھی اتنے ہی مفید ہیں جتنے انیسویں صدی کے نصف دوم میں تھے ۔ اپنی علمی قدر و قیمت کے علاوہ یہ مضامین ادبی اور فنی نقطۂ نگاہ سے بھی نثر حالی کا نہایت قیمتی سرمایہ ہیں ۔ ان کی زبان سادہ اور شیریں اور انداز نگارش اتنا دل کش ہے کہ کتاب ناول سے زیادہ دلچسپ معلوم ہوتی ہے ۔ حالی کے یہ نثر پارے ہمارے لیے نمونے کا درجہ رکھتے ہیں کہ علمی موضوعات پر بھی اتنی شگفتگی اور روانی سے اظہار خیال کیا جا سکتا ہے ۔ کئی کئی صفحات پر مشتمل لمبے لمبے مقالات پڑھ جائیے ، کہیں رکاوٹ اور جھول کا احساس تک پیدا نہ ہوگا ۔ امید ہے کہ نثر حالی کا یہ مجموعہ علمی حلقوں میں بہ نظر استحسان دیکھا جائے گا ۔

مجلس ترقی ادب لاہور